خواتین ڈائجسٹ
فروری 2017
KHAWATEEN DIGEST Regd. No. SC-51 FEBRUARY 2017

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

فروری 2017
جلد 44 شمارہ 10
قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

فروری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

دُنیا کی سب سے بیش قیمت شے کیا ہے؟ اس سوال کے مختلف جواب ہو سکتے ہیں لیکن انسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دُنیا کی سب سے قیمتی چیز آزادی ہے۔

آج تک دُنیا میں سب سے زیادہ جنگیں آزادی کے لیے لڑی گئی ہیں۔ سب سے زیادہ قربانیاں آزادی کے لیے دی گئی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

کہتے ہیں کہ جنگیں ہتھیاروں سے نہیں حوصلے سے لڑی جاتی ہیں۔ اس بات کو مقبوضہ کشمیر کے عوام نے ثابت کیا ہے۔ کشمیریوں کی طویل جدوجہد گواہ ہے کہ تمام تر ظلم و ستم کے باوجود انہوں نے ایک دن کے لیے بھی بھارت کے تسلط کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ ان کی جدوجہد آزادی کو نصف صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ آزادی کی منزل کے نشان ابھی تک واضح نہیں ہوئے ہیں مگر اہل کشمیر کے دل یقین و عمل سے معمور ہیں۔ بھارت کے سات لاکھ سے زیادہ مسلح فوجی بھی ان کے حوصلے نہیں توڑ پائے ہیں۔

پچھلے سال 8 جولائی کے بعد برہان وانی کی شہادت نے جدوجہد آزادی میں نئی رُوح پھونک دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت نے سفاکی کی انتہا کر دی اور پیلٹ گنوں کے استعمال پر اُتر آیا۔ جس سے ہزاروں نوجوان اور بچے بینائی سے محروم ہو گئے۔

اگر سینکڑوں انسانوں کے قاتل کو سزائے موت دی جائے تو انسانی حقوق کی تنظیمیں اور ادارے اسے وحشیانہ عمل قرار دیتے ہیں لیکن ایک پوری قوم کو طاقت کے زور پر محکوم بنانے پر دُنیا کی خاموشی اور بے حسی قابلِ مذمت ہے۔

سالگرہ نمبر،

اپریل کا شمارہ خواتین ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر کی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں۔ اگر آپ کے ذہن میں سالگرہ نمبر کے لیے کوئی تجویز ہو تو ہمیں ضرور لکھیں۔

مصنفین سے بھی درخواست ہے کہ اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں شامل ہو سکیں۔

اس شمارے میں،

- دوسری عورت ۔ بی بی سحر ملک کا ناول،
- حسن المآب ۔ سائرہ رضا کا مکمل ناول، ، اکسیر جاوداں ۔ مصباح علی کا مکمل ناول،
- عشق مجذوب ۔ مصباح نوشین کا مکمل ناول،
- سعدیہ اصغر کا ناولٹ ۔ مزاج آشنا، ، ایمل رضا، عطیہ خالد، عندلیب زہرا اور ملیحہ سمون کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ سعدیہ خان سے باتیں، ، باتیں ماہم عامر سے، ، خامشی کو بیاں ملے، ، حرف سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

سنا کی اور سنوت

حضرت ابو ابی عبداللہ بن ام حرام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی ہے۔ انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ نے فرمایا:

"سنا اور سنوت اپناؤ' ان میں سام کے سوا ہر بیماری سے شفا ہے۔" عرض کیا گیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم' سام کیا ہے؟"

آپ نے فرمایا: "موت۔"

ابن ابی عبلہ رحمتہ اللہ نے فرمایا: سنوت سے مراد شبت (خوشبودار پتے جو کھانے میں ڈالے جاتے ہیں) ہے۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شہد ہے جو گھی کی مشکوں میں رکھا گیا ہو۔

فوائد و مسائل :

1۔ نواب وحید الزمان خاں نے سنوت کا ترجمہ "سویا" کیا ہے۔ یہ ایک پودا ہے۔ بعض لوگ اسے ساگ میں شامل کرتے ہیں جب کہ اس روایت میں اس کا مطلب "شہد" بتایا گیا ہے۔

2۔ سنا کی بھی ایک پودا ہے جس کی پتی دست آور ہوتی ہے۔

3۔ نباتات سے علاج بہتر طریقہ ہے۔

4۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بری دوا سے منع فرمایا ہے۔ اس سے مراد زہر ہے۔"

خودکشی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے زہر پی کر خودکشی کرلی' وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ ابد تک زہر پیتا رہے گا۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1۔ خودکشی حرام ہے۔

2۔ خودکشی مرض کا علاج نہیں بلکہ جرم ہے۔

3۔ نقصان دہ اور مضر صحت اشیاء سے نیز شراب اور اس سے مخلوط اشیاء سے علاج حرام ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ غیر مسلم معالجین نے حرام اور مکروہ اشیاء سے مرکب ادویہ کو اس قدر عام کیا ہے اور ان کی شہرت کردی ہے کہ عوام و خواص ان کے استعمال میں کوئی کراہت محسوس نہیں کرتے۔ مسلمان کو صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے حرام اور مشکوک ادویہ کے استعمال سے بچنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "اور جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا' اللہ اس کے لیے (تنگی سے نکلنے کی) کوئی راہ پیدا فرمادے گا۔ (الطلاق 65-2)

اور اگر کوئی مخلص طبیب کسی مرض میں اپنے عجز کا اظہار کرے اور شراب ہی کو علاج سمجھے تو جان بچانے کے لیے 'بشرطیکہ جان کا بچ جانا یقینی ہو' اس کا استعمال مباح ہو گا۔

مذکور روایت سندا" ضعیف ہے۔

گلے آنے کا علاج اور (انگلی سے) دبانے کی ممانعت

حضرت ام قیس (آمنہ) بنت محصن رضی اللہ عنہا سے روایت ہے 'انہوں نے کہا: میں اپنے ایک بچے کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس کو گلے پڑ گئے تھے اور میں نے انہیں انگلی سے دبایا تھا (جو اس بیماری کا رائج علاج تھا۔) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم اس بیماری کا علاج بچوں کا گلا انگلی سے دبا کر کیوں کرتی ہو؟ عود ہندی استعمال کیا کرو۔ اس میں سات شفائیں ہیں۔ گلے پڑ جانے کی صورت میں ناک میں ٹپکایا جائے۔ ذات الجنب کی صورت میں پلایا جائے۔"

امام ابن ماجہ رحمتہ اللہ نے ایک دوسری سند سے بھی یہ روایت سابقہ حدیث کے ہم معنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے۔

روایت کے راوی یونس نے کہا: اعلقت کے معنی غزرت یعنی انگلی سے دبانے کے ہیں۔

فوائد و مسائل :

1۔ عذر ایک بیماری ہے، جو بچوں کو ہوتی ہے، جس میں گلے کے غدود پھول جاتے ہیں اور بچہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کا علاج ان غدودوں کو انگلی سے دبا کر کر دیا جاتا ہے، جو ایک تکلیف دہ علاج ہے۔ حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ نے عذر کا مطلب لھاۃ بیان کیا ہے، جو حلق میں اوپر کی طرف لٹکا ہوا گوشت کا ٹکڑا ہوتا ہے اور فرمایا "اعلاق کا مطلب کوے کو انگلی سے دبانا ہے۔" (فتح الباری: ۱۰/ ۲۰۷)

2۔ اگر آسان علاج ممکن ہو تو ایسے علاج سے پرہیز کرنا چاہیے جس سے مریض کو زیادہ تکلیف ہو۔

3۔ عود ہندی (قسط) بہت سی بیماریوں کا علاج ہے۔ تفصیل کے لیے طب نبوی کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

4۔ لدود کا مطلب منہ میں ایک جانب دوا ڈالنا ہے۔ ذات الجنب کی بیماری میں عود ہندی کو اس انداز سے پلایا جاتا ہے۔

5۔ سعوط (ناک میں دوا ٹپکانا) بھی ایک طریقہ علاج ہے۔

عرق النسا کا علاج

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عرق النسا کا علاج یہ ہے کہ جنگلی بھیڑ (یا جنگلی دنبے) کی چکتی کو لے کر پگھلا لیا جائے' پھر اس کے تین حصے کر لیے جائیں' پھر روزانہ ایک حصہ نہار منہ پی لیا جائے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ عرق النسا ایک درد ہے جو سرین کے جوڑ سے شروع ہو کر ران کی پچھلی طرف نیچے کی طرف آتا ہے۔ بعض اوقات یہ درد ٹخنے تک بھی پہنچ جاتا ہے' مرض جتنا پرانا ہوتا جائے ٹانگ اتنی زیادہ متاثر ہوتی جاتی ہے۔ جنگلی بھیڑ کا تعین اس لیے کیا گیا ہے کہ اس

کی خوراک ایسے جنگلی پودے ہیں، جو گرم تاثیر رکھتے ہیں۔ اس بیماری کا سبب گاڑھا چپکنے والا مادہ ہے، جو اس علاج کے نتیجے میں نرم ہو جاتا ہے۔

زخم کا علاج

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:

"جنگ احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے۔ آپ کا سامنے والے دانتوں کے ساتھ والا دانت ٹوٹ گیا۔ آپ کے سر میں خود ٹوٹ کر گھس گیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے جسم مبارک سے خون کو دھو کر صاف کرنے لگیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ پانی ڈالنے سے خون اور زیادہ بہتا ہے تو انہوں نے ایک چٹائی کا ٹکڑا لے کر جلایا۔ جب اس کی راکھ بن گئی تو وہ زخم پر لگادی تب خون رک گیا۔ (الحاکم)

فوائد و مسائل :

1۔ حصیر (چٹائی) عرب میں کھجور کے پتوں سے بنائی جاتی تھی۔ راکھ کھجور کے پتوں کی ہو یا پٹ سن کے بورے کی یا سوتی کپڑے کی' خون بند کر دیتی ہے۔

2۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مشکلات کا آنا امت کے لیے سبق ہے کہ وہ حق کی راہ میں آنے والی تکلیفیں خندہ پیشانی سے برداشت کریں اور توحید کا سبق بھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مختار کل نہ تھے ورنہ جہاد کی مشکلات برداشت کیے بغیر سب کو ایک لمحے میں مسلمان کر لیتے۔

فوائد و مسائل :

1۔ پردے کا حکم نازل ہونے سے پہلے خواتین جہاد میں شریک ہوتی تھیں' بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں عورتوں کے شریک ہونے کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی۔

2۔ غزوہ احد میں جب دشمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئے تھے اس وقت عتبہ بن ابی وقاص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر مارا جس سے آپ پہلو کے بل گر گئے اور آپ کا نچلا درمیانی دانت ٹوٹ گیا۔ اور آپ کا نچلا ہونٹ زخمی ہو گیا۔ عبداللہ بن شہاب زہری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی زخمی کر دی۔ عبداللہ بن قمئہ کی تلوار کے وار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خود کی دو کڑیاں چہرے کے اندر دھنس گئیں۔ (الرحیق المختوم ص:۳۶۵)

علم طب نہ جاننے کے باوجود علاج کرنے والا

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص علاج کرے' حالانکہ اس سے پہلے وہ طبیب کے طور پر معروف نہیں تو وہ ذمہ دار ہے۔"

(ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1۔ طب کا پیشہ ایک اہم پیشہ ہے۔ چونکہ اس کا تعلق لوگوں کی زندگی اور صحت سے ہے' اس لیے اسے باقاعدہ سیکھنے کے بعد علاج کرنا شروع کرنا چاہیے۔

2۔ اناڑی حکیم کو لوگوں کی صحت سے کھیلنے سے روکنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

3۔ اناڑی ڈاکٹر یا طبیب کے غلط علاج کے نتیجے میں اگر کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اسے اس کا تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ اگر مریض ہلاک ہو جائے تو یہ طبیب قتل خطا کا مجرم قرار دیا جائے گا اور اس سے دیت وصول کر کے مریض کے وارثوں کو دی جائے گی۔

4۔ اسلام کی نظر میں ہر امیر غریب کی جان برابر قیمتی ہے۔

عود ہندی

حضرت ام قیس (آمنہ) بنت محصن رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عود ہندی (علاج کے لیے) اختیار کرو۔ اس میں

سات شفائیں ہیں (سات امراض کی شفا ہے۔) ان میں سے ایک (بیماری) پسلی کا درد ہے۔" (صحیح بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ قسط' کست اور عود ہندی ایک ہی دوا کے مختلف نام ہیں۔

2۔ اس دوا کو مختلف امراض میں مختلف انداز سے استعمال کیا جاتا ہے۔

3۔ ذات الجنب ایک بیماری ہے جو اندرونی ورم کی وجہ سے پسلی کے قریب درد کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

بخار کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بخار کا ذکر ہوا تو ایک آدمی نے اسے برا بھلا کہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اس (بخار) کو برا نہ کہو۔ اس سے گناہ اس طرح دور ہو جاتے ہیں جس طرح آگ سے لوہے کی میل کچیل دور ہو جاتی ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ بیماری پر صبر کرنا چاہیے۔ برا بھلا کہنے کے بجائے دعا اور دوا کی طرف توجہ کی جائے۔

2۔ بیماری اور مصیبت پر صبر کرنے سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

بخار

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک بیمار کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے جسے بخار تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مریض سے) فرمایا:

"خوش ہو جاؤ! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بخار میری آگ ہے جسے میں دنیا میں اپنے مومن بندے پر مسلط کرتا ہوں تاکہ آخرت میں جہنم کے عذاب کے عوض اس کا حصہ اس (بخار) کو قرار دیا جائے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ مریض کی عیادت کرنا مسلمان کا مسلمان پر حق ہے۔

2۔ عیادت کا مقصد بیمار کو تسلی دینا اور اس کے غم اور فکر میں تخفیف کرنا ہے۔

3۔ بیماری کی وجہ سے مسلمان کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

4۔ دنیا کی مصیبت پر صبر کرنے سے جہنم سے نجات ملتی ہے۔

بخار کا علاج

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بخار جہنم کی بھاپ سے ہے' لہٰذا اسے پانی کے ذریعے سے ٹھنڈا کرو۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ بخار کا جہنم کی آگ سے تعلق غیبی اور روحانی ہے۔ اس کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس سے جہنم کی یاد آتی ہے' یا جس طرح دنیا کی خوشیاں اور راحتیں جنت کی نعمتوں سے ایک طرح کی نسبت رکھتی ہیں' اسی طرح غم اور دکھ کا جہنم سے ایک تعلق ہے۔

2۔ حرارت کا علاج پانی ہے۔ بخار کی اکثر قسموں میں پانی کے استعمال سے فائدہ ہوتا ہے۔

3۔ اس حدیث میں پانی کے استعمال کا طریقہ بیان نہیں کیا گیا۔ اس کے استعمال کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں' مثلاً "پانی پینا' یا جسم پر پانی کی پٹیاں رکھنا' یا غسل کرنا' جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیات مبارکہ کے آخری ایام میں غسل فرمایا تاکہ حرارت کچھ کم ہو تو جماعت سے نماز پڑھ سکیں۔

4۔ گرم علاقوں میں بخار عام طور پر گرمی کی شدت کی وجہ سے ہوتا ہے' لہٰذا اس کا علاج پانی سے مناسب ہے۔ حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا بخار کی مریض خاتون کے گریبان میں پانی ڈال دیا کرتی تھیں

تاکہ جہنم کو ٹھنڈک پہنچے اور فرماتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اسے (بخار کو) پانی کے ذریعے سے ٹھنڈا کریں۔ (صحیح البخاری حدیث:5724)

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمان سنا:

"بخار جہنم کی بھاپ سے ہے لہٰذا اسے پانی کے ذریعے سے ٹھنڈا کرو۔"

پھر آپ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹے کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا۔

کشف الباس رب الناس الہ الناس "تکلیف دور کردے اے لوگوں کے مالک! اے لوگوں کے معبود۔"

فوائد و مسائل :

1۔ دوا کے ساتھ دعا بھی ضروری ہے۔

2۔ شفا صرف اللہ سے مانگنی چاہیے۔

3۔ جو چیزیں بندوں کے دائرہ اختیار میں ہیں ان میں ان سے صرف اسی حد تک مدد مانگی جا سکتی ہے جس حد تک اسباب کی دنیا میں مدد ممکن ہے۔ اسباب سے ماورا مدد کرنا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔

4۔ طبیب علاج کر سکتا ہے دوا دے سکتا ہے شفا اللہ ہی دیتا ہے۔

جہنم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بخار جہنم کی ایک دھونکنی ہے۔ اسے ٹھنڈے پانی کے ذریعے سے دور ہٹاؤ۔"

فائدہ :

دھونکنی اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے لوہار بھٹی کی آگ کو ہوا پہنچا کر تیز کرتا ہے۔ بخار کی گرمی کا جہنم کی آگ کے مشابہ ہونے کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

سینگی لگوانے کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جن چیزوں سے تم علاج کرتے ہو اگر ان میں سے کسی میں کوئی بھلائی (اور فائدہ) ہے تو وہ سینگی (لگانے میں) ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ سینگی ایک پیالے جیسی چیز سے لگائی جاتی ہے اسے ہوا سے خالی کر کے جلد پر رکھا جاتا ہے۔ اس سے جسم کے اس حصے میں ایک دباؤ پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے خون اور فاسد مادہ زور سے کھنچ آتا ہے۔

2۔ سینگی "تقریباً" ہر مرض کا علاج ہے لیکن معالج سمجھ دار ہونا چاہیے جو یہ جانتا ہو کہ کس مرض کے لیے جسم کے کس حصے پر سینگی لگانی چاہیے۔

اجازت

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سینگی لگوانے کی اجازت طلب کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طیبہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ انہیں سینگی لگا دیں۔

سنی سنائی بات

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ جو سنے اسے (بغیر تحقیق کیے) بیان کردے۔" (مسلم)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ ہر سنی ہوئی بات کو اس کی تحقیق کیے بغیر آگے بیان کرنا یا اسے صحیح سمجھ لینا درست نہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ جھوٹی ہو اور یہ بھی اسے بیان کر کے اپنے آپ کو جھوٹوں میں شامل کر لے۔ اس لیے پہلے ہر بات کی تحقیق ضروری ہے۔

نلکے کو دستا باندھنے والے

انشا جی

بے شک، ہم نے پچھلے دنوں اخبار میں پڑھا تھا کہ وزیر خزانہ عقیلی صاحب نے عظیم تر کراچی کو پانی کی بہم رسانی کے منصوبے کے لیے ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ گمان نہ تھا کہ اس منصوبے پر اتنی جلدی عمل ہوگا اور ہماری انقرہ سے واپسی کا انتظار بھی نہ کیا جائے گا۔ عقیلی صاحب کا بیان پڑھنے کے بعد ہم کئی دن کپڑے اتارے "ٹونٹی کھولے" نل کے نیچے بیٹھے رہے۔ آخر مایوس ہو کر چل دیے کہ اچھا بحیرہ روم میں نہالیں گے۔ آبنائے باسفورس میں ڈبکی لگالیں گے۔ ہمارے جانے کی دیر تھی کہ پانی کھل گیا اور ایسا آسمان کا چھپر پھاڑ کر کھلا کہ لوگوں کے گھروں میں ایک غسل خانے تو ضرور سوکھے رہے۔ باقی ہر جگہ جل تھل ہوگیا۔ ہم یہ خبر پاتے ہی بھاگے بھاگے کراچی واپس آئے اور جلدی سے نل کھول بالٹی آگے کی۔ اس میں سے ایک سرد آہ نکلی' ایک مصرعہ ٹپکا۔

جو کسی کے کام نہ آسکے
میں وہ ایک مشت غبار ہوں

اصل میں قصور ہمارا ہے۔ ہم پانی کے لیے کالم پر کالم تو لکھتے رہے لیکن یہ وضاحت کرنا بھول گئے کہ ہم پانی نلکوں کے راستے چاہتے ہیں۔ براہ راست نہیں کیونکہ ہم کوئی گوالے تھوڑا ہی ہیں۔ نہ پانی کے جانور ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ کے۔ڈی۔اے والوں نے عظیم تر کراچی کے لیے پانی کی بہم رسانی کا منصوبہ عقیلی صاحب کو پیش کرتے ہوئے یہ بات صاف کردی ہوگی' کیونکہ عقیلی صاحب کراچی میں نہیں رہتے۔ وہ ان رموز کو کیا جانیں کہ ہمیں پانی کی کتنی ضرورت ہے اور کس طور ضرورت ہے۔ خیر بندہ بشر ہے' غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے۔ بہرحال آئندہ کے لیے یہ ملحوظ رکھا جائے کہ ہمیں پانی' فقط اتنا چاہیے کہ خود پی سکیں۔ اتنا نہیں کہ ہمیں پی جائے۔

ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ غلط فہمی خود ہمیں ہوتی ہے۔ پانی کی اس ریل پیل سے جو ہمارے بعد کراچی میں ہوئی' عقیلی صاحب کا کچھ تعلق نہیں۔ عظیم تر کراچی کے لیے پانی کا عظیم تر منصوبہ تو ابھی تک ان کی ٹرے میں سوکھا پڑا ہے۔ یہ کارگزاری کیسے یا کارستانی کارکنان قضا و قدر کی ہے۔ ان بزرگوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے محکمہ موسمیات پر بات ڈالی کہ ہم تو جو کچھ کرتے ہیں ان کی پیش گوئی سن کر کرتے ہیں۔ اس سے سرمو انحراف کی ہمیں مجال نہیں۔ کے ڈی اے والے اپنا قصور صرف اس حد تک مانتے کہ ہم نے ابر کرم کار سالہ فقط ابن انشاء کے گھر پر کھولنے کی استدعا کی تھی کیونکہ یہی بڑھ بڑھ کر کالم لکھتا تھا اور محرم کے دنوں میں بھی پانی کے لیے ہمیں تنگ کرتا تھا۔ باقی مخلوق محض اس کے ہمسائے میں رہنے کی وجہ سے ماری گئی۔ بری صحبت کا یہی انجام ہوتا ہے۔ بھینس کالونی کے گوالوں نے اقرار کیا کہ بے شک ہم چاہتے تھے کہ دودھ کی کمی پوری ہونے کی کوئی سبیل نکلے۔ لیکن یہ منشا ہماری بھی نہ تھی کہ اس سبیل کی ٹونٹی پوری کھول کر اس زناٹے کا تریڑا دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے ہماری دعا کا پتا غلط ہوگیا اور یہ عالم بالا پر اس شاعر کو موصول ہوگئی جس نے لکھا تھا۔

رونے پہ باندھ لے جو مری چشم تر کمر
کیسی زمین' فلک پہ ہو پانی کمر کمر

چند ماہ ادھر کی بات ہے کہ لاہور میں مینہ برسا اور چھاجوں برسا۔ لوگوں کے سوکھے دھانوں پر پانی پڑا تو ہر کسی نے یہ جتانے کی کوشش کی کہ ویسے تو من آنم کہ من دانم۔ لیکن یہ بارش بندے نے برسوائی ہے۔ مجھ ہی گنہگار نے اللہ میاں کو اشارہ کیا تھا کہ ہاں اب

اجازت ہے۔ ہمارے دوست میاں انتظار حسین نے طبعی انکسار کی بنا پر اپنا نام تو نہ لیا ہاں ساری داد اپنے اور ہمارے دوست ناصر کاظمی کی جھولی میں ڈال دی کہ انہوں نے ایک غزل لکھی تھی وہ ہم نے ٹیلی ویژن پر ان سے گوائی اور صاحبو۔ بادلوں کو امڈ گھمڈ کر آتے ہی بنی۔ اسی تقریب سے ہم نے بخاری صاحب سے عرض کیا تھا کہ کراچی میں ٹیلی ویژن کے خداوند آپ ہیں۔ یہاں بھی تان سینوں اور بیجو باوروں کی کمی نہیں۔ آپ بھی کسی کو پکڑلیں۔ ٹیلی ویژن کا اسٹوڈیو تو ابھی نہیں بنا۔ لیکن کھمبے تو گڑ گئے ہیں۔ ایک کھمبے پر

اسے چڑھا کر حکم دیجئے کہ ملہار گا۔ تجھے معقول پیسے دیں گے لیکن پہلے چھتری تان لے ورنہ بھیگ جائے گا۔ کیا عجب بخاری صاحب نے ہماری یہ فرمائش ریڈیو کے فرمائشی پروگرام کو بھیج دی ہو۔ جواب تک ان کی بات مانتے ہیں کیونکہ الفقرہ میں جمعرات 27 جولائی کو ہم نے بارش کی تباہی کا سن کر فکر مندی سے ریڈیو کھولا تو یہاں گیارہ بجے دن کی خبریں ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوا قیامت برپا ہے جوں ہی خبریں ختم ہوئیں۔ پہلا ریکارڈ یہی سنائی دیا۔

جھوم جھوم کر برسو بادل، جھوم جھوم کر برسو۔

☼ ☼ ☼

خیر ہمیں شاعری اور نغمے کی تاثیر سے انکار نہیں اور یہ بھی تسلیم کہ ہمارے ہاں ایسے باکمال شاعر اور نغمہ سرا گزرے ہیں کہ گلیوں کوچوں میں صدا لگاتے پھرتے تھے۔ "بارش برسوالو بارش" آپ کو اپنے لان میں پانی دینا ہے تو آواز دی کہ میاں! ذرا آدھ انچ بارش چاہیے۔ کتنے پیسے لوگے؟ معاملہ پٹا تو اس نے فوراً برساتی اوڑھ کان پر ہاتھ رکھ کر ایک تان لگائی۔ آدھا انچ بارش برس چکی تو خود بخود دھوپ نکل آئی۔ پرانے زمانے میں ایک بات یہ اچھی تھی کہ بارش زیادہ ہوجائے، جیسی کراچی میں ہونے لگی ہے تو نالے کو رسا باندھنے والے بھی مل جاتے تھے۔ اب کسی ناصر کاظمی یا بڑے بارش علی خان سے کہئے تو کہ میاں ذرا اور نگی نالے کو رسا باندھ اور روک۔ جھونپڑیاں بہی جارہی ہیں۔ آج کل یہ فن شریف ناپید ہوگیا ہے۔ جس طرح آتشبازی پر پابندی لگنے کے بعد سے دیپک راگ گانے والے ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔

☼

حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

عائشہ فیاض

لکھنے کا ہنر فطری ہے۔ من و سلویٰ کی طرح یہ بھی ایک نعمتِ خداوندی ہے اور میں بڑی خوش بخت ہوں جو میرے پیارے اللہ جی نے مجھے یہ نعمت عطا کی ہے۔

1 ۔ بہت پرانی بات ہے، اتنی کہ اب مجھے خود بمعہ جزئیات کے یاد تک نہیں۔ بس ایک خواب دیکھا تھا۔ وہ بھی شاید نور کے تڑکے، فجر ویلے نہیں بلکہ پوری کالی رات کو، ایک بڑے سارے صحن والا، عام سا دیہاتی گھر ہے، جہاں ایک بڑے ۔۔۔ سے کڑاہے میں کچھ پک رہا ہے۔ لکڑیوں کی آگ کا الاؤ ہے، جو دھڑا دھڑ جل رہا ہے۔ ایک بڑا سارا کڑچھا لیے اس میں زور زور سے پھیرتے، پتا ہے کون بیٹھے ہیں۔۔۔ اپنے چہرے پر وہی لافانی، نرم سی مسکراہٹ کا ماسک پہنے، میرے اشفاق بابا (اشفاق احمد)

"یہ لے پتر تو بھی لے۔" انہوں نے ڈونگا بھر کر، دلیے جیسے کوئی چیز، میرے ہاتھ میں پکڑے پیالے میں ڈال دی۔

اور میں حیران پریشان بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ یہ حیرانی ہے کہ آج تک جاتی نہیں۔۔۔ بھلا کیوں۔۔۔ مجھے کیوں۔۔۔ اور پریشانی یہ ہے کہ اب اس کو سنبھالوں کیسے، میرا ظرف، اور میرا دامن بہت تنگ ہے، اللہ جی کچھ آپ بھی مدد کریں ناں۔

2 ۔ محض پندرہ بیس مختصر کہانیاں لکھ لینا ہی اگر میرے مصنف ہونے کی دلیل ہے تو چلو مان لیا کہ اس سلسلے میں قلم اٹھانا میرا بھی حق ہے (جو مجھے نہیں لگتا کہ درست ہے) عائشہ فیاض، ایک بہت عام سی عورت ہے، عام سا سوچنے، چھوٹے چھوٹے بہت سارے خواب دیکھنے اور اپنے سارے پڑھنے والوں کی دل سے قدر کرنے والی عام سی عورت۔

میری ماں نے جنم لیا تو نانا ابو کو فوت ہوئے ساڑھے چار مہینے ہو چکے تھے۔ ماں کی آنکھیں بڑی بڑی اور بے حد خوب صورت تھیں۔ مگر وہ ان میں بہت ساری حیرت سمیٹے ہوئے تھیں، جب ان کے ارد گرد کے لوگ انہیں "منحوس" کہہ کر بلاتے تھے، اتنا سخت بچپن گزارنے والی ماں کے دل میں کتاب کے عشق کی گرمی تھی، ماموں جی کالج لائبریری سے کتاب لاتے، رات کو جب سو جاتے تو امی چاند تاروں کی روشنی میں پوری رات وہ کتاب پڑھتیں، اور فجر تک پھر سے ماموں جی کے سرہانے رکھ کر سو جاتیں۔ امی کا پڑھنے کا شوق، روایتی خاندان کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اور یوں ایک نسل کے خواب، سود سمیت میری آنکھوں پر رکھ دیے گئے۔

پڑھنے اور پڑھتے ہی رہنے کا شوق ماں سے ملا، کتابوں تک رسائی ابو جی کے بہت دوستانہ رویے نے دی۔ اور خوابوں کو حقیقت اللہ جی نے بنا دیا۔ شکر الحمدللہ۔

3 ۔ لکھا کچھ عرصہ "پھول" میں تھا اور مجھے اس پر فخر ہے، خواتین اور شعاع میں جگہ پورے دس سال بعد ملی تھی۔ یہ طنز ہے نہ ہی شکوہ، بس مایوس ہوتے دلوں کے لیے ایک چھوٹا سا پیغامِ امید۔

4 ۔ ذاتی طور پر دوسرے تمام لکھنے والوں کی نسبت میرا مطالعہ اتنا زیادہ نہیں ہے اور ساری کی ساری کتابیں بھی میں ابھی تک کسی ایک ادیب کی نہیں پڑھ سکی ہوں۔ اشفاق احمد، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی، ابن انشاء، قدرت اللہ شہاب اور مستنصر حسین تارڑ سب کی طرح مجھے بھی بہت پسند ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور بات بھی ہے۔ الطاف فاطمہ کا "دستک نہ دو" میں نے آمنہ مفتی کی بات پڑھ کر پڑھا تھا، بہت اچھا لگا۔ مگر اس سے بھی زیادہ ایک اور چیز دل کو بھائی تھی، الطاف فاطمہ کے ہاتھوں ہوا ایک ترجمہ "میرے بچے

میرا سونا۔" مجھے نہیں لگتا کوئی بھی ماں اسے پڑھے اور ۔۔۔ شاندار نہ کہے۔

جہاں تک بات ہے بین الاقوامی ادب کی تو اس بارے میرا مطالعہ بالکل ہی نہ ہونے کے برابر ہے۔ بہرحال جو بھی ہے پرل ایس بک کی دی گڈ ارتھ نے بہت متاثر کیا۔ روسی ادب میں مجھے "ماں" ہمیشہ ہی سب سے اچھا لگا۔ افغانی ادیب خالد حسینی کا ایک ناول (ترجمہ) پہاڑوں کی فریاد اس لیے بہت پسند آیا تھا کیونکہ وہ افغانستان کے مسائل کے بارے میں نہیں بلکہ افغانستان کے لوگوں کے متعلق تھا۔

"امرتا پریتم" پنجابی اور ہندی ادب کا بلاشبہ ایک روشن ستارہ ہیں وہ رشتوں اور رویوں کو ایسی خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں کہ سچ میں تو مسحور ہو جاتی ہوں چاہے وہ نثر ہو یا ان کی شاعری۔

انگریزی کی ایک چھوٹی سی کہانی Willow The Little پڑھی تھی۔ بید مجنوں کے درخت کا ایک شو پیس جو دو محبت کرنے والوں میں ایک خاموش پیامبر تھا۔ سائمن برن اور لیزلی اس کہانی کے وہ کردار جو آج تک میرے لیے محبت کا لافانی استعارہ ہیں۔

5۔ اور اب میں ذکر کرنا چاہوں گی اپنی بہنوں اور اپنے قبیلے کا۔ ڈائجسٹ رائٹرز کا۔ بہت سے نام ہیں کتنے روشن چہرے ہیں۔ ستارہ آنکھوں والے کتنے ہی حوالے ہیں۔ جنہیں جب بھی پڑھا اچھا لگا اور کبھی بہت اچھا لگا۔ کچھ نام اگرچہ میری یادداشت سے باہر جا چکے ہیں تو بھی ان کی تحریریں اور کردار آج بھی یاد ہیں اور تازہ بھی۔ آج کی بات کروں تو سارے ہی اچھا لکھ رہے ہیں۔ ہر کوئی اپنے مخصوص انداز میں ہمارے دلوں کے اور بھی قریب ہوتا جا رہا ہے وہ نمرہ ہو یا سمیرا۔ ایمل رضا ہو یا پھر بنت سحر۔ ہاں اگر کسی سے بہت ساری جیلسی ہوتی ہے تو وہ ہیں سائرہ رضا سنو یہ جو سارا اچھا اچھا ہے بس تم نے ہی لکھنا ہے؟ (ماشاءاللہ)

مجھے آج بھی یاد ہے۔ سائرہ جی کا ایک کردار ساگ صاف کرتی ہوئی لڑکی کو اسی ساگ میں سے سرسوں کے پھول توڑ کر ایک چھوٹا سا گلدستہ بنا کر دیتا ہے۔ "یہ کیا ہے؟" وہ پوچھتی ہے "یہ محبت ہے۔ اور بہت ساری ہے۔ وہ جواب دیتا ہے۔

میری تحریر کی سب سے بڑی ناقد تو میری بہن آمنہ ہے، پتا نہیں تم اتنی پھیکی سی تحریریں کیوں لکھتی ہو۔ نہ فرحت اشتیاق جیسے ڈیشنگ ہیروز نہ شازیہ چوہدری جیسی رنگین محبتیں اور نہ ہی نمرہ و عمیرہ جیسا معلوماتی خزانہ اب کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا۔ بس مسکرا کر اپنا بھرم رکھتے ہیں۔ ابھی تک جو بھی لکھا ہے اس میں "ابو لوگ" اور "انار کلی" میرے دل کے بہت بہت قریب ہیں۔

میری اپنی ایک چھوٹی سی لائبریری بھی ہے۔ جو میری امی سے منسوب ہے۔ لوگ آتے ہیں۔ کتابیں پڑھنے کے لیے لے کر جاتے ہیں اور میں بہت مسرور ہوتی ہوں کہ کتاب دوستی کے فروغ میں چاول کے دانے جتنا سہی میرا بھی حصہ تو ہے۔ لکھنے کو تو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ ان شاء اللہ بہت جلد کیونکہ مجھے بنی اسرائیل بن کر نعمت الٰہی کی ناشکری کرنے والا تو ہرگز نہیں بننا ہے اچھا اب خدا حافظ۔

ماڈل اور اداکارہ

سعدیہ خان سے ملاقات

شاہین رشید

وہ چہرے جو اسکرین پہ کم نظر آئیں مگر ہمیشہ اچھے کردار میں تو لوگوں کو وہ یاد رہتے ہیں۔ جیسے "سعدیہ خان" جسے آپ نے 2011ء میں "خدا اور محبت" میں دیکھا تھا اور آج کل اس سیریل کا "سیزن ٹو" آن ائیر ہے اور سعدیہ خان کی پرفارمنس لوگوں کو متاثر کررہی ہے۔

"کیا حال ہے؟"

"جی شکر ہے اللہ کا۔"

"آج کل آپ کو "خدا اور محبت" کے "سیزن ٹو" میں دیکھ رہے ہیں۔ کچھ بتائیں اس بارے میں؟"

"خدا اور محبت' جب پہلی بار کیا' تب ہی احساس ہو گیا تھا کہ ہم کوئی بہت اچھا کام کرنے جارہے ہیں۔ ایسا کام جو تھوڑا نیا بھی ہوگا اور منفرد بھی۔۔۔ اور پھر یہ سیریل آن ائیر ہوا تو ہماری توقعات سے بڑھ کر اس سیریل کو شہرت ملی۔۔۔ تو بہت اچھا لگا۔"

"خدا اور محبت' کے "سیزن ون" اور "سیزن ٹو" میں کیا بات مختلف ہے؟"

"یہ سیریل پہلے بھی بہت پسند کیا گیا تھا اور اب بھی کیا جارہا ہے اور بہت کچھ مختلف ہے۔ اسٹوری پہلے کی طرح بہت جان دار ہے۔ تو یہ بھی ناظرین کو پسند آرہی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ جدید کیمروں کا استعمال کیا گیا ہے اور پاکستان میں تو اس کو شوٹ کیا ہی گیا ہے پاکستان سے باہر امریکہ میں بھی اس کی شوٹس ہوئی ہیں۔ تو اس لحاظ سے یہ پہلے کے مقابلے میں تھوڑا سا مختلف ہے۔"

"آپ اور آپ کی ٹیم کا وقت امریکہ میں کیسا گزرا۔ کوئی مشکل پیش آئی؟"

"کوئی مشکل پیش نہیں آئی' بلکہ بہت اچھا وقت گزرا' بہت مزا آیا۔ ایک فیملی کی طرح ہم سب مل جل کر رہے۔ سچ پوچھیں تو بہت انجوائے کیا ہم سب نے۔"

"خدا اور محبت" کا کردار آپ کی عام لائف سے کتنا مختلف ہے۔"

"سیریل میں' میں نے "ایمان" کا رول کیا ہے اور حقیقت میں بھی ایمان جیسی ہی ہوں۔ مشرقی لباس پہنتی ہوں۔ اگر کبھی جینز پہن لوں تو لمبے کرتے کے ساتھ پہنتی ہوں۔ ہاں یہ فرق ہے کہ عام زندگی میں سر پر دوپٹا ہر وقت نہیں لیتی اور نہ ہی برقعہ پہنتی ہوں۔ باقی میرے کمرشلز' میری میگزین شوٹس وغیرہ سب نارمل طریقے کی ہوتی ہیں۔ جس میں مغرب کی جھلک کہیں بھی نظر نہیں آئے گی۔"

"برقعے سے یاد آیا کہ سیریل میں آپ نے برقعہ بھی پہنا ہے' کیسا رہا یہ تجربہ؟"

ہنستے ہوئے۔ "بہت مزا آیا۔ جب سب لوگ سنجیدہ پرفارمنس دے رہے ہوتے تھے۔ میں برقعے میں مسکرا رہی ہوتی تھی۔ سب کو دیکھ کر اور جب ڈائریکٹر کو پتا چلتا تھا تو مزے دار ڈانٹ بھی پڑتی تھی۔ ہم نے سخت گرمیوں میں بھی شوٹس کی ہیں اور سخت گرمیوں میں برقعہ پہن کر روڈ پر چلنا کسی قیامت سے کم نہیں ہوتا تھا۔ مگر یہی تو ایک ڈائریکٹر کا کمال ہے کہ وہ فن کاروں سے کام لے اور فن کاروں کا بھی کمال یہ ہے کہ وہ موسمی اثرات کو اپنے اوپر مسلط نہ کریں۔"

"ٹی وی کے لیے مزید کیا کررہی ہیں؟"

"مزید ایک ہی سیریل ہے۔ "مشرک" کے نام سے۔ جو ان شاء اللہ عنقریب آن ائیر ہوگا اور یہ بھی ناظرین کو پسند آئے گا۔"

"کم کام کرنے کی وجہ؟"

"کبھی کبھار کام کرنا اچھا لگتا ہے۔ مگر اب سب کا اصرار بڑھتا جارہا ہے کہ میں زیادہ کام کروں۔ تو ان شاء اللہ نئے سال سے زیادہ کام کرنے کا ارادہ ہے۔ پہلے میں سال میں ایک پروجیکٹ کرتی تھی۔ 2016ء میں دو پروجیکٹ کیے اور 2017ء میں دو سے زیادہ کرنے کا ارادہ ہے۔ فی الحال ایک کمپنی کے ساتھ ایک سال کا کنٹریکٹ ہے' اس لیے اداکاری کو زیادہ ٹائم نہیں دے پارہی۔"

"سعدیہ! آپ نے فلموں میں بھی کام کیا۔ کچھ اس کے بارے میں بتائیے؟"

"جی.... میں نے "دیور بھابھی" اور "عبداللہ" میں کام کیا ہے۔ اچھا لگا کام کرکے۔ کافی چینج آیا ہے اس انڈسٹری میں اور مزید کے لیے پرامید ہوں۔ ان شاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔ لوگ کوششوں میں لگے ہوئے ہیں تو بہتری ہی آئے گی۔"

"پڑوسیوں نے بلایا؟"

"بالکل بلایا.... اور فن کاروں کے بلاوے آتے ہی رہتے ہیں۔ مجھے "بولی ووڈ" کے ڈائریکٹر "کبیر خان" نے بلایا۔ بقول ان کے۔ مجھ میں اداکاری کی بہت صلاحتیں ہیں اور میں فلم کے لیے موزوں ترین فنکارہ ہوں۔"

"کبیر خان نے خود بات کی آپ سے؟"

"براہ راست میرا رابطہ نہیں ہوا۔ لیکن ان کی بات مجھ تک پہنچ گئی۔ مجھے کئی بار بولی ووڈ سے آفر آچکی ہے اور وہاں کے فن کاروں سے میرا رابطہ رہتا ہے اور سب کی باتیں مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں۔ مجھے اچھے اسکرپٹ کے ساتھ دنیا کے کسی بھی ملک سے آفر آئی تو میں ضرور کام کروں گی۔ کیونکہ فلم میں کام کرنا سب کا خواب ہوتا ہے۔"

"کیا شوبز میں ہی رہنے کا ارادہ ہے' جبکہ آپ کی ڈگریاں دوسری فیلڈ کی ہیں؟"

"جی.... میری ڈگریاں اس فیلڈ کی نہیں ہیں اور اس فیلڈ میں رہنے کا کچھ کہہ نہیں سکتی کہ پتا نہیں میرے نصیب میں کیا لکھا ہے۔ کیونکہ ملتا وہی ہے جو نصیب میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔"

"گویا قسمت پر یقین ہے آپ کو؟"

"قسمت پر بھی اور تقدیر کے لکھے پر بھی یقین ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرا فیوچر کیسا ہے۔ میں اس فیلڈ میں رہتی ہوں یا کوئی اور کام کرتی ہوں۔ بس اللہ سے یہی دعا ہے کہ جو میرے لیے بہتر ہے وہ ہی کرنا۔ میں اپنے سارے فیصلے اللہ پر چھوڑ دیتی ہوں۔"

"بچپن میں کیا سوچا تھا کہ بڑے ہو کر کیا بننا ہے؟"

"نہیں کچھ خاص نہیں سوچا تھا۔ میں نے "ایم بی اے" انگلینڈ سے کیا اور سائیکولوجی میں بھی ڈگری لی۔ تو ظاہر ہے کہ میں بزنس کرنا چاہتی تھی 'مگر اس فیلڈ میں آگئی تو ڈگریاں طاق میں سجا کر رکھ دیں۔ مگر ڈگری ہونا بہت ضروری ہے۔ کبھی بھی آپ کو اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"تو پھر اس فیلڈ میں کیسے آگئیں؟"

"جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں اعلا تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ گئی۔ وہاں میرے بھائی رہتے ہیں۔ جب پڑھائی مکمل کر کے آئی تو جمال شاہ کے آرٹ ادارے "ہنر کدہ" میں داخلہ لے لیا۔ مجھے مجسمہ سازی کا شوق ہو گیا تھا۔ ایک دن مجسمہ سازی سیکھ رہی تھی کہ کچھ لوگ آئے اور میں مٹی میں لتھڑے ہاتھوں سے کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ اسی دوران انہوں نے شاید جمال شاہ صاحب سے اجازت لے کر میری کچھ تصاویر بنالیں۔ جس کا میں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ مگر تقریباً" ایک ماہ کے بعد میری ہی تصاویر بڑے بڑے بل بورڈز پر لگی ہوئی تھیں' حیران ہوئی' معلومات کی تو پتا چلا کہ وہ لوگ ایک ٹیلی کام کمپنی کے نمائندے تھے۔ خیر اچھا لگا اور پھر پیسہ بھی ملا۔ پھر اسے ہی دیکھ کر لاہور کے معروف فوٹو گرافر خاور ریاض نے بلایا۔ یہ میرے لیے بہت خوشی کی بات تھی 'کیونکہ خاور ریاض تو بہت سے لوگوں کو متعارف کرا چکے تھے۔ بس تو پھر ماڈلنگ کی تو بہت آفرز آنے لگیں اور پھر ڈراموں کی بھی آنے لگیں۔"

"اچھا لگا یہ سب کچھ؟ اور گھر والوں نے خوشی خوشی اجازت دے دی؟"

"بہت اچھا لگا اور جہاں تک گھر والوں کی بات ہے تو شروع شروع میں فیملی کے کچھ لوگوں نے اعتراض کیا۔ لیکن پھر مان ہی گئے۔ میں سمجھتی ہوں کہ کوئی بھی فیلڈ بری نہیں ہوتی' اگر نیک نیتی سے کام کیا جائے تو۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری فیملی میرے کام سے مطمئن ہے۔"

"کب احساس ہوا کہ مجھ میں اداکاری کی صلاحیت بھی ہے؟"

"درحقیقت میں اسکول کے زمانے سے ہی اداکاری' گلوکاری اور ہوسٹنگ کے مختلف شوز میں حصہ لیتی رہتی تھی۔ اس وقت یہ سب کچھ کرنا اچھا لگتا تھا۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ آئندہ چل کر یہی میرا پروفیشن بن جائے گا اور سب کچھ اچانک ہی اور خود بخود ہی ہوتا چلا گیا اور جب اس فیلڈ میں آگئی تو اداکاری بھی کی اور ایک کوکنگ شو کی میزبانی بھی کی اور کھانا پکانا بھی سکھایا۔۔۔ اور دیگر مختلف شوز کی میزبانی بھی کر چکی ہوں۔"

"گڈ۔۔۔ کوکنگ شو میں آئیں تو کیا پکانے سے دلچسپی ہے؟"

"جی۔۔۔ بہت ہے اور میں نے کوکنگ میں باقاعدہ ڈپلوما لیا ہے اور میں بہت اچھا پکا بھی لیتی ہوں۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

"میری تاریخ پیدائش 10 اکتوبر ہے اور اسٹار لبرا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ میرے اسٹار کی خوبیاں مجھ میں ہیں۔ تعلیم کے بارے میں' میں آپ کو بتا چکی ہوں اور بہن' بھائی ہم تین ہیں۔ ایک بھائی اور بہن مجھ سے بڑی ہیں اور میں دونوں سے چھوٹی ہوں۔ بھائی کی شادی ہو چکی ہے۔ والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ اللہ سلامت رکھے میرے والد صاحب کو۔"

"شادی ہوئی؟"

"نہیں جی۔۔۔ اور ابھی ارادہ بھی نہیں ہے۔ ابھی تو اپنے کام پہ فوکس کیا ہوا ہے۔ ہر کام کے لیے وقت مقرر ہے جب ہونی ہوگی' ہو جائے گی۔"

"زندگی میں کیا بہت ضروری ہے؟"

"میرے خیال میں تعلیم بہت ضروری ہے۔ تعلیم ہی آپ کو شعور دیتی ہے' کوئی بھی ہو' تعلیم کے بغیر ادھورا ہے۔"

"اداکاری کم اور ماڈلنگ زیادہ کی' کیوں؟"

"اس کی مین وجہ یہ ہے کہ ماڈلنگ ایک ہی دن کا کام ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ دو دن کا۔ لیکن اداکاری دنوں کا کام نہیں' بلکہ مہینوں کا کام ہے اور اس کے لیے دیر تک گھر سے باہر بھی رہنا پڑتا ہے۔ تو میری کوشش ہوتی ہے کہ جو سیریلز لاہور میں شوٹ ہوں ان ہی میں کام کروں۔ مگر مجبوری ہے کہ شہر سے باہر بھی رہنا پڑتا ہے اور ملک سے باہر رہنا پڑتا ہے۔"

"اور جو عزت و شہرت ملی ہے۔ وہ بھی تو کسی کسی کے نصیب میں ہوتی ہے۔"

"بے شک۔ بڑا کرم ہے ۔" "گلوکاری کا بھی تمہیں شوق تھا۔ وہ کہاں تک پہنچی؟"

"میوزک میں میرے استاد رفیق صاحب تھے' لیکن دیگر کاموں کی وجہ سے میں باقاعدہ کلاسز نہیں لے سکی۔ اس لیے گلوکاری درمیان میں ہی رہ گئی ہے۔ جبکہ اصل میں تو میں گلوکارہ ہی بننا چاہتی تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ میں نے اپنے اس شوق کو بالکل ہی خیرباد کہہ دیا ہو۔ کچھ نہ کچھ چلتا ہی رہتا ہے اس سلسلے میں بھی۔" "شہرت کس میں ہے' اداکاری' ماڈلنگ یا پھر گلوکاری میں۔؟"

"گلوکاری کی تو خیر کیا ہی بات ہے۔ آپ ہر وقت ہی سنائی دیتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد میرے خیال میں اداکاری میں شہرت زیادہ ہے اور اسکوپ بھی ہے۔ فل ٹائم اور ہمیشہ رہنے والی جاب ہے۔ بہت ورائٹی ہے اداکاری میں۔ اور میں بھی تو "خدا اور محبت" سے ہی پہچانی جاتی ہوں۔"

"آج کل کے فن کاروں میں کن کا کام آپ کو اچھا لگتا ہے؟"

"مجھے سجل' احسن خان' میکال حسن اور صبا قمر کا کام کافی متاثر کرتا ہے۔ ان کا ڈراما آن ایئر آرہا ہو تو ضرور ٹائم نکال کر تھوڑا بہت دیکھ لیتی ہوں۔"

"فارغ وقت میں کیا مشاغل ہیں۔"

"فیملی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا۔ میوزک سننا۔ اور مزے مزے کے کھانے پکانا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

خیر اللہ پاک سمیرا حمید کے قلم کو مزید پختہ کرے ان کو بہت ترقی دے آمین۔ سائرہ جی کا ناول ابھی بس آدھا پڑھا ہے یقیناً" بہت اعلا ہو گا۔
افسانوں میں نفیسہ سعید کا دل کے بھید بہت اچھا لگا' بہت اچھا پیغام دیا انہوں نے' باقی افسانے بھی اچھے تھے میمونہ صدف کا "راہ جنوں میں" بھی اچھی تحریر تھی۔ پورا شمارہ ماشاء اللہ بہترین' اگلے شمارے کا انتظار' نمل کی کمی تو محسوس ہو گی مگر امید ہے آپ کوئی اور اچھا سا ناول شروع کریں گے ہم سب کے لیے۔
امریز صاحب بار بار ڈسٹرب کر رہے ہیں اور میری بیسٹ فرینڈز صفیہ' شازیہ اور بختاور کی طرف سے بھی آپ کو بہت بہت سلام۔
ج: پیاری آسیہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔ نمرہ احمد کے ناول کے بارے میں تقریباً" ہر بہن نے یہی سوال کیا ہے کہ کیا نمرہ اس کا دوسرا حصہ لکھیں گی۔ ہم بھی سوچ رہے ہیں کہ نمرہ کو اس کا دوسرا حصہ لکھنے کو کہیں فی الحال نیا ناول لکھنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ اپنی دوستوں صفیہ شازیہ اور بختاور کو ہماری طرف سے سلام کہیں اور امریز صاحب کو پیار۔

نیلم خان ۔۔۔ ڈی آئی خان' کے پی کے

خواتین ڈائجسٹ سے واسطے کا سبب عمیرہ احمد کا "آب حیات" اور نمرہ احمد کا ناول "نمل" تھے۔ ان کے تحریری انداز سے ہمیشہ یہ تحریک ملتی رہی کہ میں بھی لکھوں۔ اپنے اندر علم و آگہی کے خزانوں کا ایک جہاں آباد رکھنے والی یہ تحریریں' دین کی ترویج اس بہترین انداز سے کر رہی ہیں کہ لبرل سے لبرل بندہ بھی اگر یہ تحریریں پڑھ لے تو اس کا دل ان کا دیرپا اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔
ج: نیلم! آپ کہانیاں لکھنا چاہتی ہیں تو ضرور لکھیں۔ محنت اور کوشش کرنے والوں کو ہی کامیابی ملتی ہے۔

اقرا انصاری اور رویا انصاری ۔۔۔ کراچی

خواتین آنکھ کھلتے ہی پڑھنا شروع کر دیا تھا (ہاہاہا) مطلب شعور کی آنکھ کھلتے ہی۔ ہمیں خط لکھنے پر کسی کہانی نے مجبور نہیں کیا' بلکہ ہاشم کا کردار کی تکلیف نے مجبور کیا ہے۔ اس بے چارے کا تو کوئی اپنا رہا ہی نہیں۔ ہاشم کے

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

آسیہ فرید ۔۔۔ ملتان

افسردہ ہوئی کہ اب "نمل" ختم مگر امید ہے نمرو جی کوئی اور ڈفرنٹ سا ناول لے کر جلد ہی آئیں گی۔ نمل کی آخری قسط ویسے تو ہر لحاظ سے مکمل لگی مگر اینڈ پہ سونیا کی نفرت! اب کیا نمرو جی نمل کا دوسرا حصہ لے کر آئیں گی؟ اس کے بعد دشت جنوں پڑھا۔ اچھی رہی یہ قسط بھی' ایسا لگتا ہے جیسے خوش نصیب ہی آبو شمتی سے ریلیٹڈ ہو گی۔ شاہ میر بھی عجیب سا ہی لگتا ہے۔
فہرست میں سمیرا حمید اور سائرہ رضا کے ناول کا پڑھ کے بہت خوشی ہوئی' سمیرا جی کی یہ تحریر "عشق آمد و من" بہت اچھوتی اور ڈفرنٹ سی ہمیشہ کی طرح' ہماری یہ رائٹر بہت یونیک بہت منفرد سی ہیں۔ ہمیشہ بہت اچھا لکھتی ہیں معلومات کا ذخیرہ ہے ماشاء اللہ ان کے پاس۔ مجیب درانی اور نظیر شعراوی کی بے حسی پہ تو غصہ آیا۔ اتنا ظالم باپ۔

لیے تو دل میں دکھ ہے اور سونیا کے ساتھ بھی غلط ہوا' وہ فارس سے نفرت کرتی ہے۔ یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اسے اچھا بنانا چاہیے تھا۔ کارداروں میں کوئی تو اچھا ہوتا۔ کم از کم نوشیرواں ہی اسے سب سچ بتا دیتا تاکہ وہ کسی غلط فہمی میں نہ رہتی اور جواہرات' اسے تو کم از کم اندھا ہی کر دیتیں یا پھر خاور والا ایک انجکشن لگا دیتا تھا۔ سولہ سال بعد صرف سونیا کا کیوں دکھایا۔ باقی سب کا بھی بتانا تھا اور ہاشم اچانک لاپتا ہو گیا۔ ایک اتنا ذہین' قابل اور مشہور وکیل جو آر فیکٹز انگلیوں پہ یاد رکھتا تھا۔ اسے کسی نے ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ کہاں گیا؟ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ کیوں؟ اور فارس تو بھئی واقعی فارس ہے۔ کیا زبردست پلان بنایا اور وہ ملازمہ محترمہ فیشونا تھیں۔ ہم نے فضول میں بیچاری حسینہ کو چڑیل بنا دیا۔ خیر ہاشم اور آبدار کے لیے بہت جی برا ہوا۔ نمرہ احمد کو جب بھی پڑھتے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے سب ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ آب حیات بھی اچھی تھی۔ آمنہ ریاض تو ڈرا بھی رہی ہیں۔ ہنسا بھی رہی ہیں اور کہیں کہیں الجھا بھی رہی ہیں مگر پھر بھی کہانی زبردست ہے۔

ج: افرا انصاری اور رویا! ہاشم کہاں اکیلا رہ گیا۔ آپ کی ہمدردیاں ہیں نا اس کے ساتھ۔ یقیناً" دعائیں بھی ہوں گی۔ کبھی کبھی بہت زیادہ عقل اور ہشیاری بھی مروا دیتی ہے۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ رہی ہاشم کو ڈھونڈنے کی بات تو ہاشم کو کون ڈھونڈتا۔ ہاں جواہرات نے ضرور کوشش کی ہوگی اور یقیناً" وہ جان بھی گئی ہوگی کہ ہاشم کہاں ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ بھی ہاشم کے ہر جرم میں برابر کی شریک تھی۔ اگر وہ ہاشم کے لیے کوشش کرتی تو وہ خود بھی پکڑی جاتی جبکہ اسے ہاشم کی بیٹی کے لیے زندہ رہنا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی جان بچانے کو ترجیح دی۔ نوشیرواں تو تقریباً" پاگل ہو چکا ہے اور تنہا زندگی گزار رہا ہے' ویسے بھی نوشیرواں ایسا کردار تھا جو کسی کے ساتھ بھی مخلص نہیں تھا۔ سعدی نے اس کی جان بچائی' اس نے سعدی کی جان لینے کی کوشش کی۔ اپنے بھائی کو ساری دنیا کے سامنے ذلیل کیا۔ بھائی کی بیوی پر نظر رکھی۔ ایسے لوگ کسی کے نہیں ہوتے۔ اپنی ماں یا بھتیجی کے بھی نہیں۔

ثمینہ اکرم۔۔۔ لیاری۔ کراچی

"امی یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ میں ضرور اپنا احتجاج ریکارڈ کراؤں گی۔" خواتین (سالنامہ نمبر) جیسے ہی غنویٰ کے ہاتھ میں آیا۔ صدمے سے وہ جیسے رونے والی ہو گئی۔ بھئی سروے میں اس کو کہیں اپنا نام جو نظر نہ آیا۔ غنویٰ بولی کہ امی آپ نے تو اتنا لیٹ خط پوسٹ کرایا تھا پھر بھی انہوں نے آپ کو سروے میں شامل کر لیا۔ میں نے اتنی محنت سے سروے کے جوابات لکھے مگر مجھے شامل نہیں کیا گیا۔ یہ تو سراسر (خواتین والوں کی) ناانصافی ہے۔ دکھ تو مجھے بھی بہت ہوا۔ بے چاری سارا دن اپنے بھائیوں کے مذاق کا نشانہ بنتی رہی۔

"نمل" کے اختتام پر میں بھی بہت افسردہ ہوں۔ مگر پھر بھی نمرہ احمد نے اچھا اینڈ کیا۔ کوئی تشنگی نہ رہی۔ ہر ہر کردار کے ساتھ انصاف ہوا۔ زندگی میں جیت جانا ہی بڑی بات نہیں۔ کبھی کبھی ہار جانا بھی اہم ہو جاتا ہے۔ ہاشم کو ایک نہ ختم ہونے والی سزا مل گئی ہے۔ اینڈ میں سونیا پاکستان واپس آرہی ہے۔ اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے۔۔۔ تو کیا نمرہ احمد "نمل کا پارٹ 2" لکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں یا کوئی اور دلچسپ ناول شروع کرنے والی ہیں۔

آمنہ ریاض "وحشت جنوں" میں ایک بھٹکتی روح کی کہانی کو ہی پورے ناول پر محیط کر دیا گیا ہے۔ فلک بوس کے اسرار کو بہت زیادہ پھیلا دیا گیا ہے۔ عطیہ خالد کی کہانی "خالہ" مجھے بہت اچھی لگی۔ سمیرا حمید اور سائرہ رضا کے ناول ایک ساتھ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ ابھی میں نے سمیرا حمید کا ناول "عشق آمد و من" پڑھا ہے۔ اس طرح کی کہانیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ جنہیں پڑھ کر ہم پرانے زمانے کے عہد میں پہنچ جائیں (میں یشفین کی محفل مندی سے بہت متاثر ہوئی) یہ ایک کلاسک کہانی ہے شکریہ آپ کا (نئے سال کا بہترین تحفہ ملا۔ سائرہ رضا اور سمیرا حمید کی کہانیوں کی صورت) سائرہ رضا کا ناول "حسن المآب" واقعی ایک شاہکار ناول ہے۔ بڑی کلاسیکل کہانی ہے۔ جبکہ مجھے حرا قریشی کے جوابات اچھے لگے۔ نفیسہ سعید کا افسانہ "دل کے بھید" بہت اچھا لگا۔ میمونہ صدف کا ناولٹ "راہ جنون میں" اچھی تحریر تھی۔ "نائدہ" (خوشنود حنیف) کی پہلی تحریر بہت جان دار رہی۔ بہت اچھا افسانہ لکھا۔ حقیقت سے قریب تر۔۔۔ مگر سب شوہر ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کچھ شوہر بیوی کو اپنے سامنے کھاتا دیکھ کر زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

ج: اوہو غنویٰ! اب دیکھو۔ خط آپ کی امی کا شائع کر رہے ہیں۔ لیکن جواب آپ کو دے رہے ہیں۔ سروے میں تو آپ کو بھی شامل کیا تھا۔ مگر ہمارے پاس محدود صفحات ہوتے ہیں اس لیے مجبوراً "ڈراپ کرنا پڑا۔ اب دیکھنا آئندہ آپ کی والدہ کا دل توڑیں گے مگر آپ کا معصوم دل نہیں۔ ابھی بھائی آپ کا مذاق اڑا رہے ہیں پھر اکرم صاحب آپ کی امی کا اڑائیں گے۔ بس خوش!

نمرہ احمد اس کا دوسرا حصہ لکھیں گی یا نہیں اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتے' ہاں نمرہ بہت جلد آپ کے لیے ایک بہت دلچسپ ناول لکھیں گی۔

فہمیدہ گل ۔ لاڑکانہ

نمل کی آخری قسط پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ ایسا لگا کوئی بہت پیارا دوست اچانک ہی کہیں چلا گیا ہو۔ ہاشم کے ساتھ بہت اچھا ہوا سعدی اور حنین کا ہیرو' ہیروئین دکھانا چاہیے تھا۔ احمر اہم کردار تھا' وہ بھی غائب۔ سولہ سال بعد فارس زمر کا کوئی بچہ تو دکھاتے لیکن پھر بھی میں یہ ہی کہوں گی کہ آئی لو یو سو مچ نمل اینڈ آئی مس یو' اور ہاں' نمرا احمد سے ایک درخواست ہے وہ نمل کا دوسرا پارٹ بھی لکھیں پلیز پلیز' باقی سب بھی بہت اچھی تحریریں تھیں پرچا دیر سے ملتا ہے اس لیے جلدی جلدی خط لکھنا پڑتا ہے۔

ج: پیاری فہمیدہ! ہمیں احساس ہے کہ خواتین قارئین تک تاخیر سے پہنچتا ہے اس لیے وہ تفصیلی تبصرہ نہیں کر پاتیں۔ خیر ہمارے لیے یہ بھی بہت ہے کہ آپ نے ہمیں خط لکھا۔

سعدی اور حنین کا ہیرو' ہیروئن..... بھئی ہیرو تو ایک ہی ہوتا ہے وہ زمر کو مل گیا اور ہیروئین بھی ایک ہوتی ہے' وہ فارس کو مل گئی۔ نمل کے اختتام پر ہم بھی بہت افسردہ ہیں۔ اسی لیے نمرہ سے کہا ہے کہ وہ جلد دوسرا ناول شروع کریں۔ ان شاء اللہ آپ جلد ہی ان کا نیا ناول پڑھیں گی۔

شگفتہ پٹھانی' شائستہ' رانی' عمیرہ احمد' ایمن۔ ڈیرہ غازی خان

ہمیں ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے تقریباً 4 سال ہوئے ہیں لیکن ہم نے دس سال پرانے ڈائجسٹ بھی پڑھ رکھے ہیں سب ہی کہانیاں بہترین ہوتی ہیں مگر نمرہ احمد کی نمل بے حمیت لوگوں کے چہرے سے نقاب اتارتی ہوئی' بہترین تحریر' افسانے آج کل بہت آرہے ہیں۔ ساجدہ حبیب کی "وردی وعدہ اور وفائیں" نگہت سیما کی "زمین کے آنسو" اور اسی طرح کی ڈھیروں کہانیاں آج تک ہمارے دلوں پہ حکومت کرتی ہیں۔ ساجدہ حبیب ضرب عضب اور اس کے شہداء آپ کے قلم کو پکار رہے ہیں بڑے عرصے سے وطن کی محبت سے لبریز دلوں کو گرماتی ہوئی کوئی تحریر خواتین ڈائجسٹ کی زینت نہیں بنی۔ شاہین رشید سے آر جے عرفان شیخ' وقار ملک مست ایف ایم 103 کراچی کے انٹرویو کی درخواست ہے۔

ج: شگفتہ' شائستہ' رانی اور ایمن! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں' ساجدہ حبیب اور نگہت سیما تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

صائمہ ابراہیم ۔ کوٹ مٹھن ضلع راجن پور

میں نے چار' پانچ ماہ پہلے اپنی کہانی "واپسی" کے نام سے بھیجی تھی۔ اس کے بارے میں بتا دیں کہ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔

ج: صائمہ! آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔

صفا خان ..... کالو خان

میرے تکمیل میں شامل ہیں کچھ تیرے حصے
ہم اگر تجھ سے نہ ملتے تو ادھورے رہتے

نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے ساتھ ساتھ ہم نے بالآخر نمل کو الوداع کہہ دیا..... فارس' سعدی اور حنین ہم سے بچھڑ گئے۔ ایسے لگا جیسے کوئی اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ لیے کھڑا ہو الوداع کہنے کو اور جانے کا ارادہ پہلے ہی سے کر چکا ہو.....

نمرہ نے سب کچھ سنبھال لیا اور یوں اسی بات نے ہم سے التجا کی کہ "بس کرو" الوداع کہو لیکن اب ہمیں حنین جیسا بن کر دکھانا ہے "شیطانی وسوسے سے چھٹکارا پانا ہے" فارس جیسا جو کہتا ہے کہ "ہر بات ہر کسی کو بتانے والی نہیں ہوتی اور بیٹیاں سب کی برابر ہوتی ہیں۔" سعدی جیسا جو اپنی ضمیر کی آواز کو اس ڈر سے نہیں دباتا کہ پھر غلام کہلائے گا..... زمر جیسا..... جس نے سکھایا کہ رشتوں کو ساتھ لے کر کیسے چلتے ہیں۔

ہاشم کو شاید میں کبھی بھی نہ بھلا سکوں..... آپی' جواہرات اور خاص کر احمر جتنی کہ کوئی بھی بھلا دینے کے قابل نہیں' ہر

کردار چونکا دینے والا تھا۔ اس دفعہ سونیا کی برتھ ڈے سلیبریشن اور محسن کا یہ شعر پورے ناول کی جان تھے۔
دیکھا نہ کسی نے بھی میری سمت پلٹ کر
محسن میں بکھرتے ہوئے شیشوں کی صدا تھا
ڈائجسٹ چونکہ ابھی تک پورا پڑھا ہی نہیں ہے۔ کیا کریں لائٹ چلی گئی اور "نمل" کا ادھار تو آج چکانا ہی ہے۔

ج:۔ پیاری صفا! بہت شکریہ آپ نے خط لکھا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

طہٰ مصطفیٰ۔ فاروق آباد

مجھ جیسی معصوم سی قاری کا دل صدمے اور دکھ سے چور چور ہے۔ میرا سروے، میرے خط۔ ہائے اس دفعہ شائع ہی نہیں کیے گئے۔ یہ ہماری بے قدری تو بہ۔ دل خون کے آنسو رویا پر ہم نے خواتین نہ کھویا۔ نمل ہو گیا ختم۔۔۔ نمرہ احمد نے اینڈیوں کیا جیسے نمل 2 لکھنا ہو۔ ویسے اچھا تھا۔
البتہ خواتین کے سلسلے وار ناولز پڑھ لیے باقی نہیں پڑھا۔ بھلا میں پڑھوں نہ پڑھوں "آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں فرضی نہیں حقیقت یہ بنی کہانی لکھ چکی ہوں پر بھیجی اس لیے نہیں کہ۔۔۔؟ خیر رہنے دیں "گلہ" اپنوں سے ہوتا ہے غیروں سے نہیں۔
میں مسلسل لکھتی رہوں گی کبھی نہ کبھی۔ کہیں نہ کہیں آپ کو مجھ پہ ترس آئے گا نا۔
ج:۔ پیاری طہٰ! ہمیں بالکل اچھا نہیں لگا' یہ کیا بات ہوئی بھلا' ایک دفعہ خط نہیں شائع ہوا تو آپ نے ہمیں غیر بنا دیا۔ یہ پرچا بھی آپ کا ہے اور ہم بھی آپ کے ہیں اور ترس کھانے والی تو بات ہی نہیں' اچھی تحریریں اپنی جگہ خود بنا لیتی ہیں اور ہم ان کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ آپ ضرور لکھیں۔ ہم منتظر ہیں۔

ہما فاروق۔۔۔۔ گوجرانوالہ

خواتین ڈائجسٹ کا اس بار کا ٹائٹل بہت کیوٹ لگا۔ سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" سے استفادہ کیا۔ رنگا رنگ پھول اور باقی سلسلے بھی اے ون تھے۔ نمل کی آخری قسط بہت شان دار تھی۔ افسانے "بول دو" "مائدہ" "خالہ" اور "دل کے بھید" سب کے سب اچھے تھے۔ آپی ایک درخواست ہے۔ جب اپریل میں "سالگرہ نمبر" آئے گا تو پلیز آپ اس کے صفحات زیادہ کردیجئے گا۔ اس سلسلے میں اگر قیمت میں بھی اضافہ کرنا پڑا تو کرلیں گے۔ "سالگرہ نمبر" منفرد اور موٹا ہونا چاہیے۔ انتظار ہے کہ فروری میں کون سا ناول شروع ہوگا۔
ج:۔ پیاری ہما! ہماری بھی خواہش ہے کہ سالگرہ نمبر کے صفحات عام شمارے سے زیادہ ہوں لیکن مسئلہ قیمت میں اضافے کا ہے' صفحات زیادہ ہوں گے تو لازما" قیمت بھی زیادہ ہوگی۔ اگر دیگر قارئین نے بھی تائید کی تو ہم صفحات میں اضافہ کردیں گے۔
نیا ناول فروری میں نہیں' اپریل کے شمارے میں شروع ہوگا اور کس کا ہوگا؟ یہ آپ اندازہ لگائیں۔ اتنا بتا سکتے ہیں کہ آپ کی پسندیدہ ترین مصنفہ کا ہوگا۔

فریحہ عزیز شیخ۔۔۔۔ کنڈیارو

اعتذار

دسمبر کے شمارے میں بچ ٹی وی کے نیوز اینکر ارسلان کھوکھر کا انٹرویو شائع ہوا تھا۔ انٹرویو کے ساتھ جو تصاویر شائع ہوئیں وہ ارسلان خالد کی تھیں۔
اس سہو کے لیے ہم ارسلان کھوکھر سے معذرت خواہ ہیں۔ ارسلان کھوکھر کی تصویر شائع کی جارہی ہے۔
ہم ارسلان خالد سے بھی معذرت چاہتے ہیں' جنہیں اس انٹرویو کی وجہ سے زحمت ہوئی۔

مروادیا نا بے چاری آپی کو سب خواتینوں نے جس کو دیکھو "اللہ کرے یہ آپی تو مر جائے" سب یہی کہتے تھے۔ میں پوچھتی ہوں آخر اس کا قصور کیا تھا۔ جو آپ سب اسے بددعائیں دے رہے تھے۔ وہ بے چاری تو سب کی بد دعا کرتی تھی خاص کر یوسفز کی جو آپ کو پیارے ہیں۔ خیر گزرا ہوا سال میرے لیے اینڈ میں بہت اچھا رہا کیونکہ دسمبر میں میری برتھ ڈے بھی تھی اور میرے بھائی کی شادی بھی تھی۔ 25 دسمبر 2013ء کو میرے بھائی کی شادی ہوئی اور 12 دسمبر کو میری سال گرہ۔ ویسے سال گرہ تو بابائے قوم کی بھی تھی۔

ج:۔ پیاری فریحہ! سالگرہ اور بھائی کی شادی کی مبارک باد۔

خاتون کی جمع خواتین ہے۔۔۔ آپی کا ہمیں بھی دکھ ہے۔

مگر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ آپ آپی کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ ویسے یہ بھی سوچیں کہ آپی زندہ رہ کر کیا کرتی۔ فارس تو اسے ملتا نہیں اگر مل جاتا تو آپ زمر پر افسوس کرتیں

مہناز رانی، رمشاء۔۔۔ مانانوالہ، ضلع شیخوپورہ

کرن کرن روشنی بہت اچھا سلسلہ ہے۔ میری ڈائری سے اور آپ کی بیاض سے اس کے علاوہ نظم اور غزلیں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں۔ بھائی عدنان بھی قارئین کو بہت اچھے مشوروں سے نوازتے ہیں۔ اب آتے ہیں نمل کی طرف تو نومبر میں آخر کا صفحہ پڑھ کر تو جان نکلنے کے قریب تھی۔ دسمبر کا شمارہ پڑھ کر سکون ہوا کہ زمر کو کچھ نہیں ہوا۔ لیکن یہ کیا قارئین کی بددعاؤں سے آبدار بے چاری ماری گئی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ قاری بہنیں آبدار کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑی ہوئی تھیں، ہاشم کا انجام بھی بہت اچھا ہوا۔ جواہرات کے ساتھ بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ آپی نمو، ویری نائس آپ بہت ہی اچھا لکھتی ہیں۔ آپ کی تعریف کے لیے تو الفاظ نہیں۔ آپی آمنہ آپ کا ناول دشت جنوں بھی بہت اچھا ہے۔ آپ شمعی کا راز بھی کھول دیں اور یہ کیف کہاں ہے اسے بھی واپس لائیں منفرا اور تیمی کو بھی منظر عام پر لے آئیں اور پلیز اس کے صفحات بھی بڑھا دیں۔ چاہے افسانے ایک دو کم کر دیا کریں۔ میمونہ صدف کا "راہ جنوں میں" ناولٹ بھی بہت اچھا ہے اس ماہ کا ٹائٹل بھی زبردست تھا۔

ج:۔ پیاری مہناز اور رمشاء! اب اگر آپ کو یہ لکھا بھی دیا جائے کہ قاری بہنیں آبدار کی دشمن کیوں تھیں تو کچھ فائدہ نہیں۔ کیوں کہ وہ بے چاری تو اس دنیا سے جا چکی اور آپ ہمیں ایسا بداخلاق سمجھتی ہیں۔ توبہ توبہ! جناب یہ آپ کی محفل ہے، سو بار آئیں۔ ہم سو بار آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔

اقراء ممتاز۔۔۔ سرگودھا

میری طرف سے خواتین کی تمام رائیٹر اور قارئین کو محبتوں بھرا اسلام۔ آج مجھے جس چیز نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ ہے ایک شکوہ۔ میری قارئین سے گزارش ہے کہ آپ رسالے پڑھ کر اگر دکاندار کو دیتی ہیں تو پلیز اس سے صفحے نہ پھاڑا کریں۔ میں خواتین رسالہ پڑھتی ضرور ہوں مگر دو ماہ بعد پچھلا رسالہ لے لیا۔ مگر جب رسالہ منگواتی ہوں تو اندر سے صفحے غائب ہوتے ہیں۔ میری قارئین سے مکرر گزارش ہے کہ اگر آپ کو کوئی چیز پسند ہے تو آپ اپنی ڈائری پر اتار لیں مگر دوسروں کو بھی پڑھنے دیں۔

ج:۔ پیاری اقراء! آپ کی شکایت جائز ہے۔ ہم اپنی قارئین سے استدعا کریں گے کہ پرچے میں سے صفحات نہ پھاڑا کریں۔

وردہ زبیر۔۔۔ کیماڑی، کراچی

نمل نے مجھے برسوں کی خاموشی توڑنے پر مجبور کردیا۔

سانحہ ارتحال

ہماری ہر دل عزیز مصنفہ مصباح نوشین کی خالہ رضائے الٰہی سے اس دار فانی سے رخصت ہو گئی ہیں۔ دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور مصباح نوشین اور دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

نمل ایک ایسی کہانی جس نے میری جیسی کنجوس کو 60 روپے خرچ کرکے ڈائجسٹ منگوانے پر مجبور کردیا۔ اتنی بہترین کہانی کہ تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ سارے ہی کردار ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ کچھ بہنوں کو آب دار پسند نہیں تھی مگر مجھے وہ بھی اچھی لگتی تھی کیونکہ آپی مرتے وقت جو سوچتی ہے کہ قیدی کے برے لگتے ہیں۔ سو ہاشم اگر آب دار کا قیدی تھا تو آب دار فارس کی قیدی تھی اور وہ فارس کو بری نہیں لگتی تھی۔ خیر فارس اور زمر کی ازدواجی زندگی پرسکون گزرنے کے لیے بھی اس کا مرنا ضروری تھا اور کہانی کا اینڈ یہ کیا؟ کیا نمرہ اس کہانی کا دوسرا حصہ لکھنا چاہتی ہیں اینڈ پڑھ کر تو یہی لگا۔ ہاشم کا انجام اس سے بھی زیادہ برا ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں خاص طور پر سمیرا حمید کی (عشق آمد و من) زبردست کہانی تھی۔ ان کی ساری کہانیوں کی طرح مشکل اور بہترین' سائرہ رضا کی کہانی ابھی پڑھی نہیں اس لیے تبصرہ محفوظ۔ آپ دسترخوان میں سوہن حلوے کی جو ترکیب لکھی تھی ' اراروٹ کیا چیز ہے یہاں کوئی بھی اس نام سے واقف نہیں ہے۔

ج:۔ پیاری وردہ! آپ کے ماموں کی شہادت نے افسردہ کردیا' اللہ تعالیٰ آپ کو اور ان کے دیگر متعلقین کو صبر عطا فرمائے۔

نمرہ احمد اور سمیرا حمید تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ اراروٹ آپ کو کسی بھی جنرل اسٹور سے مل سکتا ہے۔ لیاقت آباد کی مارکیٹ میں عام ملتا ہے۔

روبینہ شوکت۔۔۔۔ کراچی

سلسلے وار ناول "نمل" نمرہ احمد کے دوسرے تمام ناولوں (قراقرم کا تاج محل"' "مصحف" اور "جنت کے پتے") کی طرح سپرہٹ اور سدا یاد رہنے والا ناول۔ ان کے ناولوں میں جس طرح قرآنی آیات کا خوب صورتی سے ترجمہ بیان کیا جاتا ہے' وہ قابل دید ہے۔
"کرن کرن روشنی" سے بہت سے مسائل کا حل ملتا ہے۔ "آپ کا باورچی خانہ" تمام تراکیب ڈائری میں نوٹ کرلیتی ہوں اور پھر میں اور میری بچیاں مل کر ٹرائی کرتے ہیں۔

ج:۔ بہن روبینہ! ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ اس سے پہلے

ہمیں آپ کا کوئی خط ملا ہو۔ ملتا تو ضرور شامل اشاعت کرتے۔

ہمارے لیے آپ کی رائے اہمیت کی حامل ہے۔ کوئی بات نہیں اگر آپ بروقت تبصرہ نہیں کر سکتیں تو آپ ہماری دیرینہ قاری ہیں ہمارے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ اپنے بیٹے کو ہماری طرف سے پیار دیجیے گا۔

رابعہ رفاقت، افیرہ رفاقت..... BZU ملتان

مجھے خواتین ڈائجسٹ سے جتنی محبت ہے اگر بیان کروں تو شاید آپ کو لگے مبالغہ آرائی کر رہی ہوں۔ اس کی وجہ سے ڈانٹ بھی کھائی ہے، مار بھی لیکن اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ابو پوسٹ نہیں کرواتے ورنہ بہت سی تحریروں پہ تبصرہ کرنے کو دل چاہا۔ اب یونیورسٹی آتے ہی پہلے دن ڈاک خانہ ڈھونڈا۔ سب سے پہلے "آب حیات" کی بات ہو جائے۔ بہت ہی اچھی کہانی بلکہ اسے کہانی کہنا جائز نہیں، یہ ضابطہ حیات تھی۔ اختتام بہت ہی اچھا ہوا۔ اللہ ہمیں بھی اپنی محبت کا "آب حیات" نصیب فرمائے۔ آمین۔ ـــــ نمرہ احمد میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔

ج:۔ رابعہ اور افیرہ! محبت میں تکلیفیں تو اٹھانا پڑتی ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان جب کسی سے محبت کرتا ہے تو ہنسی خوشی سب تکلیفیں برداشت بھی کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اللہ تعالیٰ اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

خواتین سے آپ کی محبت کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

مریم شاعر..... لاہور

آج اگر اتنے عرصہ بعد قلم اٹھایا ہے تو اس کا محرک "نمل" ہے۔ اکثر افسانے بھی لکھے مگر پھر وہی، خط ہی چھپنے کی امید نہ تھی کہاں کہانی مگر اب "نمل" نے تبصرہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

"نمل" تو نمرہ جی کمال کر دیا آپ نے، یچ انفرادیت اور کاملیت مجھے تو یہ دو الفاظ ملے اس کے لیے۔ بھئی، کوئی بھی تو آپ کے جیسا نہیں اور کوئی بھی تو "نمل" جیسا نہیں نا! خیر نمل کے کرداروں پر مفصل تبصرہ پھر سہی، سائرہ جی ہمیں تو پتا ہی نہ تھا کہ آپ شادی شدہ ہیں خیر آپ بھی بہت اچھا لکھتی ہیں کسی ندی کے بہاؤ کی طرح اور "جس مٹی کو ہاتھ لگایا" کے مصداق جو موضوع لیتی ہیں، کمال کرتی ہیں سائرہ جی! نوال، اخفش والے ناول کی اگلی قسط کب آئی ہے بہت انتظار ہے۔ مزید نایاب جیلانی، عمیرہ احمد، نمیرا احمید بھی اچھا لکھتی ہیں۔ قانتہ رابعہ کے موضوعات بے حد اچھے ہوتے ہیں۔

ج:۔ پیاری مریم! آپ اظہار خیال تو کرتیں، ہو سکتا ہے کہ آپ کے خط شائع ہو جاتے۔ یہ سلسلہ قارئین کے خطوط کے لیے ہی تو ہے۔ کہانی آپ ضرور لکھیں۔ اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہو گی۔ نمرہ اور سائرہ تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔ نوال اور اخفش والی قسط تو عید پر ہی آئے گی۔

شبنم وحید..... آزاد کشمیر

ہم نے سوچا کہ سولہ سترہ سال کی چپ توڑ دی جائے اور نمل اور نمرہ احمد کی تعریف میں کچھ لکھا جائے۔ جس کاغذ پہ تعریف لکھی جا رہی ہے۔ یہ کاغذ بھی سولہ سترہ سال پرانا ہے۔ مجھے تو باقی لوگوں کی طرح آپی زہر نہیں لگتی تھی اور نہ جواہرات کے چہرے پہ تیزاب ڈالنے کا شوق تھا۔ آپی کی موت کا مجھے تو بہت دکھ ہوا۔ محبت کرنے کی کچھ زیادہ سزا مل گئی۔ لیکن جواہرات نے جو بویا وہی کاٹا۔ سارے کردار زبردست تھے بٹ فارس غازی کا کیا کہنا۔

ج:۔ پیاری شبنم! خواتین پہ ناحق الزام ہے زیادہ بولنے کا۔ اتنی طویل خاموشی؟ آئندہ مثال کے طور پر ہم آپ کا نام پیش کر دیں گے۔ سترہ سال بعد چپ ٹوٹی وہ بھی صرف نمرہ کے لیے۔ آئندہ خط کب لکھیں گی؟ کیا ہمیں پھر سولہ سترہ سال انتظار کرنا پڑے گا۔

کاغذ کی خستگی بتا رہی ہے کہ یہ واقعی سولہ سترہ سال پرانا ہے۔ آپ نے خط لکھنے کے لیے یہ کاغذ سنبھال کر رکھا تھا اب تک؟

❁

آمنہ ریاض

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی۔ ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔
معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔
فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ' وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آئے کت اور وسامہ' معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔
کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔
صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے' رامین' کیف اور فہیمہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔
شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہ جہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔
باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔ خوش

نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تنک مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں، جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور ٹیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

بارہویں قسط

"تم چلو گی میرے ساتھ اس راستے پہ۔۔۔؟" وہ سرگوشی کر رہا تھا اور نیم تاریک ماحول میں خوش نصیب کا معصوم سا دل خوف کی دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ اس کی ساری تیزی طراری دھری کی دھری رہ گئی تھی اور اب سامنے ایک ہونق اور حواس باختہ لڑکی کھڑی تھی۔

"مم، مجھے جانا ہے۔" گھبراہٹ اور ڈر کے مارے اس کی آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔

شامیر اس کا رنگ اڑا چہرہ دیکھ کر دل فریبی سے مسکرایا اور ایک طرف ہٹ گیا۔

"جاؤ۔"

خوش نصیب کو آزادی کا پروانہ ملا تھا، وہ سر پر پیر رکھ کر دوڑی۔ دروازے میں رک کر ایک بار شامیر کو دیکھا۔ وہ زیر لب مسکراتا ہوا اپنی میز پر رکھی چیزوں کی ترتیب درست کر رہا تھا۔

اگلے کچھ روز بشام میں مطلع صاف رہا اور ان سب کو فلک بوس سے نکل کر گھومنے پھرنے کا موقع ملتا رہا۔
کبھی ماموں اور ممانی بھی ساتھ ہوتے بیشتر وقت معاویہ ہی آئے کت کو باہر لے جاتا رہا۔ بشام معصوم لوگوں کا ٹھکانہ تھا مقامی آبادی بمشکل ڈیڑھ دو سو مکانات پر مشتمل ہوگی۔ اور فلک بوس بشام کا دل تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا فلک بوس کے مکینوں سے بشام کے لوگ واقف نہ ہوں۔ لیکن ان دونوں کو ہمہ وقت ساتھ ساتھ دیکھ کر چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔ ان دونوں میں دوستی بھی بہت ہو گئی تھی۔ وسامہ کا دکھ وہ مرکز تھا جس کے گرد معاویہ اور آئے کت کی زندگی گردش کرتی رہتی تھی اور اسی گردش کے دوران وہ دونوں ایک دوسرے کے نزدیک آ گئے تھے۔ یہ بات خود ان دونوں نے محسوس کی یا نہیں لیکن دنیا کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا۔
اڑتی پڑتی یہ اطلاع فلک بوس میں چند دن کی مہمان بن کر آئی صاعقہ ممانی کے کانوں تک بھی پہنچ گئی کہ فلک بوس کا مالک معاویہ شیرازی عنقریب اپنے مرحوم ماموں زاد بھائی کی بیوی سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ صاعقہ ممانی کو سخت صدمہ پہنچا کیونکہ معاویہ کا آئے کت کی طرف بڑھتا ہوا جھکاؤ انہیں بھی ایسی ہی غلط فہمی کا شکار بنا چکا تھا۔
بیٹے کو گزرے ابھی چند دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایسی باتیں شروع ہو گئی تھیں، وہ جتنی بھی اعلا ظرف ہوتیں لیکن بہو کی دوسری شادی کا خیال ہی ان کے دل پر پتھر بن کر برسنے لگا تھا۔ ان کے دل سے ابھی یہ ناراضی بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ آئے کت نے عدت کے دن گھر کے اندر رہ کر اور پورے مذہبی احکامات کو مانتے ہو ئےنہیں گزارے۔ وہ ایک بڑی چادر سے اپنا آپ ڈھانپ کر ضرور رکھتی تھی لیکن نامحرموں کے سامنے آنے میں احتیاط ہرگز نہیں کرتی تھی۔ عدت کے متعلق احکامات کو وہ مانتی ضرور تھی لیکن ان احکامات کا مطلب اس نے اپنے حساب سے سیٹ کر رکھا تھا جن سے صاعقہ ممانی جیسی مذہبی خیالات کی مالک خاتون کو خاصا اعتراض بھی تھا۔ انہوں نے کئی بار سوچا کہ آئے کت کو معاویہ سے بھی پردہ کرنے کی تلقین کریں لیکن آئے کت کے دکھ کا احساس کر کے وہ خواہش کے باوجود اسے منع نہیں کر پائی تھیں۔ اب جب بشام کی چہ مگوئیاں ان کے کانوں میں پڑیں تو انہوں نے اپنا سر ہی پیٹ لیا۔ کیا تھا جو وہ آئے کت کو پہلے ہی منع کر دیتیں۔ اللہ نے ایام عدت عورت کو پردے میں رہنے کی تلقین کی ہے تو اس کے پیچھے کچھ نہ کچھ مصلحت ہوگی۔ بہرحال انہوں نے طالب حسن سے اس بارے میں بات کی تو ان کی پیشانی پر سوچ کے بل نمودار ہو گئے۔
"یہ اچھا خیال ہے اگر معاویہ راضی ہو جائے تو آئے کت اور معاویہ کی شادی کی جا سکتی ہے۔"
"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ بھابھی لگتی ہے آئے کت معاویہ کی۔ وہ کیسے اس سے شادی کرنے پر راضی ہو سکتا ہے۔" صاعقہ ممانی نے تڑپ کر کہا تھا۔
"وسامہ کا انتقال ہو چکا ہے صاعقہ! اس حقیقت کو تم قبول کر لو تو بہتر ہوگا۔" انہوں نے نرمی سے کہا تھا۔
"آئے کت کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ وسامہ اس دنیا میں رہا نہیں ہے۔ آگے پیچھے کوئی اس کے ہے نہیں۔ پہاڑ جیسی زندگی وہ اکیلی کیسے گزارے گی! تم خود سوچو آج نہیں تو چند سال بعد آئے کت کسی نہ کسی سے تو شادی کرے گی تو اگر معاویہ سے ہی کر لے تو اس میں کیا برائی ہے؟"
صاعقہ ممانی سوچ میں پڑ گئیں۔
"اور اس طرح وسامہ کے آنے والے بچے کو بھی تحفظ مل جائے گا۔"
بات معقول تھی لیکن صاعقہ ممانی قائل ہو کر نہ دیں۔ ان کے اعتراضات اپنی جگہ جوں کے توں قائم رہے۔ آئے کت اور معاویہ کو پتا چلا تو کچھ دیر کے لیے وہ دونوں ہی دنگ رہ گئے۔ پھر معاویہ کو اس زور کی ہنسی آئی کہ ہنستے

ہنستے اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ آئے کت اسے ہنستا دیکھ کر عجیب سے دکھ میں گھر گئی۔ پھر اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

"پہلے مجھے یہ بتائیں۔ یہ احمقانہ باتیں آپ کے دل میں ڈالتا کون ہے؟" اس نے آنکھوں کا پانی پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"آج خاتون بتا رہی تھی وادی میں کچھ عورتیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں کہ تم دونوں کی جوڑی کتنی پیاری لگتی ہے۔ ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تم دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔"

"وہ ان پڑھ دیہاتی عورتیں ہوں گی ممانی! یہاں بشام میں یہ رواج ہے۔ ایک بھائی کے مرجانے پر اس کی بیوی کی شادی دوسرے بھائی سے کردی جاتی ہے تو ان عورتوں نے اسی حساب سے بات کی ہوگی۔ سوال یہ ہے ممانی! انہوں نے کہا اور آپ نے یقین کر لیا۔۔۔ کیا آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔"

"بات بھروسے کی نہیں ہے۔" وہ قدرے جھنجلا کر بولیں۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"تمہارے ماموں کا خیال ہے اس شادی میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ اگر تم اور آئے کت راضی ہو جاؤ تو۔"

"ممانی پلیز!" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "یہ بات اب کی ہے دوبارہ مت کیجیے گا۔ میں آئے کت کی بہت عزت کرتا ہوں۔ وسامہ کے حوالے سے وہ بہت قابل احترام ہے میرے لیے۔ بھائی کو مرے ہوئے چند مہینے بھی نہیں گزرے اور آپ لوگ چاہتے ہیں میں اس کی بیوی سے شادی کے بارے میں سوچنے لگوں۔۔۔ بے غیرت نہیں ہوں میں۔" وہ بہت ہی برا مان گیا تھا اس بات کا۔

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے ہتم۔" صاعقہ ممانی نے کہا۔

"میں تمہیں صرف وارن کرنا چاہ رہی تھی کہ باہر نکلتے ہوئے احتیاط کیا کرو۔ تم دونوں کو ساتھ ساتھ گھومتا پھرتا دیکھ کر لوگ اپنی مرضی کے مطلب نکال رہے ہیں۔"

"کوئی میرے سامنے یہ بات کہے۔۔۔ میں اس کا منہ توڑ دوں گا۔" وہ ناراضی سے بولا۔

صاعقہ ممانی اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"مجھے بھی یہ خیال آیا تھا لیکن عدت کے دوران ایسی بات کرنا مناسب نہیں لگ رہا تھا مجھے۔ تمہارے ماموں کے نزدیک یہ سب سے بہتر آپشن ہو سکتا ہے۔ اس طرح آئے کت اور اس کا ہونے والا بچہ دونوں بے گھر ہونے سے بچ جائیں گے۔"

"میرے نزدیک سب سے بہتر آپشن یہ ہے کہ دوبارہ اس بارے میں بات ہی نہ کی جائے۔" اس نے ناراضی سے کہا اور باہر نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

خوش نصیب نے کچن میں آکر غٹاغٹ دو گلاس پانی کے چڑھائے اور گہرے گہرے سانس بھر کر اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کی۔

ماہ نور اور صیام کچن میں پہلے سے موجود تھیں۔ ماہ نور کھانا بنا رہی تھی جبکہ صیام کچن ٹیبل پر فرنچ فرائز کی پلیٹ رکھے اس میں مزید چپس کا ڈھیر لگا رہی تھی۔ خوش نصیب کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی اور ان تمام باتوں پر غور کرنے لگی جو ابھی شامیر کے منہ سے سن کر آئی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے خوش نصیب! طبیعت تو ٹھیک ہے۔" ماہ نور اسے دیکھ کر چونک گئی تھی، فکرمندی سے کہتی ہوئی قریب آئی اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ خوش نصیب کسی اور ہی دھیان میں تھی، بری طرح سٹپٹا گئی بلکہ کسی حد تک ڈر ہی گئی۔

صیام بھی اسے حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اتنا زرد چہرہ؟

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" صیام کی وجہ سے اس نے اپنی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا تھا۔

"لگ تو نہیں رہا۔" صیام نے کہا۔ "رنگت تو تمہاری ایسے پیلی ہو رہی ہے جیسے کوئی جن پیچھے پڑ گیا ہو۔"

گو کہ اس نے ازراہ مذاق کہا تھا اور ٹھٹھا لگا کر کہا تھا لیکن خوش نصیب کو ایسا لگا گویا اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ سٹپٹا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاہاہا... لو بتاؤ خوش نصیب کے پیچھے کوئی جن کیسے پڑ سکتا ہے۔ اس کے شر سے تو جن بھی پناہ مانگتے ہوں گے۔" وہ اپنے اس درجہ اعلا کے مذاق پر خود ہی جی بھر کر محظوظ ہو رہی تھی۔ بس کندھا تھپکنے کی کسر رہ گئی تھی۔

اور گو کہ خوش نصیب ڈر گئی تھی، اس کے حواس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور شامیر کا انکشاف اس کے دماغ کے پرزے ہلا گیا تھا لیکن نام اس کا ابھی بھی خوش نصیب ہی تھا۔

"میرا نہیں خیال کہ جن بھی میرے شر سے پناہ مانگتے ہوں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو جنوں کا پورا خاندان میرے پیچھے ہاتھ دھو کر نہ پڑا ہوتا۔" ہوائیاں اڑے چہرے کے ساتھ بھی لفظ جیسے خود بخود اس کی دو دھاری تلوار جیسی زبان سے پھسلتے چلے گئے تھے۔

"ایں؟ جنوں کا پورا خاندان۔" وہ ہکا بکا رہ گئی۔ "تم نے پہلے کبھی بتایا ہی نہیں خوش نصیب۔" اس کی آواز انجانے خوف سے سرسرا رہی تھی۔

"لے۔" اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔ "بتانے کی کیا ضرورت ہے، تم اس خاندان کو اچھی طرح جانتی ہو کیونکہ اس خاندان کی سربراہ بھی کوئی جن نہیں بلکہ ایک چڑیل ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" صیام سوچ میں پڑ گئی۔ ایک دم سے دماغ کی بتی جلی تھی۔ اس نے غصے سے خوش نصیب کو گھورا۔

"بدتمیز! تم میری امی کو چڑیل کہہ رہی ہو۔ رک جاؤ ابھی بتاتی ہوں امی کو۔"

"جو بھی کہا ہے تم نے ہی کہا ہے۔" وہ گڑبڑا کر اٹھی اور دروازے کی طرف پلٹی۔

"مم میں اوپر کمرے میں جا رہی ہوں۔" جلدی سے باہر کی طرف لپکی۔ "اللہ! کس قدر ذہین ہے یہ صیام۔" وہ دل ہی دل میں اش اش کرتی ہوئی گئی تھی۔

"صیام! تم خوش نصیب کی باتوں کا برا مت مناؤ۔ تمہیں پتا ہے، اسے اوٹ پٹانگ ہانکنے کی عادت ہے۔" ماہ نور نے جلدی سے صیام کا غصہ دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔
"یہ اوٹ پٹانگ ہانکنے کی عادتیں پتا نہیں کب ٹھیک ہوں گی اس کی۔" صیام نے ناراضی سے بولتے ہوئے ماہ نور کے الفاظ اسے لوٹائے۔
"میں نے ہی غلط بول دیا تھا کہ کوئی جن اس کے پیچھے پڑا ہوگا۔ جن بھوتوں کے گھر والے تو کہتے ہوں گے۔ اپنے بچے شام کو ہی کمروں میں بٹھالیا کرو۔۔۔ کہیں ان کے پیچھے خوش نصیب نہ پڑ جائے' ہونہہ۔" وہ اپنی کڑاہی کی طرف متوجہ ہو گئی۔
ماہ نور نے سر جھٹک کر اس دہری پریشانی سے دھیان ہٹایا۔ اور دروازے کی طرف دیکھا اسے خوش نصیب کی فکر کھائے جا رہی تھی۔
"اسے آخر ہوا کیا ہے؟" ماہ نور سوچ رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

باہر آکر اس نے دیکھا' آئے کت فلک بوس کی دوسری منزل کے ٹیرس پر کھڑی تھی اور دور خلاؤں میں دیکھ رہی تھی۔
سنہری دھوپ نے اس کے بالوں کے رنگ کو مزید خوش رنگ بنا دیا تھا۔ اور وہ سنگ مرمر کا ایسا مجسمہ معلوم ہوتی تھی جسے بنانے کے لیے مجسمہ ساز نے بڑی دل جمعی سے کام کیا ہو۔ چادر جسے وہ وسامہ کے بعد ہر وقت اوڑھے ہوئے نظر آتی تھی اس وقت کندھے پر ایک طرف پڑی تھی۔ بالوں کو بے ڈھب انداز میں دوسرے کندھے پر آگے کی طرف ڈال رکھا تھا۔ ایک کہنی ٹیرس کی باؤنڈری وال پر ٹکی تھی۔ عقب میں فلک بوس کی قد آور عمارت کا فسوں تھا اور عمارت کے کنگروں سے جھانکتے آسمان پر پرندوں کی اڑان تھی۔ قدرت کی صناعی پر تصویر کا گمان ہوتا تھا۔
معاویہ غیر ارادی طور پر اسے دیکھتا چلا گیا۔ فلک بوس کی مین روش پر کھڑا یوں منہ اٹھائے آئے کت کو تکتا ہوا معاویہ۔
دور سے دیکھو تو یوں کھڑا وہ ایک مجذوب سا معلوم ہوتا تھا جو قدرت کے عشق میں مبتلا ہو کر سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔
یک دم وہ چونکا اور اپنے دل میں سر اٹھاتے خیالات سے سٹپٹا گیا۔
"پتا نہیں لوگ اتنی عجیب باتیں کیسے سوچ لیتے ہیں۔" اس نے ناراضی سے ہی دل ہی دل میں کہا اور وہاں سے ہٹ گیا۔

✡ ✡ ✡

خوش نصیب اوپر اپنے کمرے میں آگئی اور حسب عادت جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس کا دماغ جیسے سائیں سائیں کر رہا تھا اور کچھ بھی واضح نہ ہوتا تھا۔ کیا حقیقت تھی شامیر کی؟ پتا نہیں وہ سچ بول رہا تھا یا جھوٹ؟ اگر یہ مذاق تھا تو بھی انتہائی گھٹیا درجے کا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شامیر اس کے ساتھ ایسا مذاق کیوں کرے گا؟
یکایک اسے گیلری کی کھڑکی پر لگی ہوئی چق ہلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ خوش نصیب کا ننھا سا دل حلق میں آ گیا۔ وہ ہمت کر کے اٹھی ہاتھ بڑھا کر چق ہٹانے لگی تو ایسا لگا جیسے۔ چق کے پیچھے سے دو بڑی بڑی آنکھیں جھانک رہی ہوں۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی اور الٹے قدموں بھاگتی ہوئی گیلری سے باہر نکل گئی اور ایسے ہی بھاگتی ہوئی نانی کے

بستر میں گھس گئی۔
"نانی! نانی! پلیز مجھے بچالو۔" وہ ان سے ایسے لپٹ گئی کہ کیا ہی گرم کمبل کو ٹھنڈ کا مارا ہوا انسان خود سے لپٹاتا ہو گا۔
نانی بے چاری کی ابھی آنکھ لگی تھی۔ اس افتاد پر سٹپٹا ہی گئیں۔ اوں آں کی آوازیں بھی حلق سے نکلیں لیکن خوش نصیب اتنا ڈر چکی تھی کہ نانی کی بے لفظ التجاؤں پر دھیان ہی نہ دے سکی۔ جس وقت ماہ نور کمرے میں داخل ہوئی' بے چاری بوڑھی بیمار نانی خوش نصیب کی مضبوط گرفت کے ہاتھوں بس آخری ہچکی لینے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ اور ان کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔
ماہ نور نے دیکھا تو دیوانہ وار ان دونوں کی طرف دوڑی۔
"خوش نصیب! ہٹو پیچھے ہٹو۔" اس نے پوری قوت سے خوش نصیب کو پرے ہٹایا اور نانی کے گلے سے ان کا اپنا ہی دوپٹہ نکالا جو خوش نصیب کے ساتھ لپٹنے سے نانی کے گلے سے لپٹ کر پھندا بن گیا تھا اور نانی کی جان لے کر ٹلنے کا ارادہ رکھتا تھا۔
دوپٹہ نکلتے ہی نانی کی جان میں جان آئی۔ خوش نصیب نے ان کی حالت دیکھی تو اس کے صحیح معنوں میں چھکے چھوٹ گئے۔ جلدی سے لا کر انہیں پانی پلایا اور مری ہوئی سی آواز میں بولی۔
"سوری نانی۔" نانی بے چاری نے کیا جواب دینا تھا ذرا سا ہاتھ اٹھایا سر ہلایا اور آنکھیں موند لیں۔ وہ جیسے بے دم سی ہو رہی تھیں۔
ماہ نور نے ان کا لحاف درست کیا اور خوش نصیب کو لے کر کمرے کے دوسرے کونے میں جہاں بستر زمین پر بچھے تھے وہاں چلی آئی۔
"نانی کی حالت دیکھو خوش نصیب! کبھی تو کوئی عقل والا کام کر لیا کرو۔" اس نے ڈپٹ کر کہا تھا۔
"نہیں۔ میں ڈر گئی تھی۔" اس نے انگلیاں مسلتے ہوئے شرمندگی سے کہا۔
"ڈر گئی تھیں تو اس کا مطلب نانی کی جان لے لی جاتی۔" وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔
"اور کس سے ڈر گئی تھیں تم؟ یہاں کون سے جن بھوت آگئے ہیں جن سے بچنے کے لیے تم نے نانی کی جان کی بھی پروا نہیں کی۔"
"خدارا! جن بھوتوں کا نام نہ لو۔" وہ روہانسی ہو کر بولی اور دو قدم ماہ نور کے قریب بھی ہو گئی۔
"خوش نصیب! ہوش کے ناخن لو کیوں پاگلوں کی طرح بی ہیو کر رہی ہو۔"
خوش نصیب متذبذب سی نیچے بیٹھ گئی اور ہاتھ مسلتے ہوئے سوچنے لگی کہ ماہ نور کو بتایا جائے یا نہیں۔
"میں تمہیں ہی دیکھنے آئی تھی۔ صیام کے سامنے بھی اوٹ پٹانگ بول کر آئی ہو۔ تمہارے اٹھائے ہوئے ایک طوفان کا اثر ختم نہیں ہوتا خوش نصیب کہ تم کوئی نیا شوشہ چھوڑ دیتی ہو۔ اب دیکھنا صیام ایک کی چار کر کے فضیلہ چچی کے کانوں میں ڈالے گی۔"
"ارے تم چھوڑو صیام اور چچی کو۔ یہاں بیٹھ کر میری بات سنو۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر ماہ نور کو پاس بٹھایا۔
"وہ میں شامیر کے کمرے میں گئی تھی۔" اس نے جھجکتے ہوئے بتایا کیونکہ جانتی تھی ڈانٹ تو پڑے گی اور حسب توقع ماہ نور کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
"شامیر کے کمرے میں؟ وہاں کیا کرنے گئی تھیں؟"
"وہ میں۔ شامیر نے مجھے چاکلیٹس گفٹ کی تھیں۔ میں وہی واپس کرنے گئی تھی۔"
ماہ نور نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ دراصل کہنا کیا چاہ رہی ہے۔

"اچھا تو پھر...؟"

"مجھے اس کے کمرے میں ایک کتاب ملی ماہ نور!اس کتاب کے ٹائٹل پہ ایک خوفناک چہرہ بنا ہوا تھا۔" خوف اور ناسمجھی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ وہ بتا رہی تھی۔

"اور... اور شامیر نے مجھ سے کہا... وہ کتاب راستہ ہے جنات تک پہنچنے کا۔" جملے کے آخر تک آتے آتے اس کے حلق میں آواز جیسے بالکل ہی گھٹ گئی تھی اور آنکھیں ڈر اور خوف سے پھیل گئی تھیں۔

ماہ نور جو بغور اس کی بات سن رہی تھی اس کے خاموش ہونے کے بعد بھی ایسے ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھی تھی جیسے انتظار میں ہو کہ ابھی بلی تھیلے سے باہر نکلے گی۔ لیکن خوش نصیب کے خاموش ہو جانے کے بعد اس کے چہرے پر حیرانی نظر آئی اور جب اسے بات سمجھ میں آئی تو اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ شامیر جن ہے؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔ "لیکن میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ جو شامیر نے کہا ہے کوئی مجھے اس کا مطلب سمجھا دے۔"

"پاگل لڑکی! وہ مذاق کر رہا ہو گا۔" ماہ نور نے اس کے سر پر چپت لگا کر کہا۔ "مذاق کرنا اس کی عادت ہے۔ تمہیں بھی ایسے ہی چڑا رہا ہو گا تم خوامخواہ گھبرا گئیں۔"

"لیکن... کوئی ایسا مذاق کیوں کرے گا۔" وہ الجھ کر بولی۔ "اور پھر وہ کتاب..."

"کتابیں تو عرفات ماموں کے پاس بھی بہت ہیں... تم جا کر دیکھو ان کے پاس بھی ایسی بہت سی کتابیں ہوں گی جن میں بھوتوں کا ذکر ہو گا۔"

"نہیں ماہ نور! تم مانو یا نہ مانو... کوئی نہ کوئی تو گڑبڑ ہے۔"

"اچھا؟ مثلاً "کیا؟"

"یہ مجھے نہیں پتا۔" وہ پرسوچ انداز میں بولی۔ "لیکن میں چند دنوں میں پتا چلالوں گی۔ میرا دل کہہ رہا ہے شامیر وہ نہیں ہے، جو نظر آتا ہے۔"

"ہاں وہ خود کوئی جن بھوت ہو گا یا کوئی عامل اور تانترک۔ جو مؤکل اکٹھے کرتا پھرتا ہے۔" ماہ نور نے اس کا مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

"وہ تو جادوگر بھی ہے۔ کبھی اس کے پاس بیٹھ کر اس کے کرتب دیکھنا۔ اپنی مٹھی میں سکہ بند کر کے سامنے والے کی جیب سے نکالتا ہے۔ بنا دیکھے تاش کا پتا بتا دیتا ہے اور کل تو اس نے چٹکی بجا کر موم بتی بھی جلادی تھی۔ ہو نہ ہو' مؤکل ہی ہوں گی اس کے پاس، جو یہ سب منٹوں میں کر دیتے ہیں۔" وہ ہنستی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

خوش نصیب کی پیشانی پر الجھن آمیز بل پڑ گئے۔ وہ یہ سب بھی کرتا ہے؟ اسے کیوں خبر نہ مل سکی۔

"اب اپنی ننھی سی عقل پر زور ڈالنا بند کرو۔ کھانا لا رہی ہوں میں اور سنو اب دوبارہ نانی کے اوپر مت چڑھ جانا۔"

وہ باہر نکل گئی خوش نصیب جلدی سے دوبارہ نانی کے لحاف میں گھس گئی۔

☆ ☆ ☆

بشام پر ایک خوب صورت صبح طلوع ہوئی تو قبرستان والی چوٹی پر کھڑا معاویہ دکھائی دینے لگا۔ اس نے آج اپنی کالی لیدر جیکٹ پہنی تھی اور سر پر چترالی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ نم ہوائیں کپکپا دینے والی ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی۔

اس کا چہرہ بالخصوص ناک سردی سے لال ہو رہی تھی۔
معاویہ کی پیشانی پر بل پڑے تھے اور آنکھوں میں مایوسی کی لہر تیرتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ گردن جھکائے نیچے دریا کی روانی کو دیکھ رہا تھا۔ بظاہر وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا پر اس کا دماغ فلک بوس کی راہداریوں میں گردش کرتا پھرتا تھا۔
وہ راز جو اس سے کھلتا نہ تھا اور جسے کھولنے کی کنجی بھی فلک بوس کے تہہ خانے میں دبی رہ گئی تھی۔ تو یہ راز اب ایک ذہنی آزار بن کر اس کا سکون برباد کر رہا تھا۔
کافی فاصلے پر وسامہ کی قبر تھی جس کے سرہانے اکڑوں بیٹھی اور کالی چادر میں لپٹی آئے کت قبر پر پھیلے سوکھے پتے اور ٹہنیاں ہٹا رہی تھی۔ وہ نرمی اور سست روی سے یہ کام کر رہی تھی۔ ایسے ہی وہ وسامہ کے بال سہلایا کرتی تھی۔ اس نے ہاتھوں سے ہی قبر کے احاطے کو صاف کیا تھا۔
دور سے ہی اس نے معاویہ کو دیکھا۔ وہ ابھی تک نیچے دیکھ رہا تھا۔ معاً اس کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ کی کرنیں دکھائی دینے لگیں۔ پھر اس نے دایاں ہاتھ جیکٹ کی جیب سے نکالا اور اس کی طرف ہلانے لگا۔
آئے کت نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دعا مانگی' چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے قبر پر الوداعی نگاہیں ڈالیں اور بوجھل قدموں سے چلتی معاویہ کے پاس آ گئی۔ نیچے لب دریا چند مقامی بچے اپنے پالتو جانور چراتے ہوئے آگے جا رہے تھے۔ وہ خوش تھے اور اپنے کھیل میں مگن۔
آئے کت چپ چاپ معاویہ کے ساتھ کھڑی نیچے دیکھنے لگی۔ چند منٹ خاموشی سے سرک گئے۔
"تم نے کیمرے کی ریکارڈنگ چیک کی؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔
"صبح اٹھتے ہی یہی کام کیا تھا۔" معاویہ نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
"کوئی سراغ ملا؟" آئے کت نے دبے دبے سے جوش کے ساتھ پوچھا۔
معاویہ نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلا دی۔ آئے کت کا سارا جوش دھوئیں کا بادل بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔
"میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ اس کوریڈور میں کوئی بھی نہیں تھا۔ تمہیں وہم ہوا ہو گا۔"
"میری آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں آئے کت!"
"وسامہ بھی یہی کہتا تھا۔" آئے کت نے کسی قدر بیزار لہجے میں کہا تھا۔
"واپس چلتے ہیں معاویہ! ہمیں یہاں کوئی سراغ نہیں ملے گا۔ بابا جان صحیح کہہ رہے تھے۔ ہم اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ ہوا کا تعاقب کرنے والے کسی کھائی میں تو گر سکتے ہیں ہوا کو قید نہیں کر سکتے۔ وہ آسیب وسامہ کا وہم تھا یا کوئی حقیقت۔ اصل بات یہ ہے کہ وسامہ کے بعد اب ہم تمہاری جان خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔"
"میں سمجھا نہیں۔" وہ چونک کر بولا۔ "میری جان کو فلک بوس میں کیسے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"
"وسامہ بھی ایک وقت پر تمہاری طرح ہی باتیں کرنے لگا تھا۔ مجھے ڈر ہے وہ آسیب اب تمہارے حواس پر قبضہ نہ جما لے۔" اس نے خائف سر سراتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔
"عجیب باتیں کر رہی ہو۔" وہ چڑ کر بولا۔ "کبھی تم کہتی ہو فلک بوس میں کوئی آسیب نہیں ہے۔ وہ سب وسامہ کا وہم تھا اور کبھی تمہیں میری فکر ہونے لگتی ہے۔"
"تمہاری فکر صرف اس لیے ہوتی ہے کیونکہ وسامہ کو تم سے بہت محبت تھی۔ تمہیں کچھ ہوا تو یقیناً" وسامہ کو تکلیف ہو گی' مرے ہوئے انسان کو کیا تکلیف پہنچانی۔" آئے کت نے تیزی سے اور بیزاری سے کہا تھا لیکن صاف پتا چلتا تھا وہ اپنے ذہن کے کسی خیال کو رد کرنے کے لیے ایسے بول رہی ہے اور اپنے ہی کسی خیال سے تنگ ہو رہی ہے۔

معاویہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور بغور دیکھا۔ کچھ کہنے کا ارادہ کیا' لیکن پھر فوراً" ہی خاموش ہو گیا۔
"میں نے سوچ لیا ہے۔ میں واپس استنبول چلی جاؤں گی۔" آئے گت کہہ رہی تھی۔
"وہاں جا کر کیا کرو گی؟" معاویہ اس کے ارادے پر حیران ہوا۔ "بہن بھائی کوئی ہے نہیں۔ قادر کا کچھ پتا نہیں اور ماں کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ جہاں تمہارا کوئی نہیں ہے' وہاں جا کر اب کیا کرو گی؟"
"میرا تو اب یہاں پر بھی کوئی نہیں ہے۔" آئے گت نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور پلٹ کر واپسی کے رستے پر قدم بڑھا دیے۔
معاویہ چند سیکنڈ اسے دیکھتا رہا پھر اس کے پیچھے چل پڑا۔

☼ ☼ ☼

رات بھر وہ آدھی سوئی آدھی جاگی کیفیت میں کروٹیں بدلتی رہی۔ بار بار کانوں میں نامانوس سی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ کبھی لگتا کوئی چپکے چپکے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اس کا دل حلق میں آکر ٹھہر جاتا کان لگا کر سننے کی کوشش کرتی تو پراسرار خاموشی کی بازگشت رہ جاتی۔ آنکھ لگتی تو آگ اور سیاہی سے بنی شکلیں آکر ڈرانے لگتیں۔ یعنی کل ملا کر سکون اسے رات بھر نصیب نہ ہو سکا۔
فجر کی اذان کے وقت جا کر دل کو ذرا تسلی ہوئی تو ذہن بھی نیند کی وادی میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر روشن امی اور ماہ نور نے بہتیری آوازیں دیں لیکن وہ تو مردوں سے شرط لگا کر سوئی تھی۔ کسمسائی بھی نہیں۔ دن چڑھے کہیں جا کر آنکھ کھلی' وقت دیکھا تو گیارہ بجے تھے۔ بے اختیار اس نے ماتھے پہ ہاتھ مارا کیونکہ جانتی تھی اب روشن امی سے نماز کے لیے نہ اٹھنے پر ڈانٹ پڑے گی۔ لیکن خیر آنکھیں مسلتی نیچے آگئی۔ روشن امی اپنے ہیڈ کوارٹر مطلب کچن میں موجود تھیں' ماہ نور غالباً "جا چکی تھی۔
"ہو گئی تمہاری صبح؟" اسے دیکھتے ہی روشن امی نے کہا۔
"نماز کے لیے تو اٹھا کرو خوش نصیب!" انہوں نے سرزنش کی تو وہ آنکھیں مسلتے ہوئے بولی۔
"روز تو اٹھتی ہوں روشن امی! کل رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ صبح جا کر کہیں آنکھ لگی تھی۔"
"اچھا تو اب قضا ہی پڑھ لو۔"
"ہوں۔۔۔ پڑھتی ہوں۔" وہ سست سی ہو رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر پانی پینے لگی۔
"میں سوچ رہی ہوں تمہیں یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہی دلوا دوں۔ گھر میں بیٹھ کر مکھیاں مارنے سے بہتر ہے آگے پڑھ ہی لو۔" روشن امی کہہ رہی تھیں۔
"جب میں نے کہا تھا تو آپ راضی نہیں تھیں۔ اب تو پورا سال بھی ضائع ہو گیا میرا۔"
"اس وقت ہاتھ تنگ تھا۔ تمہارے ابا کے حصے کی دکانیں کرائے پر چڑھ گئی ہیں' سوچ رہی ہوں اشفاق بھائی صاحب سے بات کروں۔ ان دکانوں کا کرایہ ہمیں دے دیا کریں تو وہ کرایہ تمہاری پڑھائی کی مد میں خرچ کر لیں گے۔" وہ خاصی خوش امید نظر آ رہی تھیں اور ان کا خیال تھا ہر وقت اپنا حق مارے جانے کا رونا رونے والی خوش نصیب کم سے کم یہ سن کر بہت خوش ہو گی۔
"ابھی آپ بات کریں گی اور تایا جان مانیں گے یا نہیں' اس بات کی گارنٹی کون دے سکتا ہے۔"
اس کے جواب میں مایوسی جھلکتی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ کہتی کہ کرائے کے پیسے لڑ جھگڑ کر حاصل کرے گی اور روشن آرا کو بھی اکسائی' لیکن اس بار اس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا اور یہی بات روشن آرا کو چونکا گئی تھی۔
"اتنی چپ چپ کیوں ہو؟ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟"

"میں ایک بات سوچ رہی تھی روشن امی!" اس نے میز کی سطح کھرچتے ہوئے جواب دیا۔
"کون سی بات؟"
"یہی کہ۔" اس نے جان بوجھ کر جملے کو لمبا کیا کیونکہ تذبذب کا شکار تھی اور بیوقوفی میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ "یہی کہ جن، بھوت دنیا میں کہیں ہوتے بھی ہیں یا نہیں؟"
"اب یہ بیٹھے بٹھائے جنوں بھوتوں کی یاد کہاں سے آ گئی؟"
چولہے پر رکھے پتیلے میں پیاز براؤن ہو چکی تھی روشن امی نے کٹے ہوئے لہسن میں پانی ملا کر پیاز پر ڈالا تو تڑکے کی تیز مزے دار خوشبو اور تیز۔ آواز سارے کچن میں پھیل گئی۔
"وہ دراصل رات میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا اسی لیے پوچھ رہی تھی۔" اس نے بات بتائی۔
"آیت الکرسی اور رات کو سونے کی دعا پڑھ کر نہیں سوئی تھیں؟"
خوش نصیب نے بے اختیار سر کھجایا۔
"سمجھ گئی بھول گئی تھیں ناں؟ پتا نہیں تم کب ہوش مندی سے کام کرنا شروع کرو گی۔" روشن امی نے حسب عادت سرزنش بھی کر ڈالی تھی۔
"اچھا۔ جنوں کا تو بتائیں ناں۔"
"جس چیز کا قرآن پاک میں ذکر ہے، اس سے ہم کیسے انکار کر سکتے ہیں۔"
"لیکن روشن امی۔!" اس نے پر سوچ انداز میں کہنا شروع کیا لیکن اسی وقت پچھلے دروازے سے شامیر اور عرفات ماموں کچن میں داخل ہوئے۔
"کس چیز کا قرآن میں ذکر ہے؟" عرفات ماموں نے بس اتنا ہی سنا تھا سو آتے ہی سوال کیا۔
شامیر اور خوش نصیب کی آنکھیں ملیں۔ شامیر کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ خوش نصیب نے سٹپٹا کر آنکھیں پھیر لیں۔
"یہ کہ جن، بھوت کا وجود دنیا میں ہے یا نہیں۔" روشن امی نے انہیں بتایا۔ "خوش نصیب نے رات کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے اب اسی کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔"
"خوش نصیب اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ڈر جاتی ہے؟ میں تو سمجھا یہ بہادر لڑکی ہے۔" شامیر نے اس کے عین سامنے والی کرسی گھسیٹتے ہوئے اور اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
عرفات ماموں پھلوں کی باسکٹ سے ایک صحت مند سیب نکال کر اب چھری لینے شیلف تک چلے گئے تھے۔ روشن امی پہلے ہی اپنے کھانے کی طرف متوجہ تھیں۔ ان دونوں کی طرف کسی کا بھی دھیان نہیں تھا۔
"ہماری خوش نصیب تمہاری سوچ سے بھی زیادہ بہادر ہے۔" عرفات ماموں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور آکر دوسری کرسی پر بیٹھ گئے۔ ساتھ ہی پلیٹ چھری اور سیب خوش نصیب کی طرف بڑھا دیا۔
"یہ کاٹ دو۔" اور خوش نصیب جو وہاں سے کھسکنے کے لیے پر تول رہی تھی ناچار اسے بیٹھنا پڑا۔
"روشن کی بات بالکل درست ہے۔ جب قرآن پاک میں اللہ پاک نے فرما دیا کہ اس نے ناری مخلوق پیدا کی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے جھٹلا نہیں سکتی۔ سب سے بڑی بات شیطان بھی ایک جن ہی تھا فرشتہ نہیں تھا۔" عرفات ماموں نے بات جاری رکھی۔
"لیکن میں نہیں مانتی۔" خوش نصیب نے نظریں جھکائے سیب کاٹتے ہوئے کہا' دراصل وہ شامیر پر ثابت کرنا چاہتی تھی کہ وہ ڈرتی نہیں ہے۔ خود کو بہادر ثابت کروانا جیسے اس کی عزت نفس کا معاملہ بن گیا تھا۔

"کیا جن بھوتوں کو کسی نے دیکھا ہے؟ اس بارے میں صرف مفروضے ہی بیان کیے جاتے ہیں۔"
"قرآن سے جنوں کی موجودگی واضح ہے۔" شامیر نے کن انکھیوں سے خوش نصیب کو دیکھتے ہوئے کہا تھا "لیکن میں اس مخلوق پر یقین نہیں رکھتا۔" خوش نصیب نے چونک کر شامیر کو دیکھا۔ کل جو کچھ اس نے کہا آج کی بات اس سے سو فیصد مختلف تھی۔
"اچھا۔" عرفات ماموں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔
"مجھے لگتا ہے تم سے اس موضوع پر ایک صحت مندانہ بحث ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مجھے اس موضوع میں کافی دلچسپی رہی ہے۔ خصوصاً "حیات بعد الموت پر کافی کچھ پڑھ رکھا ہے۔ میں نے سنا ہے روحوں جنوں اور فرشتوں کا ٹھکانہ cosmic world (عالم اثیر) ہے۔ روحیں اسی دنیا سے آتی ہیں اور وہیں واپس جائیں گی۔"
"ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن مجھے قائل کرنا مشکل ہے۔" شامیر نے دوٹوک کہا۔ "میں ہر چیز کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھنے کا عادی ہوں اور جو چیز یا بات سائنٹیفک لی ثابت نہیں ہو سکتی میں اس پر یقین نہیں کر سکتا۔" وہ دوٹوک کہہ رہا تھا۔
"اگر ایسی بات ہے تو ہم اسے سائنٹیفک لی ثابت کیے دیتے ہیں۔" عرفات ماموں نے مسکرا کر کہا تھا جواباً شامیر بھی مسکرایا اور ہاتھ سے انہیں اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو پلیز شروع کریں۔
"اگر آپ میرے خیالات بدل دیں مجھے خوشی ہوگی۔" وہ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ خوش نصیب بھی دلچسپی سے ان کی بات سننے لگی۔
"روح ایک ابدی حقیقت ہے لیکن جن یا موکل ایسی مخلوق ہیں جن سے بہت روایتیں جڑی ہوئی ہیں۔ لوگ ان کے وجود کا انکار بھی کرتے ہیں اور اقرار بھی۔"
"دیکھو ہم انسان جن کیمیاوی مادوں سے مل کر بنے ہیں پوری کائنات کو بنانے کے لیے وہی ایٹم، گیس اور عناصر استعمال کیے گئے ہیں۔ پھر ہم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ صرف دنیا نامی اس سیارے پر ہی زندگی کی تخلیق ممکن ہوئی ہوگی۔ زمین کی تمام زندہ مخلوقات ایک قسم کے ایٹموں سے مل کر بنی ہیں ایک ہی قسم کی کیمیاوی تبدیلیوں کے دور سے گزرتی ہیں اور انرجی حاصل کرنے اور خارج کرنے کے لیے ایک سے ذرائع استعمال کرتی ہیں ممکن ہے اس کائنات میں کسی اور سیارے پر زندگی کے سروائیول کا فارمولا کچھ اور ہو۔"
"میں کچھ سمجھا نہیں۔ ذرا تفصیل سے بتائیے۔" شامیر نے کہا۔
عرفات ماموں نے تھوڑا توقف کیا اور بولے۔
"رکو۔ میں سمجھاتا ہوں۔" انہوں نے داہنی ٹانگ بائیں پر منتقل کی اور کہنے لگے۔
"میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا اور ہم سب بھی جانتے ہیں کہ زمین پر آکسیجن کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن ہم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جہاں آکسیجن نہیں ہے وہاں زندگی کا نام و نشان بھی نہیں ہوگا۔ آکسیجن کے حصول کے سب سے بڑے ذرائع پودے، درخت اور سبزہ ہیں۔ لیکن ایک وقت تھا زمین پر پھول پودے بھی نہیں تھے۔ لیکن اس وقت بھی ایسی مخلوقات موجود تھیں جو آکسیجن کے بغیر زندہ رہ سکتی تھیں۔ تو جب ایسی مخلوق اسی دنیا میں موجود ہے جو اپنی زندگی کے سروائیول کے لیے آکسیجن کی محتاج نہیں ہے۔ تو کسی دوسرے سیارے پر کسی دوسری مخلوق کے پیدا ہونے کے چانسز کو ہم کیسے اگنور کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے وہ سیارہ مریخ ہو، زحل یا کوئی اور سیارہ ہو۔" انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔
"مریخ پر زندگی کا کوئی چانس نہیں ہے۔" شامیر نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ "وہاں اتنی ٹھنڈ ہے کہ کسی قسم کی زندگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"جس مخلوق کی تخلیق ہی آگ سے کی گئی ہے اسے ٹھنڈ سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔" عرفات ماموں نے مسکرا کر کہا اور گیند جیسے اپنے کورٹ میں ڈالی۔
"ویسے بھی سائنس کہتی ہے کائنات میں زندگی کئی شکلوں میں پیدا ہو سکتی ہے۔ عین ممکن ہے زندگی کا ایک چہرہ یا لباس وہ ہو جو ہمیں جن، بھوت، پری یا فرشتوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔" عرفات ماموں اپنی بات پر مصر تھے۔
"لیکن اس سے ثابت ہوتا ہے، جنوں کی دنیا کوئی اور ہے۔" خوش نصیب نے بے ساختہ کہا۔ "ہماری دنیا میں ان کا کیا کام؟"
"بالکل۔" روشن امی نے بھی کہا۔
"اماں کہا کرتی تھیں، جنوں، بھوتوں کی الگ دنیا ہوتی ہے۔ جیسے انسانوں کو ان کی دنیا میں مداخلت کی اجازت نہیں ہے ویسے ہی جنوں کو انسانوں کی دنیا میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔"
"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ آنٹی!" شامیر نے اپنی خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ بحث سمیٹی۔ پھر اس نے عرفات ماموں کی طرف دیکھا اور کہا۔
"میں آپ کی بات مان لیتا ہوں کہ جن بھوت کا وجود ہوتا ہے لیکن اس بات کو بھی ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان کی دنیا میں مداخلت کیے بغیر وہ ہماری دنیا کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"
وہ اتنا پر اعتماد نظر آ رہا تھا کہ خوش نصیب اسے دیکھ کر رہ گئی۔ پتا نہیں اس کا کون سا چہرہ اصلی تھا وہ جو کل رات اسے دکھائی دیا یا یہ جواب نار (آگ) مخلوق کے وجود سے ہی انکاری نظر آ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں لیکن خوش نصیب کو ایسا لگا جیسے وہ کسی بڑی مشکل میں پھنسنے والی ہے۔ اس وقت سب کے درمیان بیٹھے اس نے تہیہ کیا وہ دوبارہ شامیر کی باتوں میں نہیں آئے گی۔ اچھے مستقبل کے حصول کا یہ طریقہ جو خوش نصیب اختیار کرنے جا رہی تھی۔ وہ اپنے پورے کلیجے سمیت ناکام ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

قبرستان سے واپسی پر وہ سیدھا فلک بوس آنے کے بجائے وادی میں پھرتے رہے اور وادی کی مارکیٹ میں بے سبب دکانیں چھانتے ہوئے انہوں نے کچھ وقت گزارا۔ ایسے پھرتے ہوئے ان دونوں کے ہی ذہن میں وہ تمام باتیں گونجنے لگیں بجن کے بارے میں پتا چلا تھا وادی میں ان دونوں کے بارے میں کی جا رہی ہیں۔ معاویہ کو تو خیر ان باتوں کی زیادہ پروا نہیں تھی سو اس نے سر جھٹک کر ان خیالات کو رفع کر دیا۔ آئے کت البتہ محتاط ہو چکی تھی۔ اس نے معاویہ سے کہا۔
"ہمیں واپس چلنا چاہیے۔۔۔ ایسا نہ ہو پھر کسی کو کچھ کہنے کا موقع مل جائے۔"
"کیا مطلب؟ کیسی باتیں؟" وہ سمجھ گیا تھا لیکن پھر بھی لاتعلقی سے پوچھا۔
"وہی جو۔۔۔ ماما جان کہہ رہی تھیں۔" وہ جھجک کر بولی۔ "ہم لوگوں کے ذہنوں کو سوچنے اور زبانوں کو باتیں بنانے سے نہیں روک سکتے۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ ماما جان اور بابا کو تکلیف نہ پہنچے۔ وہ دونوں شاید عدت پوری نہ کرنے پر مجھ سے ناراض بھی ہیں۔" اس نے آنکھیں چراتے ہوئے کہا تھا۔
معاویہ نے اسے دیکھا اور ایک گہری سانس بھر کر اس کی ساری احتیاط پسندی کو ہوا میں اڑا دیا۔
یخ ہوا کہیں سے بادلوں کے ٹکڑے اڑا لائی تھی اور ہوا کے ہی زور سے بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ معاویہ نے اپنی جیکٹ کے کالر کی زپ کھول کر کالر کو کانوں تک چڑھا لیا۔ آئے کت نے چھتری کھول کر سر پر تان لی لیکن

سردی کی شدت سے اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ اسے دیکھ کر ایک ٹی اسٹال پر معاویہ چائے پینے بیٹھ گیا۔
"بارش کو رک جانے دو۔ پھر چلتے ہیں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔
آئے کت جلد از جلد واپس جا کر اپنا سامان سمیٹنا چاہتی تھی لیکن ناچار اسے رکنا پڑا۔ معاویہ اتنا ضدی تھا کہ اس کی نہ کو ہاں میں بدلا ہی نہیں جا سکتا تھا۔
ٹی اسٹال ایک چھوٹی سی دکان کے اندر بنا ہوا تھا۔ دکان کے مالک نے انہیں بیٹھنے کے لیے لکڑی کا بینچ فراہم کیا اور گرما گرم چائے کی بھاپ اڑاتی پیالیاں پیش کیں' ساتھ میں بسکٹ جیسے کچھ لوازمات کی پلیٹ وہ لے کر آیا ان پر سفید تل لگے ہوئے تھے اور ان کی خوشبو اتنی دلفریب تھی کہ وہ دونوں کھانے سے انکار کر ہی نہیں سکے۔ وہ دونوں چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے باہر دیکھنے لگے۔ بارش موتیوں کی طرح برس رہی تھی۔ ڈھلوانی سڑک بھیگ کر اپنا اصل رنگ کھو چکی تھی اور صبح کی تروتازہ روشنیوں کو بادلوں کے مٹیالے پن نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔
کچھ دیر میں بادل گرجنے لگے اور بجلی کی کڑک سے بشام گونج اٹھا۔
"مجھے لگ رہا ہے۔ استنبول جانے کا تمہارا فیصلہ غلط ہے۔" بہت دیر خاموش رہنے کے بعد معاویہ نے خاموشی کے اس حصار کو توڑا' جو ان دونوں کو بار بار اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ لیکن اس نے اپنی آواز بے حد دھیمی رکھی کیونکہ دکان کے اندر ان دونوں کے علاوہ بھی چند لوگ موجود تھے جو اس بے وقتی بارش سے پناہ لے کر وہاں آگئے تھے۔ اور آپس میں باتیں کرتے' سردی سے ہاتھ آپس میں رگڑتے بارش کو دیکھ رہے تھے۔ ان سب کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔
آئے کت نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
"میں یہاں رہ کر بھی کیا کروں گی معاویہ! وسامہ تھا تو میری ہر خوشی اسی سرزمین سے جڑی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اب۔" وہ پھر سے باہر دیکھنے لگی۔ "سچ کہوں تو ایک آخری سہارا یہ بچہ ہی ہے۔ ورنہ وسامہ کے بعد تو زندہ رہنے کی کوئی لاجک ہی نہ بچتی میرے پاس۔" وہ بہت دکھی ہو کر کہہ رہی تھی۔
"پھر تم ڈلیوری کے بعد چلی جانا۔۔۔ اکیلے جا کر تمہیں دقت ہوگی۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔
"تم بات نہیں سمجھے' زندہ رہنے کی لاجک ہے میرے پاس۔ لیکن زندگی گزارنے کے اسباب تو مجھے خود بنانے ہوں گے۔ اپنا اور اس بچے کا پیٹ بھرنے کے لیے پیسہ کمانا ہے' گھر تلاش کرنا ہے۔ اور یہ سب کام جتنی جلدی شروع کر لوں اتنا ہی بہتر ہوگا۔"
"تم ان سب چیزوں کی کیوں فکر کر رہی ہو۔" معاویہ نے جھنجلا کر خالی پیالی میز پر رکھی۔ "جب تک میں ہوں تمہیں کسی چیز کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"میں تمہارا احسان نہیں لینا چاہتی۔" اس نے دوٹوک کہا۔
"یہ احسان نہیں ہے۔ وسامہ کے بعد تم میری ذمہ داری ہو اور میں یہ ذمہ داری آخری دم تک نبھاؤں گا۔" وہ چھوٹا سا لڑکا بہت بڑی بات بول رہا تھا۔ آئے کت نے ماتھے پر بل ڈال کر اسے دیکھا اور سمجھنے کی کوشش کی کہ اس کی بات کا کیا مطلب ہے۔
"اور یہ ذمہ داری تمہیں کس نے سونپی ہے؟"
"وسامہ نے۔" اس نے ترنت کہا۔ آئے کت چپ سی رہ گئی۔ پھر اس نے کہا۔
"وسامہ نے جذباتیت میں ایک بات کہہ دی ہوگی۔ لیکن میں تم پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔ میں چاہتی ہوں تم بے فکری سے اپنی زندگی جیو اور۔۔۔ اور میرے معاملات میں دخل دینا چھوڑ دو۔" وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر کی طرف بڑھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

معاویہ پہلے حیران ہوا پھر لپک کراس کے پیچھے آیا۔
"ابھی بارش رکی نہیں ہے تم کہاں جا رہی ہو؟"
"بارش ہلکی ہو گئی ہے۔ لیکن بادلوں کو دیکھ کر لگتا ہے ابھی تھوڑی دیر میں دوبارہ تیز بارش شروع ہو جائے گی۔ اس سے پہلے میں فلک بوس پہنچنا چاہتی ہوں۔" اس نے ہاتھ باہر نکال کر چھتری کھولی سر پر تانی اور سڑک کی چڑھائی پر مضبوطی اور احتیاط سے قدم رکھنے لگی۔
معاویہ نے جھنجلا کر اس کی عقل کو جس نے ایسے موسم میں بنا سوچے سمجھے اسے باہر نکلنے کا مشورہ دیا تھا۔ سات سلام بھیجے اور بنگلے کی طرف گردن کندھوں میں دھنسا کر اس کے پیچھے چل پڑا۔

☆ ☆ ☆

ذرا دن سہ پہر ڈھلے وہ فریحہ کی طرف چلی آئی۔ ذہن پر اتنا بوجھ تھا کہ وہ اس کیفیت سے جان نہیں چھڑا پا رہی تھی۔ لیکن یہاں آکر پتا چلا فریحہ کچھ روز کے لیے اپنے آبائی گاؤں گئی ہوئی تھی۔ خوش نصیب منہ بنا کر باہر نکل آئی۔
اب کس سے بات کرے؟ چالاک تھی، ہوشیار تھی (بقول اس کے) کالی زبان والی تھی لیکن تھی تو انسان اور دیگر انسانوں کی طرح دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اسے بھی کسی انسان کی ہی ضرورت تھی، جو بیٹھ کر اس کی بات سنے۔
بے ساختہ اسے کیف یاد آنے لگا۔ وہ چڑاتا تھا تنگ کرتا تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جب خوش نصیب کی سننے کے لیے کوئی موجود نہیں ہوتا تھا تب بھی کیف موجود رہتا تھا۔ وہ اس کی بات نہ صرف سنتا تھا بلکہ باتوں ہی باتوں میں اس کی برین واشنگ بھی کر دیتا تھا بالکل ایسے جیسے کوئی ماہر نفسیات اپنی باتوں سے مریض کو ہلکا پھلکا کر دیتا ہے اور بچپن کی دشمنی کے زیر اثر خوش نصیب نے کبھی منہ سے یہ بات تسلیم نہیں کی مگر دل سے وہ کیف کی اس صلاحیت کی معترف تھی۔
ایسے ہی بے زار بے زار سی وہ فضل منزل کی طرف چلی جا رہی تھی کہ کالی اوڈی نے اس کا راستہ روک لیا۔ خوش نصیب نے دیکھا اسٹیئرنگ سنبھالے شامیر مسکرا رہا تھا۔ پھر وہ ایسے ہی مسکراتا ہوا اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اترا اور خوش نصیب کے لیے دروازہ کھول دیا۔
"بیٹھو۔"
متذبذب سی خوش نصیب دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ "نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں۔"
"بیٹھ جاؤ خوش نصیب! اتنا سوچنے کی کیا بات ہے۔" وہ حیران ہوا۔ "ویسے بھی سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ ایسے بیچ راستے میں کھڑے رہنا مناسب نہیں لگتا۔"
خوش نصیب نے ادھر ادھر دیکھا۔ ذرا دیر سوچا پھر خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔
شامیر نے اپنی سیٹ سنبھال کر ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیا۔
"تم ڈر گئی ہو۔۔۔؟"
"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔
"دیکھو خوش نصیب! ہم سب کی زندگیوں میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں ضرور ہوتی ہیں جنہیں ہم سب سے چھپا کر رکھنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ہر راز ہم ہر ایک کے سامنے تو نہیں کھول سکتے۔ لیکن تم میری زندگی میں خاص جگہ رکھتی ہو مجھے لگا میرے سیکرٹس، میرے انٹرسٹس تمہیں پتا ہونے چاہئیں۔۔۔ اور چونکہ میں خود تمہارے ساتھ اتنا honest (ایمان دار) ہوں تو میں ایسی ہی honesty (ایمان داری) کی امید تم سے بھی رکھتا ہوں۔ محبت اتنا حق تو دو افراد کو ضرور دیتی ہے کہ وہ اپنا ہر راز ایک دوسرے سے شیئر کریں۔" وہ گاڑی چلاتے ہوئے بہت سنجیدگی سے بول

رہا تھا۔

"ایک منٹ ایک منٹ۔۔۔" خوش نصیب ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"کون دو افراد؟ کس کی محبت؟ دیکھو شامیر! تمہیں کوئی بہت ہی بڑی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں نے دو بار ہنس کر تم سے بات کیا کر لی، تم نے پتا نہیں کیا کیا فرض کر لیا۔ دیکھو میں ایسی ہی ہوں۔ ہر ایک سے ہنس کر بات کر لیتی ہوں اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تم مجھے اپنی محبت میں مبتلا سمجھو۔" اس نے ایک منٹ میں فیصلہ کیا کہ شامیر کو ہر طرح کی خوش فہمی سے نکال باہر کیا جائے۔

اب ہکا بکا ہونے کی باری شامیر کی تھی۔

"کک۔۔۔ کیا؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟" اس کی شخصیت کے سارے رنگ آگ پر رکھی موم کی طرح پگھلتے چلے گئے تھے اور اس وقت وہ انگلش فلموں کا ہیرو کم پنجابی فلموں کا وہ مخولو دوست لگنے لگا تھا جس کے گول چہرے کو کیمو فریم میں رکھ کر سب سے زیادہ مزاحیہ سین فلم بند کیے جاتے ہیں۔

"بب' بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔" اس نے سخت سے تاثرات بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور جان بوجھ کر شامیر کی طرف سے نظریں پھیریں مبادا اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اپنے خیالات بدل ہی نہ دے۔

"تم ہمارے مہمان ہو اور مہمانوں کے ساتھ ہم ایسے ہی دوستانہ انداز میں پیش آتے ہیں۔ ذات کے راجپوت ہیں۔ مہمان نوازی تو سمجھو ختم ہے ہم پر۔" گردن اکڑا اور اترا کر بولی۔ شامیر چپ چاپ سامنے دیکھنے لگا لیکن اس کا چہرہ ایسے غم کی داستان سنا رہا تھا جس نے اس کی ساری شخصیت کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیا ہو۔

خوش نصیب نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا اور آنسہ ہوشیار کا دل پسیج کر رہ گیا۔ بڑا ہی دکھ ہوا اسے شامیر کو اداس دیکھ کر۔

"دیکھو شامیر! آئم سوری اگر تم ہرٹ ہوئے ہو تو۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن سچ یہی ہے کہ میرے دل میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تو صرف صیام اور فضیلہ چچی کو چڑانے کے لیے تمہارے ساتھ کچھ زیادہ فرینک ہو کے بات کر رہی تھی۔" اس نے کہہ تو دیا لیکن ڈرتے ڈرتے۔ کیونکہ دل سے جانتی تھی اس نے غلط کہا ہے۔

شامیر سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کا وہ حال تھا جیسے سمجھ ہی نہ پا رہا ہو اب کیا کہے اور کیا نہیں۔

"مجھے پتا ہے میں نے تمہیں ہرٹ کیا ہے۔۔۔ لیکن۔"

"پلیز اب کچھ مت کہو۔" شامیر نے بوجھل آواز میں منت سے کہا اور گیئر بدلتے ہوئے بولا۔

"یہ صدمہ بہت شدید ہے۔۔۔ مجھے سنبھلنے میں کچھ وقت لگے گا۔"

"شامیر! میں تو۔"

"پلیز خوش نصیب! میں نے تم سے کہا نا اب کچھ مت کہو۔" اس نے اس بار جھنجلا کے کہا تھا۔ "میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم میری فیلنگز کے ساتھ کھیل رہی ہو۔"

"اللہ معافی۔۔۔ میں کیوں کھیلوں گی؟ مجھے تو ویسے ہی گیمز میں دلچسپی نہیں ہے۔" وہ دل ہی دل میں منمنائی تھی۔

"برا کیا ہے تم نے۔۔۔ بہت ہی برا۔" وہ جیسے روانکھا ہی ہو گیا تھا۔

"زندگی میں پہلی بار کسی کو میں نے اپنے راز میں شریک کیا تھا' مجھے لگا صرف تم ہو جو مجھے سمجھ سکتی ہو اور تم۔" وہ جذباتی ہو رہا تھا۔

"راز؟" اسے یاد آیا۔ "وہ جنات والا؟"

شامیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کوئی نہیں جانتا کہ میرے پاس موکل ہیں۔ میں غیر انسانی مخلوق سے نہ صرف بات کر سکتا ہوں بلکہ ان کے ذریعے کوئی بھی کام کروا سکتا ہوں۔" وہ بولتا جا رہا تھا اور خوش نصیب کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا اور ڈر کے مارے اس کی آنکھیں بھی پھیل رہی تھیں۔

"یہ ایسا راز ہے، جس سے میرے انتہائی قریبی لوگ بھی واقف نہیں ہیں حتیٰ کہ میرے پیرنٹس بھی نہیں۔"

"اور یہ، یہ موکل تمہیں ملے کہاں؟" خوش نصیب کی آواز حلق میں ہی گھٹ رہی تھی۔

"میری پاپا ایک پیر صاحب کی پیروکار رہ چکی ہیں۔ بچپن میں وہ مجھے ہر جمعرات کو لے کر پیر صاحب کے آستانے پر جایا کرتی تھیں۔"

"تم تو ساری زندگی یورپین کنٹریز میں رہے ہو۔ وہاں بھی کیا پیر اور ان کے آستانے ہوتے ہیں؟"

"بہت زیادہ۔" شامیر نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ "پاکستانی اور انڈین نژاد، پیروں فقیروں کو بہت مانتے ہیں اور ان کا بہت احترام بھی کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں پر ایسے آستانے نہیں بنے ہوئے جیسے میں یہاں پاکستان میں دیکھ چکا ہوں۔ خیر ان ہی پیر صاحب کی دعا کے طفیل وہ موکل یا جن کہہ لو میرا دوست بن گیا۔ اس کا نام جبار ہے اور وہ بیشتر وقت میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس وقت بھی وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔" اتنا کہنے کی دیر تھی کہ گاڑی کی چھت خوش نصیب کے سر پر آن گری۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حلق میں سانس اٹک گئی اور دل تیز گام کی رفتار سے دوڑنے لگا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے بدقت گردن موڑ کر پیچھے دیکھا لیکن یہ کیا۔ وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ پوری کی پوری سیٹ خالی پڑی تھی۔

خوش نصیب کی ذرا جان میں جان آئی۔

"لیکن پیچھے تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"جبار ہر ایک کو نظر نہیں آتا۔" شامیر نے ایک بار پھر آرام سے کہا اور ایک بار پھر خوش نصیب کا ڈر کے مارے برا حال ہو گیا۔

"پپ، پلیز شامیر! گاڑی روک دو۔ مم میں اترنا چاہتی ہوں۔" خوف کے مارے کانپتے دل اور لڑکھڑاتی زبان کے ساتھ اس نے التجا کی۔

"کیا تم ڈر رہی ہو؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا پھر بولا۔ "پریشان مت ہو میرے دوستوں کو جبار کچھ نہیں کہتا۔"

"نن نہیں.... تم پلیز گاڑی روک دو۔" وہ بضد تھی۔ خدا جانے، جو نظر نہیں آ رہا تھا وہ پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اس کا گلا ہی دبا دیتا۔ جو نظر آئے کم سے کم انسان اس کی طرف سے محتاط تو رہتا ہے۔

"اچھا ایک منٹ۔" اس نے گاڑی روک دی۔

"جبار! خوش نصیب کو ڈر لگ رہا ہے۔ تم پلیز گاڑی سے اتر جاؤ۔" شامیر نے پیچھے گردن موڑ کر کہا اور اگلا لمحہ خوش نصیب کے لیے اور بھی تعجب خیز تھا۔ اس کی آنکھیں ایک بار پھر کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں کیونکہ شامیر کی بات کے فوراً بعد گاڑی کا پچھلا دروازہ خود بخود کھل گیا تھا۔ چند سیکنڈ کا توقف ہوا اور پھر دروازہ باہر سے دھکیل کر بند کر دیا گیا۔ اس سارے عمل کے دوران نہ کوئی ٹھوس وجود خوش نصیب کو دکھائی دیا تھا نہ اس کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔

شامیر نے مڑ کر دوبارہ اسٹیئرنگ سنبھالا اور کھڑکی سے منہ نکال کر جبار سے بولا۔

"سنو! تم سیدھے فضل منزل چلے جاؤ اور خوش نصیب کے تایا جان سے بات کر کے اس کا مسئلہ حل کروا دو۔"

ساتھ ہی گاڑی سے باہر اس نے کسی کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ بھی کہا تھا۔
خوش نصیب ہونقوں کی طرح منہ کھولے کبھی شامیر کو تو کبھی گاڑی سے باہر اس نادیدہ مخلوق کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی جس کا نام جبار تھا اور خدا ہی جانے وہ تھا بھی یا نہیں تھا۔ گاڑی جوں ہی آگے بڑھی اس نے بدقت تھوک نگل کر اپنا خشک ہوتا حلق تر کیا اور سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اگرچند منٹ کے لیے یہ تصور کر لیا جائے کہ شامیر کی باتوں میں صداقت تھی تو سچ بات تو یہی ہے بھائی! کہ شامیر ایک خطرناک انسان تھا۔ اور خوش نصیب کو بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ غلط بندے سے پنگا لے بیٹھی ہے۔ اگر اس کی جگہ کیف ہوتا تو کوک کے ساتھ شامی کباب والا برگر کھا کر بھی راضی ہو جاتا۔ بیچارہ معصوم لڑکا۔
لیکن ایک منٹ۔ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ شامیر سچ ہی بول رہا تھا۔ یکایک خوش نصیب کو اپنے بونگے پن کا احساس ہوا اور وہ گردن اکڑا کر بیٹھ گئی۔
"میں سمجھ گئی۔" اس نے کہا "تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔"
وہ دنگ رہ گیا۔ "میں تمہیں کیوں بے وقوف بناؤں گا؟"
"یہ مجھے نہیں پتا۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی تھی۔ ضدی ہٹ دھرم بلا کا پُراعتماد لہجہ۔
"لیکن اتنا بتا دوں تم مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہاں البتہ یہ کوشش صیام کے ساتھ کی ہوتی تو کامیابی ضرور تمہارے قدم چوم سکتی تھی۔"
"میں تمہیں کیوں بے وقوف بناؤں گا۔ محبت نہیں کرنی مت کرو۔ کم سے کم میری فیلنگز کو جھوٹا تو مت کہو۔" وہ برا منا کر بولا تھا۔
"میں تمہاری فیلنگز کو کچھ نہیں کہہ رہی میں تو اس جبار نامی ڈرامے کی بات کر رہی ہوں۔" تنک کر بولی تھی۔
"میں نہیں مانتی تمہارے پاس کوئی جن وِن ہو سکتا ہے۔ یہ سب دھوکا ہے۔ محض نظر کا دھوکا۔" وہ بضد تھی۔
شامیر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔
"دھوکا، نظروں کا ہیر پھیر؟ ابھی جب جبار جا کر تمہارے تایا کو راضی کرے گا کہ تمہارے ابا کی دکانوں کا کرایہ تمہیں دیا کرے تو تمہیں جبار کی حقیقت کا علم ہو جائے گا۔"
ایک بار پھر خوش نصیب کے سر پر آسمان گرا۔
"تمہیں یہ کرائے والی بات کیسے پتا چلی؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔
"جبار مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔" شامیر نے کہا۔ "ان فیکٹ مجھے تو جبار نے یہ بات بھی پہلے ہی بتا دی تھی کہ تم نے مجھ پر تعویذ کروائے ہیں۔ لیکن جب صیام نے بتایا تو میں نے کھل کے یہ بات کر کے تمہیں شرمندہ کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔"
خوش نصیب تھوڑی سی دیر کے لیے شرمندہ ہوئی پھر ہٹ دھرمی سے بولی۔
"میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"
"جو مرضی سمجھو۔ لیکن اگلے کچھ روز کے لیے میں نے جبار کی ڈیوٹی لگا دی ہے وہ تمہاری پرابلمز سولو کرواتا رہے گا۔"
خوش نصیبی نے ایسے سر جھٹکا جیسے کہہ رہی ہو "مجھے ابھی بھی یقین نہیں آیا۔"
"ہمارے پرابلمز تو ہمیشہ سے ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں حل نہیں کرا سکتی۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

بارش کی وجہ سے سڑک پر پیر جمانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ چار قدم آگے بڑھتے تو لگتا دو قدم پیچھے پھسل رہے ہیں۔

فلک بوس سے ذرا پہلے معاویہ نے ایک ذیلی پگڈنڈی کی طرف رخ موڑ لیا۔ ایک طرف کھائیاں تو دوسری طرف یہاں درختوں اور خود رو جھاڑیوں کی بھرمار تھی۔ دور دور تک ان دونوں کے سوا کوئی ذی روح دکھائی نہ دیتا تھا۔

"یہ شارٹ کٹ ہے ہم جلدی پہنچ جائیں گے۔" اس نے آگے بڑھ کر آئے کت کی رہنمائی کرتے ہوئے کہا۔ اور قدم آگے بڑھا دیے۔ چند قدم آگے جا کر احساس ہوا وہ اکیلا ہی آگے بڑھ رہا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو آئے کت وہیں متذبذب سی کھڑی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"یہاں بہت کیچڑ ہے معاویہ! ہم پھسل سکتے ہیں۔" وہ فکر مندی سے داہنے ہاتھ پر منہ کھولے کھڑی کھائیوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

معاویہ الٹے قدموں واپس آیا اور بایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ آئے کت نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو بولا۔

"میں تمہیں گرنے نہیں دوں گا۔"

آئے کت ایک بار پھر متذبذب ہوئی لیکن پھر اس نے اپنا ہاتھ معاویہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اب وہ دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ معاویہ نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور درختوں اور خود رو جھاڑیوں کو راستے سے آئے کت کی سہولت کے لیے ہٹاتا جا رہا تھا۔ آئے کت ایک ہاتھ سے چھتری پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے معاویہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے اوپر چڑھ رہی تھی۔

اس کا سانس بھی پھول چکا تھا۔

"تمہارے اس کورس کا کیا ہوا؟" اوپر چڑھتے ہوئے آئے کت نے پوچھا۔

"کون سا کورس؟" معاویہ نے ایک نظر اسے گردن موڑ کر دیکھا۔

"وہ جو تم کیلیفورنیا یونیورسٹی سے کرنا چاہتے تھے؟ کیا نام تھا اس کا۔" آئے کت نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے صرف اتنا یاد ہے تم اس سال کے آخر تک کوئی کورس کرنے کے لیے جانا چاہتے تھے۔" اس نے نام یاد نہ آنے پر ناکام ہو کر کہا۔

"اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اس سال کے آخر تک میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور وہ "کچھ اور" کیا ہے۔" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مجھے وسامہ کی موت کا معمہ حل کرنا ہے ہر حال میں۔" وہ سنجیدگی سے اور دو ٹوک انداز میں کہہ رہا تھا۔

"کاش میں تمہارا ساتھ دے سکتی۔" چند منٹ کی خاموشی کے بعد آئے کت نے کہا تھا۔

معاویہ نے بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"تم میرا ساتھ دے سکتی ہو۔" اس کا انداز سادہ تھا۔ لیکن لہجے میں اصرار بولتا تھا۔

آئے کت اس وقت اس کا ہاتھ پکڑے ایک بڑے پتھر پر پیر جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بارش کی کن من میں شدت آگئی تھی اور چھتری ہٹ جانے سے آئے کت بھی بھیگ گئی تھی۔ ان دونوں کی نظریں ملیں۔ معاویہ کی

آنکھوں میں اصرار تھا تو آئے کت کی آنکھیں لاچاری کے بوجھ سے جھک گئیں۔

"تم جانتے ہو یہ ممکن نہیں ہے۔"

"دنیا میں ناممکن کچھ نہیں ہوتا اور یہ تم بھی بہت اچھی طرح جانتی ہو۔" وہ آگے چل پڑا۔

"تم ماموں اور ممانی کے ساتھ واپس چلی جاؤ۔۔۔ میں ابھی کچھ دن اور فلک بوس میں رکوں گا۔"

"لیکن معاویہ!"

"میں فیصلہ کرچکا ہوں اور کسی کی کوئی بات میرا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔"

تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ بے دھیانی میں اس نے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ یہ بالکل غیرارادی حرکت تھی۔ آئے کت اپنی جھونک میں اور کسی قدر معاویہ پر انحصار کرتے ہوئے قدم آگے رکھ رہی تھی۔ معاویہ کے ہاتھ کو جھٹکنے پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ سنبھلنے کے لیے اس نے چٹان کا سہارا لینا چاہا لیکن اس کوشش میں اس کے پیروں کے نیچے سے پتھر پھسلتے چلے گئے۔ اور ان پھسلتے پتھروں کے ساتھ وہ خود بھی تقریباً" دس فٹ گہری کھائی میں پھسلتی چلی گئی۔

"معاویہ!" آئے کت کی چیخ بادلوں کی گرج کے ساتھ وادی میں گونجی۔

"آئے کت!" معاویہ نے حواس باختہ ہوتے ہوئے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں وہ منہ کے بل نیچے کیچڑ میں گر پڑا۔ اس کے باوجود اس کے حواس اتنے بحال رہے کہ اس نے آئے کت کو بچانے کی کوشش ترک نہیں کی اور آئے کت کی آستین کا کنارہ اس کے ہاتھ میں آگیا۔

"میرا ہاتھ پکڑو۔۔۔ جلدی کرو' میرا ہاتھ پکڑو۔"

وہ کیچڑ کے ساتھ ناہموار چٹان پر مسلسل نیچے کھسکتا جارہا تھا۔ وہ اپنے پیروں کو تیز تیز حرکت دے رہا تھا۔ اسے کسی ایسے سہارے کی ضرورت تھی جس کے ذریعے خود کو نیچے کھائی میں گرنے سے بچا سکے۔ دوسری جانب وہ آئے کت کی آستین کو مسلسل کھینچتا اس کا ہاتھ یا کلائی قابو کرنے کی کوشش بھی کررہا تھا۔

آئے کت کے لیے کھائیوں میں موت کا اژدھا منہ کھولے کھڑا تھا کہ کب وہ اپنی زندگی بچانے کی تگ و دو ترک کرے اور کب اس کا لقمہ بنے۔ ہوا میں معلق آئے کت کا خون ہی خشک ہوچکا تھا۔ بارش اسے اوپر معاویہ کی طرف دیکھنے نہ دیتی تھی اور نیچے گہری ناہموار کھائیوں کی دہشت اسے مرنے سے پہلے ختم کردینا چاہتی تھی۔

"معاویہ! مجھے بچاؤ' میں مرنا نہیں چاہتی۔" موت کے خوف نے جیسے اسے ادھ موا کردیا تھا۔ وہ رو رہی تھی اور چلا رہی تھی اور اپنی زندگی بچانے کے لیے مسلسل ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔

"مم۔۔۔ میں تمہیں کک۔۔۔ کچھ نہیں ہونے دوں گا۔" وہ پوری جان کی طاقت لگا کر چلا رہا تھا۔ بالآخر اس کے پیروں نے ایک ٹھوس سطح کو چھوا۔ معاویہ نے فوراً" سے پیشتر اپنے پیر اس سطح میں پھنسائے اور دونوں ہاتھوں کو آگے کی طرف لٹکا کر سڑک کے کٹاؤ سے نیچے لٹک گیا۔

پوری مضبوطی سے اس نے آئے کت کی دونوں کلائیوں کو قابو کیا اور جتنی طاقت سے اسے اوپر کھینچ سکتا تھا کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ بارش کی وجہ سے گرفت رکتی نہ تھی اور ان دونوں کے ہاتھ باربار چھوٹ رہے تھے۔

پتا نہیں کتنی دیر کی اذیت اور محنت کے بعد وہ اسے اوپر لانے میں کامیاب ہوسکا تھا اور پھر وہ دونوں جیسے بے دم سے ہوکر وہیں کیچڑ زدہ زمین پر گر گئے تھے۔

موت کا سامنا بہرحال مرجانے سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

خوش نصیب اپنے کمرے میں آئی تو دیکھا ماہ نور کے ساتھ فہمینہ بھی وہیں موجود تھی۔ روشن کروشیہ اور دھاگے سامنے رکھے کوئی ڈیزائن بنانے میں مصروف تھیں اور نانی حسب توقع تکیہ سے ٹیک لگائے نیم دراز بیٹھی تھیں۔

ماہ نور اور فہمینہ کے سامنے کینو رکھے تھے۔ وہ کینو چھیل چھیل کر کھا رہی تھیں' ساتھ ساتھ باتیں ہو رہی تھیں۔ فیصلہ کرنا مشکل تھا ان کے ہاتھ زیادہ تیزی سے کینو چھیل رہے ہیں یا زبانیں زیادہ تیزی سے چل رہی ہیں۔

"یہاں تو پارٹی ہو رہی ہے۔ کینو کھانے کے لیے کسی نے میرا انتظار ہی نہیں کیا۔" وہ اندر آتے ہوئے بولی۔

"تم گھر پر ٹک کر بیٹھو تو کوئی تمہارا انتظار کرے۔" روشن امی نے حسب عادت اسے سرزنش کی۔ "تھی کہاں تم اب تک۔"

"اس نے کہاں جانا ہے۔ فریحہ کی طرف ہی گئی ہو گی۔" ماہ نور نے کہا۔

"جی ہاں۔ ملا کی دوڑ مسجد تک اور ہماری خوش نصیب کی دوڑ فریحہ کے گھر تک۔" فہمینہ شرارت سے بولی وہ دونوں مل کر اسے چڑا رہی تھیں۔ خوش نصیب نے اسے منہ چڑایا اور جا کر ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ غصے کے اظہار کے طور پر فہمینہ کے ہاتھ سے کینو جھپٹ لیا۔

"جی ہاں' فریحہ کی طرف گئی ہوئی تھی میں۔۔۔ لیکن یہ پارٹی کس خوشی میں ہو رہی ہے۔"

"ارے اصل پارٹی تو تمہاری طرف سے ہو گی وہ بھی تب جب یونیورسٹی میں تمہارا ایڈمیشن ہو جائے گا۔ بات سنو! میں لارج سائز پیزا کھاؤں گی۔"

"اللہ معافی تم اپنی صحت دیکھو فہمی اور اپنی خوراک پر دھیان دو۔ جتنا تم ایک وقت میں کھاتی ہو نارمل سائز کے چار لوگ اتنا کھانا کھا سکتے ہیں۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"ارے چپ کرو' کیوں بچی کی صحت کو نظر لگا رہی ہو۔"

"اس بچی کا بھائی ہمیشہ میرے کھانے پینے پر نظر رکھتا ہے۔ تب تو آپ کو اعتراض نہیں ہوتا۔" اس نے ٹھنک کر روشن امی کو دیکھا۔

"بھائی سے یاد آیا۔" فہمینہ رازداری سے اس کی طرف جھکی اور شرارت سے بولی۔ "فون آیا تھا اس کا۔ بہت یاد کر رہا تھا تمہیں۔" فہمینہ کوئی مزے دار سا جواب سننے کی امید رکھتی تھی' لیکن خوش نصیب نے کہا تو صرف اتنا۔

"یاد تو میں بھی کر رہی تھی اسے۔"

"کیف نے سنا تو خوشی کے مارے بے ہوش ہی نہ ہو جائے۔"

"اسے کہو' میرا ایک کام کر دے۔ اس کے بعد بھلے سے بے ہوش ہو یا پھر یا کومے میں ہی چلا جائے۔"

"فٹے منہ تمہارا۔ کبھی تو کوئی اچھی بات کیا کرو۔" فہمینہ جل کر بولی تھی' خوش نصیب قہقہہ لگا کر ہنسی۔

"اچھا سنو۔۔۔ اگلی بار کیف سے بات ہو تو کہنا مجھ سے بات بھی کرے۔ ایک ضروری کام ہے مجھے اس سے۔"

"ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا کیف سے۔۔۔ ہمیں بھی تو بتاؤ۔" اس نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

"فریحہ کی ایک کزن ماس کمیونیکیشن میں ایڈمیشن لینا چاہ رہی ہے۔ اسی کے بارے میں معلومات چاہیے تھیں۔" اس نے ایک موٹی سی پھانک منہ میں رکھتے ہوئے بات بنائی۔

"اچھا کہہ دوں گی' لیکن اب تو تم اپنے ایڈمیشن کا سوچو۔"

"ایڈمیشن کا ابھی کچھ پتا تو ہے نہیں۔"

"پتا کیوں نہیں ہے۔ روشن امی تمہارے ایڈمیشن کے لیے راضی ہو گئی ہیں۔" ماہ نور نے پُرجوش انداز میں اسے خوش خبری سنائی۔

"ایڈمیشن تو تب ہو گا نا جب ایڈمیشن کے لیے پیسے ہمارے پاس آئیں گے۔"

"پیسوں کی اب تم فکر مت کرو۔" روشن امی نے دھاگے لپیٹتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"میں نے صبح تمہیں دکانوں کے کرائے کی بات بتائی تھی نا؟ اشفاق بھائی صاحب وہ سارا کرایہ ہمیں دینے پر راضی ہو گئے ہیں۔" وہ اتنا خوش تھیں اس بات پر کہ خوشی ان کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

"دیکھا۔ کتنے اچھے ہیں میرے ابو۔" فہمینہ نے دانت نکال کر کہا۔

اور خوش نصیب بجائے اس بات پر خوش ہونے کے مخمصے میں پڑ گئی۔ روشن امی گیلری کی الماری میں کروشیا اور دھاگے رکھنے گئی تھیں۔ وہ تیزی سے اٹھ کر ان کے پیچھے آئی۔

"روشن امی! یہ کیا معاملہ ہوا ہے؟ تایا جان تو ایک کمرہ ہمیں دینے پر راضی نہیں ہو رہے تھے۔ یہ اتنے سارے پیسے دینے کی حامی کیسے بھرلی۔"

"میں تو خود حیران ہوں۔" وہ الماری بند کر کے اس کی طرف پلٹیں تو بہت خوش لگ رہی تھیں۔

"تمہارے جانے کے بعد اشفاق بھائی صاحب نے مجھے بلوایا اور کہا کہ تمہارے ابا کی دکانوں کا سارا کرایہ اگلے مہینے سے وہ ہمیں دیا کریں گے۔ صرف یہی نہیں پچھلے دو مہینوں کا کرایہ بھی انہوں نے مجھے دیا ہے۔ دیکھو تو خوش نصیب! تم ہمیشہ ان سب سے متنفر رہتی ہو۔ لیکن ان سب کو ہمارا کتنا خیال رہتا ہے۔" روشن امی اور بھی کچھ بول رہی تھیں' ایک چھوٹی سی خوشی مل جانے کے بعد ان کا دل خاندان والوں کے لیے اور بھی گداز ہو گیا تھا' جبکہ خوش نصیب ششدر سی کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کے کانوں میں شامیر کی کہی ہوئی باتیں گونج رہی تھیں۔

"میں نے جبار سے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہارے سارے پرابلمز حل کروا دے گا۔"

اس کے دماغ میں جیسے چیونٹیاں سی چلنے لگی تھیں۔

☆ ☆ ☆

مونٹوک کے بے بادل آسمان پر ایک خوب صورت شام رات میں ڈھل رہی تھی۔ ساحل سمندر کی طرف سے آنے والی ہوائیں خنک اور بھیگی معلوم ہوتی تھیں۔ ایسے میں اس دو کمروں کے کاٹیج کی تمام بتیاں جلا دی گئی تھیں اور کھلی ہوئی کھڑکیوں سے اندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ سامنے کی طرف چھوٹا سا باغیچہ تھا جس میں ایک طرف درخت کی شاخ سے پرانے ٹائر کا جھولا لگایا گیا تھا۔ ٹائر کو خوب صورت رنگوں کی ربنوں کی گرہوں سے سجایا گیا تھا۔ باغیچے سے برآمدے کی سیڑھیاں متصل تھیں جن کی تعداد چار سے زیادہ نہیں تھی۔

سیڑھیوں کے دونوں طرف برآمدے کی گرل تھی۔

برآمدے میں دروازے کھلتے تھے۔ ایک کاٹیج کا داخلی دروازہ تھا' دوسرا دروازہ کاٹیج کے پچھلی طرف جانے والی گلی کی طرف لے جاتا تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہوں تو بالکل سامنے ٹی وی لاؤنج پلس سٹنگ روم تھا۔ سامنے کی دیوار پر ایک بڑا فیملی پورٹریٹ لگا ہوا تھا۔ تصویر تقریباً بیس سال پہلے کھینچی گئی ہو گی لیکن اتنے سالوں نے بھی چہروں کی خوب صورتی کو ماند نہیں کیا تھا۔ مسٹر اینڈ مسز جمال (جو مانٹوک میں مسٹر اینڈ مسز جیک کے نام سے جانے جاتے تھے۔) اس وقت جوان تھے اور ان کے چہرے زندگی کی رعنائیوں کی عکاسی کرتے تھے۔ ننھا آدم مسز جمال کی گود میں اپنی فرشتوں جیسی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا' جبکہ چار سالہ منفرا مسٹر جمال کے بائیں بازو کے گھیرے میں کھڑی بالوں کو دو پونیوں میں باندھے' پورے دانت نکالے مسکرا رہی تھی۔ یہ اتنا خوب صورت فیملی

فوٹو تھا کہ جو بھی دیکھتا سراہے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔

اس بڑے پورٹریٹ کے ساتھ دیوار پر جابجا چھوٹے بڑے فریم لگے ہوئے تھے جن میں منفرا اور آدم کی بچپن سے لے کر اب تک کی کئی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ بڑے فیملی فوٹو کے ساتھ نسبتاً" درمیانے سائز کا ایک اور فریم لگا ہوا تھا جس میں ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ عورت کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی اس کا چہرہ بیضوی اور نقوش خوب صورت لیکن دیہاتی پن کا عکس لیے ہوئے تھے۔ یہ مسٹر جمال کی والدہ کی تصویر تھی اور پرانی یادوں کی وہ آخری کڑی تھی جسے انہوں نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی کے ساتھ ساتھ ضرورت کا کچھ اور سامان بھی موجود تھا جو پنجابی ثقافت کی نمائندگی کرتا تھا۔ یہ وہ تمام اشیا تھیں جنہیں مسز جمال نے جمع کر رکھا تھا۔ وہ ایسی ہر چیز کو گھر میں لانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں جن سے انہیں پاکستان سے جڑے رہنے کا احساس ہوتا رہے۔

دائیں ہاتھ پر ماسٹر بیڈ روم تھا۔ دوسری طرف کچن کا دروازہ تھا جس سے کچن میں کھانے کا اہتمام کرتی مسز جمال اور منفرا نظر آرہی تھیں۔ دروازے کی جگہ کھلی ہوئی تھی وہاں صرف دروازے کا فریم لگا ہوا تھا۔ کچن کے بالکل ساتھ سیڑھیاں اوپر کی منزل کی طرف جاتی تھیں۔ اوپر ایک بیڈ روم اور ایک چھوٹا اسٹڈی روم تھا یہ کمرہ منفرا کے بعد زیادہ تر آدم کے زیر استعمال رہتا تھا۔ کمرے کے سامنے چھوٹا سا ٹیرس تھا جہاں کھڑے ہو کر ساحل سمندر کو دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔ لکڑی کا بنا ہوا یہ بلاشبہ ایک خوب صورت کاٹیج تھا۔ سٹنگ روم کی پورٹریٹ والی دیوار کے سامنے مسٹر جمال کھڑے تھے اور اپنی والدہ کے چہرے کو حسرت سے تک رہے تھے۔ منفرا نے کچن سے انہیں دیکھا اور باہر آکر ان کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر اپنی ٹھوڑی بھی ان کے کندھے سے لگادی۔

"ڈیڈ!" اس نے پیار سے انہیں پکارا تو وہ جیسے کسی گہرے خیال سے چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں کے کنارے نم تھے اور پتلیوں میں درد کا ایک جہان آباد تھا۔ منفرا ان کا درد محسوس کرسکتی تھی لیکن اس درد کا مداوا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے ہولے سے ان کے کندھے تھپتھپا دیے۔

"ڈنر ریڈی ہے ڈیڈ!"

مسٹر جمال نے نظر کا چشمہ آنکھوں سے ہٹا کر آنکھوں کے کنارے پونچھے اور اس کے ساتھ کچن میں آگئے۔

"اتنے دنوں کے بعد منفرا آئی ہے کم سے کم آج تو سب لوگ وقت پر ڈنر کے لیے آجائیں۔ یہ آدم بھی پتا نہیں کہاں رہ گیا؟"

مسز جمال چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر لزانیہ کی ٹرے رکھ رہی تھیں انہوں نے مسٹر جمال کا چہرہ دیکھا تو چونک گئیں اور آنکھوں کے اشارے سے منفرا سے سبب پوچھا۔ منفرا نے چپکے سے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کردیا اور مسٹر جمال کے لیے کرسی کھینچ کر انہیں بیٹھنے میں مدد دینے لگی۔

"مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ اچھا ہوا جو ڈنر جلدی تیار ہوگیا۔" منفرا نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے خوش دلی سے کہا تھا۔

"کیا ہی اچھا ہو کہ آدم بھی وقت پر پہنچ جائے۔ آدم! آجاؤ بھئی۔" مسز جمال نے اونچی آواز میں کہا تھا۔

"کیا کسی نے مجھے یاد کیا ہے؟" آدم خوش دلی سے کہتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ انیس بیس سال کا ایک بھرپور نوجوان تھا۔ چہرے مہرے سے معصوم معلوم ہوتا تھا لیکن قد کاٹھ اتنا تھا کہ منفرا کا بڑا بھائی لگتا۔ صبح وہ کالج جاتا تھا اور شام میں مسٹر جمال کے ساتھ مچھلیوں کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا لیکن یہ کام اسے کچھ خاص پسند نہیں تھا۔ وہ بچپن سے ہی سمندر کے عشق میں مبتلا رہا تھا اور اسکوبا ڈائیور بننا چاہتا تھا اور سمندر کی تہہ میں چھپے ہوئے رازوں سے پردے اٹھانا چاہتا تھا۔

"یہ وائٹ ساس لزانیہ آپ نے منفرا کے لیے بنایا ہے۔ اگر میں نے کہا ہوتا تو آپ کبھی نہ بناتیں۔" آدم نے کھانے کا جائزہ لیتے ہوئے مسز جمال کو سنجیدگی سے چڑایا تھا۔

"وہ اتنے دنوں کے بعد آئی ہے۔ کھانا تو اسی کی پسند کا ہونا چاہیے تھا۔" مسز جمال خوش دلی سے منفرا کو دیکھ کر بولیں تو منفرا خوش ہو کر آدم کو دیکھنے لگی۔

"اس کی صحت دیکھیں۔ میرا خیال ہے اسے دو سال کا روزہ رکھنا چاہیے۔ آپ لوگوں کو نہیں لگ رہا کہ یہ پہلے سے زیادہ موٹی ہو کر آئی ہے۔" وہ سنجیدگی سے منفرا کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ بظاہر سنجیدہ تھا' لیکن صاف پتا چل رہا تھا مذاق کر رہا ہے۔

"جی نہیں۔ میں موٹی نہیں ہوئی۔" منفرا نے ناراضی سے کہا تھا۔

"یہ تو تم صرف اپنا دل بہلانے کے لیے کہہ رہی ہو' ورنہ اپنے موٹاپے کا خود تمہیں بھی احساس ہے۔" وہ حاضر جوابی سے بولا تھا۔ مسٹر اور مسز جمال ہنسنے لگے۔

"اچھا اب اسے کھانا کھانے دو۔ تنگ مت کرو میری بیٹی کو۔" مسز جمال نے پیار سے منفرا کو دیکھتے ہوئے کہا تو منفرا آدم کو منہ چڑا کر اپنی پلیٹ میں لزانیہ نکالنے لگی۔

"تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟"

"اچھی چل رہی ہے۔ آج کل میں ایک تھیسز پر کام کر رہی ہوں اور اس کے لیے اکثر ڈاکٹر ریمسن کی سائیکاٹری بھی جاتی ہوں۔" اس نے خوشی خوشی سب کو بتایا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ویسے تمہاری پڑھائی ختم کب تک ہو جائے گی۔" مسز جمال نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

"میری پڑھائی ختم ہو جائے گی مام! لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔ پاکستانی کیمونٹی میں اب کس لڑکی کی شادی ہوئی ہے جو آپ کو ایک دم سے میری پڑھائی ختم ہونے کا خیال آ رہا ہے۔" منفرا نے شرارت سے پوچھا تو مسز جمال ناراضی سے اسے دیکھنے لگیں۔

"اگر کسی کی شادی کا سن کر تمہاری شادی کی فکر ہو رہی ہے تو اس میں غلط کون سی بات ہے؟ تمہارے ساتھ کی ساری لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ کم سے کم ہمارے سرکل میں تو سب کی ہو گئی ہے۔" انہوں نے ناراضی سے اور ذرا سوچ کر کہا تھا۔

"منفرا کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری بیٹی کے لیے کوئی شہزادہ آئے گا۔" مسٹر جمال نے مسکرا کر منفرا کو دیکھا تھا۔ وہ بچپن سے اس سے یہی کہا کرتے تھے کہ تمہارے لیے کوئی شہزادہ آئے گا اور وہ کوئی عام آدمی نہیں ہو گا۔

"اور جب تک وہ شہزادہ آ نہیں جاتا۔ اسے اس کی پڑھائی مکمل کر کے کیریئر پر دھیان دینے دو۔" انہوں نے اب سنجیدگی سے کہا تھا۔

"پتا نہیں آپ اس طرح کی باتیں کیوں کرتے ہیں؟ کیا آپ کو منفرا کی فکر نہیں ہے۔ زمانہ اتنا خراب ہو گیا ہے' امریکن سوسائٹی میں تو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں نہ جانے کیا کیا کرتی پھر رہی ہیں۔ منفرا تو پھر۔" ان کے خدشات تھے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

"شائستہ!" مسٹر جمال نے انہیں سنجیدگی سے ٹوک دیا۔ "جن لڑکیوں کی بات تم کر رہی ہو' وہ اسی ماحول کی پروردہ ہیں اور ان سب کے پاس تمہاری جیسی ماں بھی نہیں ہے جو ان کی تربیت کر سکے اور انہیں اچھے برے اور غلط صحیح کا فرق سمجھا سکے۔ کم سے کم تمہیں اپنی تربیت پر ضرور بھروسا ہونا چاہیے۔"

"ڈیڈ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" منفرا نے ماں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اور میں نے آپ سے پرامس کیا ہے، کبھی آپ کو لیٹ ڈاؤن نہیں کروں گی مام!" مسز جمال گہری سانس بھر کر خاموش ہو رہیں اور بیٹی کو دیکھ کر مسکرانے بھی لگیں۔ منفرا نے بات ہی بدل دی۔

"ڈیڈ! آپ کا پاکستان جانے کا پلان کہاں تک پہنچا؟" اس سے پہلے کہ مسٹر جمال کوئی جواب دیتے" آدم نے کہا۔

"وہ پلان میری وجہ سے مکمل نہیں ہو پا رہا۔ دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے میں پاکستان نہیں جاؤں گا۔" ایک بڑا سا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔ مسٹر جمال کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

"آخر تمہیں وہاں جانے میں تکلیف کیا ہے؟" وہ پھٹ پڑنے والے انداز میں بولے تھے۔ "وہ ملک ہے ہمارا، تم لوگوں کے اچھے مستقبل کے لیے میں یہاں رہنے پر راضی ہوا تھا' لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ساری زندگی وہاں کا منہ نہ دیکھوں۔ میرے اپنے تو وہیں پر ہیں' جنہیں اچھے مستقبل کی تلاش میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ خدا معلوم اب سب کہاں ہوں گے' کہاں نہیں.... جہاں انسان کی بنیادیں ہوتی ہیں' جانا تو وہیں ہوتا ہے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ یہاں آکر آباد ہونا آپ کی اپنی چوائس تھی ڈیڈ! اس کے لیے کسی نے آپ کو فورس نہیں کیا تھا اور دوسری بات یہ کہ آپ کی بنیادیں وہاں ہو سکتی ہیں' لیکن ہم یہاں پیدا ہوئے' یہیں بڑے ہوئے ہیں۔ اینڈ لیس آئی ایم اے پراؤڈ امریکن.... میں پاکستان جا کر کیا کروں گا؟" اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

"تمہیں بس ہر اس بات سے اختلاف کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ تم ایک نالائق اور نافرمان — اولاد کے سوا کچھ نہیں ہو۔" مسٹر جمال ایک دم سے غصے میں آکر بولے تھے۔

آدم کا چہرہ بے عزتی کے احساس سے لال ہو گیا۔ اس نے شکوہ کناں انداز میں ماں اور بہن کو دیکھا جن کے چہرے بے زاری اور الجھن سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے' پھر اس نے پلیٹ کو ہاتھ مار کر پرے دھکیلا اور کرسی گھسیٹ کر اٹھا اور دھپ دھپ کرکے وہاں سے چلا گیا۔

"آدم رکو.... کھانا کھا کر جاؤ۔" مسز جمال تیزی سے آدم کے پیچھے لپکی تھیں۔

ان کے جانے کے بعد کچن میں چند منٹ کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔ مسٹر جمال کا تنفس تیز ہو رہا تھا اور چہرہ غصے اور پچھتاوے سے لال ہو گیا تھا۔

"تم نے دیکھا منفرا! یہ کتنا بدتمیز ہو گیا ہے۔ تم لوگوں کے لیے میں نے اپنی سرزمین' اپنے لوگ چھوڑ دیے.... کیا اس لیے ان سب کو چھوڑا تھا کہ کل کو میری اولاد میرے فیصلوں کو غلط قرار دے؟ اصل میں یہ زمین ہی خراب ہے۔ اس ملک کی آب و ہوا ہی نوجوان نسل کو باادب بننے نہیں دیتی۔ مشرقی مرد اس سرزمین پر آکر اچھا مستقبل تو بنا سکتا ہے' لیکن اچھی اولاد نہیں بنا سکتا۔ پتا نہیں' ہم مشرقی لوگ ایسی فاش غلطیاں کیوں کرتے ہیں؟"

ان کے پچھتاوے' ان کے غم' ان تمام مشرقی لوگوں جیسے ہی تھے جو کئی سال پہلے اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آئے اور آباد ہو گئے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عطیہ خالد

خلش

"مژدہ! کب سے بلوا رہی ہوں بیٹا۔ دوپہر میں بھی کچھ نہیں کھایا تم نے۔ جاں فزا بھی انتظار میں بیٹھی ہے۔ چلو اب اٹھ جاؤ۔ تمہاری پسند کے چکن فرائیڈ رائس بنوائے ہیں میں نے۔ بروسٹ بھی منگوایا ہے۔ اب ضد مت کرو۔"

مژدہ نے میری ذات کا عکس لیے مجھے خائف نظروں سے دیکھا۔ "کوئی نہ کرے میرا انتظار۔ نہیں کھانا مجھے کھانا۔"

"اچھا! وہ جو بریزے کے پنک اور پرپل سوٹ تمہارے پاپا لائے تھے' تم وہ دونوں لے لینا۔ میچنگ کے لیے چلیں گے کل۔ ٹھیک!"

"آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہا۔ آپ مجھے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش نہ کریں ماما۔"

"تم یہ سب کر کے مجھ سے اپنی ضد نہیں منوا سکتیں۔ تمہارے بھلے کے لیے وہاں شادی سے انکار کر رہی ہوں۔" میرا لہجہ سخت ہو گیا۔

"میرا بھلایا آپ کی اپنی ضد۔ میں جاں فزا نہیں ہوں جو ڈر جاؤں گی اور پیچھے ہٹ جاؤں گی۔"

"تم مجھے ایسے جذباتی بلیک میل نہیں کر سکتیں۔ جو سمجھا رہی ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"آپ مجھے کہہ رہی ہیں بلیک میلنگ کا' آپ؟ اور آپ نے ساری زندگی کیا کیا ہے؟ اصل بلیک میلر تو آپ ہیں ماما۔ ساری زندگی آپ ہم سب کے جذبات سے کھیلتی رہی ہیں۔ اپنی بے جا ضدوں سے ہم سب کو پریشان کرتی رہی ہیں۔ آپ مجھے سمجھا رہی ہیں' سمجھنا تو آپ کو چاہیے۔ ایک بیٹی کی زندگی برباد کر کے آپ کو کیا ملا جو آپ میری زندگی کے پیچھے بھی پڑی ہیں؟"

اونچا اونچا بول کر مژدہ دروازہ پیچ کر باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے آتی جاں فزا نے مجھے لپٹا لیا۔ مجھے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی۔

"ماما! آپ کیوں فکر کرتی ہیں' میں منالوں گی اس کو ابھی۔"

"میں بلیک میل کرتی ہوں تم سب کو۔" میں نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

"اوہ پیاری ماما!" جاں فزا نے میرے ہاتھ چوم کر کہا۔ "آپ دنیا کی سب سے پیاری ماں ہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں نے تمہاری زندگی برباد کر دی جاں فزا؟ ہے نا؟" جاں فزا ایک ٹک مجھے دیکھنے لگی اور نہ میں سر ہلایا۔

"آپ ایسے نہ سوچیں ماما۔"

"تمہیں مجھ سے کہنا چاہیے تھا۔ یہ سب جو تمہاری بہن نے کہہ دیا۔"

"تمہاری بدقسمتی ہماری تدبیروں سے نہیں بدلتی ماما۔ میرے ساتھ جو ہوا وہ میرا نصیب تھا۔"

"تمہاری اس بدنصیبی کی وجہ میری بے جا ضد بنی۔ کہہ دو جاں فزا... اگر تمہاری شادی حارث سے ہو جاتی تو..."

"میرا نصیب حارث تھا ہی نہیں ماما... آپ خود کو الزام دینا چھوڑ دیں پلیز۔"

اس نے تو کہہ دیا کہ میں خود کو الزام دینا چھوڑ دوں' لیکن کیا میرا ضمیر مجھے ملامت کرنا چھوڑ دے گا؟ میں جو ہزار طریقوں سے اپنے ضمیر کو بہلانے کی کوشش کرتی ہوں' وہ بہل جائے گا؟ امان' خالہ' ابا' مژدہ' ان سب کی نگاہیں مجھے جو کچھ جتاتی ہیں' میں ان نظروں سے کتنی دیر تک بچی رہ سکتی ہوں۔ آج مژدہ نے وہ منہ سے کہہ ہی دیا جو وہ اشاروں میں کہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے کسی صورت بھی جوائنٹ فیملی میں نہیں رہنا امان۔ بس آپ الگ گھر لیں، بے شک کرائے کا گھر لے لیں۔"

"دیکھو نا جیہ! شادی میں صرف تین ہفتے رہتے ہیں۔ ایسے وقت میں الگ گھر؟ کیوں پریشان کر رہی ہو مجھے؟" امان نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"ٹھیک ہے تو شادی لیٹ ہو سکتی ہے ناں! بے کار بحث بڑھانے کا کیا فائدہ۔" میں نے اپنے ناخنوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اگر الگ گھر ہی چاہیے تھا تو تم نے پہلے کیوں نہیں کہا؟"

"ڈیڑھ سال ہماری منگنی رہی ہے۔ باتوں باتوں میں کتنی بار آپ سے الگ گھر ڈسکس کر چکی ہوں۔"

"تمہارا ڈریم ہاؤس لے دوں گا نا جیہ! تھوڑا صبر کرو، لیکن ایسے؟ اتنی جلدی؟"

"آپ کی نظر میں میری بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے امان! لڑکیاں تو نہ جانے کیا کیا فرمائشیں کرتی ہیں۔ صرف اتنا ہی تو کہہ رہی ہوں کہ آپ الگ گھر کا انتظام کریں۔ مجھے پتا ہے آپ افورڈ کر سکتے ہیں۔" میں نے روہانسی ہو کر کہا۔

"بات افورڈ کرنے نہ کرنے کی نہیں ہے' وقت کی ہے۔اب جبکہ۔" اماں نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

"بس اب میں کوئی بات نہیں سنوں گی۔ مجھے رخصت کرواکر لے جانا ہے تو الگ گھر میں لے جائیں ورنہ ہمارے راستے الگ ہیں۔"

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور دروازہ بند کرلیا۔ مجھے یقین تھا کہ اماں ہر صورت الگ گھر کا انتظام کرلیں گے اور اماں نے ایسا ہی کیا۔ خالہ کو کیسے راضی کیا' نہیں جانتی' لیکن اماں نے ایک بہت خوب صورت لگژری اپارٹمنٹ خرید لیا تھا۔ خالہ شادی پر چپ چپ تھیں۔ ان کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا تھا' لیکن کیا مجھے اس سے فرق پڑنا چاہیے تھا؟

نہیں! مجھے کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہر انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی خوشیوں کے لیے جدوجہد کرے۔ انہیں حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگادے۔ میں نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگادیا۔ شادی سے تین ہفتے قبل کہا تاکہ نہ شادی ٹالی جاسکے' نہ مجھے۔ چھوٹی سی اس زندگی میں لمبے لمبے انتظار کون کرے۔

میرے ولیمہ پر میری بڑی نند عریشہ آپا کی رخصتی تھی۔ صبح ہی آپا کے سسرال سے ان کا جوڑا اور زیور آگئے تھے۔ خالہ نے مجھے بلاکر یہ سب چیزیں میرے حوالے کیں کہ اپنے سامان کے ساتھ رکھ لوں۔ ہم دونوں کو پارلر جانا تھا۔

چمک چمک سارا کمرہ جیسے روشنیوں سے بھر گیا۔ کیا جوڑا بھیجا تھا آپا کے سسرال والوں نے۔ اف!! سنہرے دبکے سے سجا سفید بنارسی لہنگا' سونے جیسا جھلملاتا جمپر! کیا کمال کا نکاح کے لیے پہناوا تھا اور زیور! زمرد اور روبی سے سجے بھاری سیٹ وہ بھی دو۔ کنگن اور چوبیس چوڑیاں۔ یہ ان کا خاندانی زیور تھا۔ انتہائی قیمتی اور نگاہوں کو خیرہ کرنے والا۔ عریشہ آپا ان کی اکلوتی بہو بن کر جارہی تھیں۔ اکلوتی بہو تو میں بھی تھی۔ خالہ نے میرے لیے بھی نکاح اور ولیمہ کے لیے بہت بھاری سیٹ بنوائے تھے' مگر وہ ایسے قیمتی بہرحال نہیں تھے۔ ہم دونوں خالہ زاد بہنیں تھیں اور ہماری شکلیں آپس میں بہت ملتی تھیں' لیکن عریشہ آپا کے سسرال سے آیا جوڑا اور زیورات دیکھ کر مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ دلہن بنے ان کا روپ' ہار سنگھار' مجھے مات دے دینے والا ہے۔ وہ محفل لوٹ لینے والی تھیں۔

اور میں کیوں نہیں؟ یہ چیز مجھے تڑپا رہی تھی۔ میں تڑپتی رہتی۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ کسی صورت نہیں۔ مجھے جو کرنا تھا جلد کرنا تھا۔ میرا لہنگا کاہی سبز تھا اور اس پر سنہری کلیوں والی فراک۔ جوڑا بے حد خوب صورت تھا اور مجھے پسند بھی تھا۔

میں نے خالہ سے کہا "مجھے اپنا زیور کا سیٹ بالکل پسند نہیں آیا۔ مجھے اسے بدلنا ہے۔" خالہ نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔

"لیکن تم نے تو خود پسند کیا تھا۔" وہ الگ گھر والی بات سے پہلے ہی خائف تھیں۔

"جی کیا تھا۔ پتا نہیں اس وقت میرا دھیان کہاں تھا۔ میں ایسا ہلکا اور پرانے ڈیزائن کا سیٹ کیسے پسند کرسکتی ہوں۔ بس مجھے یہ نہیں پہننا خالہ۔ آپ اماں سے کہیں' مجھے نیا سیٹ دلوائیں۔"

گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اور میری آواز بلند ہورہی تھی۔ خالہ نے سرد مہری سے مجھے دیکھا۔

"اکلوتی بہو ہوں آپ کی خالہ' مگر آپ کو مجھ سے محبت نہیں۔ عریشہ آپا کے سسرال والوں کو دیکھیں' کتنا قیمتی زیور لائے ہیں ان کے لیے۔" میں رونے لگی۔

میرے رونے سے خالہ پریشان ہوگئیں۔ مجھے سمجھانے کے جتن کرنے لگیں۔ اماں بھی آگیا اور مجھے بہلانے لگا۔ میں بہل جاتی اگر میرے ولیمہ کا دن زندگی میں پھر کبھی دوبارہ آجاتا۔ یہ دن کوئی بار بار آتے ہیں۔ جس نظر سے مہمان مجھے آج دیکھیں گے' دوبارہ تو نہیں دیکھیں گے نا۔ فوٹو سیشن ہوگا' مووی بنے گی۔ عریشہ آپا مجھ سے زیادہ حسین لگیں گی۔ پھاڑ کے

پھینک نہ دوں گی میں ایسا فوٹو البم جس میں میں کسی سے کمتر لگوں۔ زہر کھا کر مرجاؤں گی جو کسی نے عریشہ کی مجھ سے زیادہ تعریف کردی۔

تین چار گھنٹے تک میرے اور امان کے درمیان کشمکش چلتی رہی۔ کچھ مہمانوں کے کانوں میں بھی بھنک پڑی اور خالہ نے امان سے خود کہا کہ وہ مجھے جیولرز کے پاس لے جائے۔ زرکار جیولرز سے اپنا من پسند سیٹ لے کر میں سیدھی پارلر پہنچ گئی۔ عریشہ ہزار جتن بھی کرلیتی تو مجھ سے زیادہ حسین نہیں لگ سکتی تھی اور ہوا بھی یہ ہی۔ ہر کسی نے میری تعریف کی۔ عریشہ کی ساس تک میرے حسن کی مدح سرائی کررہی تھیں اور یوں بارات کی دلہن کے پہلو میں بیٹھے' ولیمہ کی دلہن نے محفل لوٹ لی۔

میری گردن فخر سے مزید اکڑ گئی۔ یہ فخروغرور کے موقعے پیدا کیے جاتے ہیں' خود بخود جھولی میں نہیں آگرتے۔

☆ ☆ ☆

"اپنی خالہ کی طرف آیا جایا کرو بیٹا! اس بیوہ نے مشکلوں بھری زندگی گزار کر امان کو پروان چڑھایا ہے۔ چار چھوٹے چھوٹے بچے' اکیلے' تن تنہا پالے ہیں تمہاری خالہ نے۔ اس بوڑھے درخت کا اکلوتا پھل ہے امان۔ اس کا بڑا حق ہے تم دونوں پر' بڑا حق ہے اس بوڑھے وجود کا اپنے پھل پر۔ خیال رکھا کرو ان کا۔"

ابا اکثر مجھ سے کہتے رہتے۔ مجھے بڑا غصہ آتا تھا۔ ابا بھی ناں بس! موقع دیکھتے ہیں نہ جگہ۔ شروع ہوجاتے ہیں۔

"اماں! ابا کو منع کردیں روز روز مجھے نصیحتیں نہ کیا کریں۔ خاص کر امان کے سامنے۔ نہیں جانا چاہتی میں خالہ کے گھر۔"

"سو بار منع کیا ہے میں نے بیٹا مگر ان کی عادت ہی ایسی ہے گھر کو بھی مسجد سمجھتے ہیں۔ کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ جانا چاہے گی تو چلی جائے گی ورنہ کون اس پر اپنا حکم چلا سکتا ہے۔ الٹا مجھے ٹوکتے ہیں کہ تمہیں سمجھاتی نہیں ہوں۔ کہتے ہیں تمہاری تو سگی بہن ہے' اپنی بیٹی سے کہو بہن کی خدمت کرے۔ کیوں کرے میری بیٹی کسی کی خدمت۔"

اماں مجھ سے زیادہ خالہ سے بے زار تھیں۔

امان ایک پرائیویٹ فرم میں مینیجنگ ڈائریکٹر تھے۔ پرکشش تنخواہ کے ساتھ گاڑی ملی ہوئی تھی۔ انہوں نے گھر میں کل وقتی ملازمہ رکھ دی تھی۔ ہم کبھی خالہ کے گھر بھی چلے جاتے تھے' ورنہ امان گاڑی میں ان سب کو بھر کر لے آتے۔ شادی سے پہلے ہی میرا الگ ہوجانا خالہ کو کھلا تو بہت تھا' لیکن مجھ پر کوئی زور نہیں چلا تھا۔ امان مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ وہ کسی صورت مجھے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ہاں البتہ انہوں نے اپنی ماں کو چھوڑ دیا اور یہی ماں کو برا لگا۔ جب خالہ کو امان خرچا دے رہے تھے تو انہیں بیٹے کی الگ خوش باش زندگی پر اعتراض کیوں تھا؟ مجھے تو یہ بوڑھے لوگ سمجھ میں نہیں آتے۔ اپنی زندگی گزار لیتے ہیں' ہمیں ہماری زندگی ہماری مرضی سے گزارنے نہیں دیتے۔

عرشی آپا کے گھر بیٹا ہوا تھا۔ وہ خالہ کے پاس تھیں۔ امان کو نجانے کیوں بھانجے سے اتنی محبت ہوگئی تھی کہ روز ہی وہاں پہنچ جاتے۔ میں زیادہ بہانے کرتی تو وہ اکیلے چلے جاتے' مگر میں پوری طرح چوکسی کرتی کہ وہ زیادہ دینا دلانا نہ کریں۔ خالو کی ٹھیک ٹھاک پنشن تھی اور زمین کی آمدنی الگ۔ اب ہر چیز امان کی ذمہ داری تو نہیں تھی ناں!

"انسان بڑی عجیب مخلوق ہے۔ عنایات کی بارش ہوتی رہے تو اس کو اپنا حق جان کر وصول کرتا ہے' دینے کی باری آتی ہے تو بوجھ سمجھنے لگتا ہے۔ بس یہی وقت ہوتا ہے غفلت کا۔ شکر کی طرف توجہ کرو' میری بچی' شکر کی طرف۔"

میں امان کے کھلے ہاتھ کا شکوہ اماں سے کررہی تھی

کہ ابا نے سن لیا اور مجھے سمجھانے لگے۔
"شکر کرتی ہوں ابا۔ ناشکری نہیں ہوں میں۔"
میں بلاوجہ ہی چڑ گئی۔
"آپ کو اتنا برا لگتا ہے میری بچی کا آنا تو نہیں آئے گی یہاں۔ ہر وقت نصیحتیں۔" اماں بھی شروع ہو گئیں۔
ابا تاسف سے سرہلاتے رہ گئے۔ "اسے سمجھانے کے بجائے تم اسے بڑھاوا دیتی ہو۔"
"کیوں ٹوکتے رہتے ہیں اسے ہر وقت۔ شادی شدہ ہے کیا اچھا برا خوب سمجھتی ہے۔"
"جتنی پیاری یہ مجھے ہے' میرا دل چاہتا ہے ویسی ہی پیاری بن جائے مالک کل کے حضور۔ میں تو بس یہی چاہتا ہوں۔ سج جائے اس کا پیارا وجود نیکی کی روشنی سے۔ چمک جائے اس کا اعمال نامہ۔ برا چاہتا ہوں کیا؟ تم بھی اس کو نیکی کی بات سمجھایا کرو۔ چھری سے چھری ٹکراتی ہے تو اس کی آب برقرار رہتی ہے۔"

٭ ٭ ٭

شادی کی سالگرہ آئی تو میں نے سرپرائز پارٹی ارینج کی۔ صرف میں اور امان۔ پور شفون کی پلین سرخ ساڑھی خریدی تھی اس دن کے لیے میں نے۔ وائٹ گولڈ کی پازیبیں میرے پیروں میں پہناتے ہوئے ان کے الفاظ مجھے اپنے نام کی طرح ہمیشہ یاد رہے۔
"تم میری زندگی کی بہار ہو ناجیہ۔"
"اور آپ میری زندگی کی امان۔"
ان ہی دنوں میری طبیعت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو اس نے خوش خبری سنائی۔ امان' اماں اور خالہ پہلے سے بڑھ کر مجھ پر نثار ہونے لگے۔ میرے قدموں تلے ہتھیلیاں رکھتے۔ مجھے پھولوں کی طرح سنبھالتے۔ اماں تو تقریباً" روزانہ ہی میری طرف آجاتی تھیں۔ پھر جاں فزا نے میری گود میں آکر زندگی کو مزید خوب صورت بنا دیا۔
امان کی پروموشن ہو گئی' وہ ڈائریکٹر ہو گئے تھے۔ وہ جاں فزا کو بہت خوش قسمت کہتے تھے۔ بہت لاڈ اٹھاتے اس کے بھی اور میرے بھی۔ ان ہی دنوں آمنہ اور مومنہ کی شادیاں ایک ہی گھر میں دو بھائیوں سے طے ہو گئیں۔ بقول خالہ شریف لوگ تھے' سادہ اور سفید پوش۔ کرائے کا گھر تھا۔ امان نے کرائے کے گھر پر اعتراض کیا تو خالہ نے سمجھا دیا کہ فی زمانہ گھر تو ہر کسی کو میسر ہے' شرافت ہی ناپید ہوتی جارہی ہے۔ خاندانی لوگ ہیں۔ آمنہ' مومنہ کو خوش بھی رکھیں گے اور ہماری عزت بھی کریں گے۔
لیکن امان کو پتا نہیں کیا سوجھ رہی تھی کہ بس بہنیں کرائے کے گھر میں نہ جائیں۔ کیا دنیا رہتی نہیں کرائے کے گھروں میں؟ وہ کیا انوکھی تھیں؟ ایک بے چینی ہی تھی' امان کو کہ بس کچھ کروں ان کے لیے۔ وہ تو مجھے کہاں بتاتے' مگر میری خوش قسمتی کہ ان کی ڈیلر سے ہونے والی بات چیت میں نے سن لی تھی۔ تیس' بتیس لاکھ کا ذکر ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی قسم دے کر امان سے ساری بات اگلوالی۔ بس میں نے اپنے لیے کوٹھی خریدنے پر اصرار شروع کر دیا' لیکن امان نے بھی جیسے ضد باندھ لی تھی کہ اس بار وہ میری کوئی ضد پوری نہیں کریں گے۔ بہنوں کی محبت کا بھوت سرپر سوار تھا ان پر۔
ان کے سرپر بھوت سوار تھا تو میرے سرپر بھی وہی بھوت سوار تھا۔ میں نے نو ماہ کی جاں فزا کو چھوڑا ان کے پاس اور آگئی اماں کے پاس میکے۔ جاں فزا دودھ کے لیے بلکتی تو امان کی جان نکلنے لگتی۔ خالہ آئیں' امان آئے' روتی ہوئی جاں فزا کو میرے حوالے کر کے جانا چاہا' لیکن میں بھی نہیں مانی۔ میں یہاں خواب دیکھتی رہ جاؤں اور وہ کوٹھی' بنگلے اپنی بہنوں کے لیے خریدلیں۔ پاگل سمجھا تھا کیا مجھے۔۔۔؟
ابا نے بہت سمجھایا مجھے' لیکن میں نہیں سمجھی۔ الٹا رو رو کر میں نے اپنا حشر کر لیا۔ خالہ آئیں جاں فزا کو لے کر' جسے میں نے اپنے سینے سے لگا لیا۔
"امان کے پاس جو کچھ ہے' وہ صرف تمہارا اور تمہاری بیٹی کا ہے۔ بس۔" خالہ نے بڑے دل گرفتہ انداز سے کہا اور مجھے لے کر گھر آگئیں۔ بہنوں کے لیے گھر کی خریداری موخر ہوئی۔ امان کچھ ہفتے ناراض

رہے' لیکن پھر میں نے انہیں منالیا۔

آمنہ اور مومنہ اپنے گھر کی ہو چکی تھیں۔ خالہ اکیلی ہو گئی تھیں۔ امان چاہتے تھے کہ اب ہم خالہ کو اپنے ہاں لے آئیں۔ ابا بھی وقتاً" فوقتاً" مجھے سمجھاتے رہتے تھے بلکہ اصرار کرنے لگے تھے۔ میں پھر امید سے تھی۔ امان کا اصرار بڑھا تو میری بھی طبیعت بگڑنے لگی۔ سوچ سوچ کر مجھے ڈپریشن ہونے لگا۔ کیا اسی دن کے لیے الگ گھر لیا تھا کہ ساس صاحبہ آکر براجمان ہو جائیں۔

ڈپریشن نے مجھے اسپتال پہنچادیا۔ بچہ الٹا تھا' آپریشن کرنا پڑا۔ اماں نے اس قدر شور ڈالا کہ ٹینشن کی وجہ سے ناجیہ کی طبیعت خراب ہو گئی اور آپریشن کرنا پڑا۔ خالہ اپنی جگہ چور ہو گئیں۔ رو رو کر دعائیں کرتی رہیں۔ امان کو میری جان کے خطرے نے ہلا ڈالا۔

ننھی مژدہ کی آمد نے نہ صرف مجھے ڈپریشن سے نکالا بلکہ خالہ کے جھنجھٹ سے بھی آزاد کرادیا۔ خالہ نے خود ہی امان سے کہہ دیا کہ عریشہ کا شوہر بیرون ملک ہوتا ہے' وہ عریشہ کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں۔ جب بھی ان کا دل چاہے گا' وہ ہمارے پاس آجایا کریں گی۔

میری جان اتنے بڑے خطرے سے باہر نکلی تھی کہ امان نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا اور خاموش ہو گئے۔

اماں تو تقریباً" میرے پاس ہی رہتی تھیں۔ سارا گھر بھی سنبھالیتیں اور میری بچیوں کو بھی۔ میں سب فکروں سے آزاد تھی۔ جی بھر کر بجتی سنورتی۔ مجھے دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ میں دو بچیوں کی ماں ہوں۔

خالہ کبھی عرشی آپا' کبھی آمنہ' مومنہ اور کبھی اپنے آبائی گھر میں رہتیں۔ امان زیادہ ضد کرتے تو ہمارے گھر بھی آجاتی تھیں۔ میرے جلے کٹے' تیکھے انداز کے باوجود امان کی بہنیں' بچیوں کی محبت میں مہینے میں ایک دوبار چکر لگاتی رہتی تھیں۔ بچیاں اب بڑی ہو رہی تھیں۔ جاں فزا کی طبیعت بالکل امان جیسی تھی۔ صلح جو اور امن پسند۔ اس کا رجحان اپنے ددھیال کی طرف بہت تھا۔ دادی پھوپھیوں پر قربان ہوتی تھی۔ خوب صورتی میں تو دونوں بہنیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں' لیکن جاں فزا ہر فن مولا بھی تھی۔ دل لگا کر پڑھتی تھی' اچھے مارکس لیتی تھی۔ ساتھ ساتھ کوکنگ' بیکنگ' سلائی کڑھائی کے کورسز بھی کرتی جارہی تھی۔ میں روکتی رہتی کہ کیا ضرورت ہے خود کو ہلکان کرنے کی۔ ایسی جگہ بیاہوں گی کہ ہاتھ نہیں ہلانا پڑے گا میری پری کو۔

"جہاں مرضی بیاہ دیجئے گا' مگر مجھے یہ سب سیکھنے دیں۔ یہ میرا شوق ہے۔ مجھے میرا شوق پورا کرنے دیں۔"

بی ایس سی فرسٹ ایئر میں تھی جاں فزا کہ عریشہ آپا اپنے بیٹے حارث کا رشتہ لے کر آئیں۔ وہ کمپیوٹر انجینئر بن رہا تھا۔ پیسہ بھی ٹھیک ٹھاک تھا ان لوگوں کے پاس' مگر وہ خوب صورت نہیں تھا۔ سانولا رنگ درمیانہ قد' دبے ہوئے نین نقش۔ پیسہ تو آہی جاتا ہے' لڑکوں کو نوکریاں بھی مل ہی جاتی ہیں' لیکن خوب صورتی اور وجاہت تو نہیں ملتی نا۔ میری بیٹی پری سی حسین اور وہ۔۔۔

"آپا! ابھی اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی عمر ہی کیا ہے جاں فزا کی۔" میں نے ٹالنا چاہا۔

"بچیوں کو بڑھتے کیا دیر لگتی ہے۔" خالہ بولیں۔

خالہ کو عادت تھی اپنی بیٹیوں کی طرف داری کرنے کی۔ میں بات ٹال رہی تھی اور وہ بات آگے بڑھا رہی تھیں۔ میری طرف سے گرم جوشی نظر نہیں آئی تو امان سے ذکر کیا۔ اسے راضی کرنے لگیں۔ امان کو تو حارث یوں بھی بے حد پسند تھا۔ انہوں نے جاں فزا سے پوچھا تو اس نے بھی رضامندی ظاہر کردی۔ میں دونوں سے روٹھ کر کمرے میں بند ہو گئی۔

"جاں فزا کی شادی ہو گی اور میری موت۔ سمجھ لیں آپ سب۔"

معمولی سی بات کو میں کہاں سے کہاں لے گئی۔ کوئی میری انا پر ضرب لگائے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ جب میں نے آپا کو ٹال دیا تھا تو خالہ' امان اور جاں فزا کون ہوتے تھے ہاں کہنے والے۔ اب ہاں کہا تھا تو بھگتیں پھر۔ گھر کا ماحول گھٹن زدہ ہو گیا۔ میں نے خود

کو سب سے الگ تھلگ کرلیا۔ چپ سادھ لی۔ روتی رہتی۔ بیمار پڑی رہتی۔ سب آ آکر سمجھاتے سمجھاتے ہار گئے۔ اماں نے کچھ ماضی کے حوالے دیے، کچھ میرے مزاج پر طنز کیے اور وہ الٹا مجھ سے لڑنے لگے۔

"عمر گزر گئی تمہاری ضدی طبیعت سے نباہ کرتے کرتے، لیکن تم نے ٹھیک نہ ہونے کی قسم کھالی ہے۔ میری محبت کا تم نے ہمیشہ ناجائز فائدہ اٹھایا ہے مگر اپنی بیٹیوں کی محبت کا تو ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ۔ ان کے مستقبل کے بارے میں ماں بن کر سوچو، خود سر عورت بن کر نہیں۔"

اماں اور بہت کچھ بھی کہتے رہے اور جاں فزا نے خود اپنی پھوپھو کو فون کرکے سہولت سے انکار کردیا۔

☼ ☼ ☼

ایک دعوت میں ماڈل ٹاؤن میں رہنے والی سمیعہ سہیل سے میری واقفیت ہوئی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی ارصم کا رشتہ جاں فزا کے لیے لے کر آئی تھی۔ لوگ جدی پشتی رئیس تھے۔ اماں کو اس رشتے پر بے حد اعتراض تھا۔ انہیں ارصم کے خاندان کے رنگ ڈھنگ پسند نہیں آئے تھے۔ میں جانتی تھی کہ اب وہ ہر رشتے میں ایسے ہی کیڑے نکالیں گے۔ میں حارث کے لیے نہیں مانی تھی تو وہ کیوں مانتے۔ میری بلا سے کوئی نہ مانے میں نے تو ہاں کردی۔

منگنی کا فنکشن پی سی میں تھا۔ جاں فزا کی پنک نیٹ کی لانگ میکسی پر سارا کام چاندی کا تھا۔ پیچھے اس کا گھیرا اتنا لمبا تھا کہ اس کی کئی سسرالی بچیوں نے اٹھا رکھا تھا۔ ان سب نے ایک جیسی سفید فراکیں پہن رکھی تھیں۔ دمکتے ڈائمنڈ کے سیٹ کی روشنی اس کے معصوم اور خوب صورت چہرے کو عجیب سی ٹھنڈی روشنی بخش رہی تھی۔ ارصم نے بیش قیمت انگوٹھی کے علاوہ ڈائمنڈ کا کنگن بھی پہنایا۔

"اماں! دیکھا ہے آپ نے،" انہوں نے آپ کی بیٹی کو ہیروں میں تول دیا ہے۔"

"میری بیٹی خود ایک انمول ہیرا ہے، کوئی ہیرا اس کی برابری نہیں کرسکتا۔ میرا دل ابھی بھی اس رشتے پر راضی نہیں ہے ناجیہ۔"

"جانتی ہوں کیوں راضی نہیں ہے۔" انہیں جتائے بغیر میں رہ نہیں سکی۔

ارصم ہر ہفتے، عشرے جاں فزا کو کبھی لانگ ڈرائیو تو کبھی ڈنر کے لیے لینے آجاتا۔ میں سمجھا بجھا کر جاں فزا کو بھیج دیتی کہ وہ لوگ ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتے ہیں ایسی باتیں تو اب عام ہیں، لیکن وہ واپسی پر ذرا بجھی بجھی سی لگتی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ارصم تھوڑا بے باک ہے۔

"میں ارصم سے بات کروں گی۔"

جاں فزا کو تسلی دینے کے لیے میں نے کہہ دیا۔ بات میں نے کی، لیکن یہ کہ ہم دونوں کی شادی کردیتے ہیں، کیا ضرورت ہے منگنی کو طول دینے کی۔ وہ تو خود یہی چاہتا تھا۔ جاں فزا کو پڑھائی چھوڑنے کا قلق تھا۔ میری منت کرتی رہی کہ امتحانات تک تو ٹھہر جائیں، لیکن اب جب میں نے ہی بات منہ سے نکال دی تھی تو واپس کیسے لیتی۔

میں تو منگنی پر ہی ان لوگوں کی لائی چیزوں کے حوالے سے پریشان تھی کہ جہیز میں کیا رکھوں۔ اپنی ساری بچت اور زیور نکال کر میں نے اس کے کپڑے اور زیور بنوانے شروع کردیے۔ انہوں نے جہیز سے انکار کردیا، البتہ سہولت سے کہہ دیا کہ دینا ہی ہے تو کیش دے دیں۔ ہم نے نقد ہی دینے کا فیصلہ کرلیا۔ ہمارا جو بھی تھا ہماری بچیوں کا ہی تھا۔

ولیمہ پر فیروزی جمپر اور گولڈن فرشی غرارے میں مغلائی جڑاؤ زیورات پہنے میری بیٹی تو کسی اور ہی دنیا کی شہزادی لگ رہی تھی۔ نظر ہی نہیں ٹھہر رہی تھی اس پر، مگر اس کی آنکھوں میں مجھے دلہن والی چمک نظر نہیں آئی۔

میں نے پوچھا تو فوراً ارصم بولا۔ "آنٹی بہت تھک گئی ہے یہ۔ جاں فزا تم فلائٹ میں سو جانا۔ اب تو مسکراؤ، سب پوچھ رہے ہیں۔"

"کہاں جانا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"پیرس۔ پھر لندن۔۔۔ ورلڈ ٹور پر آئی۔"

پیرس کے بجائے وہ دبئی گئی۔ اس نے ہمیں فون کیا کہ وہ ٹھیک ٹھاک ہے' مگر اس کے بعد اس کا ہمیں کوئی فون نہیں آیا۔ ایک ہفتہ انتظار کرکے ہم اس کے سسرال پہنچے تو گھر میں صرف نوکر موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آج کل سب دبئی گئے ہوئے ہیں۔ نوکروں کے پاس دبئی کا کوئی نمبر نہیں تھا۔ سیمعہ کے گھر گئے تو پتا چلا کہ وہ لوگ تو ولیمہ کے اگلے دن ہی ملائیشیا چلے گئے تھے۔

ان ہی دنوں عریشہ آپا نے اپنی نند کی بیٹی سے حارث کا رشتہ طے کردیا۔ ہم منگنی میں شامل ہوئے۔ سب کے پوچھنے پر ہم نے یہی بتایا کہ جاں فزا ہنی مون پر ورلڈ ٹور کے لیے گئی ہوئی ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی' لیکن بتاتے ہوئے میرا لہجہ کمزور تھا۔ اسی رات کو جاں فزا سے تھوڑی دیر کے لیے فون پر بات ہوئی۔ بڑے دبے دبے انداز سے بات کررہی تھی۔ پھر جلدی سے فون بھی بند کردیا۔ امان تو فکر مند ہوگئے۔

دس بارہ روز بعد ارصم کا فون آیا کہ جاں فزا کو بخار ہے۔ اس کے ٹھیک ہوتے ہی وہ لوگ واپس آجائیں گے۔ جاں فزا سے بات نہ ہوسکی' وہ سورہی تھی۔

اس کا بخار اترا یا نہیں اترا۔ وہ ٹھیک ہے یا نہیں ہے۔ ہماری جان یہاں لبوں پر تھی۔ امان نے میری جان عذاب میں کی ہوئی تھی۔ خاندان بھر میں الگ چہ مگوئیاں ہورہی تھیں۔ خاندان تو ویسے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا کہ کیسے میں نے اتنے رئیس لوگ اپنی بیٹی کے لیے ڈھونڈ لیے۔

"ارصم کے گھر والے کیوں غائب ہیں۔ ہم سے رابطہ کیوں نہیں کررہے؟ شادی کے بعد ہی سب غائب ہوگئے۔"

امان مجھ پر چلاتے۔ میں انہیں کیا جواب دیتی میں تو خود پریشان تھی۔ رات دن رو رو کر دعائیں کرتی کہ یا اللہ میری بچی خیریت سے ہو۔

لیکن وہ خیریت سے نہیں تھی۔ ایک صبح ہم سب ناشتا کررہے تھے کہ دبئی سے ایک خاتون وکیل کا فون آیا۔ امان ان کی بات سن کر تڑپ اٹھے۔ اگلے دن ہی وہ دبئی کے لیے روانہ ہوگئے۔

"دعا کرنا ناجیہ بیگم کہ میری جاں فزا زندہ ہو۔ اگر میری بیٹی کو کچھ ہوا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔"

مجھے تفصیل بتائے بغیر' یہ دھمکی دے کر وہ چلے گئے۔ ان کا فون آتا تو وہ صرف مژدہ سے بات کرتے اور مژدہ یہی کہتی کہ جاں فزا کی طبیعت خراب ہے۔ دو ہفتے بڑی مشکل سے گزرے۔ سترہویں دن شام کو امان جاں فزا کو لے کر آئے۔۔۔

شکستہ حال' اجڑی ہوئی' ویران' ہوش و خرد سے بے گانہ کوئی وجود تھا۔۔۔ وہ میری جاں فزا تو نہیں تھی۔۔۔

مژدہ تو چیخ چیخ کر رونے لگی۔ میرے کپکپاتے ہاتھوں کو امان نے پرے دھکیل دیا۔ امان نے اسے اسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا۔ وہی دن رات اس کے پاس رہتے یا پھر مژدہ۔۔۔ مجھے تو وہ اس کے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتے تھے۔

شادی کے دو ہفتے بعد ہی ارصم نے اسے طلاق دے دی تھی اور سارا روپیہ اور زیور چھین کر بھاری رقم کے عوض دبئی کے شیخ کے حوالے کردیا تھا۔ یہی ارصم اور اس خاندان کا کاروبار تھا اور یہی اس کا اصل روپ۔ پوری طرح تباہ کرنے کے بعد اس شیخ نے ہوش خرد سے بے گانہ جاں فزا کو اسپتال میں ہی چھوڑ دیا۔ اسپتال سے ہی ایک این جی او نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

تڑپ تو ہم سب رہے تھے' لیکن ابا اور خالہ نے سر کو سجدوں سے اٹھنے نہیں دیا۔ ان کی دعائیں رنگ لے آئیں اور آٹھ ماہ بعد جاں فزا ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔ وہ جسمانی طور پر ٹھیک ہونے لگی' لیکن ذہنی طور پر وہ وہیں کھڑی تھی جہاں سے برباد ہوئی تھی۔ جاں فزا کے دکھ نے مجھے روگ لگا دیا۔ میں اتنی وہمی ہوگئی کہ اسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ اسے خوش کرنے کے ہزار جتن کرتی۔ امان مجھے یہ سب

کرتے دیکھتے تو چڑ جاتے۔

"اب تو اکیلا چھوڑ دو اسے۔ کیا چاہتی ہو اب تم اس سے؟"

کیا کوئی ماں اپنی اولاد کے لیے برا چاہ سکتی ہے؟ کیا میں نے جاں فزا کے لیے برا چاہا؟ میں نے تو بس اس کو روشن مستقبل دیا اور ارصم سے شادی کر دی۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی یا میری کہ یہ سب ہو گیا۔

مژدہ فائن آرٹس کے فائنل ایئر میں تھی۔ عریشہ آپا کا چھوٹا بیٹا صمیم اس کا ہم جماعت تھا۔ دونوں نے کب شادی کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ بالا ہی بالا اماں سے بات کر کے ان کو راضی بھی کر لیا۔ مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا گیا کہ پوچھ ہی لیا جاتا۔ یہ حیثیت رہ گئی تھی اب میری۔ جو بھی ہے میں ماں ہوں گھر کی مالکن ہوں۔ کوئی بالا ہی بالا میرے گھر کے معاملات طے کر دے اور میں منہ دیکھتی رہ جاؤں۔

میرا بی پی شوٹ ہو گیا۔ غصے سے میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے سرے سے اس رشتے سے ہی انکار کر دیا۔ میں نے مژدہ کو جاں فزا کی طرح اپنی طرف لانے کی کوشش کی، لیکن وہ جاں فزا نہیں تھی جو فون اٹھاتی اور پھوپھو کو فون کر کے انکار کر دیتی۔ میرا انکار اقرار نہیں بنا تو اس کا اصرار بھی نہیں ٹلا۔ اس کا فیصلہ اٹل رہا۔ الٹا وہ مجھ سے ناراض ہو گئی۔ میں نے منانے کی کوشش کی تو اس نے ایک ہی بات میں ساری باتیں گنوا دیں۔ میری شادی کے ستائیس سال اور اس کی عمر کے پچیس سال۔ اس نے جو جو دیکھا، محسوس کیا، اس نے سب مجھے گنوا دیا۔ ایک ہی فقرے میں، ایک ہی جست میں اس نے میرا سارا ماضی، میرا مزاج، میری ذات لا کر میرے سامنے کھڑی کر دی۔

"تباہ کر دیا آپ نے جاں فزا کو... ہمیں... اور خود کو بھی... خود کو بھی..."

جو آئینہ مجھے ان لفظوں نے دکھایا اس میں مجھے اپنی مکروہ صورت رات بھر نظر آتی رہی۔ جاں فزا کی روتی روتی، اداس صورت بھی۔ میں نے اسے شہزادی بنانا چاہا، لیکن اسے چاروں شانے ایسا چت کیا کہ وہ زندگی سے منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کا چھپ چھپ کر رونا، اس کی سسکیاں میرے اعصاب پر ہتھوڑے برساتیں۔ میں خود سے سوال کرتی۔

"میں نے تو سب ٹھیک کرنا چاہا تھا، لیکن غلط کہاں ہوا؟ اس کا نصیب ایسا کھوٹا کیوں نکلا؟"

"بیٹی! نصیب کا کھوٹ بدل سکتا ہے۔ اعمال کا کھوٹ کوئی کیسے بدلے گا۔"

ابا کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ خالہ کی تنہائی اور کمزوری کا خیال مجھے ڈرانے لگا۔ مجھے لگا روز قیامت ہے اور میرے اعمال کی سیاہی مجھ پر تھوپ دی گئی ہے۔ ہر طرف سے صدائے نفرین آ رہی ہے۔ میں بلک بلک کر رو رہی تھی اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ رہی تھی۔ پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ جاگی تو جاں فزا میرے سرہانے بیٹھی تھی۔

"کیا ہو گیا تھا ماما آپ کو؟ اتنی ٹینشن نہ لیا کریں۔ آنکھیں دیکھیں اپنی۔ نہ رویا کریں میرے لیے اتنا۔ اللہ ہے نا میرے ساتھ۔" اس نے جھک کر میرا رخسار چوم لیا۔

زندگی کی دلدل میں ڈوب کر وہ کنول بن کر نکلی تھی... میری جاں فزا... اور میں... مجھے خود پر افسوس ہوا۔

"اپنی پھوپھو کو فون کرو، ان سے پوچھو وہ کب صمیم کا رشتہ لے کر آنا چاہتی ہیں۔ چاہیں تو آج رات آ جائیں۔ اگر وہ آج رات کا کہیں تو اپنے پاپا کو آفس کر کے جلدی آنے کے لیے کہہ دینا۔"

جاں فزا نے حیرت و خوشی سے مجھے دیکھا۔ "کیا واقعی ماما؟"

میں نے سر ہلا دیا تو وہ اپنی بہن کی خوشی میں تقریباً بھاگتے ہوئے کمرے سے باہر گئی۔ وہ خوش تھی کہ آخر کار اس کی بہن نے وہ پا لیا جو اسے نہ مل سکا، لیکن اب میں کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔ جاں فزا کی صورت، ضمیر کی خلش ہر سانس پر موت کی طرح بھاری رہے گی۔

تربیت

ملکا سمون

"بھابھی! آپ کھانا بالکل بھی اچھا نہیں بناتیں' آپ کے ہاتھ میں وہ ذائقہ ہی نہیں ہے جو کسی بھی لڑکی کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ خیر اس میں آپ کا بھی کوئی قصور نہیں۔ تربیت کی بھی بات ہوتی ہے۔" نمرہ نے اپنی شادی کے محض ایک ہفتہ بعد اپنی چھوٹی نند علیزہ کے منہ سے یہ بات سنی تو اس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔

سب گھر والے اس وقت اکٹھے بیٹھے کھانا تناول فرما رہے تھے مگر کسی نے بھی اس بدتمیزی پر اسے نہ ٹوکا۔ (لاڈلی بیٹی جو ٹھہری)

"اب دیکھیں ناں۔۔۔ یہ تو ماؤں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ بیٹیوں کی صحیح تربیت کریں۔۔۔ وہ انہیں اور کچھ سکھائیں یا نہ سکھائیں' مگر کوکنگ ضرور سکھائیں۔ لڑکیوں میں اور کوئی خوبی ہو نہ ہو' لیکن ان کو اچھا کھانا ضرور بنانا آنا چاہیے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں۔" بولنے کے ساتھ ساتھ وہ رغبت سے کھانا بھی کھا رہی تھی۔ آخر میں تائید چاہنے کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

حالانکہ میکے میں اس کے ہاتھ کا بنا کھانا سب ہی شوق سے کھاتے تھے۔ اس کے ہاتھ کے ذائقہ کی خاندان بھر میں دھوم تھی اور یہ چند ہفتوں بعد کی بات تھی جب سب گھر والے اکٹھے بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ کہ پڑوس سے دو چھوٹے بچے کھیلتے ہوئے ان کے گھر آگئے۔ علیزہ نے دیکھا کہ چھوٹے بچے نے ان کے صحن میں لگے پودوں میں سے ایک پھول توڑ لیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ان بچوں کی ماں انہیں لینے آگئی۔ نمرہ نے سنا' علیزہ اس لڑکی سے کہہ رہی تھی۔

"ماؤں کو چاہیے کہ وہ بچوں کی بہترین تربیت کریں' اپنے گھر میں وہ جیسے رہیں ان کی مرضی۔۔۔ مگر دوسروں کے گھر جب بھی جائیں تو تمیز سے ایک جگہ بیٹھے رہیں' نہ کوئی شرارت کریں اور نہ ہی فضول بولیں۔"

ماں اپنے بچوں کی انگلی تھامے وہاں سے چلی گئی اور پھر دوبارہ کبھی نہیں آئی۔

☼ ☼ ☼

علیزہ کے ساتھ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا۔ رامس نے اسے اس کی دوست کی شادی میں دیکھا اور پسندیدگی کی سند بخش دی۔ اور پھر دو ماہ کے اندر اندر وہ رامس کے سنگ رخصت بھی ہو گئی۔

علیزہ کے سسر عمرہ کر کے آئے تھے۔ سب ہی عزیز رشتے دار ان سے ملنے جا رہے تھے جب نمرہ اپنی ساس کے ہمراہ وہاں پہنچی تو اس نے دیکھا آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

مہمانوں کے بیچ پھرکی کی طرح گھومتی علیزہ سب میں

نمایاں تھی۔ وہ اس وقت کہیں سے بھی لاپروا' کام چور اور منہ پھٹ علیزہ نہ لگ رہی تھی۔ یہ علیزہ اس وقت مسکرا مسکرا کر مہمانوں کو لوازمات پیش کر رہی تھی۔ یعنی ہمہ وقت انگارے چباتی علیزہ کے سسرال جا کر سارے کس بل نکل چکے تھے۔

"سوچا تھا کہ بہو آجائے گی تو سارا گھر سنبھال لے گی مگر تم سے تو کوئی کام ڈھنگ کا نہیں ہوتا' دو دن سے تم نے یہی سوٹ پہنا ہوا ہے' ڈرائنگ روم کی صفائی بھی ٹھیک طرح نہیں کی اور مہمانوں کے لیے جو چائے تم نے بنائی تھی کتنی بدمزہ اور پھیکی سی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتی ہو تاکہ تمہاری وجہ سے مجھے مہمانوں کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے۔"

نمرہ پانی پینے کچن میں آئی تھی کہ یہ آوازیں اس کے کانوں میں پڑیں۔ علیزہ کی ساس اسے بے نقط سنا رہی تھیں۔ نمرہ کو دیکھتے ہی وہ علیزہ کی شکایت کرنے لگیں کہ علیزہ صفائی ٹھیک سے نہیں کرتی' کھانے میں نمک ڈالنا بھول جاتی ہے' راس کو ہمارے خلاف بھڑکاتی ہے' میلے کچیلے حلیے میں مہمانوں کے سامنے چلی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

علیزہ سر جھکائے خاموشی سے سنتی رہی' آنسو اندر اتارتی اور لب کچلتی رہی۔

"مگر اس میں اس کا کیا قصور' اس کی ماں کی تربیت ہی ایسی ہوگی یہ تو ماؤں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ بچیوں کی ایسی تربیت کریں کہ کسی کو شکایت کا موقع ہی نہ دیں۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ اور علیزہ کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اپنے کہے ہوئے بڑے بول آج سامنے آرہے تھے۔ آج کسی نے اس کی ماں کی تربیت کو غلط کہا تو کتنی تکلیف ہو رہی تھی۔ آنکھوں سے بہتا نمکین' بے رنگ پانی چپکے چپکے اس کا چہرہ بھگو رہا تھا۔

☆

صحرا کا آگ اگلتا سورج، شدید پیاس، پھوڑے، پھنسیوں سے بھرا جسم وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ نام، عہدہ، شخصیت، رشتے، محبت، نفرت.... اس لمحے اسے اپنے گناہ یاد آرہے تھے وہ اللہ کو پکار رہا تھا۔

ماہ رو، اریبہ، حلیمہ اور حسن المآب کالج میں دوست تھیں۔ ماہ رو کا آزاد خیال اور ماڈرن گھرانے سے تعلق ہے۔ اریبہ ایک مڈل کلاس فیملی سے ہے اور بڑی بہنوں کے رشتے نہ ہونے سے پریشان رہتی ہے۔ حلیمہ کا تعلق ایک بہت مذہبی گھرانے سے ہے۔ حسن المآب غیر معمولی حسین ہے۔ اس نے سن شعور سے اپنے گھر میں شریعت کے احکام نے اور مذہب کی سختی سے پابندی دیکھی ہے۔ مفتی عبیدالرحمٰن اس کے نانا تھے۔

حسنل کا خاندان تبلیغ دین کے لیے مشہور تھا۔ جبکہ حلیمہ کے گھر والوں کی حیثیت ان کے مریدین جیسی تھی۔ حلیمہ کے والد کی انتہاپسندی کی وجہ سے حلیمہ کی بڑی بہن اور دو بھائیوں کے رشتے نہ ہو سکے تھے۔

حلیمہ اپنے والد کا پرتو تھی، جبکہ حسنل اپنے مذہبی ماحول سے شدید بے زار تھی۔

میری اپنی خالہ زاد کی شادی میں شرکت کرنے چرچ جاتی ہے۔ وہاں دولہا یوحنا اسے شکوہ بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ یوحنا نے پہلے اس کے لیے رشتہ دیا تھا۔ ماما کو بھی شدید رنج ہے کہ میری نے یوحنا کے رشتے سے انکار کیوں کیا۔

حسنل کے لیے عبدالمبین اور عبدالمتین کا نام لیا جاتا ہے۔ جن سے حسنل شدید نفرت کرتی ہے۔

حسنل ماہ رو اور اریبہ کے شدید اصرار پر ایک میوزک کنسرٹ میں جاتی ہے۔ وہاں موسیٰ بی کو دیکھتی ہے۔ اسے لگتا

سائرہ رضا

ہے کہ جس شخص کو وہ اپنے تصورات میں دیکھتی رہی ہے۔ وہ موسی ہی ہے۔ اس کا خیالی پیکر مجسم ہو کر سامنے آگیا تھا۔
عقیلہ بیگم اپنے پوتے کے آنے سے بہت خوش تھیں۔ ان کا پوتا ساری زندگی ان سے دور رہا تھا۔ ان کا پوتا ماورائی حسن کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بے حد نازک مزاج بھی تھا۔ خصوصاً کھانے کے معاملے میں اس کے ہزار نخرے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے خاص طور پر شیف رکھا تھا۔

۲
دوسری قسط

گہری نیند میں یہ خواب کا عالم تھا۔ سفید گھوڑوں کی رتھ پر سوار وہ بادلوں میں اڑتی جاتی تھی۔ وہ سفید جالی دار لباس میں تھی اور فراک کا گھیر نظروں کو تھکا دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر جوش، خوشی، بے تابی کے رنگ چمکتے تھے۔

اور اس کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے وہ تمام تارے بھی تھے، جو کبھی زمین سے دیکھنے پر دور، بہت دور لگتے تھے اور اب... اوہ... وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کر تارے توڑنے لگی۔ پھر اس نے انہیں اپنے دامن میں بھرنا شروع کر دیا۔ وہ محبوب سے ملنے جا رہی تھی۔ اسے آدھے سفر پر کچھ پھول ساتھ لانے کا خیال آیا، مگر تب تک تو زمین بہت پیچھے رہ گئی تھی۔
(اور پھول تو زمین پر ہی کھلتے ہیں نا۔)
چلو خیر اب وہ یہ سارے تارے اس کے قدموں میں ڈھیر کر دے گی اور چاند... وہ متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ مگر اس سے پہلے رتھ رک گئی۔ اوہ سفر تمام... وہ فراک کے گھیرے کو بدقت پکڑے نیچے اتری۔ اس کی آنکھوں سے غیر معمولی جوش و خوشی جھلکتی تھی۔
نہ جانے کس نے سرخ قالین بچھا دیا تھا اس کی رہنمائی کی خاطر اور محبوب کہاں تھا؟
ہاں وہ سامنے... سفید و گلابی مہین پردے ہوا سے

مکمل ناول

ملتے تھے اور وہ رخ موڑے اسی کا منتظر تھا۔
اور یہاں تک کا خواب وہ کتنے عرصے سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ساری رکاوٹیں عبور کر کے اس تک پہنچ ضرور جاتی تھی۔ مگر سلام و کلام سے پہلے سلسلہ ٹوٹ جاتا۔
مگر اسے صورت ہر بار کسی نہ کسی پردے کے پار نظر آتی تھی۔ مگر اس بار خواب برقرار تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے دامن کے تاروں کو سنبھالا اور بہت عجلت کے عالم میں آگے بڑھی۔ محبوب نے رخ بدل لیا تھا۔ وہ جیسے اس کی الجھن کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے قدموں میں تیزی آگئی۔ ہوا بہت تیز ہو گئی۔ پردے ایسے اڑنے لگے کہ آپس میں الجھنے لگے۔ اس کے لیے سب کچھ سنبھالنا ناممکن ہو گیا۔ اس نے سخت بے بسی سے محبوب کو دیکھا کہ اب کیا کروں۔
وہ اس کی طرف آرہا تھا۔ پردے اس کے راستے میں حائل نہیں ہو رہے تھے۔ اور پھر وہ اس کے روبرو آگیا۔ اتنا قریب کہ وہ ہاتھ بڑھا کر چھو لیتی' مگر اس کے لیے ذرا سی جنبش کرنا بھی محال تھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ جسے دیکھنے میں ہمیشہ پردے حائل تھے' پر آج... آج تو وہ خود اس تک بڑھ آیا تھا۔
ہو بہو... وہی... جیسا اس نے سوچ رکھا تھا۔ بلکہ تصور تو کچھ بھی نہ تھا۔ جو حقیقت تھی۔
اس نے اس کی سمت ہاتھ بڑھایا۔ اچانک اسے پیچھے سے دھکا سا لگا۔
آف... آف...
"نماز کا وقت نکل گیا حسنل... اتنی گہری نیند... تمہیں تو کبھی بھی نماز کے لیے نہیں اٹھایا گیا۔" وہ اسے بری طرح ہلا رہی تھی۔ "سب سے پہلے بغیر کہے اٹھتی ہو۔ کن خوابوں میں ہو بہن؟"
"ہاں..." اس نے منہ سے تکیہ ہٹا دیا۔ سامنے تبسم و تحیر کے ملے جلے تاثر کے ساتھ نماز پڑھ کر آجانے والی صبغہ تھی۔ وہ دوپٹا کھول رہی تھی۔
خواب... اوہ تو خواب... یہ اس کا کمرہ تھا اور سامنے صبغہ تھی۔ اس نے سختی سے پپوٹے بھینچے... اور
کاش صبغہ اسے نہ پکارتی تو... پچھتاوے سے لبریز طیش اسے پھونکنے لگا۔
"کیا بہت مزے کا خواب تھا؟" صبغہ دوستانہ انداز میں اس کے قریب بیٹھی۔
حسنل نے ٹھنڈا سانس کھینچا۔ "نہیں' خواب نہیں تھا۔"
"خواب نہیں تھا مطلب...؟" صبغہ نے دہرایا۔
"تعبیر تھا۔" حسنل ابھی بھی حاضر نہیں تھی۔
"تعبیر..." صبغہ نے پھر دہرایا۔ اس کے پلے ایک لفظ نہیں پڑا تھا۔
"کیا فضول بول رہی ہو' لگتا ہے ابھی پوری طرح سے جاگی نہیں ہو۔" صبغہ نے نتیجہ اخذ کیا۔ اور اٹھ کر کھڑکی سے پردے سرکانے لگی۔
حسنل کی نظریں آسمان کی سمت اٹھ گئیں۔ وہ ہنوز سیاہ تھا۔ حسنل نے اپنے دل کو غم سے پھٹتا محسوس کیا۔ وہ اب اپنی خالی ہتھیلیاں دیکھ رہی تھی اور اگر وہ صبغہ کو بتائے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے تارے توڑے تو وہ کتنا ٹھٹھا اڑائے گی نا۔
"تعبیر تو کھڑکی سے باہر کھڑی ہے حسن المآب..." صبغہ کی آواز میں سرخ رنگ کی سی شوخی تھی۔
"تعبیر..." حسن المآب نے دہرایا۔ "باہر... باہر کہاں؟" وہ وہاں سے کھڑکی تک پہنچی۔ صبغہ کی نگاہوں میں بھی سنہری شوخی جھلملانے لگی۔
"کہاں ہے تعبیر؟" حسنل کو تو کچھ نظر نہ آیا۔
"ارے کم نظر آتا ہے کیا... وہ دیکھو بائیں جانب... عبدالمبین بھائی دکھائی نہیں دے رہے۔"
صبغہ کو اس کی کم نگاہی پر افسوس ہوا۔ (وہ واک کر رہا تھا۔) اور حسنل کے پورے وجود پر برف سی گر گئی۔ وہ بولی تو لہجہ چٹختا ہوا تھا۔
"تم نے اسے تعبیر کہا ہے۔"
"تو کیا غلط کہا ہے۔" اس کی آواز با اعتماد تھی۔
"ہاں... بالکل غلط..." وہ کھڑکی سے دور ہٹ گئی۔ اس کے چہرے پر غصہ و ناگواری تھی۔
"تو یعنی..." صبغہ نے انگلی ہونٹ پر ٹکا کر کچھ

سوچا۔ وہ ایک قدم آگے آئی' آواز مدھم تھی' مگر اس میں اک خوشی کا عنصر بھی تھا۔ جیسے کچھ پالیا ہو۔
"یعنی تم عبدالمبین بھائی کو تعبیر نہیں سمجھتیں۔"
"میں صبح صبح فضول باتوں میں وقت برباد نہیں کرنا چاہتی۔ ہٹو سامنے سے' جوتی پہننے دو۔"
"اچھا تو یہ فضول بات ہے۔" صبغہ تو اٹک گئی تھی۔" اس کا مطلب ہوا۔ مجھے عبدالمتین بھائی کا نام لینا چاہیے تھا۔" واش روم کا دروازہ کھولتی حسنل کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔
"میرا مطلب ہے اس دن ممانی جان نے ہی تو کہا تھا۔ عبدالمبین یا عبدالمتین' کوئی زبردستی نہیں۔"
اتنی ٹھنڈی صبح میں حسنل کے وجود میں شرارے دوڑنے لگے۔ صبغہ کسی مزے کے جواب کی بے چینی سے منتظر تھی۔
"زبردستی تو خیر کوئی بھی نہیں کر سکتا۔" وہ نہ جانے کس تناظر میں کہہ رہی تھی۔ جیسے خود سے عہد کر رہی تھی۔ صبغہ ہنس پڑی۔ سحر نمودار ہونے کو تھی۔ نماز کا وقت ختم ہونے والا تھا۔ وہ وضو کرنے لگی۔
اتنے خوب صورت خواب کی ایسی بھیانک تعبیر۔
صبح صبح صبغہ کی بے ہودگیاں۔۔۔ اور عبدالمبین کی صورت۔۔۔ وہ نماز کے لیے کھڑی ہوئی تو صبغہ باہر نکل گئی۔ کالج کے لیے جب جگانے پہنچی تو حسنل کو گہری نیند میں پایا۔ آوازوں پر بھی نہ اٹھی۔ صبغہ شانے اچکاتی چلی گئی۔ حسنل نے چہرہ تکیہ میں دے دیا۔ وہ لاشعور میں دیکھے ہوئے خواب کو اب شعوری کوشش سے ری وائنڈ کر کر کے دیکھ رہی تھی اور یہ بڑے ہی مزے کا کھیل تھا۔ اتنا خوب صورت خواب اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کاش صبغہ نہ جگاتی۔ پچھتاوا ریت بن کر دانتوں میں رگڑ کھاتا رہا۔

کبھی کبھار وہ ایسے ہی اکتا جاتی تھی۔ اپنے اردگرد کی ہر شے سے۔۔۔ اسے لگتا وہ روبوٹ ہو' مشینی انداز میں سارے کام انجام دیتا ہے۔ روبوٹ کے اندر دل نہیں ہوتا۔

کاش وہ اس وقت پاکستان ریلوے کی کسی ٹرین میں بیٹھی ہوتی اور ڈونگا بونگا سے کچا کھوہ یا ٹھٹھے کھوہ جا رہی ہوتی۔ تو کتنے آرام سے اپنے دونوں پیر کرسی پر رکھ کر اس پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیتی۔ گردن گھما کر مناظر حفظ کرتی یا پھر کھڑکی سے منہ نکال لیتی اور ہوا سے جلتی کٹتی آنکھوں کو جھپکا جھپکا کر ظاہر کرتی کہ رونا نہیں آ رہا یہ تو بس یونہی۔۔۔
مگر دو مسئلے پیدا ہو گئے تھے۔ وہ انگریزوں کے دیس میں تھی۔ ان کی ٹرین میں' ان کے لباس میں تو اتنی ساری انگریزیت تقاضا کرتی تھی کہ وہ شرافت' پر تکلف انداز میں رہے۔ اور اگر جاگ رہی ہے' تو کتاب پڑھ لے۔
ٹرین تو بس کھانے پینے یا سونے کے لیے ہوتی ہے۔
کاش ابھی کوئی آئے اور کہے 'انڈے گرم انڈے' موم نگ پھلی گرم کرتے متھی مونگ پھلی۔۔۔ چائے ناشتہ۔۔۔ گھر کے دودھ کی تازہ چائے۔۔۔ چائے۔
آوازوں نے اسے ہراساں کر دیا۔ خود پر چڑھا خول ٹوٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے سیل رواں جاری ہو گیا۔
اس نے گھور کر سب کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ مگر کوئی متوجہ نہیں تھا۔
اس نے ٹھوڑی گریبان میں دے لی گویا رونے کے لیے خود کو ایک محفوظ جگہ فراہم کر دی۔ تو دراصل وہ رونا چاہتی تھی۔ آنسو بہتے رہے' دل ہلکا ہوتا رہا۔
"غم میں ایک خاص بات ہے۔ یہ ہر بار نئے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہی حال یادوں کا ہے' بڑا دھوکا دیتی ہیں' جب دل یہ سوچتا ہے کہ اب سب بھول گیا اور آگے بڑھنا چاہتا ہے تب یہ ایسی شان سے وارد ہوتی ہیں اور یوں پیچھے دھکیلتی ہیں کہ پتا چلتا ہے۔ محض گمان تھا کہ ہم آگے بڑھ گئے ہیں' ہم تو وہیں کھڑے ہیں

جہاں سے کبھی چلے تھے۔
اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا اسے اتنا رونا آ کس لیے رہا ہے۔ پھر خود ہی ٹوٹی تھی' خود ہی جڑ گئی۔

آنکھیں صاف کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔

کوئی اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ ہوتی نا اگر وہ پاکستان کی ریل گاڑی میں تو کتنے لوگ اس سے پوچھ چکے ہوتے 'وہاں تو۔ اپنا کندھا پیش کر دیتے۔ یہاں تک کہ گلے لگا لیتے مگر۔۔۔ اور آج اسے پاکستان اتنا یاد کیوں آ رہا تھا اور اس سے بڑا یہ سوال' وہ کیوں چاہتی تھی اس سے پوچھا جائے کہ کیوں روتی ہو کیا ہوا؟ اس نے پاس بیٹھے انگریز کو دیکھا' وہ اخبار پڑھ رہا تھا۔

"کیسی کون سی خبر ہے۔ جو ساتھ بیٹھ کر روتی لڑکی سے بھی زیادہ توجہ کی طالب ہے۔ اس نے گردن اچکا کر کھلے اخبار کو دیکھا۔

اوہ۔۔۔ وہ سب بھول بھال گئی۔ وہ اسی خبر کو پڑھ رہا تھا جس کے لیے اس نے دعا مانگی تھی' اللہ کرے جھوٹ ہو۔ یونہی بے پرکی بکواس۔

مگر یہاں زیادہ تفصیل سے ذکر تھا اور وہ جیسے جیسے پڑھ رہی تھی' اس کے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔ صاحب اخبار نے بالآخر اس کی طرف دیکھ لیا۔ وہ خبر پڑھنے کے شوق میں اس کے کندھے سے تھوڑی چپکائے جھک گئی تھی۔ یکدم سیدھی ہوئی' انگریز کی سوالیہ نگاہیں اس پر رک گئیں۔ پھر اس نے اپنی شہادت کی انگلی اٹھا کر پلک سے ٹپک جانے کو بے قرار آنسو کی سمت اشارہ کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اس کے لیے۔" اس نے اپنی شہادت کی انگلی اخبار میں موجود تصویر پر رکھ دی۔ "میں اس شخص کے لیے رو رہی تھی۔"

"کیا تم اسے جانتی ہو؟" انگریز کی آواز بھی اس کی شکل کی طرح اجنبی اور بے تاثر تھی۔

"آں۔" وہ چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے' ہاں میں اسے جانتی ہوں یہ۔۔۔"

"تمہارا بوائے فرینڈ؟"

"نہیں۔۔۔" اس کا چہرہ ہونق ہو گیا۔ وہ ہنوز منتظر تھا۔

"(تو پھر کون۔۔۔؟)"

"وہ میرا اسٹیشن۔۔۔" اس کے لیے اللہ کی طرف سے مدد آئی گویا۔

وہ بھاگتے ہوئے دروازے تک پہنچی۔ سب قطار در قطار اتر رہے تھے' اس نے انگریز کی سمت دیکھا۔ وہ اخبار کو لپیٹ رہا تھا پھر اس نے اس کا رول بنا کر پاس بنے اسٹینڈ پر رکھ دیا۔

کسی کی جان پر بنی تھی اور کسی نے اتنی بے دردی سے لپیٹ دیا تھا۔ اور پھر وہ اس رول کو یہیں بھول جائے گا اور پھر خبر پرانی ہو جائے گی۔

نیا مسافر اخبار کو کھولے گا' پرانی تاریخ دیکھے گا تو بدمزہ ہو کر یونہی کہیں ڈال دے گا۔ مگر یہ یونہی والی بات تھی نہیں۔ اس کا دل کرلایا' اسے جلد از جلد آفس پہنچنا تھا۔ وہ اس خبر کو رول کر کے نہیں رکھ سکتی تھی پر اتنا کہہ ڈال نہیں سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے یہ کیوں سوچ لیا خدیجہ بانو' کہ بیوہ ہو جانے سے زندگی ختم ہو جاتی ہے۔"

"میں نے نہیں سوچا کہ زندگی ختم ہو گئی ہے۔ دراصل وہ داب شروع ہوئی ہے۔ مایوسی' بدحالی' لاچاری اور یتیمی' حسرتیں اور۔۔۔" ان کا پہلا جملہ امید افزا تھا مگر آگے جا کر۔۔۔

"ایسے نہیں کہتے بے وقوف۔۔۔" وہ بھائی تھے۔ آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"منا کدھر ہے؟"

"باپ کی قبر پر پودا لگانے گیا ہے۔ اس معصوم کو یہ نہیں پتا۔ جس درخت کی جڑ کھوکھلی زمین میں جگہ بنائے' وہاں کوئی پھل نہیں اگتا۔"

وہ مایوس تھی' مایوسی تلخی کو جنم دیتی ہے۔

بھائی کو لگا سارے ماحول میں نیم کی کڑوی مہک رچ بس گئی ہے۔

"میں ہوں ناں۔۔۔" بھائی نے تین لفظوں میں بات ختم کرنی چاہی۔

"وہ کیوں نہیں ہے۔ کیوں چلا گیا؟" بظاہر آسان دکھائی دینے والا سوال اتنا آسان تھا تو نہیں۔۔۔ بھائی نے طویل سانس بھر کے ناک کی سیدھ میں دیکھا۔ منا پانی کی چھوٹی بالٹی اٹھائے کچھ لنگڑاتا اندر داخل ہوا تھا۔
"چپل ٹوٹ گئی۔" اس کے دوسرے ہاتھ میں چپل تھی۔
"کوئی بات نہیں بیٹا۔ نئی لے لیں گے۔" وہ نرمی سے بولے۔
"کیسے لے لیں گے۔ اب ابو تو ہیں نہیں۔۔۔ اور امی نے کہہ دیا ہے ان کے پاس پیسے نہیں ہوں گے۔"
"میں لے کر دوں گا بیٹا۔۔۔" انہوں نے تھوک نگلا۔
"نہیں۔۔۔" ننھے کا سر نفی میں ہلا۔ "امی نے کہا ہے ہم کسی سے پیسے نہیں لیں گے۔"
"میں کسی ہوں۔" انہوں نے مصنوعی خفگی سے اسے شانے سے پکڑ کر سیدھا کیا۔
"پتا نہیں۔۔۔ مگر آپ ابو تو نہیں ہیں ناں۔" دریا کوزے میں بند ہو بھی جایا کرتے ہیں۔ اوہ خدا۔۔۔ بھائی کی پیشانی بھیگی (بچے اتنے سچے کیوں ہوتے ہیں)
"تم نے بچے کو ایسی باتیں سکھائی ہیں خدیجہ۔" انہوں نے شاکی نظروں سے دیکھا۔
"ہاں۔۔۔ اس سے پہلے کہ دنیا سکھاتی۔۔۔ میں اس کی آنکھیں کھول دینا چاہتی ہوں۔"
"میں تمہارا بھائی اور اس کا ماموں ہوں۔ اس کا حق ہے میرے مال پر۔۔۔ اور میرا فرض ہے کہ میں اس کی دست گیری کروں۔"
"دست گیر تو اللہ ہوتا ہے۔"
"تم اتنی سخت باتیں کیوں کر رہی ہو۔" وہ ہار گئے۔
"نرمی کہاں سے لاؤں۔ ابھی تو صرف چار ماہ ہوئے ہیں۔ دس دن باقی ہیں۔"
"میں مر گیا ہوں کیا۔" وہ اتنی زور سے دھاڑے کہ آواز پھٹ گئی۔
"اللہ نہ کرے۔" انہوں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں ایسے کہ شوہر کے جنازے پر بھی نہ روئی ہوں گی۔
"تمہیں میری عمر لگ جائے مگر کیا میں تمہارے مسائل سے واقف نہیں۔"
"وہ تو تم چاہتی کیا ہو؟"
"بس میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔" قطعیت عیاں تھی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔
وہ سوا پکڑ کر چپل گانٹھنے لگیں اور گانٹھنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ چارپائی پر بیٹھے بہن کو تکتے جاتے تھے۔ وہ ضدی تھیں۔ صاف گو تھیں، لگی لپٹی نہ رکھتی تھیں۔ آنکھیں کھلی رکھتی تھیں۔ جانتی تھیں بھائی کے اپنے مالی حالات اس قابل نہ تھے کہ اپنا گھر بار عزت سے چلا سکیں اس پر چار روٹیوں کا اضافہ۔۔۔ مہینے کی ایک سو بیس روٹیاں اور سال کی۔۔۔ اوہ۔۔۔ اور زندگی صرف روٹی تو نہیں مانگتی۔ سو۔۔۔ وہ کسی پر بوجھ نہیں بنیں گی۔ اپنا بوجھ خود اٹھائیں گی۔ مگر کیسے؟ یہ نہیں سوجھتا تھا۔ شوہر جاتے جاتے جیسے عقل کو تالا ڈال کر چابی ساتھ لے گیا تھا۔ اندھا بھی ٹامک ٹوئیاں مار لیتا ہے۔ ٹھوکر کھا لیتا ہے۔ سر پھوڑ لیتا ہے۔ وہ اپنے اندر اتنی ہمت بھی نہ پاتیں۔ ایسے میں ایک دن جب وہ۔۔۔ ایسی ہی ناامیدی سے چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھی تھیں اور بچوں کی طرح ٹانگیں جھلائے جاتی تھیں بھائی آ گئے۔
"اپنی میٹرک کی سند دے دو اور پی ٹی سی کی بھی۔"
"اس کا کیا کرنا ہے؟"
"تمہاری نوکری کی بات کی ہے اسکول میں۔۔۔ کاغذ جمع کروانے ہیں اور ہاں شناختی کارڈ بھی۔" اور وہ بھونچکی رہ گئیں۔ یہی وہ بھائی تھا ناں جو پی ٹی سی کے نام پر ناک بھوں چڑھاتا تھا۔ ان سے بڑی بہن کو استانی بننے کا شوق تھا (انہیں نہیں تھا۔۔۔ بالکل) ساری ہم جماعت ٹریننگ اسکول میں داخلہ لے رہی تھیں۔ بڑی بہن نے رو رو کر آنکھیں سجالیں۔ بھائی کا ایک ہی

اعتراض تھا۔ دنیا کیا کہے گی بہن سے نوکری کروانے کے ارادے ہیں۔ بہن نے سر پیٹ لیا۔ نوکری نہیں کرے گی مگر بس کورس تو کر لے۔ اور وہ اسے بھی زبردستی ساتھ داخل کروا آئیں وہ سر پٹختی رہیں انہیں نہیں پڑھنا انہیں تو بس گھر بیٹھ کر اخبارات و رسائل پڑھنے کا شوق تھا۔

بھائی کیسے مانا' یہ الگ کہانی تھی اور آج وہی بھائی ۔۔۔ اور انہیں آج بھی نوکری کرنے کا شوق نہیں تھا۔ ان کا مزاج ہی نہیں تھا۔ انہیں گھر کی رانی بن کر رہنا اچھا لگتا تھا مگر جب راجہ ہی نہ رہا تو رانی ۔۔۔ رانیاں پھر دربدر ہو جاتی ہیں تو کیا وہ بھی ۔۔۔

"مجھ سے مدد لینا نہیں چاہتیں۔ سسرال والے کتنا ساتھ دیں گے' وہ واضح ہے۔ یہ بھی عہد باندھ چکی ہو کہ اپنے بچے کو صدقے زکوٰۃ پر نہیں پالو گی تو پھر کیسے پالو گی۔ کوئی تو سبب ہونا چاہیے ناں۔"

"ہاں ۔۔۔ یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہ تھا اور زندگی نے کروٹ لی۔ نئے سرے سے آغاز ہوا۔ وہ ان کا بیٹا اور اسکول ۔۔۔

کہنے کو وہ ایک ورکنگ وومن بن گئیں' سر پر دوپٹا اوڑھتیں۔ شانوں پر بڑی چادر لپیٹتیں۔ کندھے پر پرس اور پیروں میں بند شوز دور سے پہچانی جاتیں' استانی آ رہی ہیں۔ صاف ستھرا لباس' سادہ انداز کچھ فطرتاً" بھی تھا۔ کچھ بیوگی نے اثر ڈالا۔

اپنے لیے تو چیزیں ضرورتاً" لیتیں مگر بیٹے کو ایسے پال رہی تھیں جیسے شہزادہ ۔۔۔ اور وہ دیکھنے میں لگتا بھی شہزادہ ہی تھا۔ خوب صورت' خوش مزاج' خوش لباس فرماں بردار ۔۔۔ اور قابل ۔۔۔ اسی قابلیت نے بڑی اچھی نوکری دلوادی۔

ان کی زندگی بڑی محدود تھی۔ اسکول اور گھر ۔۔۔ محلہ پڑوس کی خبر عید بقر عید یا خوشی غمی میں ملتی' ایسے حالات میں بھولانے کی بات سن کر خود ان کو شرم آ گئی تو منا اتنا بڑا ہو گیا کہ ۔۔۔ بیاہنے کی باتیں ہونے لگیں۔ کہاں اسے بڑا کرنے کا خیال ۔۔۔ خواب لگتا تھا اور کہاں ۔۔۔

اور وہ کہاں جائیں گی بہو ڈھونڈنے۔ مزاجاً" سادہ تھیں۔ صاف اور تلخ مزاج بھی ۔۔۔ مصلحت سے کام لینا نہیں جانتی تھیں۔ لوگ باز رہنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ اتنی صاف گوئی اچھی نہیں ۔۔۔ اور اتنی تلخی ۔۔۔ اوں ہوں بری بات ۔۔۔

مگر عادتیں اب مزاج کا حصہ بن چکی تھیں۔ اتنی سخت مزاج ساس کی موجودگی میں مائیں جیسے عاجزی کی آخری حدوں پر جا کر خود سے رشتہ پیش کرنے میں بھی ذرا شرمندہ نہ تھیں۔ بس ان کے منہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ ہاں اب وہ بھولانا چاہتی ہیں۔ دنیا تو اشارے کی منتظر تھی۔ خاندان والے' اہل محلہ' دوست رشتے دار اور سب سے بڑھ کر ان کی کولیگز ۔۔۔ کچھ نے اپنے منہ سے کہہ دیا۔ کچھ نے کہلوا دیا۔ کوئی اپنی بیٹی کے لیے کوئی بہن کے لیے بھانجی یا بھتیجی کے لیے ۔۔۔ یہاں تک کہ نئی آنے والی نوجوان ٹیچرز تک انہیں اب زیادہ مؤدبانہ سلام کرتی تھیں۔

"لائیں مسز خدیجہ! میں آپ کا رجسٹر بنا دوں۔"

ہائیں ۔۔۔ کہاں تو ان کے مزاج کی سختی' خاموشی کے باعث وہ اسٹاف روم میں خاموشی سے سب کی سنتے ہوئے چائے کے گھونٹ بھرا کرتی تھیں اور کہاں۔

"یہ تو بڑا مشکل کام ہو گیا بھابھی۔"

مسز نواز نے مجھے اپنے گھر قرآن خوانی پر بلایا ہے اور مسز حیدر نے سالگرہ پر اور ایک ینگ ٹیچر ہے صدف اس کی والدہ اور بھابھی مجھ سے اسکول آ کر مل گئیں' بار بار کہا صدف آپ کی بہت تعریف کرتی ہے۔ کبھی آئیے ناں ہمارے گھر شام کی چائے پر۔ اللہ گواہ ہے۔ مجھے تو پہلے کبھی کسی نے ایسے نہیں مدعو کیا۔ سب کی اپنی اپنی سرگرمیاں رہتی تھیں۔" وہ معصومیت آمیز فکر سے بھاوج کو دیکھنے لگیں۔

بھاوج نے انہیں خود سے لپٹا لیا۔ "تم ویسی ہی معصوم اور سیدھی ہو خدیجہ ۔۔۔"

"نہیں۔ مگر پہلے تو ۔۔۔"

"تمہیں دنیا کی پرکھ نہیں ۔۔۔ میری نانی کہتی تھیں' بیوہ کی عقل بند ہو جاتی ہے اور تم ساری زندگی دوپٹا

پیشانی سے نیچے آنکھوں تک کھینچ کر اپنے پیروں پر نگاہ جما کر چلیں یا پھر اتنی بلند جتنی دوپٹے سے دکھائی دے گئی۔ تم نے دنیا کو چار اطراف سے کبھی نہیں دیکھا۔ اب اتنی تھوڑی سی دنیا کا باسی خرانٹ نہیں ہو سکتا۔ زمانہ شناس نہیں ہو سکتا، دنیا سے نمٹنے کے لیے دنیا کو جاننا بہت ضروری ہوتا ہے اور تم سے یہی کام ہو نہیں۔"

"صاف بات کریں بھابھی۔۔۔" وہ مزید الجھیں۔

"صاف بات یہ ہے پھپھو۔۔۔" خاموش بیٹھی بھتیجی جو ان سے چند برس چھوٹی تھی۔ سہیلی جیسی۔۔۔ مسکراتے ہوئے قریب آگئی۔ "پہلے آپ ایک غریب بیوہ تھیں اور آپ کا منا ایک یتیم لڑکا۔ مگر آج وہ یتیم لڑکا ایک پڑھا لکھا قابل اور اچھے عہدے پر فائز نوجوان ہے جس کی خوبیوں کا کوئی اختتام نہیں۔۔۔ اکیلا لڑکا نہ نند، نہ دیور جیٹھ۔۔۔ کا جھنجھٹ اور ساس۔۔۔ او نہہ، آج مری کل دوسرا دن۔" ان کا رنگ زرد ہو گیا۔

"اوں ہوں۔" بھتیجی کے لہجے کی شوخی کم نہ ہوئی۔

"اور اگر زندہ بھی رہے بھلے سے سو سال۔۔۔ تو بھی مرا ہا تھی۔ ساٹھ سال کے بعد تو پنشن شروع ہو جائے گی، فکر نہ فاقہ عیش کر کاکا۔۔۔ خود کفیل ساس۔۔۔ خود مختار زندگی۔۔۔ بیٹے کی کمائی پر نظر نہیں رکھے گی بلکہ الٹا دے گی ہی۔" بھتیجی کا لہجہ خوشگوار اور ہلکا پھلکا مگر بات بڑی گہری تھی۔

"اچھا تو یہ بات۔۔۔" وہ طویل سانس بھر کے رہ گئیں اور اگلے ہی روز اتفاقاً "مسز رشیدی اور مس جہاں آرا کی مدہم گفتگو کانوں میں پڑ گئی۔

"بہت کڑک مزاج ہے مسز خدیجہ کا۔۔۔ اتنی صاف گو ہیں کہ کپڑے اتار کے رکھ دیں۔ ورنہ خاموش ہوں تب بھی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ ان کی اسٹوڈنٹس تو ان سے ڈرتی ہی ہیں۔ ہم جیسی کولیگز تک انہیں آتا دیکھ کر خاموش ہو جاتی ہیں۔ ایسے مزاج کی عورت کو بیٹی دینے کی خواہش کچھ عجیب نہیں ہے۔ آپ کی بچی تو بہت شوخ و شنگ ہے۔ اور میری اماں کہتی ہیں جوانی میں بیوہ ہو جانے والی عورتیں بھو کے بناؤ سنگھار سے

بھی کینہ رکھتی ہیں۔" مس جہاں آرا کہہ رہی تھیں اور مسز رشیدی کا قہقہہ فلک شگاف تھا۔ مس جہاں آرا وہ تھیں جو نہ خود امیدوار بن سکتی تھیں اور نہ کوئی اور امید تھی سو۔۔۔

"آپ کی اماں ٹھیک کہتی ہوں گی مگر۔۔۔" اس سے آگے مسز رشیدی نے وہی سب الفاظ دہرا دیے جو خدیجہ بانو سے ان کی بھاوج کہہ چکی تھیں۔ مگر وہی بات الفاظ کا چناؤ اور طرز بیاں کا فرق۔۔۔ بھاوج نے دل بڑا پایا تھا۔ خدیجہ کی ذات کی خوبیاں بتائی تھیں۔ مسز رشیدی نے دل توڑ دیا تھا۔ انہوں نے مس جہاں آرا کو بتایا کہ ان کی شوخ و شنگ بیٹی سب درست کرنا جانتی ہے۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ جس سے ٹوٹے دل پر اور ضربیں پڑ رہی تھیں۔ وہ شکست خوردگی سے بھاوج کے پاس آبیٹھی تھیں۔

"پھر میں کہاں سے ڈھونڈوں گی پُرخلوص اور سیدھے لوگ۔۔۔ اور اچھی سی لڑکی۔"

"لو دنیا ختم تو نہیں ہوئی۔" بھاوج نے لاپروائی سے ہاتھ چلایا۔

"میں اپنے سسرال میں دیکھوں گی۔ کاش میری ہی کوئی بیٹی ہوتی۔" بھیجی نے کہا۔

"یا میں ایک پیس تمہارے بیٹے کے لیے سنبھال رکھتی۔" بھاوج نے قہقہہ لگایا۔

"مگر بہت پڑھی لکھی لڑکی ہو۔" وہ کچھ جھجک کر کہنے لگیں۔ "اور اچھے لوگ ہوں۔" "بہت پیاری بھی ہو۔" مگر اب یہ ہوا کہ ہر ایک کو مشکوک نگاہ سے دیکھتیں، ہر چہرے میں مسز رشیدی اور مس جہاں آرا نظر آتیں۔ پھر ایک روز۔۔۔

"بہت پڑھی لکھی ہے امی۔۔۔ اور لوگ بھی۔" منا ذرا اٹکا۔ ماں کے پر اشتیاق چہرے کو دیکھا۔ "اچھے ہیں اور بہت پیاری بھی ہے۔" خدیجہ بانو نے جوش سے بیٹے کا ہاتھ دبوچ لیا۔ بیٹے کا سر مجرمانہ انداز سے جھک گیا۔ ساتھ ہی اسے ماں سے شرم بھی آرہی تھی۔

"پہلے بتانا تھا ناں ہمیں ایسے ہی اتنے دن۔۔۔" خدیجہ بانو ہلکی پھلکی ہو گئیں زندگی تو بیٹے نے گزارنی تھی۔

"اچھا تو وہ تمہیں کہاں ملی؟"

"دوست کے گھر۔۔۔"

"اچھا تو دوست کی بہن ہے؟"

"نہیں۔۔۔ بہن کی سہیلی ہے۔"

"اچھا اچھا۔۔۔ انہیں سب سمجھ میں آگیا۔" "مگر۔" انہیں دھیان آیا۔ "تم نے اتنا سارا کیسے جان لیا کہ شادی تک سوچ لیا۔"

"اسے ایک بار اس کے گھر تک ڈراپ کیا تھا۔" وہ جھوٹ بول رہا تھا خدیجہ بانو ہنس دیں۔

"صرف ایک بار۔۔۔؟"

"نہیں دوبار، میرا مطلب ہے۔" وہ گڑبڑایا۔

"بار بار۔۔۔ ہزاروں بار۔" خدیجہ بانو کو اپنی شوخی بھلی لگ رہی تھی۔ "تو پھر ہم کب چل رہے ہیں ان کے گھر۔۔۔"

"گھر۔۔۔" وہ بری طرح چونکا۔ "گھر کیوں؟"

"ارے رشتہ مانگنے کے لیے اس کے گھر ہی جاؤں گی ناں۔" بیٹے کے سر پر چپت رسید کی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔" وہ پرسکون ہوا پھر فکر مند ہوا۔ وہ بیٹے کے چہرے کو بغور پڑھ رہی تھیں۔

"کوئی مسئلہ ہے منے۔۔۔؟" ان کا لہجہ فکر مند ہوا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں کوئی مسئلہ نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔" اس نے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کیا۔

"نہیں کوئی بات تو ہے۔" وہ آخر کو ماں تھیں۔

"وہ جانتی ہے ہم اسے پسند کرتے ہو؟" انہیں یک طرفہ پسندیدگی کا خیال آیا۔ منے نے نظر اٹھا کر دیکھا پھر نظر جھکا لی۔

"ہوں تو پھر کیا مسئلہ ہے۔ صاف بات کرو ناں۔" انہوں نے بچوں کے سے انداز میں اس کا شانہ ہلایا۔

منا ان کی صورت دیکھنے لگا۔ جیسے کسی ادھیڑبن میں ہو۔ انہوں نے اشارے سے سب کہہ دینے کا کہا جو بھی دل میں ہے کہہ دے۔

"ہاں۔۔۔ وہ پیاری ہے مگر۔۔۔"

"مگر بیٹے۔۔۔"

"مگر وہ کچھ سانولی ہے۔۔۔" اس نے تیزی سے کہہ

دیا۔

"کچھ۔۔۔؟"

"کچھ زیادہ۔۔۔"

"کتنی زیادہ۔۔۔" وہ یکدم ہلکی پھلکی ہو گئی تھیں۔

(اتنی ذرا سی بات۔۔۔ ہائے ان کا بھولا بھالا بیٹا۔۔۔)

"میں آپ کو دور سے دکھا دوں گا ناں۔۔۔"

"تم اتنا اٹک کیوں رہے ہو۔ اصل بات بتاتے کیوں نہیں۔ اچھا کیا وہ تمہیں پسند کرتی ہے؟" انہیں نیا دھیان آیا۔

منے کا سر پر یقین انداز میں اثبات میں ہلا (ہوم۔۔۔ تو دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی)

"پھر کیا بات ہے بیٹے۔۔۔؟"

"بات۔۔۔ کوئی بات نہیں۔" وہ صاف مکر گیا۔

"اس نے اپنے گھر میں ذکر کر رکھا ہے تمہارا۔" بیٹا صاف بات کر ہی نہیں رہا تھا۔ وہی اگلوانے کو بات بدل بدل کر لاتی تھیں۔ بیٹا پھر چونک گیا۔ اس بار وہ بھی چونکیں۔

"میں کہہ رہی ہوں جیسے تم نے مجھے بتایا۔۔۔ اس نے بتایا ہے اپنی ماں کو گھر میں کسی کو بھی۔"

"ہاں۔۔۔" اس نے ہاں یوں کہا جیسے صدیوں کا رکا سانس لیا ہو اور خدیجہ بانو جو خوش تھیں الجھن میں پڑ گئیں "ایسا کیوں؟"

"اس کے گھر والے راضی نہیں ہیں کیا؟" اب اگلا سوال اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں پوری بات کرنا چاہیے تھی۔" ماریہ نے کچھ جھنجلا کر آدھے بھرے جوس کا ڈبا ہوا میں اچھال دیا۔

"میری ہمت نہیں ہو سکی۔ حالانکہ میں نے کوشش کی تھی۔" خدیجہ بانو کے منے کی آواز مدہم ہو گئی۔ وہ لائبریری کے پارک میں ایک بینچ پر بیٹھے تھے۔ کیاریوں کو جاتا پائپ لیک تھا۔ پتلی سی دھار کا دو فٹ اونچا فوارہ اپنے نیچے تالاب بنا چکا تھا اور چڑیاں اس تالاب میں چونچیں مارتی تھیں۔ کچھ شرارت سے ہلکی اڑان بھر لیتیں اپنے پر بھگوتیں پھر پر جھٹک کر جیسے برسات کا مزہ لیتیں۔

"ایسے کیسے چلے گا۔" ماریہ ہاتھ ملنے لگی۔

"میں کوشش کروں گا دوبارہ۔"

"اور ہار کا اعلان بھی کر دوں گا۔۔۔ دوبارہ۔" ماریہ کی نگاہوں میں خفگی کی پرت گہری ہو گئی۔

"پلیز۔۔۔ ماریہ۔" اس نے ماریہ کو روکا۔

"کل۔۔۔ ہاں کل کیسے۔" اس نے پل بھر میں بات سنبھال لی تھی۔ کھائی تھی کہ وہ سانولی ہے۔ کچھ زیادہ سانولی۔۔۔ اس نے اپنے تئیں اماں کو پیشگی تیار کرنا چاہا تھا۔ حالانکہ اس کو پیشگی کسی اور چیز کے لیے تیار کرنا تھا۔ مگر عین وقت پر اس کی ہمت کا غبارہ پھس ہو جاتا تھا۔

"تم نے تو اپنے گھر والوں سے بات کر لی ہے ناں؟"

"میں کر چکی ہوں۔"

"وہ مانے۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔"

"پھر۔۔۔؟"

"یہ تو اب تم بتاؤ۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"میرے گھر والے مانے نہیں ہیں مگر میں انہیں منا لوں گی۔" ماریہ کو خود پر بھروسا تھا۔ "مگر تم۔۔۔ تم تو ابھی تک بات بھی نہ کر سکے۔"

"میں کر لوں گا۔" وہ کب سے یہ کہہ رہا تھا۔ "یہ بہت بڑی بات ہے ماریہ۔۔۔! ایسے یکدم۔۔۔ بتانے سے سب برباد ہو سکتا ہے۔"

"میرے گھر والوں کے لیے بھی یہ بہت بڑی بات ہے۔ ان کے سر پر بھی بم پھوٹا تھا۔" وہ آج ناراض سی تھی۔ "رات گھر میں پھر معرکہ ہوا تھا۔ جنگ عظیم سوئم، لفظوں کی سنگ باری طعنے ایسے تباہی لاتے تھے جیسے بم اور اس پر آہ و زاری اور اسے سب سے زیادہ حیرت ڈیڈی کے رد عمل نے دی تھی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ اس کی بات سب کو حیران و پریشان کر دے گی۔ سب

اسے ملامت کریں گے۔ منع کریں گے، سمجھائیں گے۔ مگر اتنا سخت رد عمل، وہ بھی ڈیڈی۔ وہ تو بہت ماڈرن لبرل آدمی تھے۔ شخصی آزادی کے قائل مگر..... وہ کچھ نہیں پا رہی تھی۔ ڈیڈی کے لیے زیادہ دکھ یا صدمے کی بات کون سی تھی۔ اس کا اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کا اعلان یا اس کا ایک مسلم لڑکے کو پسند کر لینا۔

"اس میں اتنی حیرت کی بات ہے تو نہیں۔" فاریہ نے نخوت سے کہا۔

"تم جانتی ہو ڈیڈی ہی نہیں ہم سب کے لیے بھی ایک مسلم لڑکے والی بات ناقابل قبول ہے۔"

"مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔" اس کا لہجہ مجبوری سے تڑخ گیا تھا۔

"اوہ...." فاریہ نے بھنویں سکیڑیں۔ "ڈیڈی سے ختم ہو گئی ہے؟"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" اس کی آواز بلند ہو گئی۔

"جو مقام ڈیڈی کا ہے وہ ڈیڈی کا ہے اور جو اس کا ہے وہ اس کا۔"

"تم ان دونوں کو مدمقابل لے آئی ہو ماریہ۔"

"اس سے ملے بغیر انکار کیسے کر سکتے ہیں سب لوگ۔"

"ملنے سے کیا ہو گا۔ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے گا۔ عیسائی ہو جائے گا؟" فاریہ نے اتنی تیزی سے کہا کہ ماریہ کو ایک پل کے لیے گویائی سلب ہونے کا گمان ہوا۔

"کیا فرق پڑتا ہے...." بہت دیر کی اعصاب شکن خاموشی کو اسی کی آواز نے توڑا۔ پرسکون قطعیت سے بھرپور لہجہ.... "میں مسلم ہونے کو تیار ہوں ناں۔"

فاریہ کے سر پر چھت گر گئی۔ یہ بات گمان کے کسی اندھے گوشے میں موجود تھی۔ مگر روشن حقیقت اتنی سفاک.... او خدا.... او گاڈ.... او گاڈ اس نے دل کر سینے پر صلیب بنائی اور مدد کے لیے اوپر خداوند کو دیکھا۔

کوئی اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کہتا ہے بھلا۔

"تم مذہب بدل لو گی ماریہ۔" فاریہ جانتی تھی یا خدا کہ اس نے کتنی مشکلوں سے جملہ مکمل کیا تھا۔

"میرا دل بدل گیا ہے۔" اس نے دانستہ نظریں سامنے آویزاں مریم کی شبیہ پر گاڑ دیں۔

"غلط بالکل غلط...." فاریہ تیزی سے اس کے سامنے آ گئی اور ٹھوڑی سے پکڑ کر اسے اپنی آنکھوں میں دیکھنے کا اشارہ دیا۔

"جن کا دل بدلتا ہے اور پھر وہ مذہب بدلتے ہیں، وہ اور لوگ ہوتے ہیں۔ تم ایک لڑکے کی محبت میں یہ سب کر رہی ہو۔ دل ایسے نہیں بدلتا۔ میں تم سے زیادہ جانتی ہوں مذہب بدلنے والوں کی بائیوگرافی کو...." فاریہ کا انداز جارحانہ تھا۔

"میں اس سے محبت کرتی ہوں۔" وہ فاریہ کا ہاتھ جھٹکتی کھڑی ہو گئی۔

"اور ہم سے نہیں کرتیں اور ڈیڈی سے اور خدا سے۔" وہ پیچھے سے چلائی تھی۔

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔" اس کی آواز بھی بلند ہو گئی۔

"اوکے.... تو پھر کیوں ہم سب کو مناتی پھرتی ہو، کبھی مجھے، کبھی بھائیوں کو، مام کو، گرینڈ مام کو.... اور ڈیڈی کو...."

وہ بھی اسی کی بہن تھی۔ سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر پھر سامنے آ گئی۔ اور اس آخری بات کا جواب واقعی اس کے پاس نہیں تھا۔

اس نے رونا شروع کر دیا۔ اتنا رونا.... اتنا رونا.... کہ کہ.... اور اتنے بہت سارے آنسو.... جو بہالے جائیں۔ دیکھے نہ جائیں.... اپنے دل پر پڑتے محسوس ہوں اور پھر جن سے محبت ہو۔ ان کی آنکھ کے آنسو تو گرم تیل کا چھینٹا بن کر دل پر گرتے ہیں اور سسکیاں پگھلا سیسہ بن کر سماعت پر قہر ڈھاتی ہیں۔ اور آہ و زاریاں۔ اف....

ڈیڈی کے مصمم ارادوں کی دیوار چٹخنے لگی۔ روزن بن گئے۔ چھوٹی اینٹیں پھر بڑی والی اور پھر۔

چھ بچوں میں وہ سب سے پیاری تھی۔ حالانکہ کوئی وجہ نہیں تھی مگر وہ سب سے پیاری لگتی۔ یا شاید کہ وہ

عام بچوں کی بہ نسبت ماں کے بجائے باپ سے زیادہ قریب تھی۔ اس وجہ سے۔۔۔

جب وہ چھوٹی تھی، اور ماما صبح اسکول بھیجتے وقت بڑی مصروفیت میں گھری ہوتی تھیں۔ وہ برش اور پونیاں پکڑ کر باپ کے سامنے آجاتی۔ شوز کی لیس بند کردیں اور وی سیٹ کردیں۔ پھر وقت آگے سرکا۔

بات کچھ اور آگے بڑھی یعنی محبت کچھ اور آگے بڑھی۔ جو ڈیڈی کھاتے وہی اسے پسند آنے لگا۔ شاپنگ پر جاتی تو سوالیہ کھوجتی نگاہوں سے ڈیڈی کو دیکھتی۔ ڈیڈی کو کیا پسند ہے۔ ڈیڈی کی پسند سے۔۔۔ اسکول میں مضامین بھی ڈیڈی کی پسند کے حالانکہ یہ مشکل مضامین تھے مگر اس نے سردھڑ کی بازی لگادی۔ ڈیڈی کا سر نہ نیچا ہو۔۔۔ اور اب جو وہ کرنے جارہی تھی۔ اس سے کون سا پھندنا لگ جاتا تھا ڈیڈی کی شان میں؛

اور ڈیڈی۔۔۔ ان کے اعصاب پر برف جم گئی تھی۔ ہر باپ کو اپنی بیٹی کے لیے شہزادہ مہاراجہ درکار ہوتا ہے اور کمتر نگاہوں میں بچتا ہی نہیں۔ ساریہ کے معاملے میں شہزادے مہاراجے بھی خاطر میں نہیں آتے تھے، اس سے بھی کچھ بڑھ کر۔ مگر کیسے ڈھونڈیں گے؟ ایک تو بادشاہت ختم ہوگئی اور ریاستوں نے ملکوں سے الحاق کرلیا۔ سارے نواب لندن امریکہ جابسے تو کیا وہ سفر کریں۔ اچھا تو کرلیں گے ؟ اب ایسے کیسے اپنی لاڈلی پرنسس کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کے حوالے کرسکتے تھے۔ سو وہ ڈھونڈیں گے اور تلاش مشکل ہوگی نا ممکن تو نہیں۔

مگر بیٹی نے انہیں اس مشکل سے بچالیا۔

اور لڑکیوں کا دماغ خراب ہوتا ہے۔ انہیں فقیر بھی بھاجائے تو شہزادہ لگنے لگتا ہے۔ اور ان کی خاطر وہ باپ کے دل کی ریاست کو لات مار کے چلی جاتی ہیں۔

"میں من مانی نہیں کررہی ڈیڈی۔۔۔ آپ کو منانے کی کوشش کررہی ہوں۔" وہ لجاجت سے کہہ رہی تھی۔

"اور میں نہیں مانوں گا ماریہ۔"

"وہ بہت اچھا ہے ڈیڈی۔۔۔"

"تم تو کینڈی تک میری پسند سے اٹھاتی تھیں ماریہ۔" ڈیڈی کا لہجہ چور چور تھا۔

"ہاں ڈیڈی! آپ کے سوال ہی میں جواب ہے۔ مجھے اتنا حق بھی نہیں کہ میں اپنی زندگی میں ایک چیز اپنی پسند سے بھی لے لوں۔"

"میں نے تم پر کبھی اپنی پسند ٹھونسی نہیں تھی۔" وہ ہکا بکا رہ گئے۔

"تو یہ جواب آپ کررہے ہیں کیا ہے؟" اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔ ڈیڈی کتنی ہی دیر بول نہ سکے اور پھر جب لب کشائی کی تو۔۔۔

"تو مجھ سے اب کیا چاہتی ہو؟"

"آپ اس سے مل لیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟"

"مجھے فرق پڑے گا ڈیڈی۔۔۔ میں آپ سب کی مرضی و شمولیت کے بغیر قدم اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"جہاں سوچنا تھا وہاں تو تم نے زحمت کی نہیں۔۔۔ اب چاہے زندگی بھر نہ سوچو۔" گرینڈ مام پورے ہفتے میں گن کر سات جملے بولا کرتی تھیں۔ سونے کے مقابل تولے جانے والے۔

"فاریہ بتارہی تھی ہم مذہب بدل لوگی۔" بھائی ڈیڈی کو دیکھ رہا تھا۔

"جی۔۔!" اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ "اس کے بغیر ہماری شادی ہو نہیں سکے گی۔"

"وہ بھی تو بدل سکتا تھا۔" ممی کا سوال سب سے زیادہ سخت ثابت ہوا۔ ماریہ پہلی بار لاجواب ہوئی۔ اس نے ڈیڈی کی جانب دیکھا۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ ان کی آنکھیں لبریز تھیں اور وہ شعوری کوشش سے پلکوں کو جھپکنے سے باز رکھے ہوئے تھے۔ اس کی جانب سے قصداً منہ موڑے ہوئے تھے۔ مگر صاف پتا لگتا تھا۔ ان کا پور اوجود کان میں ڈھل چکا تھا۔

"محبت الہام ہوتی ہے اللہ کی طرف سے دل میں اتاری جاتی ہے۔ بس مجھے ایک روز جیسے کسی نے چپکے

سے کہہ دیا۔ مجھے تم سے شدید محبت ہو چکی ہے۔ کب کیسے کہاں... نہیں معلوم مگر کیوں کا جواب میں تمہیں دے سکتا ہوں۔"

ایک فلسفیانہ اظہار' شوخی کے پیراہن میں لپٹا سرگوشی میں ڈھل گیا۔ اس کے ایسے بے باکانہ اظہار نے اسے ہراساں کر دیا تھا۔ وہ بھی اس کی کیفیت بھانپ گیا۔ اور زوردار قہقہہ لگاتا پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے ہنستے ہوئے گردن پیچھے ڈال دی تھی۔ پھر منہ پر دونوں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے کن انکھیوں سے دیکھنے لگا۔ جو حیرت کا مجسمہ بنی ہوئی تھی' نگاہ ملنے پر خود پر قابو پاتی' نگاہیں چرا گئی۔ پھر رخ بدل کر مسکرانے لگی۔ اور وہی مسکراہٹ "یاد" کے ساتھ اس وقت دوبارہ سے اس کے چہرے پر چمکنے لگی تھی۔

اور ممی... دیگر... اور ڈیڈی جو اجنبیت کا تاثر دے رہے تھے۔ سب کی نظریں اس پر ٹکی تھیں۔ ممی کے سوال کے جواب میں ایسی مسکراہٹ تو نہیں بنتی تھی تو صاف پتا لگ رہا تھا۔ وہ یہاں تھی ہی نہیں۔ ممی کے اعصاب تن گئے۔

"تم نے جواب نہیں دیا ماریہ۔"

"وہ بھی تو بدل سکتا تھا؟" یہ سوال نہیں تھا۔ ایک امید تھی۔ ایک تنبیہہ ایک کوشش (بیٹی کو اصلاح کی ضرورت تھی)

"کیا فرق پڑتا ہے ممی وہ بدلے یا میں...؟"

اوہ... راگ آگ لگا دیتے ہیں' باتیں دل بدل دیتی ہیں۔ جملہ فقط ایک جملہ سب کچھ تباہ و برباد کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بعض اوقات مباحثے کے عین درمیان میں ایک ایسا جملہ آجاتا ہے۔ جس کے بعد بحث ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف کے دلائل بودے ہو جاتے ہیں تو یہ وہی مقام عبرت تھا۔

"مذہب لباس نہیں ہوتا کہ اتنی آسانی سے بدل لیا جائے ماریہ۔" گرینڈ ما سے آج ہی کے دن دوسری بات سننا بڑی حیرت کی بات تھی۔ تو وہ بھی صدمے میں تھیں۔ ڈیڈی نے اپنی ڈبڈبائی آنکھیں تشکر سے ماں پر ڈالیں۔ ان کے پاس سمجھانے کے لیے بہت کچھ تھا اور اگر ٹھان لیتے تو شاید کامیاب ہو جاتے۔ مگر اس کا کیا کرتے کہ لاڈلی کی آنکھوں میں در آنے والی اجنبیت جھیلی نہیں جاتی تھی۔ دماغ خالی ہو جاتا تھا۔ زبان لڑکھڑا جاتی تھی اور سب سے زیادہ دھوکا آنکھوں نے دیا تھا۔ جو رسنا شروع کر دیتی تھیں۔

"تو آپ کو کیسے لگا کہ آسانی سے بدل رہی ہوں۔ اتنی ساری رکاوٹیں عبور کرنے کے بعد بدلوں گی۔" اس نے سخت بے مروتی سے ان سب کو مورد الزام ٹھہرا دیا۔

"خدا تم سے سخت ناخوش ہو گا ماریہ۔"

"تم یسوع کو ناراض کر کے کبھی خوش نہیں رہو گی۔"

"ہاں ہم یسوع سے الگ ہو کر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔" فاریہ نے کہا۔ سب اسے گمان و اندیشوں سے ڈرا رہے تھے۔ فاریہ نے ببانگ دہل مہر لگا دی۔

"آپ سب سے کس نے کہا ہے۔" وہ چلائی تھی۔ "کہ میں یسوع کو چھوڑ دوں گی۔ مسلمان ہونے کی بہت سی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو پچھلے تمام پیغمبروں پر ایمان رکھنا ہے۔ میں یسوع کو کل بھی مانتی تھی۔ آج بھی... اور ہمیشہ مانوں گی۔" ڈیڈی نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ ان کی آنکھیں یک بیک خشک ہو گئی تھیں۔

تو اس نے یسوع کو پچھلا پیغمبر کہہ دیا تو بات یہاں تک پہنچی کہ ختم ہو گئی۔

"ہم سے کیا چاہتی ہو؟" فاریہ بہت تنفر سے اسے منہ توڑ جواب دینا چاہتی تھی۔ ڈیڈی کے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کی استدعا اور سوال پر بھونچکی رہ گئی۔

تو یہ شکست کا اعلان تھا۔ یعنی... اس نے ماریہ کو دیکھا۔ اس کے سلونے چہرے پر سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ ڈیڈی کو بتا رہی تھی' وہ کیا چاہتی ہے۔ بھائی کمرے سے چلے گئے۔ فاریہ کے لیے یہاں کھڑا رہنا فضول تھا۔

اسے تفصیلات سن کر کیا کرنا تھا۔ ہوتا تو اب وہی تھا ناں جو وہ چاہتی تھی۔ اس نے سینے پر صلیب بنا کر جیسے

گناہوں سے معافی طلب کی تھی۔

☆ ☆ ☆

خدیجہ بانو کچھ جھجکی سی ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ منا سنگل صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ کچھ گھبرایا سا دکھائی دیتا تھا۔ انہیں بیٹے پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ بھلا اسے کیا ضرورت تھی گھبرانے کی... کس چیز کی کمی تھی اس میں' ایسا رشتہ تو نصیبوں والی کو ملتا' لیکن نہیں... شادی کے معاملات میں ایسے گھبرانا بلکہ شرمانا تو بنتا ہے تو ان کا منا شرما رہا تھا۔ انہیں بڑا مزہ آیا' وہ ان سے نگاہیں چرائے بیٹھا تھا۔ ورنہ وہ اسے نارمل رہنے کا اشارہ کرتیں یا یہ کہ اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔

انہیں ڈرائنگ روم کی سجاوٹ بہت پسند آئی تھی۔ سفید و سیاہ کا امتزاج بلکہ سفیدی غالب تھی۔ وائٹ لیدر کے صوفے... سفید درودیوار... سفید پردوں میں بہت چھوٹے سیاہ دائرے تھے۔ میز پر سجی پر تکلف چائے کے برتن بھی سفید و سیاہ تھے۔ پاکیزگی و نفاست کے احساس نے ان کے دل کو چھو لیا۔ اگر بھاوج ساتھ ہوتیں تو سلیقے کے نمبروں میں دس ہوتے اور اگر بھتیجی ساتھ ہوتی تو رنگت پر غش کھا کر جاتی مگر کشش و نقوش کی جاذبیت پر فدا ہو جاتی۔ منا تو خیر انہیں بتا کر لایا تھا "وہ کچھ سانولی ہے" ان کا معصوم بچہ... انہیں نئے سرے سے پیار آیا۔

کچھ سانولی... ابھی تک نظر نہیں آئی تھی... اور بہت زیادہ سانولے ممی ڈیڈی اور دادی نظر آگئے تھے۔ محتاط' کم گو' پر تکلف میزبان۔

"آپ نے یونہی اتنا تکلف کر لیا۔" خاموشی کھٹکنے لگی تو انہیں بولنے کے لیے بہانہ سوجھ ہی گیا۔

"تکلف کیسا... مہمانوں کے لیے تو سب ہی کرتے ہیں۔" جملہ اچھا تھا مگر لہجے میں گرم جوشی کا فقدان تھا۔

"کیک بہت مزے دار ہے' میں کچھ زیادہ ہی کھا گئی۔" وہ کچھ شرمندگی و مجبوری سے بولیں۔

"فاریہ نے بنایا ہے۔ اسے بیکنگ کا شوق ہے۔"

خدیجہ بانو بری طرح متاثر ہو گئیں۔ انہوں نے کیک گھر میں بنائے جانے کا سنا تھا۔ کھایا پہلی بار... ساتھ ہی دل مزید بڑھا۔

تو صرف صفائی ستھرائی نہیں... کھانے پکانے کے نمبر بھی دس میں دس (وہ شاگردوں کی نظر میں اول نمبر کی کنجوس استاد تھیں۔ نمبر ہی نہیں دیتی تھیں۔ مگر آج تو... خیر)

"بچی کو نہیں بلوائیں گی آپ..." آخر اب وہ اور کتنا صبر کرتیں' کچھ زیادہ سانولی کو دیکھنے کے لیے اب تو بے قراری بڑھ گئی تھی۔

"جاؤ فاریہ! ماریہ کو لاؤ۔"

"آرہی ہے وہ۔" فاریہ جم کر ممی کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کا ایک سرد تاثر سارے ماحول پر حاوی ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تنفر تھا۔ بھنویں آپس میں مل جاتیں نجانے کیوں... وہ جیسے کسی ادھیڑبن کا شکار تھی اور ڈیڈی مروت و ضبط کی تصویر تھے۔ ممی نگاہ ملنے پر مسکراتی ضرور تھیں۔ جبکہ دادی... وہ زیر لب کچھ پڑھتی تھیں' ہاں بزرگ اس عمر میں آکر درود و ذکر و اذکار میں مشغول ہو ہی جاتے ہیں۔

خدیجہ بیگم کو اچھا لگا اور گرینڈ مدر واقعی اللہ کو پکار رہی تھیں۔

"اے خداوند' یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ روح القدس... مجھے ہمت دے اور ساہوسن کو بھی (انہیں بیٹے کے بہت فکر تھی' مائیں کتنی مجبور ہوتی ہیں) اور کاش ماریہ کو عقل آجائے کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے۔

خدیجہ نے بیٹے کے چہرے پر روشنی پھوٹتی دیکھی۔ پھر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں روشنی کا منبع بھی نظر آگیا۔

زرد لباس میں وہ ہزار والٹ کا بلب لگ رہی تھی۔ اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ اس کے نقوش کی جاذبیت کے آگے رنگت دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ اور اس کے بال... بال... کمر تک گھٹنوں کو چھوتے نہیں گھٹنوں... سے گزرتے ایڑیوں کو چھوتے

اور۔۔۔ اوپر سے انہیں وہ کھول کر آ گئی تھی۔ منے کی نگاہیں ایڑی پر جمی تھیں۔
ان کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ انہیں لڑکی پسند آ گئی تھی۔ گرینڈ مام کا رنگ فق ہو گیا۔ ممی کی نظریں جھک گئیں۔ ڈیڈی نے سرد آہ بھر کے سامنے دیوار پر لگی مستقیل پینٹنگ پر نگاہیں گاڑ دیں۔
خدیجہ بانو نے ڈیڈی کو پکارا۔ وہ متوجہ نہ ہو سکے۔ خدیجہ بانو نے ان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہ اسی پینٹنگ کو دیکھ رہے تھے۔ جسے خدیجہ بانو بار بار دیکھنے کے باوجود سمجھ نہیں پائی تھیں۔ ہر بار دیکھنے پر انہیں لگتا تھا جیسے وہ جانتی ہیں ان مشکلوں کو اور ان واقعات کو مگر وضاحت نہیں ہو سکی۔
"میرا اکلوتا بیٹا ہے منا۔۔۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا 'مجھ بیوہ نے بڑی مشکلوں سے اس یتیم کو پالا۔ آج اللہ کے فضل سے یہ اس مقام پر ہے۔ اس ذات پاک کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔" خدیجہ بانو نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا لیا۔ اس بات سے بے خبر۔۔۔ ماریہ کے سرپرست جبڑے بھینچے ضبط کے کن مراحل میں تھے۔
فاریہ کے چہرے کی سختی اب کسی مصلحت سے گھبرانے والی نہیں تھی۔
منے نے کچھ گھبرا کر ماریہ کو دیکھا۔ منے کا اپنا دل ٹھہرنے لگا۔ امی کو لڑکی پسند آ گئی تھی۔ ہاں بس وہی ایک تھی جو پر سکون تھی۔ اب آگے کا مرحلہ آسان تھا۔ وہ دھیرے دھیرے۔۔۔
"میں منگنی بہت دھوم دھام سے کرنا چاہتی ہوں۔" خدیجہ بانو کہہ رہی تھیں۔
"منگنی کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم ڈائریکٹ شادی کرنا چاہتے ہیں اور بھی وِدان اے ویک (ایک ہفتہ کے اندر)"
"جی۔۔۔" خدیجہ بانو نے حیرت سے منے کو دیکھا۔ جس کی سٹی گم ہو گئی تھی اور وہ ماریہ کو دیکھ رہا تھا اور ماریہ ڈیڈی کو۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔ فاریہ کے چہرے پر اتنی سختی' اجنبیت اور نفرت آ گئی کہ اس کی صورت بگڑ سی گئی۔

"اور جہاں تک آپ دیگر تفصیلات طے کرنے کی بات کر رہی ہیں۔" ڈیڈی کی آواز متوازن با اخلاق اور قطعیت سے بھرپور تھی۔ شیر کے آنے سے ڈر لگتا ہے ناں اور جب آ ہی جائے تو۔۔۔ "تو یہ دونوں سب کچھ آپس میں طے کر چکے ہیں۔ ہمیں تو بس شرکت کرنی ہے۔ وہ بھی دنیا دکھاوے کو۔۔۔ ورنہ دل سے تو۔۔"
ان کی آواز ٹوٹنے لگی۔
خدیجہ بیگم نے پل بھر کے توقف میں منے کو اور پھر زرد گلاب کو نا سمجھی سے دیکھا۔ منے کے چہرے پر حواس باختگی کیوں تھی۔ جبکہ پل بھر کی حیرت کے بعد ماریہ نے خود کو ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار کر لیا تھا۔ (ایسے تو پھر ایسے ہی سہی)
"دل سے کیوں نہیں جناب۔۔۔ آپ دل سے شرکت نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔ کیا میں صحیح اندازہ لگا رہی ہوں کہ آپ کو میرے بیٹے کے رشتے پر اعتراض ہے۔ تو یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ میرا منا کتنا نیک' شریف لڑکا ہے۔ اللہ ایسی اولاد ہر شخص کو دے' یتیمی کا پلا بچہ ہے مگر ندیدہ بالکل نہیں۔ پڑھائی لکھائی میں گولڈ میڈل لاتا تھا۔ اور اب جو یہ نوکری ملی ہے۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔۔۔ کسی بری علت کا شکار نہیں۔ سگریٹ تو در کنار۔۔۔ پان سپاری تک سے رغبت نہیں۔
کھانا تک گھر کا بنا کھاتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر پانچ وقت کا نمازی رات جتنی دیر ہو جائے' نماز پڑھ کر سوتا ہے۔۔۔ صبح اٹھ کر پڑھتا ہے۔ بلکہ ہم ماں بیٹا اکٹھے پڑھتے ہیں۔ مرے باپ کی قبر پر ہر جمعرات کو پانی ڈالتا ہے۔ محلے کے بیمار بزرگ کو سیر کروانے بھی لے جاتا ہے بلکہ۔۔۔"
خدیجہ بانو کے اندر کی استانی بیدار ہو گئی تھی۔ وہ سب کے تاثرات سے بے خبر بولتی چلی جا رہی تھیں۔ انہیں اپنے زمانہ طالب علمی میں بھی۔۔۔ اور اب بحیثیت استاد بھی "ثابت کیجیے" والے سوال بہت پسند تھے اور یہاں تو اپنے بیٹے کو ثابت کرنا تھا' ان کی علمیت کے کیا کہنے۔ (ساتھ یہ عقدہ بھی کھلا۔۔۔ وہ جو لڑکی کے

والدین کی طرف سے سرد مہری سی محسوس ہو رہی تھی تو وجہ یہ تھی کہ ان کے منے کی طرح ان کی منی نے بھی اپنی پسند کا اعلان کیا تھا۔ اچھا تو چلو ؟ اتنی خفگی کا حق تو والدین رکھتے ہی ہیں۔ مگر وہ انہیں بتا کر پرسکون کر دیں گی کہ ان کا بیٹا ایک انمول نگینہ ہے اور وہ لوگ خوش قسمت ہیں کہ جوان کے بیٹے نے ان کی بیٹی کو چنا جو کہ بقول منے کے کچھ زیادہ سانولی ہے (بے وقوف نہ ہو تو ... دونوں رنگ اللہ کے)

خدیجہ بانو کی سوچوں اور گفتگو سے پرے... ماریہ کے ڈیڈی ؟ انہیں لگا تھا کوئی انہیں ریتی سے کھرچ رہا ہے۔ یا پھر دانے دار چھری سے ذبح کر رہا ہے یا پھر...

اور ممی کو بھی... اور گرینڈ مام نے آنکھیں موند کر خدا کو یاد کرنا شروع کر دیا تھا ؟ انہیں اس عمر میں کم دکھائی دیتا تھا۔ کاش سنائی بھی کم دیتا تو صفات سننے سے بچ جاتیں۔ فاریہ کسی خون آشام بلا کی طرح ماریہ پر جھپٹ پڑنا چاہتی تھی۔ اور ماریہ ؟ اسے پہلی بار صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا اور ساتھ ہی یہ ہوش ربا انکشاف کہ وہ اپنی ماں کو سچائی بتائے بغیر گھر تک لے آیا تھا۔

"یہ بات نہیں ہے مسز خدیجہ۔" ڈیڈی جو تحمل سے سن رہے تھے۔ ان کے سانس لینے کے وقفے میں متانت سے بولے۔ "دراصل ہمیں آپ لوگوں کے طریقے میرا مطلب شادی کے حوالے سے رسومات و عقائد وغیرہ کے حوالے سے اتنی معلومات نہیں ہیں، لہٰذا ہم تو محض مہمان ہی کی طرح شرکت کریں گے ناں... باقی بیٹی کو عزت سے رخصت کرنا تو ہر باپ کا فرض و فخر ہوتا ہے۔"

"ہاں ہاں..." خدیجہ بانو کی ہمت بندھی۔ "لیکن آپ یہ رسم و رواج کی کیا بات کر رہے ہیں۔ رسمیں انسانوں کے لیے بنی ہیں انسان رسموں کے لیے نہیں... جیسی آپ کو سہولت ہو... بلکہ ہم دونوں کو کیونکہ ماشاء اللہ سے اب ہم ایک خاندان بنتے جا رہے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میرے گھر میں اللہ کی دی کس چیز کی کمی ہے۔ سونا ہی اتنا ہے کہ زکواۃ دینے والی ہو گئی اب تو... میرے منے نے بنوا کر دی ہیں چوڑیاں اور کڑے۔" ان کے انداز میں بیٹے کے لیے فخر ہی فخر تھا۔ منے کی ہتھیلیوں سے پھوٹ نکلنے والا پسینہ، ماتھے پر نمودار ہوا تھا اور اب ریڑھ کی ہڈی پر سفر کرتا تھا۔

"باقی رہ گئیں رسمیں... تو دودھ پلائی، جوتا چھپائی۔ اور راستہ رکوائی ہم بیٹا کیا نام بتایا ہاں فاریہ! جتنا دل چاہے مانگ لینا۔ تم سے کوئی اچھے ہیں پیسے۔"

ڈیڈی کا سر جھک گیا۔ ممی کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر کاش وہ ہم مذہب ہوتا۔ دعا جیسا لڑکا... مگر فاریہ کا تنا چہرہ عجیب سے احساس جرم کا شکار ہو گیا۔ اسے یک بیک خدیجہ بانو پر رحم آنے لگا۔ رونے کو دل کرنے لگا مگر ڈیڈی کچھ کہنے لگے تھے۔

"وہ سب مسئلہ نہیں ہے۔ مگر آپ لوگوں کے ہاں نکاح گھر میں یا اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو مسجد میں ہوتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں... شادی کی تمام رسومات چرچ میں ادا کی جاتی ہیں۔ اسی لیے میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ ہمیں آپ کے ہاں کی رسومات و طریقہ وغیرہ معلوم نہیں۔ لہٰذا جو بھی آپ لوگ کہیں گے، وہی کرلیں گے۔"

زن... بغور سنتی خدیجہ بانو کے اوپر سے ٹرین گزر گئی۔ پھر کمرے کی چھت سنہری فانوس سمیت ان پر آ رہی۔ ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور ہاتھ دل پر ٹھہر گیا۔ انہوں نے سر جھٹکا۔ انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہو گی۔ وہ منے کی طرف تصدیق طلب انداز میں دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر نگاہیں راستے ہی میں رک گئیں۔ دیوار پر آویزاں مستطیل پینٹنگ، جس کی کہانی لاکھ زور دینے پر بھی یاد نہ آ رہی تھی۔ اب وحی کی طرح دل پر اتر گئی۔

کھجور کا درخت... مریم کی تصویر... اور ایک نومولود... اور عیسیٰؑ کی تبلیغ کی داستان تصویری انداز میں بیان تھی۔

خدیجہ بانو نے تیز تیز پلکیں جھپکا کر آنکھوں کے آگے تنتے جالے کو صاف کرنا چاہا تھا۔ "میرے ساتھ ایسا کیوں کیا منے! جواب دو۔" کاڑ دیا تھا ان کے منے

نے ان کو۔۔۔
"آپ ٹھیک ہیں امی۔۔؟" منا ان کے نزدیک آیا۔
وہ انہیں سہارا دے کر کھڑا کرنا چاہتا تھا پر خدیجہ بانو نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ اپنے اندر کی مضبوطی کے سہارے کھڑی ہوئی تھیں اور کمرے سے نکل گئی تھیں۔ ان کا پرس چابی کا گچھا اور چشمہ منا اٹھا کر لایا۔

☆ ☆ ☆

"ایک اچھی عورت زندگی کو کس طرح بدل سکتی ہے۔ ایک اچھی عورت کا انتخاب کتنا اچھا اور شاندار ہو سکتا ہے۔" محی الدین سہگل نے اپنی زندگی سے یہ سیکھا۔

مرد کی کامیابی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ پتا نہیں سچ جھوٹ یا یونہی بے پر کی اڑائی۔۔۔ مگر ان کی تمام تر کامیابیوں کا آغاز تب ہوا جب بنت سعد نے ان کی زندگی میں قدم رکھا۔

اور بیٹی کی خوبیاں تو بعد میں منکشف ہوئی تھیں۔ سعد حسن کی خوبیاں سامنے دکھائی دینے لگیں۔ وہ پاکستان بننے کے بعد بیوروکریٹس کی پہلی کھیپ کا حصہ تھے اور کیونکہ محی الدین سہگل ان کے اکلوتے داماد بنے اور خود ان کے اپنے بیٹے ابھی بہت چھوٹے تھے لہٰذا بیوروکریٹس کی اگلی کھیپ کا نام محی الدین سہگل بن گیا۔

پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آگئے تھے۔ سعد حسن کے خاندان میں بیٹیوں کی شادیاں بہت کم عمری میں کی جاتی تھیں۔ اور خاندان کے اندر لازمی یہ شق کہیں تحریر نہیں تھی مگر عمل درآمد کی سختی تھی۔ تعلیم کم تھی یا تو بہت اعلیٰ لندن سے پڑھ کر آئے ہوئے مگر سعد حسن کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ سترہ برس کی بیٹی کے لیے کہاں سے لائیں لندن پلٹ ایجوکیٹڈ لڑکا۔۔۔ خاندان کے تمام ماں باپ رال ٹپکاتے یہی سوچ کر آتے کہ اتنا بڑا افسر ہے ہمارے بیٹے کو کہیں نہ کہیں کھپا دے گا۔ سرکاری ملازمت ملے گی۔ ترقی کرنا پھر بیٹے کے اپنے ہاتھ میں ہوگا۔ سعد حسن کو وہ سب بہت برے لگتے، سیدھا پاجامہ کرتا موٹے فریم کی عینک ٹیڑھی مانگ کو تیل سے بھگو کر جمائے، بے حد مؤدب لڑکے پیروں میں انگوٹھے والی چپلیں۔۔۔

بیٹیاں آج بھی کم بولتی ہیں اور پچاس کی دہائی میں تو بالکل نہیں بولتی تھیں مگر وہ اکلوتی بیٹی تھیں۔۔۔ شرماتی جھجکتی چائے کی طشتری بھی لے جاتیں اور کسی نہ کسی پردے کی اوٹ سے مؤدب کو بھی دیکھ لیتیں۔۔۔ فیصلے کا پل جب آیا تو۔۔۔

"مجھے بہت سارا پڑھنا ہے ابو۔۔۔ اور مجھے۔۔۔ مجھے آپ جیسے آدمی سے شادی کرنی ہے جیسے کہ آپ ہیں۔۔۔ آپ جیسی ڈریسنگ۔ آپ جیسی انگلش اور آپ جیسا۔"

اماں کا تو رنگ سفید ہو گیا۔ بیٹی باپ کی لاڈلی تھی۔ پڑھی لکھی تھی با اعتماد اور اس زمانے کے اعتبار سے تو حد سے زیادہ منہ پھٹ بد تمیز مگر۔۔۔ پہلے سعد حسن کا سینہ چوڑا ہوا پھر منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ افسر تھے جو کچھ عرصہ پہلے تاج برطانیہ کے وفادار تھے۔ وہی پینٹ کوٹ، جوتے، بالوں کا اسٹائل۔

باپ بیٹیوں کے آئیڈیل ہوا ہی کرتے ہیں۔ مگر۔۔۔ وہ اتنے عرصے سے جس الجھن کا شکار تھے جیسے مطمئن ہو گئے۔ بیٹی کو بہت لاڈ سے پالا تھا۔ اس زمانے میں بیٹیاں دوست نہیں ہوتی تھیں مگر انہیں دوست کی طرح لگتی تھیں۔۔۔ وہ کہاں سے لاتے ایسا داماد۔

اور واقعی ان کا داماد ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ جو ملازم کی طرح ان کے عہدے کے رعب ہی سے سہار ہے۔ اگر داماد ان کی کیٹگری کا ہو تو اس سے دوستی کی جا سکے گی۔ وہ اس کا تعارف بہت فخر سے کروا سکیں گے۔ خاندان کے یہ نمونے۔۔۔ نہیں، انہیں اپنی بیٹی کی دکھلائی راہ پر چلنا ہو گا بس۔۔۔

یہ نیا انوکھا فیصلہ مشکل تھا ناممکن تو نہیں۔۔۔ سگار کے دھوئیں میں دن رات سوچا پھر ایک حکمت عملی بنائی۔۔۔ انہیں اپنے جیسا داماد ملتا تو وہ ان ہی کا ہم عمر ہوتا۔۔۔ اچھے پڑھے لکھے لڑکے تھے مگر ان کی دسترس سے دور۔۔۔ مگر ان کی دوربین نگاہوں نے محی

الدین کو پالیا۔ وہ مقابلے کا امتحان پاس کرنے والا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عقابی چمک تھی۔ وہ ہر چیز کو بہت گہرائی سے دیکھتا تھا اگر اس کا ہاتھ تھام لیا جائے اگر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا جائے' وہ بظاہر ان جیسا نہیں تھا مگر ان جیسا بنایا جا سکتا تھا۔

وہ سفید پینٹ کے ساتھ بہت ڈیسینٹ شرٹ پہنتا' اس کی آنکھوں سے ذہانت چھلکتی تھی۔ وہ دراز قد تھا۔ وہ انگلش ان ہی کی طرح برٹش لہجے میں بولتا تھا' یہ اس نے اپنے دادا سے سیکھی تھی جو گزرے حکمران میں سے ایک کے ترجمان رہے تھے۔

محی الدین سنگل کان سے نکلنے والا تازہ ہیرے کا ٹکڑا تھا۔ اور سعد حسن اس ہیرے کو تراش کر اپنی بیٹی کے زیور کا حصہ بنا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے' وہ یہ کام کر سکتے تھے۔

اسی طرح سعد حسن کی پلاننگ بے عیب تھی۔ اور بنت سعد میں کون سی برائی تھی' وہ جتنا مرضی بڑا افسر بن جائے' گھوم پھر کر وہی خاندان کی شرمائی لجاتی کوئی دوشیزہ اس کے سر منڈھ دی جاتی انہیں جس گارڈ فادر کی ضرورت تھی۔ وہ سعد حسن ہی ہو سکتے تھے۔

آگے کی زندگی بہت آسان تھی۔

دونوں میاں بیوی ساتھ بڑھنے گئے' چند سال کے وقفے سے آگے پیچھے دونوں نے سول سروس کا امتحان پاس کر لیا۔ دونوں بڑے افسر بن گئے۔ ہر چیز پلان کے عین مطابق تھی۔ لوگ دنوں' مہینوں اور سالوں کا منصوبہ بناتے ہیں مگر دونوں نے منٹوں اور گھنٹوں کو بھی گن رکھا تھا (سعد حسن' محی الدین اور عقیلہ بانو کے رشتے میں لگاؤ' محبت اور خلوص سے پہلے حساب کتاب تھا)

اتنے حساب کتاب کی واحد گڑبڑ ڈیڑھ سال بعد آنے والا وہ بچہ تھا۔ جس کا گمان کبھی خواب میں بھی نہیں کیا گیا تھا۔ وہ اچانک کہاں سے آگیا۔ وہ کہاں سے وارد ہو گیا۔ ابھی کیوں۔۔۔ ابھی کیا ضرورت تھی؟ بچہ نانی کے پاس پلنے لگا پھر آیا رکھی گئی۔ لیکن جب وہ دونوں سفارت خانے کے ملازم ہو کر جگہ جگہ گھومنے لگے تو بچہ بھی گھوم گیا۔

اور ایک بری عورت زندگی کو کس قدر بدہیئت' بے کار اور شرمندہ کر سکتی ہے۔ یہ انہوں نے بدر الدین کی زندگی سے سیکھا اور بدر الدین کے حصے کی عورت میں "برے" ہونے کی تمام نشانیاں موجود تھیں' بتانے یا کھوجنے کی کیا ضرورت۔ وہ عیسائی باپ کے خون اور یہودی ماں کے دودھ کا مکسچر تھی۔ وہ شرابی تھی اور شرابی جھوٹا ہوتا ہے۔ اندھا ہوتا' بے ایمان ہوتا ہے' بے فیض ہوتا ہے' بے شرم ہوتا ہے' وہ ہوش و حواس سے بے گانہ رہتا ہے' خائن ہوتا ہے' شرابی کے اندر زمانے کی جو برائیاں سما سکتی تھیں وہ اس میں تھیں وہ شرابی تھی۔

محی الدین کو وہ کبھی اچھی نہ لگی اس پر جو ہر جن کے بارے میں ان کے اندازے درست تھے۔ پہلے تو نہ کھلے مگر وہ کسی بھی رخ سے ان کے دل کو نہ لگی۔

وہ سراسر عذاب تھی۔ بربادی تھی اور بدر الدین کو برباد کر دینے والی تھی اور اسے ادراک نہیں تھا اس میں ادراک کی حس ہی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک اسکارلٹ دنیا کی پہلی عورت تھی اور آخری بھی۔۔۔ وہ واحد اچھی تھی' وہ خوب صورت تھی۔ اسے اس سے محبت تھی' جنون تھا' عشق تھا وہ تمام عمر جو مرضی کرتی رہی مگر تمام عمر وہ کہلائی بھی تو مسز بدر الدین' وہ اسے چھوڑ کر تو نہ گئی۔ کیوں کہتے ہیں لوگ کہ وہ بری ہے۔۔۔ اسے تو نہیں لگتی۔

اور اچھی عورت کی تعریف کیا ہے؟ اور بری عورت کی تعریف کیا؟ کس نے کی۔۔۔ اور کون کر سکتا ہے؟

کسی بھی چیز کو دیکھنے کا نقطۂ نظر جدا ہوتا ہے' وضاحت بھی الگ ہوگی۔

وہ اب جوانی کو خدا حافظ کہہ چکی تھی۔

مگر اب بھی جوانی کو گرما دینے کے ہنر سے واقف تھی۔

اس کی نگاہ اب کچھ کمزور ہو گئی تھی۔ لکھنے پڑھنے میں کچھ الجھن ہونے لگی تھی۔

مگراب بھی نین کٹوروں میں ڈوب جانے والوں کی ایک تعداد جیسے رجسٹرڈ تھی۔ وہ مارلن منرو سے بہت متاثر تھی۔ اس کی ہم مذہب اور شاید ہم شکل بھی۔
بدر چاند تھا مگر اس پر اسکارلٹ کے نام کا گہن لگ چکا تھا۔ اور سب سے بڑی تکلیف یہ تھی کہ اسے اس کا ادراک نہیں تھا۔ اور سالوں تک محی الدین بھی اس سب سے جانتے بوجھتے بے خبر رہے مگر اب ریٹائرمنٹ کے بعد جب قضا نمازیں یاد آتی ہیں تب اور بھی بہت کچھ یاد آنے لگتا ہے، سمجھ میں آنے لگتا ہے۔
بدر الدین اور اسکارلٹ اور... اور سوئی کی چبھن جیسا یہ احساس اب ایک بھالے کی طرح گڑ گیا تھا۔ اور 'اور' اب انہیں اسے بچانا تھا۔ ایسے ہی کسی غلط فیصلے سے... جو کل کو وہ نہ کرے۔
محی الدین نے زندگی سے یہ سیکھا تھا کہ ایک اچھی عورت آپ کو سنوار سکتی ہے اور اچھی عورت کی تعریف کیا ہو سکتی ہے؟ اور ایک بری عورت... اسکارلٹ یا اس جیسی کوئی اور... اللہ نہ کرے۔ انہیں لگا ان کی زندگی کا واحد مقصد اب ایک اچھی عورت کی تلاش ہے اور محی الدین نے زندگی سے یہ سیکھا تھا کہ...

✲ ✲ ✲

ایک سحر تھا۔ ایک خوشبو... دنیا کے سارے پھولوں سے اچھوتی، مسحور کر دینے والی... فرحت انگیز۔ زندہ رہنے کے لیے سانس لینا اور سانس چھوڑنا دونوں ضروری ہیں۔ قصداً" کوشش سے بھی پانچ سے سات منٹ تک سانس روکی جا سکتی ہے۔ مگر وہ صرف سانس لینا چاہتی تھی، سانس چھوڑنا نہیں۔ سو وہ اس خوشبو کو اپنے اندر اتار لینا چاہتی تھی۔
یہ کیسی خوشبو تھی۔ اس کی کنواری سانسیں الجھ جاتیں۔ اس پرفیوم کا کیا نام ہو سکتا ہے؟ اور بے نام خوشبو... وہ الماری کا پٹ کھولتی، سب سے چھپ کر الماری کے اندر منہ دے کر شاپر کا منہ کھولتی اور لمبے لمبے سانس بھر کے اپنے اندر خوشبو کو اتار لیتی۔ اس کی آنکھیں سرور سے بند ہو جاتیں۔ ہونٹ بھینچ لیتی جب تک کہ دم نکلنے کا گمان نہ ہو، وہ سہم جاتی اس وقت کا خیال کر کے جب خوشبو اڑ جائے گی تب... تب وہ کیا کرے گی؟

✲ ✲ ✲

"استخارہ کروایا ہے۔ بس دعا کرو جواب اچھا آئے۔" اریبہ عاقل نے دل گیری سے درخواست کی۔
"ان شاء اللہ" ماہ رو نے سر ہلایا۔ حسنل نے گردن ہلائی۔ حلیمہ نے تسلی آمیز انداز میں اس کے شانے کو تھپتھپایا۔
"بالکل مگر زیادہ بہتر ہوتا کہ تمہاری امی یا بابا پھر اپنا خود کرتیں..."
"ہمیں کہاں آتا ہے صحیح طریقے سے کرنا۔" اریبہ نے معذرت خواہانہ بے چارگی سے کہا۔
"کوئی مشکل نہیں، بس ایک دعا ہے جو یاد ہونی چاہیے۔ تم وہاں سے بھی کرواؤ۔ میں ان شاء اللہ خود کروں گی۔" حلیمہ نے اپنی خدمات پیش کردیں۔
"ہیں سچ حلیمہ۔ اس سے بڑھ کر اور کیا یار..." اریبہ بے طرح خوش ہو گئی۔
"تمہیں کرنا آتا ہے۔" ماہ رو نے پوچھا۔
"کیوں نہیں بھائی جان کے گارمنٹس کے بزنس کے لیے میں نے ہی تو کیا تھا۔ یہ ہرا بھرا کھیت اور سفید کپاس جیسے پھول اور بھائی جان انہیں چن چن ناپ رہے ہیں۔ حسنل کے نانا جان نے تعبیر بتائی تھی۔ ماشاء اللہ سے..." حلیمہ جوش سے بولنے لگی۔
"حلیمہ! مجھے اسلامک اسٹڈیز کے لاسٹ ویک کے احادیث والے نوٹس دے دو۔ میں چھٹیوں پر تھی۔ ہم بھائی کی شادی میں گاؤں گئے تھے ناں" عروج فاطمہ ان کے درمیان پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔ وہ بے حد پڑھاکو، لائق لڑکی تھی۔ حلیمہ نے ٹیچر کے بتائے نوٹس اسے تھما دیے۔ اپنے خود کے کبھی نہیں دیتی۔
"اور حسنل تم انگلش کے اور اگر سوشیالوجی کا کوئی نیا ٹاپک ہو تو وہ بھی۔"

"میں نے نہیں بنائے ہیں۔" اس نے اکتائے انداز میں کہا۔

"تو کیا بناؤ گی نہیں۔۔۔ امتحان سر پر ہیں یار۔" عروج نے جھرجھری لی۔

"سب یاد ہے مجھے 'فرسٹ ایئر میں تین تین اسلامیات پڑھی ہیں۔ اسلامک ایجوکیشن' اسلامک اسٹڈیز اور اسلامک ہسٹری۔۔۔ اور خیر سے گھر تو ہے ہی اسلام کا قلعہ۔۔۔ نانا جان نے پراسیکٹس بھرا تھا۔"

حلیمہ نے ناصحانہ ہنکارا بھرا۔ اریبہ اور ماہ رو زور سے ہنس دیں' اندر کی بات سے جو واقف تھیں' اسے سوشل ورک لینا تھا (آؤٹ ڈور کے بہانے باہر نکلنے کا موقع ملتا مگر۔۔۔)

عروج کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "ایسے نہیں کہتے آئی مین تم اتنے برے انداز میں کیوں کہہ رہی ہو۔"

"چھوڑو تم' یہ پکڑو نوٹس اور جا کر بناؤ۔" اس سے پہلے عروج کی سرزنش تو یہ تلا پر پہنچ جاتی۔ حسنل نے نوٹس اس کے ہاتھ میں تھمائے اور جانے کا اشارہ کیا۔ عروج بھی یوں بھاگی جیسے کفار کے گروہ سے چھوٹی ہو۔

"ہر کسی کے سامنے ایسے باتیں نہیں کرتے۔" حلیمہ بولی۔

"صحیح کہہ رہی ہے۔" ماہ رو نے تائید کی۔ اریبہ نے سر ہلایا۔

"اب اندر کی بات تو تمہیں معلوم ہے' ہمیں معلوم ہے۔ یہ تمہیں کالج میں دہریہ نہ مشہور کر دے۔"

"اور میں نوٹ کر رہی ہوں' تم زیادہ خاموش رہنے لگی ہو' بولو تو چڑچڑی پھاڑ کھانے کو دوڑتی ہو۔"

"ہاں یہ تو میں نے بھی نوٹ کیا ہے۔۔۔ حلیمہ نے سر ہلا کر اسے بغور دیکھا۔

"وہم ہے تم لوگوں کا۔۔۔"

"نہیں حسنل! کوئی بات ہے ضرور 'موڈ خراب ہے تمہارا' بتاؤ ناں' ہم تمہارے دوست ہیں' یار شیئر کرو۔" ماہ رو نے کتاب بند کر دی' وہ ٹیچر کی غیر حاضری اور باہر تیز دھوپ کے باعث کلاس روم ہی میں بیٹھی

تھیں۔ سموسے وغیرہ یہیں آ گئے تھے۔

"بول بھی دو اب۔۔۔" اریبہ چڑ گئی۔ ادھر حسنل تین دن سے پہلے ہی پھٹنے کو تیار تھی۔

"نماز پڑھنی ہو یا نہیں' مگر۔۔۔ مجھے روزانہ صبح اٹھ کے وضو بنا کے دوپٹا لے کر۔ اس طرح گھر میں گھومنا پڑتا ہے جیسے میں نماز پڑھ رہی ہوں' پڑھنے والی ہوں یا پڑھ چکی ہوں۔ ایک طبیعت خراب اور اس پر یہ دکھاوا' سب مرد کیا سوچیں گے' حسنل نماز کے لیے کیوں نہیں اٹھی' بستر میں کیوں گھسی ہے۔ مجھے نہیں اچھا لگتا عشا کی نماز سب کے ساتھ پڑھنا' ادھر اذان مکمل ہو ادھر جماعت تیار۔۔۔ کہ جی مرد وغیرہ جب مسجد سے لوٹیں تو عورتیں بھی فراغت پا کر دسترخوان لگائے منتظر ہوں۔۔۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ جب سب سو جائیں تب میں گہرے سناٹے میں خاموشی کے ساتھ نماز ادا کروں مگر نہیں۔۔۔ جلدی جلدی کا کلمہ۔۔۔ میرا دماغ گھوم جاتا ہے۔" وہ تیز تیز بولی اس کے منہ سے تھوک نکل رہا تھا۔ چہرہ تمتمانے لگا۔

ماہ رو نے لمبا سانس لے کر اپنے نوٹس پر شمار لگانا شروع کر دیا۔ اریبہ خاموش ہو گئی' اس بارے میں ایک دو بار پہلے بھی بات ہو چکی تھی۔

"غلط حسنل نہیں تھی۔ غلط گھر والے بھی نہیں تھے۔ بس درمیانی راہ۔۔۔

وہ سب سے متنفر تھی۔ وہ بے سکون تھی۔ حلیمہ نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا' وہ اسٹرا منہ میں دبائے بلیک بورڈ کو بہت دل جمعی سے تک رہی تھی۔ اسے اب صرف خاموش رہنا تھا۔ یا پھر رو پڑنا تھا۔۔۔ (اگر مخاطب کیا جاتا تو) اور نعمتوں کو ملایا نہیں جا سکتا' یہ زیادہ اہم ہے یہ کم۔ یہ زیادہ ضروری ہے یا۔ مگر طمانیت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ قناعت سے بڑھ کر کوئی دین کہاں' وہ بے کلی کے عذاب میں مبتلا تھی۔ اس کے دکھ مصنوعی' اس کی فکر خود ساختہ یونہی خوامخواہ۔

اس کے پاس شکر نہیں تھا۔ دراصل اس کے پاس "نظر" نہیں تھی جو اسے یاد کراتی اور شکر گزاروں کی فہرست میں جگہ دیتی۔ نصیحتیں اسے کاٹتیں۔ وعظ

سر پر پتھر کی طرح پڑتے۔ مشکل الفاظ اٹک جاتے۔ سماعت پر ہتھوڑے لگتے اور سب سے بڑھ کر جب اندر سے کوئی ''میں نہ مانوں'' کی تسبیح مسلسل پڑھتا ہو تو ساری شیریں بیانی اور علم و حکمت دھری رہ جاتی ہے۔

سچائی کی بابت لاکھ کھول کھول کر بتایا جائے مگر جب دل پر سیاہ مہر لگ جائے تب زبان بولنا' کان سننا اور آنکھیں دیکھنا بند کر دیتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

اپنے سر' منہ' بالوں' گردن' ہاتھوں سے ریت جھاڑتے ہوئے وہ شدید ترین حیرانی کا شکار تھا۔ بارش میں بھیگنے کا تجربہ تو بچپن ہی میں ہو گیا کہ کس طرح موسلا دھار بارش نچڑ جانے کی حد تک بھگو دیتی ہے۔

پر ریت میں لت پت ہو جانا یہ تجربہ زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بھی کبھی ساحل سمندر پر آرام دہ حالت میں ریت پر نیم دراز ہونے کے بعد کپڑے جھاڑ لیے اور بس.... مگر یہ بہت مختلف ریت تھی۔

سانسوں سے الجھی' آنکھوں میں بیٹھی' بالوں سے چپکی بلکہ روئیں روئیں میں پیوست کانوں کے سوراخ کے اندر حد تک۔ سر کے بالوں میں انگلی گھسانا مشکل تھا۔ ناک کے اندر۔ اسے ان گنت چھینکیں مارنے کے بعد اب سکون محسوس ہو رہا تھا۔

سب سے زیادہ تکلیف وہ منہ کا حال تھا اسے حلق کے اندر تک ریت گھس جانے کا شدید ترین تکلیف دہ احساس تھا اس کے دانت کچ کچ کر رہے تھے۔

اس نے اپنے مضبوط جوتے کھولے۔ پاؤں محفوظ تھے۔ جوتے اوپر سے جھاڑے' کپڑوں کے اندر جسم کے ہر موسے چپکی ریت اسے محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پچھلی نشست پر ہاتھ مارا اور پانی کی بوتل پکڑ جھاڑ کے منہ سے لگالی۔

پائیدان کے پاس پڑے بے کار کپڑے سے جیپ کو کسی حد تک جھاڑتے ہوئے اسے یکدم احساس ہوا' جیپ اسٹارٹ تو ہو جائے گی ناں۔

خدشے نے پل بھر کے لیے چونکایا تھا پر اگلے پل وہ پرسکون ہو گیا ــــــ یہ کیلاش کی پسندیدہ جیپ تھی جسے وہ خود ڈرائیو کرتا تھا اور شکار پر جانے کے لیے اس کی پہلی اور آخری چوائس تھی۔ اور ایک شرط جیتنے کے لیے اس جیپ کا ڈرائیور آج وہ تھا۔

اس کا اندازہ درست ثابت ہوا' تیسری بار چابی گھمانے پر گاڑی چنگھاڑی تھی۔ اور آگے پیچھے روشنی کے لمبے سائے۔ بچھ گئے تھے۔ اس نے چار جانب گہرا جائزہ لیا۔ اندھیری رات گہرا سناٹا اسے اچانک احساس ہوا کہ خاموشی اور سناٹا بے حد گہرا ہے۔ یہاں کوئی آواز نہیں تھی کسی بھی قسم کی حرکت نہیں تھی۔

اسٹارٹ جیپ کی ہلکی سی ''سان'' اس نے ہاتھ بڑھا کر چابی نکالی تو سناٹا ہولناک روپ اختیار کر گیا اور اندھیرے نے خوف کی شدید لہر اس کے رگ و پے میں اتار دی۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن باقاعدہ سنائی دے رہی تھی۔ یہاں اس کے سوا کسی چرند پرند کی آواز نہیں تھی۔ وہ کچھ ساکت بیٹھا نگاہیں جما کر گویا گرد و پیش کو کھوج رہا تھا۔ جو سراسر احمقانہ عمل تھا۔

رات کے اتنے گہرے سناٹے اور اندھیرے میں گمان کی انتہاؤں تھی کہ بینائی چلی گئی ہو اندھیرے میں نگاہوں کے مسلسل ارتکاز نے کچھ ہیولے واضح کیے تھے۔ کچھ جھاڑیاں' کچھ ریت سے ڈھلے پتھر زمین پر گہری سیاہی کی صورت ڈھیری کی طرح چپکی بیلیں۔ یہاں کوئی خوشبو نہیں تھی' بدبو بھی نہیں تھی۔ یا ناک میں گھسی ریت نے قوت شامہ متاثر کی تھی۔ عجیب سی کیفیت جس کا نام مشکل تھا' اس نے غیر ارادی طور پر گاڑی کی لائٹس آن کر دیں۔

اسے تقویت کا احساس ہوا۔ زور دار ہوا ریت کا طوفان' جھکڑ جب اس پر پڑا تھا تو اس نے آگے بھاگنے کے بجائے گاڑی روک دی تھی (یہ اس کی خام خیالی تھی کہ اس نے روکی تھی۔ اس نے خود ہی رک جانا تھا۔)

اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہیں رک جانے کو ترجیح دی تھی اس نے اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھام کر سر اس پر جھکا لیا تھا۔ اس نے

ریت کے بگولوں سے بچنے کے لیے صحیح فیصلہ کیا تھا۔
مشکل وقت گزر گیا۔ اسے بس واپس پلٹ کر سیدھا جانا تھا۔ دس سے بارہ منٹ تک وہ ان چاروں تک پہنچ جاتا۔ وہ شرط جیت گیا تھا' وہ ریت پر جیپ بھگا سکتا تھا۔ اسے قطعاً" خبر نہیں تھی۔ ریت کے بگولوں کی شدت نے جیپ کا رخ بدل دیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ دس سے بارہ منٹ میں اسے کہاں سے کہاں پہنچ جانا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی حیرانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ سخت ترین اچھنبے کے بعد اب کچھ مشکل محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق ان چاروں کو دوسری گاڑی سمیت یہاں کھڑا ہونا چاہیے تھا مگر یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ہو کا عالم۔ تاریکی... آسمان پر چاند ندارد۔
وہ کمر پر ہاتھ رکھے گھوم گھوم کر اوپر نیچے ہر جانب دیکھ رہا تھا۔ جیپ کی لائٹس بے حد یاور فل تھیں۔ وہ اس روشنی کے سائے میں آگے بڑھا پھر پلٹ کر پیچھے۔ اونہوں نہیں...
دس منٹ ڈرائیو کی شرط تھی۔ کیلاش چیخا بھی تھا کہ ڈرائیو بھلے وہ ہی کرے مگر ملازمین میں سے کسی ایک کو اپنے ہمراہ لے لے۔ یہ انجان راستہ ہے۔ جھکڑ چلیں تو آزمودہ بندہ بھی سدھ بدھ کھو دیتا ہے۔ ریت ایک ہی پھیرے میں پرانے ٹیلے ڈھا دیتی ہے۔ راستے کھا جاتی ہے اور بے حد اونچے نئے ٹیلے بنا دیتی ہے کہ مانو صدیوں سے یہیں تھے۔ لوگ تجربے کی بنیاد اور سمتوں کے تعین سے پھر آگے بڑھتے ہیں۔
مگر وہ بھی ایک عرصے بعد دوستوں کی گیدرنگ اور بے فکری کو جی بھر کے انجوائے کر رہا تھا۔ عملی زندگی کے اتار چڑھاؤ... محنت کوشش کامیابی کمپٹیشن کی ٹینشن... ہر چیز سے دور نو عمر لڑکوں کی طرح یوں بے مقصد کی اچھل کود' خوامخواہ کے قہقہے جیسے زمانوں کی کثافتوں کو دھو رہے تھے۔
جیسے آنے والے بہت سارے سالوں کو انرجی دے رہے تھے۔ چارج کر رہے تھے۔ اپنی اصلی زندگی میں وہ بہت نپا تلا کم گو مغرور و مصروف قاعدے سے چلنے والا بندہ تھا۔ مخصوص لوگ۔ مخصوص جگہ' مخصوص انداز مگر یہاں دوستوں کے درمیان وہ سب ... بنی اوقات کو گویا بھلائے فقط انجوائے کر رہے تھے۔ مگر... ؟ یہ اب اس کے ساتھ کیا ہو گیا۔
شاید میں کم چلا ہوں۔ تھوڑا اور آگے جاؤں تو... شاید مجھ سے وقت کا تعین کرنے میں غلطی ہوئی ہو۔ وہ اپنی قیاس آرائی پر مطمئن ہوا تو جست لگا جیپ پر سوار ہو گیا۔
"مجھے ناک کی سیدھ میں جانا ہے۔" اس نے چابی گھمائی۔
مگر یہ فیصلہ غلط تھا' اسے اندازہ ہوا تو اس نے اسپیڈ کم کر دی۔
جتنی ڈرائیو وہ پہلے کر چکا تھا اور اب جو کر کے آیا تھا' یہ بہت زیادہ تھی یقیناً"۔
چہار اطراف کا عمیق جائزہ لینے پر اس پر شدید حیرانی اور پریشانی کا غلبہ ہوا۔
اسے کلک ہوا یہ وہ جگہ قطعاً" نہیں ہے' ہو بھی نہیں سکتی... یہ تو سراسر جھاڑیاں' پتھر' ٹیلے ہیں اور ہر صورت ایک ایسا راستہ ہے۔ جہاں شاید کبھی انسانی قدم نہیں پڑے۔
اس پر شدید پریشانی کا حملہ ہوا' اس نے چابی گھمائی اور فل اسپیڈ سے جیپ دوڑانے لگا' وہ جلد از جلد ان سب تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مگر آدھے گھنٹے تک اونچے نیچے ڈگمگ راستوں پر جھٹکے کھانے کے بعد اس نے گاڑی کو کسی شعوری ارادے کے بنا روک دیا۔ وہ جیسے تھک گیا تھا۔
اتنا یقین تو اسے ہو چکا تھا۔ یہ وہ راستہ نہیں۔ یہ وہ جگہ نہیں... اس نے بہت زور سے اپنے ہاتھ اسٹیئرنگ پر مارے' اس کی سانس الجھی ہوئی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر ماتھا پونچھا تو وہاں پسینے کی نمی تھی۔
بوتل کا بقایا پانی حلق سے اتار جب ساکت بیٹھے بہت سے پل گزرے تو اسے ہلکی کپکپی کا

احساس ہوا۔

یہ بڑی عجیب صورت حال تھی۔ اس کے ماتھے اور بالوں میں پسینہ تھا اور جسم کو لگتی ٹھنڈ۔۔۔ اس نے گریبان کے بٹن کھول کر کالر پیچھے گرایا۔ وہ سبز، سیاہ کمانڈو ٹراؤزر کے ساتھ بسکٹی رنگ کی کاٹن کی شرٹ میں ملبوس تھا۔ کیلاش نے اتنی جلدی مچائی تھی' جیکٹ وغیرہ پہننے کا موقع ہی کب دیا۔

اور۔۔ اور اسے تو کل صبح دس بجے واپس جانا تھا۔ شام کی فلائٹ سے اس کی واپسی تھی۔

اور اسے ممبئی سے ایمانے کے لیے گفٹس بھی لینے تھے اور اس نے ڈنر کا وعدہ کر رکھا تھا اور۔۔۔ اور؟'

☼ ☼ ☼

موسیٰ بی۔ اس نے اس چیز کو مان لیا تھا کہ انڈیا بہت بڑی میوزک انڈسٹری ہے' درست' مگر پاپ میوزک پر زیادہ اور بہتر کام پاکستان میں ہو رہا ہے۔

اس نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا کہ وہ اپنا دوسرا البم پاکستان میوزک کمپنی کے ذریعے ریلیز کرے گا۔ بہت سے لوگوں نے اسے احمق کہا۔ پاگل پن۔۔۔ مگر موسیٰ بی فیصلہ کر کے ہٹنے والا نہیں تھا۔ وہ تھک چکا تھا ملک ملک گھوم کر۔ اس کے پاس برٹش نیشنلٹی تھی۔ اس نے دنیا کے ہر گھاٹ کا پانی پی لیا تھا' مگر ایک بے چینی' مطمانیت کا فقدان چین نہیں لینے دیتا تھا۔ دبئی کی زندگی اس کے اپنے مزاج کے عین مطابق تھی' وہاں وہ آزاد تھا' اس پر کوئی قدغن نہیں تھی۔

مگر وہ وہاں بھی بور ہو گیا۔ کبھی کبھار بے حد آزادی اور بے فکری بھی اکتاہٹ پیدا کر دیتی ہے۔ وہ انڈیا آگیا۔ یہاں اس کے بہت اچھے دوست تھے۔ اجنبیت کا احساس نہیں تھا۔ سب بہت محبت سے ملتے۔ دیدہ و دل راہ کیے ہوئے اور ہر نئے جانے والے کی طرح وہ فوراً" متاثر ہو گیا۔ جھوم گیا' مگر کچھ وقت گزرنے کے بعد احساس ہوا' وہ تعریف تعریف میں اسے کھا جانے والے ہیں۔

اس کے بارے میں معلومات لی جاتیں تو خبر ہوتی' وہ پاکستانی نژاد برطانوی ہے۔ (پاکستانی۔ اوہاں؟)

اس سے اجازت لینا تو دور اس کی بے خبری میں ایک مشہور ڈائریکٹر نے اس کی البم کا گانا "ساون" ذرا سے ردوبدل کے ساتھ اپنے میوزک ڈائریکٹر کے نام سے فلم میں چلا دیا۔ یہاں کاپی رائٹ کے سخت قوانین تھے۔ جرمانے' ہرجانے' معذرت سب۔۔۔ مگر کچھ بھی اس کے لیے نہیں۔ اس نے اپنے دوستوں (دوستوں؟) کے سامنے فریاد کی۔ وہ چیخا' چلایا' مگر نقار خانے میں طوطی کی سن لی جائے، اس منافقت کی دنیا میں کون دادرسی کرتا۔

اس کے گانے ایم ٹی وی کے چارٹ پر سب سے لمبے عرصے تک نمبرون رہے مگر سالانہ ایوارڈ میں اس کا ذکر تک نہ تھا۔ ایک آدھ بار تو ایسا اتفاق ہو جاتا ہے مگر بار بار۔۔۔

موسیٰ سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ اس نے یہ سب سن رکھا تھا۔ دیکھا بھی تھا' مگر اب جب خود جھیلا تو یقین ہو گیا۔ موسیٰ بی نے صحیح فیصلہ کیا تھا۔ اسے پاکستان میں رہ کر اپنا کیریئر بنانا تھا۔ اسے خود پر بھروسا تھا اور ذات کا یہی یقین کامیابی کی ضمانت۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تو سوچا" آپ نے اس روز کے بعد آنا چھوڑ دیا ہے' مگر آپ تو موجود ہیں؟؟"

"اور میں نے یہ سوچا مولانا کہ آپ تائب ہو گئے۔" مفتی عبدالرحمن نے جوابی جملہ کیا۔

"ہاہاہا۔۔۔" محی الدین سہگل دل سے ہنسے۔ انہیں ان کا شیطانی قہقہہ ناگوار محسوس ہوا۔ پر اتنے دن بعد اپنے کالج کے زمانے کے دوست کو جو چار برس ان کا روم میٹ رہا تھا دیکھ کر وہ ہمیشہ دل سے خوش ہوتے تھے۔ دونوں میں بظاہر کوئی چیز مشترک نہیں' مگر نوجوانی کا اک وہ سنہرا دور جب صرف صبح سے شام کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ خواہشات' ترجیحات خواب' مسائل' فکر' سوچ' سب کے کندھے پر گٹھڑی دھری ہوتی ہے'

مگر اس کا منہ بند ہوتا ہے۔ گھڑی ایک بار کھل جائے پھر راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ سوچ خواب فکر اور "میں" کی چابک ہر بندے کو پھر اپنی مرضی سے دوڑاتی ہے۔

محی الدین سہگل نے جلد شادی کرلی اور پھر وہ امتحان پر امتحان پاس کرتا ایک "مستقل امتحان" (بیورو کریسی) میں شامل ہو گیا جس کا نتیجہ دنیا میں نہیں نکلتا۔

ادھر عبدالرحمٰن مزید دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دنیا بھر کی جامعات سے خوشہ چینی کرتے رہے۔ فیڈرل کمیشن کے امتحانات کا ایک انت ہوتا ہے۔ مذہبی علم کے طالب علم گود سے گور تک بستہ اٹھا کر چلتے ہیں۔ ان کا سلیبس کبھی مکمل نہیں ہوتا سو مفتی عبدالرحمٰن ابھی تک خود کو طالب علم مانتے۔

دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی، مگر سالوں بعد ملنا اور اب جب سے محی الدین سہگل نے یہاں ڈیفنس میں گھر بنا لیا تھا تو کبھی کبھار کا یوں راہ میں ملنا دونوں کے لیے بے حد خوشی کا باعث ہوتا۔ سنہری فریم کی عینک، گرے بال اور گرے فرنچ کٹ داڑھی کے ساتھ محی الدین آج گرے کلر کے ٹریک سوٹ میں بے حد فریش اور خوش لگ رہے تھے۔

"مولانا! آج بہت خوش ہیں؟" مفتی صاحب بہت موڈ میں اور بعض اوقات جل سڑ کر انہیں "مولانا" پکارا کرتے۔

"وہ تو ہیں ہی... ہاہاہا... مگر آپ اتنے دن کہاں تھے مفتی صاحب...؟ پارک انتظامیہ نے آنے پر پابندی عائد تو نہ کردی تھی۔"

"لاحول ولا..." وہ برافروختہ ہو گئے۔ "ارے میں نے خود ہی فجر کے فوراً" بعد آنا شروع کردیا اور "تم جیسوں" کے آنے سے پہلے واپسی۔" ان کا جلا کٹا انداز... محی الدین پھر دل کھول کر ہنسے۔

"تم کچھ زیادہ قہقہے نہیں لگا رہے۔"

"لگا رہا ہوں... ہاہاہا..."

"لاحول ولا..." وہ بھنا گئے۔

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے، واک کا فائدہ ہوا یا محترم یوں ہی ہانپتے آجاتے ہیں؟" محی الدین نے ہم قدم چلتے ہوئے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"الحمدللہ۔ بالکل افاقہ ہے مگر یہ معلوم ہوا کہ اب جب تک زندگی ہے یہ روٹین تو رکھنی پڑے گی۔ چند روز مصروفیت کے باعث جب نہیں کرسکا تو دوبارہ حال زیادہ خراب ہو گیا۔ تم اپنی کہو بہت دنوں بعد نظر آئے۔ یہیں تھے یا کہیں باہر گئے ہوئے تھے؟" انہیں دھیان آیا۔

"یہیں تھا۔ مجھے اب کہاں جانا ہے۔" محی الدین کا لہجہ بے حد ہلکا پھلکا تھا۔

"کیوں اب کیا ہو گیا' لیکن یہ ہے مولانا! تم مجھے بہت فریش، ایکٹو... بلکہ جوشیلے نظر آرہے ہو۔"

"ہے ناں... مجھے خود بھی یہی لگ رہا ہے میں اپنے اندر بے حد انرجی محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے میں پچیس سال کے نوجوان کی طرح..." جملہ ادھورا رہ گیا۔

"کہیں تم نے شادی وادی تو نہیں کرلی۔ بھاوج محترمہ کو علم ہے۔" مفتی عبدالرحمٰن کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"شادی سے بڑی خوشی ہے۔ تمہیں پتا ہے' سمیع الدین نے اپنا فلیٹ چھوڑ دیا۔ وہ میرے پاس... ہمارے پاس یعنی ہمارے گھر میں ہمارے ساتھ رہنے لگا ہے۔ ہمیشہ کے لیے... اس نے خود کہا ہے مجھ سے۔"

"واقعی محی الدین... یہ تو باعث خوشی ہے۔ اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں عطا فرمائے۔ میں تمہارے لیے دعا گو ہوں..." عبدالرحمٰن صاحب بھی دل سے مسکرائے' وہ قریبی بینچ پر ٹک گئے۔ آج محی الدین سہگل کا بہت بولنے کا دل تھا۔ اور انہیں سن کر وہ ان کی خوشی میں شامل ہو سکتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"اے بنی اسرائیل یاد کرو تم لوگ، میرے ان احسانوں کو جو کیے میں نے تم پر۔ اور پورا کرو تم۔ میرے عہد کو پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو۔ اور

صرف مجھ سے ڈرو۔ "ام القرٰی-39"

فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کالج سے امتحانات کے لیے جاچکا تھا۔ مئی کا آغاز تھا۔ بی اے' بی ایس سی کی لڑکیاں بے فکری سے سارے کالج میں دندناتیں' پڑھائی زور و شور سے چل رہی تھی بمشکل فری پریڈ ملتا' چلچلاتی دھوپ صبح ہی سے ہر کونے کھدرے میں رات تک کے لیے گھس کر بیٹھ جاتی' اتنے بہت سے دنوں کے بعد آج اچانک چوتھا اور پانچواں پریڈ فری مل گئے۔ سو وہ بڑی تسلی سے کینٹین پہنچیں' حلیمہ اور اریبہ پہلوؤں کے درمیان بنی جگہ پر دو گھس کر بیٹھ گئیں۔ یہ دونوں آلتی پالتی مار کے ان کے سامنے۔

اریبہ نے سرپرائز پارٹی کا اعلان کیا اور پھر اخبار کے کاغذ پر ڈھیر ساری کیریاں نمک مرچ لگا کر لے آئی۔ مانو عید ہوگئی۔ بعد میں سموسے اور پوریاں چنے تو لازمی تھے ہی۔۔۔

"میرے پاس بھی کچھ ہے۔" ماہ رو نے اپنا بیگ کھولا۔ اس میں کچھ فیشن میگزین تھے۔ کالج میں کافی سختی تھی۔ مگر ماہ رو موقع نکال لیا کرتی تھی۔ حلیمہ کپڑوں کی ڈیزائننگ میں کھو گئی۔ دوسرے میگزین میں لالی وڈ' بالی وڈ کے چٹ پٹے اسکینڈلز کے قصے تھے۔ اریبہ اور ماہ رو کے تبصرے اور دلچسپی کیا کہنے۔

حسنل کے ہاتھ انگلش میگزین لگا وہ یوں ہی ورق پلٹنے لگی۔ ورق پھڑپھڑائے اس کا دل بھی پھڑپھڑایا۔۔۔

"ارے یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں۔۔۔ اس کی تصاویر بھی تو مل سکتی ہیں۔" اس کا تصوراتی خاکہ اتنا بے عیب' مکمل اور واضح تھا کہ تصویر کی ضرورت نہیں تھی لیکن اب جو تصویر دیکھی تو۔۔۔ کینٹین' دیواریں' سیڑھیاں' میزیں' کرسیاں' لڑکیاں سب غائب ہوگیا۔ وہ جیسے تنہا دل پر ہاتھ دھرے کھڑی تھی اور سامنے۔۔۔

بے حد چکنے سیاہ ورق پر وہ ٹانگیں کھول کر اسٹول پر بیٹھا تھا۔ کہنی گھٹنے پر ٹکی تھی' انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے اینگل میں چہرہ ٹکا تھا' وہ سر جھکا اور آنکھیں اٹھا کر کیمرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھا تھا۔

براؤن زپ والی سفید سلیولیس جیکٹ میں اس کے مسلز نمایاں تھے۔ اس کی آنکھیں واقعی بول رہی تھیں۔ دعوت دیتی' کچھ پوچھتی' کچھ بتاتی' بے حد خوب صورت سنہری آنکھیں یا شاید سبز آنکھیں۔۔۔ سنہرے گھنے بالوں کا ایک گچھا ماتھے پر بے فکری سے گرا تھا۔

یہ میگزین کا سینٹرل پیج تھا۔ سیاہ ورق پر سفید حروف میں اس کا نام درج تھا۔ موسیٰ بی۔۔۔ موسیٰ موسیٰ۔۔۔ موسیٰ۔۔۔ حسنل کا دل دھک دھک کرنا بھول کر موسیٰ موسیٰ کی گردان کر رہا تھا۔

وہ کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ دماغ سن تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے ماورا۔۔۔ وہ بس دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں ارتکاز کی شدت کے باعث شدید جلن ہوئی تو اس نے تیز تیز پلکیں جھپکیں۔ اگلے پل وہ جیسے حاضر ہوگئی۔

"یار آفت ہے یہ آدمی۔۔۔ میں نے اپنے ہوش میں اتنا ہینڈسم بندہ شاید ہی دیکھا ہو۔" ماہ رو نے میگزین جھپٹ لیا۔

"میں نے بھی۔" اریبہ بھی متاثرین میں سے تھی۔ وہ اب میگزین گود میں دھرے بغور تصویر دیکھ رہی تھی۔ حسنل کا چہرہ ساکت تھا۔ اور اس نے بہت مشکل سے یہ تاثر ڈھالا تھا۔

"وہاں اس روز کنسرٹ میں میں نے پہلی بار جنید جمشید کو دیکھا۔ علی حیدر کو بھی یار دونوں بہت خوب صورت تھے۔ مگر سب سے زیادہ جمشید جمشید وہ اسکرین پر اتنا خاص نہیں آتا جتنا کہ سامنے تھا۔ لیمن شرٹ اور کریم پینٹ آفت یار آفت۔"

"یار! یہ جو موسیٰ ہے موسیٰ بی۔ یہ بہت ہی عجیب سا نہیں تھا۔ میں بہت دنوں تک سوچتی رہی۔ اس کی آنکھیں یا دیکھنے کا انداز۔۔۔ اب اس وقت دیکھو محو ہوگیا لیکن اب جب یہ پکچر دیکھتی ہوں تو پھر وہی احساس ہونے لگا جیسے۔۔۔ آئی کین ناٹ ایکسپلین مائی فیلنگ ان ورڈز۔۔۔" اریبہ پھر الجھ گئی۔ ماہ رو نے میگزین اچک لیا۔ اپنی گود میں رکھا بغور دیکھا پھر

آنکھوں کے بالکل قریب لے گئی۔ حلیمہ بھی متوجہ ہوئی۔

"مجھے بھی اس دن لگا تھا کہ اس کے چہرے کو بہت دیر تک دیکھنا مشکل ہے اور اس تصویر کی طرف دیکھو ناں تو بھی ویسا ہی احساس ہوتا ہے۔" حلیمہ کی رائے بھی تھی۔ اریبہ خوش ہوگئی وہ اس طرح وضاحت نہیں کرپائی تھی۔

"تم نے اپنی رائے نہیں دی' کیسا لگا اس کی طرف دیکھ کر؟"

"کوئی نہیں' کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔۔۔" وہ ہکلا سی گئی۔

"دفع کرو۔۔۔ لڑکا بے حد۔۔۔ دلکش' اسمارٹ ہینڈسم زبردست ہے' ایسے چہرے ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ مجھے یوں لگا کہ جنید اور علی کے چہرے پر ایک سادگی اور نور کا سایہ سا تھا۔ مگر اس کا۔"

"اس کا کیا مکروہ ہے ہاہا۔" ماہ رو نے بات کاٹ کر نتیجہ اخذ کیا۔

"نہیں بس۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔" اریبہ نے ورق پلٹنے شروع کردیے۔

"ہی از ویری ہینڈسم مین' ان کے عقب میں بی اے فائنل کی دو لڑکیاں ادھ کھلی کھڑکی سے میگزین دیکھ اور ان کو سن رہی تھیں۔ بول پڑیں۔

"ہمارے گھر میں ڈش ہے' بھی وہاں دیکھا ہے۔ گاتا تو کیا گاتا ہے' جو ماڈلنگ کرتا ہے' پورا کا پورا پیج ہے اوپر سے بنا بنایا۔۔۔ قد' رنگ' آواز۔۔"

"اور میں بتاؤں۔" وہ ان سب سے خطاب کرتے کرتے اپنی دوست کی جانب مڑی۔ "کسی ماہر نیوٹریشن اور باڈی انسٹرکٹر کے ساتھ رہ کر جسم بنایا ہے کہ چہرہ اپنی اصل ہیت میں رہا ورنہ اتنی زور آزمائی سے سب سے پہلے چہرے کے عضلات بگڑ کر سخت ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس کا فیس۔۔۔ مائی گاڈ۔۔۔"

"بھئی واہ کیا تم اس کی بائیوگرافی لکھ رہی ہو۔۔۔" ماہ رو نے تپ کر اسے ٹوکا تھا۔

"ہاہاہا۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔" دونوں کو خوب مزہ آیا۔

"اب تم لوگ بے چاری بچیاں' اتنی الجھن میں تھیں سو ہم نے ہیلپ کردی اب تم شکریے کے طور پر یہ مسالا لگی کیریاں شیئر کرو ناں۔۔۔" اس کے منہ میں پانی آرہا تھا۔ حلیمہ نے جان چھڑانے کے انداز میں مٹھی بھر کے اوپر کردیے کھڑکی کا پٹ بند ہوگیا اب وہ چاروں اسکینڈلز اور گوسپ کا صفحہ کھولے بیٹھی تھیں۔ لیکن۔

ایک صفحے پر یہاں بھی موسیٰ بی کے آنے والے البم کے فائنل سونگ اور ویڈیو کا چرچا تھا۔ چاروں کے سر جڑ گئے "آواز اب دھیمی تھی۔ گانے کا نام "تیری طلب تھا" ویڈیو ریلیز نہیں ہوئی تھی مگر اس کے مقابل مشہور ٹی وی فلم ایکٹریس شہرزاد عیسانی تھی' وہ چالیس کے قریب پہنچنے والی تھی مگر اپنی اسمارٹ نیس اور بے حد خیال رکھنے کے باعث بہت کم عمر اور ایکٹو دکھائی دیتی تھی۔ سال میں دو یا تین ڈرامے اور ٹوٹی پھوٹی ایک فلم مل جاتی تھی۔

"اسے اس بوڑھی گائے کے ساتھ کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" ماہ رو کو آگ لگ گئی تھی۔ اس بار تینوں ہم خیال تھیں۔ ایک ساتھ پڑھنے لگیں۔

"ویڈیو کی تھیم کے مطابق ایک نوعمر کالج بوائے کو اپنی ٹیچر سے اٹریکشن ہوجاتی ہے۔ یہی ویڈیو کی بیس ہے' باقی ویڈیو دیکھنے کے بعد۔۔۔"

"اچھی نہیں لگ رہی بالکل بھی۔" اریبہ مایوس ہوئی۔

"واقعی موسیٰ کا کا لگ رہا ہے۔" حلیمہ بی بی کی بھی رائے تھی۔

ماہ رو کا چہرہ تاسف کی تصویر تھا "مجھ سے کانٹریکٹ کرلیتا اب اتنا تو کرہی لیتی۔ بے چارہ پاکستان میں لانچ ہونے جارہا ہے۔"

"زہر لگ رہی ہے اس کے ساتھ کھڑی۔ کیسے کندھا جوڑ رکھا ہے اور اس کا ہاتھ ایسے پکڑا ہوا ہے جیسے کہیں بھاگ نہ جائے۔ کمینی۔" تینوں حق دق رہ گئیں۔

حسن المآب کی آنکھوں سے شرارے اور منہ سے

پھنکار نکلی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ پرزے پرزے کردے۔

"تمہیں کیا ہوا۔۔۔" ماہ رو چونکی۔

"خیریت حسنل کیا ہوگیا۔" حلیمہ نے اپنی مخصوص حلیمی سے اس کا گال چھوا۔

"آں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔" وہ لوٹی تو چہرہ بھی نارمل ہوگیا۔ اریبہ شانے اچکا کر رہ گئی۔ حسنل نے میگزین پکڑلیا' وہ جیسے تفصیلات پڑھ رہی تھی مگر نہیں۔ وہ تو بس یک ٹک دیکھ رہی تھی۔

"شہرزاد عیسانی دراز قد' بے حد دبلی پتلی۔ (کچھ مستقل ڈائٹنگ) گندمی رنگت کی حامل' نازک نین نقش والی دلکش عورت تھی۔ وہ سلور ستاروں والی گہری نیلی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اس کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک اور انداز تمغہ جیت لینے والا تھا۔

حسنل نے تبصرہ پڑھا۔ موسیٰ کو ویڈیو کی کامیابی کے لیے ایک جانے مانے مشہور چہرے کی ضرورت تھی اور شہرزاد کی ڈھلتی عمر اور ڈھلتے کیریئر کو یہ ویڈیو جیسے انجکشن کی طرح طاقت دینے والی تھی۔ یہ سنگم کامیاب ہوجاتا' یہ سنگت بیٹھتی تو موسیٰ جس بلندی پر ڈول رہا تھا۔ پاؤں جمالیتا اور شہرزاد کا کیریئر جیسے نیا جنم لیتا۔ دونوں کی آنکھوں میں بے حد چمک اور اپنی اپنی غرض تھی۔

"ویسے اس "بی (B) کا کیا مطلب ہوسکتا ہے" حلیمہ کا بھی دھیان وہیں تھا۔

"بی فار بخش دیں
بی فار بچائیو
بی فار بیسٹ اور بی فار بندر اور بی فار بے ہودہ' بے حیا اور بے غیرت۔" ان کی قیاس آرائیوں میں کھڑکی کا پٹ کھلا' آواز ان تک پہنچی۔ مگر اس بار یہ تینوں ہنس پڑی تھیں۔

حسنل کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ غیر محسوس طریقے سے ناخن کی مدد سے شہرزاد کا چہرہ گود چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تیری طلب۔" ہر پہلو سے کامیاب رہا۔ آواز' موسیقی' شاعری اور سب سے بڑھ کر ویڈیو۔۔۔ زیادہ تر کلاسِ روم کے سین فلمائے گئے تھے مگر ہیرو (موسیٰ) کے تصور میں جب ٹیچر (شہرزاد) مغلئی گلابی فراک میں کلاسیکل رقص کرتی نظر آتی ہے' وہ بڑا ہی خوب صورت کمبینیشن تھا۔"

موسیٰ بی کے قدم بلندی پر تو تھے ہی مگر اب جیسے مضبوطی سے جگہ بنا کر جم گئے اور اس سے زیادہ مضبوط وہ دوستی رہی جو تین ماہ کے قلیل عرصے میں اس کے اور شہرزاد عیسانی کے درمیان پروان چڑھی۔

حساب موسیٰ کا بھی بہت اچھا تھا۔ شہرزاد اسے کسی میڈل کی طرح اپنے ساتھ لیے پھرتی۔ اس کے طویل کیریئر میں بنائے گئے ہر طرح کے تعلقات' وہ سب سے موسیٰ کو متعارف کرواتی۔ دنوں میں موسیٰ کی پی آر زبردست ہوگئی' اسے روٹی کمانے' کی فکر کہیں نہیں رہی تھی۔ یہاں بھی دوستوں کی تعداد اور حلقہ احباب وسیع ہوتا جارہا تھا مگر شہرزاد سے دوستی سب سے الگ تھی۔ وہ اکٹھے پائے جاتے۔ شہرزاد عیسانی بے حد نازک عورت تھی اور ان دنوں سنگل بھی' تیری طلب نے اس کے گرتے کیریئر کو نہ صرف سہارا دیا بلکہ اسے راتوں رات شہرت کے نئے پہلوؤں سے روشناس کروایا۔

وہ ایک شوہر کو خود چھوڑ چکی تھی اور ایک نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ پہلی شادی والدین کی مرضی سے ہوئی' اور دوسری اس کی اپنی مرضی سے مگر دونوں کی ناکامی میں اس کا ہاتھ زیادہ تھا۔ دونوں شوہر اس کے آئیڈیل نہیں تھے اور زبردستی کے رشتے میں بندھے رہنے سے بہتر نہیں کہ راستے جدا کرلیے جائیں۔

دوسرے شوہر سے بطور حق مہر ملنے والا فرنشڈ فلیٹ اس کی رہائش گاہ تھا۔ وہ ایک بوڑھی بوا اور 15 سال کے لڑکے کے ساتھ جو اوپر کے تمام کام دیکھتا تھا' خوب من مانی سے رہتی۔

ویڈیو بن گئی اور بے حد کامیاب ہوگئی۔ کام ختم۔ دونوں نے ہر پہلو سے خوب فائدے بٹورے لیکن رابطے ختم ہونے کے بجائے مضبوط ہوتے گئے۔

دونوں ایک دوسرے کو جسٹ فرینڈ کہتے لیکن یہ دوستی جی بھر کے کیش ہو رہی تھی۔ عمروں کا فرق بہت نمایاں تھا۔ وہ انرجی سے بھرپور کوائٹ ینگ بوائے اور شہرزاد ڈھلتی عمر کی وہ مردوں کو جھیلی عورت' انڈسٹری کی نئی نویلی لڑکیاں تو عمر' طرح دار' بے حد خوب صورت۔ ہائی کوالیفائیڈ۔۔۔ بہت اچھے گھروں سے تعلق رکھنے والی سب حیرانی سے اس دوستی کو دیکھتیں۔ کسی بھی تقریب میں وہ ایک ہی نشست پر ہوتے۔ ساتھ آتے ساتھ جاتے گاڑیاں الگ ہی ہوتیں تب بھی ایک ٹائم میں داخل ہوتے اور نکلتے تھے۔

شہرزاد کا رنگ سنہرا اور قد مزید لمبا محسوس ہوتا۔ وہ خود قدرت کی اس مہربانی پر حیران تھی۔ سال کے دو ڈرامے اور عید کا ایک شو ایک آدھ اشتہار کرنے کے بعد اتنے پیسے حاصل نہیں ہوتے تھے کہ وہ بہ آسانی گزارا کر سکے اور اب کیریئر کو ڈاؤن ہونا تھا۔ مگر ایک موقع سب کو ملتا ہے اور موسیٰ ہی وہی موقع تھا۔ وہ کسی تقریب میں ہوتا تو حاضرین گردن اٹھا اٹھا کر کن اکھیوں سے 'سامنے سے اسے دیکھا کرتے۔ وہ اتنا شاندار تھا کہ اس کے ساتھ چلنے والی کوئی عورت شاید اتاری ہی نہیں گئی تھی۔ مگر وہ شہرزاد عیسائی کو ساتھ لے کر چلتا تھا۔

شہرزاد تنہائی میں بیٹھ کر جمع تفریق کرتی اور حقیقت کا چشمہ لگاتی تو یہ تلخی حلق کو کڑوا کریلا کر دیتی کہ اگر وہ موسیٰ کے نام سے شہرت بٹور رہی تھی تو اس کے حوالے سے موسیٰ کو بھی بہت فائدے حاصل ہوئے تھے۔ کنٹریکٹس 'انڈسٹری کے بہت بڑے بڑے نامی گرامی لوگوں سے موسیٰ اسی کے حوالے سے ملا جبکہ اس کی اپنی حیثیت مسلم ہو چکی تھی' شہرزاد جانتی تھی' یہ بے حد خود غرضانہ رشتہ ہے اور دونوں اپنے اپنے اندر سے واقف تھے۔ یہ دوستی ٹرین کے اٹھارہ گھنٹوں کے سفر جیسی تھی اور شہرزاد دعا کرتی کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔ زندگی پر محیط ہو جائے' اسے خوف محسوس ہوتا' ریڑھ کی ہڈی سنسنا جاتی یہ سوچ کر کہ۔۔۔ موسیٰ اب کسی منزل کا منتظر نہیں۔ وہ جہاں بھی اتر جائے گا وہی اسٹیشن اس کی منزل بن جائے گا۔

وہ کامیابیوں کی اس راہ کا مسافر تھا۔ جہاں قدم منزل کی جانب نہیں' منزل قدموں کی جانب دوڑتی ہے۔

مگر شہرزاد کو اس کی ضرورت تھی۔ وہ ایک بڑے ہدایت کار کی فلم میں ایک بے حد اہم رول سائن کر چکی تھی۔ اسے ایک مہنگی برانڈ کے میک اپ کی پبلسٹی کے لیے بک کر لیا گیا تھا۔ اس کے ایک گانے کی ویڈیو نے اس کے اندر کے فنکار اور اس کی خوب صورتی کو رجسٹرڈ کروا دیا تھا۔

موسیٰ ہی نے اس کی زندگی بدل دی۔ اس کا دم توڑتا "حال" نیا شان دار جنم لیے "مستقبل" میں بدل چکا تھا۔

وہ موسیٰ کو کہیں نہیں جانے دے گی۔ کبھی نہیں۔ عمروں کا فرق۔ معاشرہ لوگ۔ دنیا۔ سب۔ بھاڑ میں جائیں۔۔۔ آگ لگے سب کو۔۔۔

☆ ☆ ☆

دو ماہ کی چھٹیاں گزار کر کالج آنا بے حد اچھا لگا۔ اگست میں موسم ویسے بھی بے پناہ خوب صورت ہوا کرتا ہے۔ سیاہ بادل' ٹھنڈک' پھوار اور کبھی کبھار چہرے' گردن اور ہاتھوں پر پڑنے والی بوندیں اور اس پر چلتی مست متوالی ہوا گدگدیاں کر رہی تھی' وہ گرما گرم سموسوں کو چٹنی میں ڈبو ڈبو کر خوب لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

ساری توجہ کا مرکز اریبہ تھی۔ جو بے حد خوش تھی اور مٹھائی کا ڈبا لائی تھی۔ اس کی آپا اور باجی کی بات طے ہو گئی تھی۔ دسمبر میں شادی۔۔۔

"پہلے تو باجی مانیں ہی نہیں پھر میں نے خوب دلائل دے کر انہیں قائل کیا۔" اریبہ حلیمہ کو بتا رہی تھی۔ دراصل حلیمہ نے اسے نماز حاجت کا طریقہ بتایا تھا کہ باجی خود پڑھ کر اپنی شادی کے لیے دعا کریں لیکن باجی مان کر نہیں دیں "کتنی شرم کی بات ہے' لوگ کیا کہیں گے' شادی کے لیے اتنا مری جا رہی ہے خود وظیفہ کرتے بیٹھ گئی توبہ۔" وہ خفت سے زرد و سرخ

ہو جاتیں۔۔۔۔

"ہم امتحان میں کامیابی کے لیے 'صحت و تندرستی کے لیے' اپنے لواحقین کے لیے 'ملک و قوم کے لیے' سب کی خاطر دعائیں مانگیں اور اپنی باری میں بے نیازی دکھاتے ہوئے پیچھے ہٹ جائیں کہ "خود اپنے لیے۔"

اریبہ نے حلیمہ کے الفاظ دہرائے۔ مثال دی' دلیل سمجھائی۔ حقیقت دکھائی' بہر حال یا جی مان گئیں۔

ماہ رو ان کی خوشی میں خوش تھی اور خوب آنکھیں پھیلائے یقین کر رہی تھی۔ حسنل کے چہرے پر مسکراہٹ تھی' وہ دوستوں کے جوش و ولولے کو طمانیت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بے حد مطمئن بیٹھی تھی۔ کالج کی چار جانب نظر دوڑاتی تو ایک خوشی' سکون اور محبت پھیل جاتی۔ مٹی کی سوندھی خوشبو اس کے دل و دماغ پر چھائی تمام کثافتوں کو جیسے زائل کر رہی تھی۔

یہ موسم' ماحول' لوگ۔۔۔ یہ اس کے لیے ایسا ہی ایک پل تھا' جس کے ٹھہر جانے کی دعا کی جاسکتی ہے۔

پسندیدہ جگہ' پسندیدہ لوگ' کوئی فکر نہیں' کوئی تردد نہیں۔۔۔ اس نے ٹانگیں لمبی کر کے پیر ایک دوسرے پر رکھ دیے' دونوں ہاتھ پشت سے زمین پر سہارے کے لیے ٹکے تھے۔ اس نے گردن پیچھے ڈھلکا کر چہرہ آسمان کی طرف کر کے آنکھیں موند لیں۔ کسی گمان کی طرح پڑتی بوندیں۔۔۔

جیسے دل و دماغ سے ہر سوچ و فکر کو دھو رہی تھیں۔ موسم کی خوب صورتی نے چہرے پر مسکراہٹ جمائی تو اگلے پل کسی سوچ نے چہرے کو تاریک کر دیا۔

ماہ رو سوئے اتفاق اس کے چہرے ہی کو دیکھ رہی تھی۔ قدرت کی صناعی کا شاہکار یہ چہرہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے لیے تھا۔ اور ماہ رو بڑی حسن پرست واقع ہوئی تھی۔

مگر چہرے کی آتی جاتی روشنی۔۔۔ وہ ذرا سا چونکی' اسے دھیان آیا۔ وہ دبلی پتلی تھی مگر اب کمزور' فاقہ زدہ محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد براؤن حلقے تھے اور آنکھوں کے اندر بے حد ویرانی' مایوسی' ملال' دکھ' وہ خاموش طبع تھی۔ تنک چڑھی' بے زار' خود کم' جلا کٹا بولنے والی مگر اتنی بے بسی کا تاثر۔۔۔ ناکامی کا مضمون' ہار کا عنوان بنا اس کا چہرہ۔۔۔

کسی ان دیکھے' ان جانے دکھ کی آما جگاہ بنا ہوا تھا۔

ماہ رو نے دھیرے سے حلیمہ کا شانہ ہلایا اور اریبہ کو آنکھ کے اشارے سے حسنل کی جانب متوجہ کیا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" حلیمہ تو خود کب سے محسوس کر رہی تھی۔ دوبارہ دیکھنے لگی۔ اریبہ نے شانے اچکا دیے۔ ماہ رو اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجا کر متوجہ کرنے ہی والی تھی کہ آسمان کا سینہ شق ہو گیا۔

کبھی کبھی محاورے غلط بھی ہو جاتے ہیں۔ گرجنے والے بادل برس پڑے تھے اور کھل کے برس رہے تھے' وہ گرتی پڑتی اپنا سامان سنبھالتی بھاگیں۔ دیگر تمام لڑکیاں بھی جدھر سینگ سمائے کے مصداق دوڑ پڑیں۔

کچھ ڈھیٹ' کتابیں' بیگ محفوظ مقام پر پہنچا کر بارش میں جھومنے لگیں۔ ان میں ماہ رو بھی شامل تھی' اس نے اریبہ کو بھی شامل کر لیا۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو کھینچ کر کے پکڑے کھلے آسمان تلے گھوم رہی تھیں۔ گھر جانے' کپڑے بھیگنے کی فکر کسی کو نہیں تھی۔ حلیمہ درخت کے سائے میں بہت ساری لڑکیوں کے ساتھ بارش کی دھار کو سرخوشی کے عالم میں تک رہی تھی۔ کچھ اپنی ہتھیلیوں میں پانی بھر کر اچھال رہی تھیں۔۔۔ بے خودی کا عالم تھا' سرمستی کی انتہا' چکر کھا کے گرنے والی ماہ رو نے خود کو سنبھالتے ہوئے سامنے نگاہ کی۔

حسنل سیڑھی پر بیٹھی تھی اور اس پر خوب بارش برس رہی تھی۔ اس کے بال' چہرہ' کپڑے سب بھیگ رہے تھے پر ماہ رو نے اسے آنکھیں مسلتے دیکھا۔

اس نے یہ بھی جان لیا کہ حسن المآب بے حد بے تحاشا ہچکیوں سے رو رہی ہے۔ بارش نے بھرم رکھ لیا تھا۔ وہ سب کی نگاہوں سے بچنے کے لیے ضبط کر رہی ہے مگر آنسو' آنسو۔۔۔ اف خدا۔ ماہ رو ان اس کا چہرہ تک رہی تھی۔ دوست اس کی جان تھے اور اتنی جاں

کنی کے عالم میں۔۔۔

☼ ☼ ☼

"اچھا زیادہ خفا مت ہو۔ آرام سے بیٹھو۔۔۔ اتنا اچھا تو پکاتا ہے وہ۔۔۔ اب ایک آدھ غلطی تو ہو جاتی ہے۔" محی الدین سہگل اسے شانت کر رہے تھے۔

"جب میں ایک بار بتا چکا ہوں کہ میں کس طرح کا کھانا پسند کرتا ہوں تو بار بار یاد دہانی کیوں؟ اور اگر مجھے ریسیپی دینی ہے تو خود ہی نہ پکالوں جب کہ میں بتا چکا ہوں کہ میں ذائقے پر کوئی کمپرومائز نہیں کر سکتا۔" اس کا غصہ ٹھنڈا ہو ہی نہیں رہا تھا۔

ناشتے کی ٹیبل پر دنیا جہان کی نعمتیں سجی تھیں۔ تمام امپورٹڈ آئٹم باہر سے منگوائے گئے یا پھر بہت کم تعداد میں کراچی میں موجود اسٹورز سے خریدے گئے تھے۔

پر اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے یہاں پاکستان میں سب سے بڑا مسئلہ کھانے کا تھا۔ کک کھانا بنانے میں ماہر تھا۔ وہ بہت مؤدب ہو کر کھڑا تھا۔ اس نے چیز آملیٹ بالکل ویسے بنایا تھا جیسے کہ دنیا بھر میں بنایا جاتا تھا۔ مگر اب یہ کوئی فرشتہ اسے بتا کر جاتا کہ شملہ مرچ اسی فیصد کچی رکھی جائے اگر اسے بتا دیتے تو وہ کیوں نہ کرتا۔

"وومیٹنگ ہونے لگتی ہے کچی ہوئی شملہ مرچ سے۔۔۔ پہلا لقمہ ہی سارے منہ کا ذائقہ خراب کر گیا ہے۔ دل کر رہا ہے حلق میں انگلی ڈال کر نکال دوں۔" اس کے چہرے کے بگڑے زاویے اور مسلسل نگلنے کی کوشش سامنے تھی۔ عقیلہ نے کھا جانے والی نگاہوں سے کک کا چہرہ دیکھا۔

"کچن میں تین لوگ پہلے ہی کام کر رہے ہیں۔ میں خود بھی شوق سے کچن میں جاتی ہوں لیکن آپ کو صرف سمیع صاحب کے لیے رکھا گیا ہے۔ اتنا بڑا سیلری پیکیج دے رہے ہیں اور رزلٹ ایسا ہو گا تو۔۔۔" عقیلہ خفگی بھرے انداز میں اس پر برس پڑیں۔ عقیلہ کا اگلا جملہ حلق ہی میں رہ گیا۔ سمیع الدین شاید واش روم کی جانب بھاگا تھا۔

"آئی ایم سوری میڈم! اگر سر ایک بار ہی کہہ دیتے تو۔۔۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا مگر میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا چاہ رہے ہیں۔ نیکسٹ ٹائم ایسا نہیں ہو گا۔"

نیکسٹ ٹائم کی ضرورت ہی کب رہے گی جو حال آج تم نے کیا ہے' میں شاید زندگی بھر کبھی اس آملیٹ کو نہ کھاؤں۔" وہ تولیہ سے ہاتھ اور منہ پونچھتا آگیا۔ کرسی گھسیٹی اور خفا موڈ سے بیٹھ گیا۔ کک نے دزدیدہ نگاہوں سے دنیا کی نعمتوں سے سجی ٹیبل دیکھی اور اس کا جملہ سنا۔

"اب میں کیا کھاؤں یو نو دادا جان۔۔۔ میں کھانے کے معاملے میں بہت چوزی ہوں۔ باقاعدہ ایک ڈائٹ پلان کے ساتھ چلتا ہوں' ایکسرسائز' ہم سب کے ساتھ پراپر ڈائٹ ہو تب ہی۔۔۔ اور تم یہاں کھڑے کیا سن رہے ہو' جاؤ میرے لیے پائن ایپل کے فریش سلائس بنالو اور پلیز اسے ڈیسنٹ طریقے سے کٹ کرنا۔۔۔ جاؤ۔" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں ہاتھ کے اشارے سے جانے کو کہا۔

کک نے دل ہی دل میں اس کی شان میں خوب "بے ادبی" کی۔ ناشکرا' تھرڈ کلاس اور نہایت ادب سے گیا۔

"تمہارے لیے بیوی ڈھونڈیں تو کوکنگ اسکلز بھی ذہن میں رکھنے ہوں گے۔" عقیلہ نے نارمل گفتگو شروع کی۔

"قطعاً" نہیں۔ کھانا بنانا کک کا کام ہے۔ وائف اس کام کے لیے نہیں ہونی چاہیے۔" محی الدین سہگل اور عقیلہ نے معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

کیلاش کی فکر کا کوئی انت نہیں تھا۔ وہ رات سے یہیں رکا تھا۔ دو بار خود آگے تک دیکھ آیا تھا۔ اس نے رات بھر میں ڈھیروں لوگ اکٹھے کر لیے تھے جنہیں

مختلف پارٹیوں کی صورت وہ ہر سمت میں بھیج رہا تھا۔

پریشانی نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ جب تھکے ماندے ریت میں چھپے بندے آکر نفی میں سر ہلاتے۔

"میں ایک ایک کو شوٹ کروں گا۔ حرام خورو! ڈھونڈو اسے "سوئی نہیں وہ کہ ملے نا۔ انسان کا بچہ ہے' پورا مرد۔ اتنی بڑی جیپ ہے اس کے پاس۔ اگر آسمان کھا گیا ہے تو پکی رپورٹ دو۔ اور اگر زمین کھا گئی تو نشان بتاؤ۔ مجھے ہر حال میں... وہ سامنے چاہیے ابھی اس وقت۔ "میں کیا جواب دوں گا سب کو۔" وہ اپنے بال نوچنے لگا۔

"بڑے مہاراج کو خبر کرو۔ بستی کا ایک ایک بندہ' مرد کیا' عورتیں کیا' بچہ بچہ یہاں حاضر ہو جائے۔ میری برداشت ختم ہو رہی ہے۔ بس اسے میرے سامنے ہونا چاہیے۔ اور... تم... تم بھی خالی ہاتھ آگئے۔" اس نے پانچ چھ افراد کے گروہ کو ہانپتے ہوئے واپس آتا دیکھا۔ وہ سرغنہ کے سر پر پہنچ گیا۔

"شما مہاراج! کوئی کھرا تک نہیں... ریت ہر چیز پر چڑھ گئی۔ پچھلے دن کا کوئی نشان تک نہیں ہے۔" وہ ہاتھ جوڑے رکوع میں چلا گیا۔

"ارے تیری تو..." کیلاش نے اسے سر سے پکڑ کے جھنجھوڑا۔ اس کا بڑا رنگین پگڑ کھل کے زمین پر گر گیا۔

ایڈورڈ نے آگے بڑھ کر اسے تھاما اور سورج سے پانی کا گلاس لے کر بڑھایا۔

"تم شانت رہو گے تو کام ہوگا... ریلیکس... کوئی پرابلم نہیں۔"

"وہ میری ذمے داری پر یہاں آیا تھا۔ میرا مہمان بن کے۔ کتنے سالوں بعد اس نے ادھر کا رخ کیا ہے۔ ارے بھگوان۔" وہ آسمان کی طرف منہ کر کے دیا مانگنے لگا۔

"اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں اور پانی بھی نہیں ہے اور ادھر تو سانپ ہوتے ہیں بے حد۔"

"اور وہ برٹش نیشنل بھی ہے۔" ایڈورڈ نے گویا اس کے سر پر ڈنڈا مار دیا۔

☆ ☆ ☆

صبح کی پہلی کرن تاریکی کا سینہ چیر کے پھوٹی تو طمانیت کی گہری لہر گوپے میں دوڑ گئی۔

وہ جیپ کی سیٹ پر کھڑا ہو گیا' مگر حد نگاہ میں اضافہ اور منظر واضح ہوا تھا' مگر ان دونوں سے زیادہ حیرانی تھی جو دھیرے دھیرے پریشانی' تفکر' غم اور خوف کا لبادہ اوڑھتی جا رہی تھی۔ تاحد نگاہ ریت اور جھاڑیاں تھیں۔ اسے بھوک محسوس ہونے لگی۔ اس نے جیپ ٹٹولنی شروع کی۔ اس کے پاس پٹرول کا کین تھا۔ ڈھائی لیٹر پانی کی بوتل کے علاوہ۔ ایک چھوٹی سی خوب صورت "چھوٹی بوتل" اور بھی تھی۔ اور اس کے پاس بسکٹ کا چھوٹا پیکٹ تھا جو نہ جانے کب سے پڑا تھا۔ بسکٹ اپنا خستہ پن کھو چکے تھے۔ وہ بہت دیر تک انگلی میں پھنسے بسکٹ کو دیکھتا رہا۔ کھائے یا نہ کھائے' پتا نہیں کب کے تھے' مگر... پھر... یک دم... اس نے انہیں کھانا شروع کر دیا۔ وہ اتنے برے بھی نہیں تھے۔ اس نے پانی سے حلق تر کیا پھر اس نے چھوٹی بوتل سے دل خوش کیا تھا۔ یہ صبح کا بہترین آغاز تھا۔ وہ اپنے اندر توانائی محسوس کر رہا تھا۔ روشنی نے اعصاب کو طاقت دی تھی اور ہوا نے جسم کو ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ اسے اب درست سمت کا تعین کرنا تھا۔ اس نے آسمان کو کھوجا تو عجیب سا احساس ہوا آسمان پر کوئی پرندہ نہیں تھا۔ کوئی بھی... کیا یہاں اس کے علاوہ اور کوئی جاندار نہیں...؟ اس کی غلط فہمی جلد دور ہونے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

حلیمہ کی شہرت چاروں جانب پھیل گئی۔ "اور ڈنکے بجانے والی اریبہ عاقل و بالغ ہے۔" ماہ رو نے دانت کچکچائے "اب جہاں جائیں تو لڑکیاں آجاتی ہیں۔ میری پھپھی کے لیے بتاؤ' میری ماسی کے لیے اور آپی کے لیے اب یہ ایک اور آگئی ہیں اپنی چاچی کے لیے۔"

حلیمہ ہنسی سے بے حال ہو گئی۔ چاچی کے رشتے

کے لیے کون آتا ہے رشتہ ہو جانے کے بعد جا بجی وجود میں آتی ہے۔" حلیمہ کی ہنسی تھی تو اس نے نظروں ہی نظروں میں مروّت و لحاظ کا پاس کرنے کی ماہ رو سے درخواست کی، مگر ماہ رو میں کب یہ دو عنصر تھے۔ وہ بھناتی رہی۔ بارش کے باعث پانچ روز بلا وجہ چھٹی ہو گئی۔ وہ اس روز حسنل سے پوچھ نہیں پائی۔ اس نے "وہم ہے تمہارا" کہہ کر دامن بچانے کی کوشش کی، مگر ماہ رو نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اس نے مسلسل حسنل کے چہرے کو سوچا اور کھوجا تھا۔ اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ ناممکن۔

"اور وہ جو تم امتحان میں کامیابی کی دعائیں بتا رہی تھیں۔" اریبہ نے بس ہاتھ تھام کر بیعت نہیں کی تھی۔

حلیمہ اب کتابیں کھول رہی تھی۔ کل اسائنمنٹ کا لاسٹ ڈے تھا۔ یہ چاروں کتابوں کا ڈھیر لے کر عظمت اللہ بلاک کے تھرڈ فلور کے آخری کمرے میں یکسوئی کی خاطر آئی تھیں۔

"امتحان نسخوں وظیفوں سے پاس ہونے لگیں تو اتنی محنت کون کرے۔ کیا صرف دعائیں عمل کے بغیر طاقت ہو سکتی ہے۔"

حسنل بہت دیر بعد بولی۔

"نہیں تو خالی دعا کے لیے کون کہہ رہا ہے؟" حلیمہ بولی۔ "اپنے بس کی ساری محنت کر لینے کے بعد دعا کی باری آتی ہے۔ محنت اور ساتھ دعا اور پھر نتیجہ، یہ تالی بجانے والے دو ہاتھ جیسی مثال ہے۔"

"نہیں میں تو یہ سمجھتی ہوں، دعا بہت ضروری ہے کسی بھی چیز کے لیے۔" اریبہ کا انداز دو ٹوک تھا۔

"دعا پر یقین تو خیر میرا بھی ہے۔ اللہ مانگنے کو پسند کرتا ہے۔" ماہ رو کی معلومات کم ہوں تو وہ مختصریات کرتی تھی۔ "کیا تم نہیں مانتیں۔" اس کے بیک گراؤنڈ کو مد نظر رکھتے تو شکوک شبہات سے بھرا سوالیہ لہجہ اچنبھے کا باعث ہوتا۔ (الٹرا ماڈرن فیملی سے تعلق تھا۔

لیے خوب محنت کروں گی۔ کتابیں لے کر انہیں پڑھ پڑھ چنیدہ جملوں سے نوٹس تیار کروں گی اور میری حتی الامکان کوشش ہو گی کہ ایک ہی موضوع ہونے کے باوجود ممتحن کو میرا نوٹس کا اچھوتا پن نظر آئے۔ بھا جائے۔ اسے یہ ہر صورت لگنا چاہیے کہ میں نے خود سے محنت کی ہے۔ کہیں سے فوٹو کاپی یا مانگ تانگ نہیں کی۔

پھر امتحان کے دنوں میں خوب محنت کروں گی اور سب سے آخیر میں دعا۔ بے حد دعا بھلے سے میں جانتی ہوں کہ میں سو فیصد صحیح کام کر آئی ہوں، مگر دعا نہیں چھوڑ سکتی۔" حلیمہ نے بہت صاف الفاظ اور نپے تلے لہجے میں اپنا موقف جتایا۔

"اتنی محنت کے بعد دعا کی کیا ضرورت؟" حسنل کا لہجہ بے حد ٹھنڈا اور تکان زدہ تھا۔

"دعا تو ہر لحہ کی ضرورت ہے، ہر ایک کے لیے، ہر انسان کے لیے دعا سے بڑھ کر کیا نعمت۔" حلیمہ نے جھری جھری لی۔ "میری محنت ضائع جا سکتی ہے۔ میرے پیپرز جس وین میں جا رہے ہوں اسے آگ لگ سکتی ہے۔ بارش میرے لکھے کو مٹا سکتی ہے۔ پیپر چیکر کی چائے یا بھرا پانی کا جگ لکھے کو خلط ملط کر سکتا ہے، میرے پیپرز کی پنز کھل کر کسی اور سے گڈمڈ ہو سکتی ہیں۔ میں پیپر کرتے وقت بیمار ہو سکتی ہوں۔ امتحان ہال میں مجھے غشی کا دورہ پڑ جائے، مجھے کوئی ایسی خبر ملے کہ میں کچھ لکھ نہ پاؤں خدانخواستہ۔"

"میں محنت کو مانتی ہوں، لیکن خدا کی رحمت اور دعا کی طاقت پر اتنا یقین ہے کہ وہ مجھے یاد کیے بنا بھی کامیاب کر دے گا، لیکن چڑیا روز دانے چگنے جاتی ہے اور اسے اپنے حصے کی خوب محنت کر کے رزق ملتا ہے کیوں کہ یہ وعدہ ہے پر اللہ گھونسلے میں نہیں ڈالتا۔ چڑیا کو صبح اٹھ کر خوب محنت یعنی دعا کرنی ہوتی ہے۔" "تم کیسی باتیں کرنے لگی ہو حسن المآب، تم دن بدن کیا بنتی جا رہی ہو۔ میں تمہارے لیے بہت فکر مند ہوں اور۔"

"اب اس بات کو تم یوں دیکھو کہ میں ابھی انگیز ام کے

"اور یہ اس روز جب بارش ہوئی تو یہ بہت زیادہ رو

رہی تھی۔ "ماہ رو کو اس سے اچھا موقع اور کب ملتا۔
"کسی نے کچھ کہہ دیا' کوئی شکایت ہے۔ کوئی مسئلہ' تم کہو۔ ہم مل کر حل نکالیں گے۔ تم بہت خاموش ہو گئی ہو۔" اریبہ بھی یہی سب محسوس کر رہی تھی۔
حسنل نے جواب نہیں دیا۔ وہ دور کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید کشمکش کے آثار تھے۔
"مجھے لگتا ہے میں ہر چیز سے یقین کھو رہی ہوں' اپنے آپ سے بھی۔ اتنا گہرا اندھیرا ہے۔ گہری کھائی۔ کھاتا اور مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ تم محنت کا کہتی ہو۔ میں وہ بھی نہیں کر سکتی۔ کس چیز پر محنت کروں۔" اس کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔
"تم دعا پر یقین کا کہتی ہو کیا تمہارے پاس کوئی ایسی دعا ہے۔ جو میرے لیے ہو۔ کوئی ایسا وظیفہ۔ جو اسے میرا کر دے۔ اس کا سوچتی ہوں تو میرے پاس محنت کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ کیا اینٹیں کوٹوں۔ کیا چھلنی لے کر پتھروں سے لوہا ڈھونڈوں۔ کیا بال بکھرا کے ننگے پیر پتھروں پر چلوں۔ میرے پاس ایسی کوئی محنت نہیں ہے۔ میرے پاس ایسی کوئی راہ نہیں ہے۔ جس پر چل کر میں اسے پالوں۔ تم دے رہی ہو۔ دنیا کو وظیفے' دعائیں۔ ہے تمہارے پاس کوئی دعا کوئی تسبیح جو اسے میرا کر دے۔ بولو....."
ملتجی لہجے میں کھوئے کھوئے اس نے حلیمہ کے شانے جھنجوڑ دیے۔ اس کا بکھرا انداز عشقیروں جیسی التجا اور بھرے نین کٹورے' جو اختتام پر چھلک پڑے' وہ دونوں ہتھیلیوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کا جسم ہچکولے کھا رہا تھا۔
ماہ رو ساکت۔ اریبہ حق دق تھی اور حلیمہ کا چہرہ بگڑا سا تھا۔ کیا جو اس کی سمجھ میں آرہا تھا' حسنل نے وہی کہا تھا۔
"کون ہے وہ؟" بہت دیر بعد اریبہ اور ماہ رو کی منہ سے ایک ساتھ برآمد ہوا۔
جب کہ حلیمہ اسے زمانوں سے جانتی تھی۔ اس کے گھر کو' احباب کو' اس کے ساتھ آتی جاتی تھی۔ وہ

قیاس کے گھوڑے دوڑا دوڑا کے ہلکان ہو رہی تھی۔
"اب بولتی کیوں نہیں ہو کون ہے؟ کہاں ملے تم لوگ۔ کیسا ہے' کیا رشتے دار ہے۔ کوئی پڑوسی؟" اریبہ اور ماہ رو تابڑ توڑ سوال کر رہی تھیں' ان کی عجلت حد سے سوا تھی۔
"کبھی نہیں ملے۔ وہ میرے تصورات کا بادشاہ تھا اور میں اپنی دنیا میں خوش' نہ گھر کا ڈر نہ چوری پکڑے جانے کا خوف نہ دنیا کی زبان نہ عزت بے عزتی کے مسئلے۔ میں سب کے درمیان ہوتے ہوئے کھاتے پیتے' چلتے ہوئے اسے اپنے سامنے پا کر خوش ہو لیتی تھی۔ وہ اپنے "وجود" میں اس قدر مکمل تھا اس کا ہیولہ اتنا جان دار کہ۔۔۔ مجھے کبھی احساس بھی نہ ہوا کہ وہ مجسم میرے سامنے آجائے۔ میرے ساتھ رہے۔
خدا کی قسم حلیمہ! میں ساری زندگی اس تصوراتی خاکے کے ساتھ بڑے مزے سے جی لیتی۔ وہ موجود ہوتا تو مجھے ارد گرد سے بے گانہ کر دیتا' میں اچھے کپڑے پہن کر تیار ہو کر خود کو آئینے میں دیکھتی تو وہ سراہنے کو میرے عقب میں آکھڑا ہوتا۔"
اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے' مگر وہ رکے بنا بولے جا رہی تھی۔ حلیمہ کا سانس خشک تھا۔ ضبط گریہ نے اریبہ کے نقوش بگاڑ دیے تھے۔ چند پل جاتے کہ وہ کندھے سے کندھا ملائے دھواں دھار شروع ہونے والی تھی۔ ماہ رو کا ایک ہاتھ ڈیسک پر اور دوسرا دل کے پاس دھرا تھا' وہ ناقابل فہم نظروں سے حسنل کی ٹوٹی بکھری حالت ملاحظہ کر رہی تھی۔ اس کی ذہین دور بین نگاہیں جیسے اس کو اندر تک چیر پھاڑ ڈالنا چاہتی تھیں۔
"لیکن تمہیں خبر نہیں..... (ہچکی) وہ..... وہ ایک روز مجسم ہو کر میرے سامنے آگیا اور میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی اس طرح میرے سامنے (ہچ پک) مم میری پلکیں اپنا میکنزم (جھپکنا) بھول گئیں۔ مجھے یاد ہے اس دن میرے سینے سے ایک بار بھی دھک کی آواز نہ ابھری اور..... اور..... (ہچ پک.....) اس نے مجھے پہچانا تو در کنار..... (ہچ) اس نے میری طرف نگاہ غلط

ہے بھی نہ دیکھا۔" بے وقعتی کے احساس نے اس کی رنگت چھین کر سفیدی اس کے چہرے پر لیپ دی اور بجھتی آنکھوں کی ویرانی۔۔ اسے اچانک دیکھتے تو خوف سے چیخ پڑتے۔

"پاپائے اردو کی جانشین نہ بنو۔۔ بند کرو یہ لفاظی۔ سیدھا سیدھا نام لو۔" ماہ رو نے اسے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑ دیا۔

"دم بھی بھی وہ سامنے ہے اور ایک بار بھی ادھر نہیں دیکھتا۔ کیا اسے خبر نہیں کہ میرا کیا حال ہے؟ دیکھو کیسے کیسے ہنس رہا ہے۔" وہ کھڑکی سے باہر جیسے اسے دیکھ رہی تھی۔

اریبہ کے چہرے پر خوف کے تاثرات آگئے۔ کہیں حسنل پر کوئی جن تو عاشق نہیں ہو گیا تھا۔ ماہ رو چیل کی طرح لپکی اور کھڑکی میں ٹنگ گئی۔ اسے تو کچھ نظر نہ آیا۔ پی پی پاں کرتا ٹریفک۔۔ "بشریٰ زیدی" پل کے پاس بیٹھی فقیروں کی جوڑی۔۔ برگر والے انکل۔۔ حسنل کی نگاہوں کے تعاقب میں نگاہیں حبیب بینک تک سے ہو آئیں۔ اس نے الجھ کر اریبہ اور حلیمہ کو دیکھا اور نفی میں گردن ہلائی۔ اریبہ کو اپنا خدشہ درست معلوم ہونے لگا۔ وہ یک دم کھڑی ہو گئی۔

ماہ رو نے بہت گہرائی سے حسنل کی نگاہوں کا پیچھا کیا۔ حبیب بینک کے اوپر بہت بڑا بل بورڈ تھا اس پر کسی مشروب کی تشہیر کی گئی تھی اور۔۔ اور۔۔ گلاس ہونٹوں سے لگائے گیلے بال بکھرے سے ماتھے پر گرے تھے۔ بے حد فریش ہو جانے کا گمان دیتا ماڈل۔۔ ماہ رو نے پالیا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرانی کے تاثرات نے شدید بد صورتی پیدا کر دی تھی۔ اس نے بہت کچھ سوچ لیا تھا، مگر یہ۔۔ یوں۔۔ اس نے انگلی سامنے کر کے حسنل سے تائید چاہی۔ اسے جواب کی بے پناہ جلدی تھی، مگر جو جواب حسنل دیتی۔ وہ بھی نہیں۔۔ اریبہ اور حلیمہ بھی کھڑکی میں گھس آئیں۔

وہ نا سمجھی کے عالم میں حسنل کا چہرہ ماہ رو کی انگلی اور بار بار ہراساں سی دیکھ رہی تھیں۔

ماہ رو کا وجود ریت کا مجسمہ تھا اور حسن المآب کی اثبات والی جنبش نے اسے ڈھا کر زمین بوس کر دیا۔ وہ تینوں نڈھال حسنل اور بے حد فریش اور دلکش نظر آتے "موسیٰ بی" کو یوں دیکھتی تھیں جیسے بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

☼ ☼ ☼

اتنا تو وہ بیوہ ہو جانے پر بھی نہ روئی ہوں گی جتنا اس ایک ہفتے میں خود کو نچوڑ چکی تھیں اور کسی ایک بات پر رونا نہیں آتا تھا۔ سو باتوں پر۔۔ ایک کے بعد ایک اور پھر یہ کہ وہ رونے تک کے لیے اہتمام کرتیں۔ تخت پر تکیہ لگا کر بیٹھ جاتیں، پانی کا گلاس بھی پاس رکھ لیتیں۔ (منے سے کلام تک بند کر دیا تھا۔ کلام بھی نہیں لیتا تھا) اور رونا شروع۔۔ ایسے بھی کرتا ہے کوئی بھلا۔

اور وہ بھی منے نے۔۔ اتنا بڑا دھوکا۔۔ ایسا کھیل وہ بھی اپنی ماں سے۔۔

"جوانی میں ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں خدیجہ! ہم سمجھائیں گے نا اسے۔۔" بھاوج اسے تسلی دیتیں۔ سب انہیں ترحم سے دیکھتے۔ انہیں خود پر ترس آتا۔

"ارے لوگ کیا کہیں گے۔ میرے بیٹے نے۔۔ ہائے ہائے۔" ان سے بات پوری نہ ہوتی۔ غش آجاتا۔

"اس دن کے لیے پالا تھا۔ اس کے باپ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ یہ کی میں نے تربیت۔۔ ارے میں نے تو تربیت میں رات دن ایک کر دیے۔ اپنی جان گروی رکھ دی۔" دسیوں لوگ دوسرے نکاح کا پیام لائے، مگر بیٹے کی ماں ہونے کے زعم میں سب کو جواب دے دیا۔ میں نے کہا۔ شادی کروں گی تو اولاد بھی ہو گی۔ اس یتیم سے توجہ ہٹ گئی تو اللہ کو کیا جواب دوں گی۔ ہائے میرے اللہ، میں بے خبر تھی تو تو واقف حال تھا تو ہی میرے قدم روک لیتا۔ میں اس گھر کا منہ دیکھنے سے بچ جاتی۔ ہائے منے۔۔ ہائے۔۔ مجھے کہتا ہے امی تھوڑی کالی ہے۔ ہائے اور زیادہ کالی ہو جاتی بھلے سے، مگر کالی کملی والے کی ماننے والی ہوتی نا۔"

"وہ مسلمان ہونے کو تیار ہے امی۔۔۔"

"نہیں۔" انہیں تخت کرنٹ مارتا۔

"آپ اتنا برا ری ایکٹ کیوں کررہی ہیں۔" وہ جھنجلا گیا۔ "وہ اہل کتاب سے ہے۔"

"کتاب ہی کا تو سارا فرق ہے۔" وہ ہاتھ ملنے لگیں۔

"آپ سے کہا تو ہے' وہ مسلمان ہوگی پھر نکاح ہوگا۔"

"تو ابھی تک نکاح کی بات پر قائم ہے۔" وہ دم بخود تھیں۔

"ہاں امی۔۔۔ زندگی موت کا سوال ہے یہ میرے لیے۔۔۔"

"یہی تو میں سمجھانا چاہ رہی ہوں۔" وہ اچک کر سیدھی ہوئیں۔ "میری موت کا سامان ہے یہ منے۔۔۔ میں نے مرجانا ہے بلکہ کچھ کھاپی لینا ہے اگر دوبارہ یہ بات کی۔"

"نہیں کرتا۔ مگر مجھ سے پھر شادی کا مت کہیے گا۔"

"نہیں۔۔۔" ان کے دل پر ہاتھ پڑا۔ "ایک سے ایک مسلمان۔ حافظ قرآن' ڈاکٹر' انجینئر لڑکیوں کے رشتے پڑے ہیں تو جس پر ہاتھ رکھے میں۔۔۔"

"ہاتھ تو میں رکھ چکا ہوں امی!"

"تو پھر میری موت کا انتظار کر۔۔۔ بلکہ۔۔۔" انہوں نے یک دم اس کے دونوں ہاتھ جھپٹ کر اپنی گردن پر رکھ لیے اور اپنے ہی زور سے دبانے لگیں۔

"پہلے مجھے مار دے۔ مار' دبا دے میرا گلا۔ کیوں کہ میرے جیتے جی تو۔۔۔ آکھ آکھ۔" کھانسی کا شدید پھندا لگ گیا۔ تخت پر ڈھے گئیں۔ منا جو اپنے ہاتھ چھڑانے کے لیے بے حال ہو رہا تھا۔ گود میں سر لے کر چومنے لگا۔

"امی۔۔۔ امی۔"

☆ ☆ ☆

کتنے بہت سے دن گزر گئے۔ ایسے کہ بہار آ کے چلی بھی گئی۔ خزاں نے درختوں کو برہنہ کردیا۔ خشک گرد آلود ہوائیں سارے شہر میں چکراتیں۔ بند کواڑوں سے ٹکراتیں۔ روشن دانوں سے سر پٹختیں اور بے دم سانسیں بھرتیں۔

اس دن کے بعد ان کے گھر میں ماریہ کا ذکر نہیں ہوا۔ ماں بیٹے خود ساختہ زبان بندی پر کاربند ہوگئے تھے۔ وہی روٹین شروع ہوگئی۔ وہ آفس جاتے ہوئے انہیں اسکول چھوڑتا۔ (کولیگز حسرت سے ان کے بیٹے کو دیکھتیں۔ اچانک ہی مسز خدیجہ نے چپ کی چادر اوڑھ لی تھی مگر۔۔۔)

شام کی چائے' رات کا کھانا' ہفتہ بھر کی شاپنگ' ان کی دوائیاں ذمہ داری سے کھلاتا۔ نو بجے کا خبرنامہ اور پھر شب بخیر۔۔۔ تو سب ٹھیک ہو ہی گیا۔ وہ مسکرانے لگیں۔

مگر پھر لوگ متوجہ کرنے لگے' ان کا منا اتنا کمزور اور اداس' خاموش کیوں رہنے لگا تھا۔ اسے چپ لگ گئی تھی۔ تابع داری بھی آزمائش کی ایک صورت ہوتی ہے۔

فرماں بردار کہلانے کے لیے بڑی محنت بجالانی پڑتی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ہے۔ (فرماں برداری اللہ کی ہو یا بندے کی دونوں بڑی مشکل چیزیں ہیں) اور محنت رنگت جھلسا دیتی ہے۔ وہ واقعی ان کا منا تو نہیں لگ رہا تھا۔ کہیں ان کے چشمے کا نمبر تو نہیں بڑھ گیا۔ وہ نیا نمبر لے آئیں۔ پر یہ کیا۔ اس میں تو اس کی آنکھوں کا حزن اور زیادہ نمایاں دکھائی دینے لگا تھا تو دراصل وہ تاب نہیں ہوا تھا خائف ہو گیا تھا۔ وہ ذکر کرے گا اور اصرار کرے گا تو وہ پھر سے خود کو مار لینے پر کمربستہ ہو جائیں گی اور مرنے کا انداز بھی ملاحظہ ہو۔ اس کے ہاتھوں۔۔۔

وہ اسکول سے واپسی پر پیدل ہی گھر کی طرف رواں دواں تھیں۔ پیروں کے نیچے خزاں گزیدہ پتوں کی چرچراہٹ تھی۔ سرد ہوا کی آواز میں بہت سے سانپوں کی پھنکاریں ہوں گویا۔۔۔ کبھی کبھی خیال بھی ڈستے ہیں۔

"امی۔۔۔ امی۔۔۔ آپ کہاں جا رہی ہیں ایسے۔۔۔"

کوئی انہیں پکار رہا تھا۔ وہ چونک کر خالی نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ ہیلمٹ اتارتے ہوئے بائیک کھڑی کر کے ان کی سمت آ رہا یہ کون تھا۔۔۔ اوہ یہ تو منا تھا۔ واقعی اسے پہچاننا مشکل تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ چہرہ۔۔۔ اور ملول آنکھیں جن میں شدید تفکر کی لہریں تھیں۔۔۔

"بس یوں ہی پیدل چلنے کا دل کر رہا تھا۔" انہوں نے سر اٹھا کر ٹنڈ منڈ درخت کو دیکھا۔ بہت اوپر گھونسلے میں چڑیا اپنی چونچ میں دبا خزانہ اپنے بچوں کے منہ میں کھول رہی تھی۔ فرض شناسی، محنت اور محبت۔۔۔ بلکہ صرف محبت اور محبت کائنات کی بنیاد ہے اور محبت کی ان گنت شکلیں۔۔۔

اور۔۔۔

وہ تو یہ سمجھی تھیں۔ اتنے دن گزر گئے۔ محبت کی کہانی ختم ہو گئی ہو گی مگر محبت تو ان کے بیٹے کی آنکھ کی پتلی میں حزن بن کر ٹھہر گئی تھی۔

محبت نے خون آشام بلا کا روپ دھارن کر لیا تھا۔ ان کے بیٹے کے چہرے کی ساری سرخی نچوڑ چکی تھی اور محبت کی کہانی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ خواہ کسی کی بھی کسی سے بھی محبت۔ محبت کا چشمہ ایک بار پھوٹ جائے تو زم زم کی پکاریں بے سود رہ جاتی ہیں۔

اور محبت کا پھول ایک بار کھل جائے تو پھر اس پر کبھی خزاں نہیں آتی۔

"اس سے ملے دوبارہ۔۔۔؟" وہ بیٹے کے چہرے کو دیکھنے لگیں۔

"نہیں۔۔۔" وہ گھونسلے کو ہی دیکھ رہا تھا۔ "آپ نے منع کر دیا تھا نا۔"

"اس نے پکارا تو ہو گا۔" وہ نجانے کیا جاننا چاہتی تھیں۔

"میں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔"

"وہ مایوس ہو گئی ہو گی؟" انہیں پتا نہیں چل رہا تھا وہ ہاں سننا چاہتی ہیں یا ناں۔

"نہیں۔۔۔ اس نے کہا۔ اگر جوڑے آسمان پر بنائے جاتے ہیں تو زمین پر مٹائے نہیں جا سکتے، وہ آسمانی فیصلے کا انتظار کرے گی۔" خدیجہ بانو کے پیروں سے زمین سرک گئی۔

"ایسا توکل۔۔۔ تو عمر گزارنے کے بعد بھی قسمت سے ملتا ہے۔"

"تو تم اس سے کہنا، میں آسمانی فیصلے پر سر جھکاتی ہوں۔" منے کا سر جھٹکے سے پیچھے ہوا تھا۔ ماں نے یہ کیا کہہ دیا تھا۔

بعد میں بہت سال تک بلکہ آج تک خدیجہ بانو سوچتی رہیں آخر ان کے منہ سے وہ جملے کیسے ادا ہوئے۔

"مسئلہ پتا کیا ہے، جب اللہ کچھ کروانا چاہتا ہے تو وہ ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے مجھے اور آپ کو اس کا شعور نہیں۔۔۔ دنیا میں ظہور پذیر ہونے والا ہر واقعہ مظاہر قدرت کی طرف ایک اشارہ ہوتا ہے، ایک پیش بندی، ایک آغاز، ایک نیا سبق۔۔۔ اور دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، اس کا ایک ماضی ہوتا ہے۔ ایک حال۔۔۔ اور ایک مستقبل بھی۔۔۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عندلیب زہرا

کشکول دو

بعض کیفیات الہامی ہوتی ہیں۔ جن میں آنے والے وقت کی آہٹ ہوتی ہے۔ کسی متوقع خوشی کا سندیسہ' جدائی کا خدشہ 'ان ہونی' پریشانی کا احساس' یا پھر نقصان کے وسوسے..... یہ کیفیات دل سے نکل کر آس پاس کے ماحول سے وابستہ ہوجاتی ہیں اور پوری فضا کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ کبھی خزاں میں ٹنڈ منڈ درخت مسکراتے نظر آتے ہیں تو کبھی بہار کے پھول بھی اداسی میں لپٹے محسوس ہوتے ہیں۔

میرے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ صبح سے دل اداس لگ رہا تھا اور ماحول سے خفا بھی۔ کبھی موسم کو الزام دیتی دھند آلود' چپ میسنا موسم۔

کبھی گیس کے ندارد ہونے کو الزام دیتی تو کبھی...

اچانک طارق بھائی نے اندر آکر اطلاع دی۔ "تائی اماں فوت ہوگئی ہیں۔"

"تائی اماں فوت ہوگئی ہیں؟"

یہ حیرت تھی' شکوہ تھا' سوال تھا یا میں نے خود کو یقین دلایا تھا۔

اپنے احساسات میں خود بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ شاید یہ بے یقینی تھی اور اس کیفیت کے ساتھ میں ان کے گھر گئی۔ پورے پانچ برس بعد۔

☼ ☼ ☼

حویلی کا نقشہ ویسا ہی تھا۔

صحن' بالکونیاں' دریچے' ستون اور پھولوں کی کیاریاں جہاں ہم کھیلتے تھے۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ بس وہی نہیں تھیں جن کے دم سے زندگی میں' رشتوں میں رونق کا احساس رہتا تھا۔

اب میں خشک آنکھوں کے ساتھ اجنبی عورتوں میں بیٹھی تھی۔ یادوں کا لامتناہی سلسلہ تھا جو ذہن میں ایک ندی کی طرح رواں ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

مشترکہ نظام زندگی نعمت ہے اگر دلوں میں وسعت ہو لیکن اگر ظرف کا پیمانہ محدود اور سطحی ہو۔ رشتے وسعت قلبی سے عاری ہوں تو پھر زحمت ہے۔

میرا بچپن اس لحاظ سے بہترین ہے کہ یہ خوب صورت یادوں سے سجا ہے۔ مسکراتا کھلکھلاتا ہوا بچپن' ہنسی سے سجا لڑکپن اور خوابوں میں بسا نوجوانی کا دور۔

تائی امی سب کو یکساں محبت دیتیں۔

"آپ کو زیادہ پیار مجھ سے ہے ناں؟" ہر بچہ ان سے یقین دہانی چاہتا۔

"ہاں چاند! تم تو میری قیمتی دولت ہو۔" کم و بیش ہر بچے کی یادداشت میں یہ جملہ ایک قیمتی خزانے کی طرح محفوظ تھا۔

مجھے ہمیشہ شک رہتا کہ میری امی میری دو چوٹیاں ٹھیک نہیں بناتیں۔ اسکول جانے سے پہلے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر سر ہلا کر میں ان کی پیمائش کرتی۔

"امی! ایک اوپر ہے' ایک نیچے ہے۔" میں پیر پٹخ کر احتجاج کرتی۔

اور امی مجھے تائی کے سپرد کرتیں۔ ان کی گوندھی چوٹیاں' باندھے ربن سارے دن سلیقے سے جمے رہتے۔ مجال ہے جو ذرا بھی ترتیب خراب ہو جائے یا بال بکھرے جائیں' گڑیا کی شادی' پکوان کی تیاری میں وہ جوش و خروش سے شرکت کرتیں۔ وہ ہر شخص کو اپنے ہونے کا احساس دلاتیں۔

رشتوں کو آبیاری چاہیے۔ دل جوئی کی' ہمدردی کی' محبت کی' رشتے وہ پودے ہیں جن کی آبیاری وسعت قلبی سے ہوتی ہے۔ بظاہر چھوٹی چھوٹی رنجشیں' گلے شکوے' انا کی باتیں بڑھتی گئیں اور آخر کار رشتوں میں کھنچاؤ آتا گیا۔

آصف بھائی نے اپنی پسند کی شادی کی تو سب لڑکیوں کی امیاں خفا ہو گئیں۔ حالانکہ تائی امی نے کسی لڑکی کو بہو بنانے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ وہ بچوں کی مرضی اور خوشی کو مقدم جانتی تھیں۔ لیکن اچھے لڑکوں پر خاندان والے "اپنا حق" سمجھتے ہیں۔ سو ان کی دانست میں تائی امی سے سب لڑکیوں کی "حق تلفی" ہوئی تھی۔ امی کے آپریشن میں ان کی بہو نے خیریت نہ پوچھی۔

رانیہ آپی کا رشتہ ماموں کے لیے ہم چاہتے تھے لیکن ان کا رشتہ ان کی خالہ کے گھر ہو گیا۔ بس ایسے ہی گلے شکوے' بدلتے خیالات و رجحانات نے ہم سب کو ایک دوسرے سے پہلے رسمی ملاقاتوں تک محدود کیا اور پھر ٹیلی فونک رابطے اور آخر وہ بھی ختم ہو گئے۔

تائی امی سے ہماری باضابطہ ناراضی دو برس تک رہی اور پھر اچانک ان کی وفات کی خبر آ گئی۔ سارے گلے شکوے' رنجشیں گونگے ہو گئے اور لاتعلقی بھاپ بن کر تحلیل ہو گئی۔ اور ہم سب ان کے گھر چلے گئے۔

وہ سب سے بے نیاز' آنکھیں موندے گہری ابدی نیند سو رہی تھیں۔ یادوں کا پنچھی میرے ہاتھوں سے اڑ گیا تھا۔ اب صرف ان کا عکس باقی رہ گیا تھا۔ جس میں سے اب کافور کی مہک آ رہی تھی۔

میں' رانیہ آپی' آصف بھائی اور امی ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو رہے تھے۔ ابو اور تایا ایک دوسرے سے معافی تلافی کر رہے تھے۔ اور تائی اماں۔۔۔ وہ جیسے ہر بات سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔

کیا رشتوں کی تجدید کے لیے کوئی حادثہ یا خدانخواستہ ابدی جدائی ضروری ہے؟ آخر حالات ٹھیک کرنے کے لیے ٹھوکر کیوں ضروری ہوتی ہے؟ ہم اپنی زندگی کا کتنا وقت رشتوں کو ناراض کرنے میں صرف کرتے ہیں ناں؟

واپسی پر میں اور امی دونوں چپ چپ سی تھیں۔

"امی! کیا ہم زندگی میں ایک دوسرے سے گلے شکوے دور نہیں کر سکتے۔" میں نے رندھی آواز میں

کہا۔ امی نے خاموشی سے مجھے دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔

"آپ مامی سے رنجش ختم کردیں۔ شازیہ باجی بتا رہی تھیں کہ وہ بہت بیمار ہیں۔ ثنا باجی سسرال میں خوش نہیں ہیں اور ماموں کی مالی حالت بھی ٹھیک نہیں۔ کیا ہم دل صاف کرنے کے لیے لقمہ اجل ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔"

امی اور مامی کے وہی گلے تھے جو نند اور بھاوج کے ازلی ہیں۔ بھائی کے کان بھرنے کا الزام تو امی کو گلہ کہ ہمارا بھائی جدا کردیا ہے۔

"ہائے میرے میکے کی گلیاں۔۔۔" اکثر امی ہوکا بھرتیں۔ ان شکووں کی فصل اتنی توانا ہوچکی تھی کہ تین برس سے ہمارا رابطہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ کسی شادی یا کسی تقریب پر صرف ماموں سے امی کی سلام دعا ہوتی تھی۔ امی بھی شاید پچھتاووں کے زیر اثر تھیں۔ ہم دونوں اگلے ہی روز ماموں سے ملنے گئے۔

نانو کے گھر کی گلیاں اور راستے جو ذہن میں مدھم سے نقوش رکھتے تھے، ابھر کر نمایاں ہوگئے۔

مانوس فضا اور شناسا چہرے، دل کو کیسا ہلکا پھلکا کردیتے ہیں۔

دروازہ بند تھا۔ امی بتاتی ہیں کہ پہلے یہ دروازہ دن بھر کھلا رہتا تھا ہر رشتے دار اور ہمسائے کے لیے۔ کسی وسیع القلب بزرگ کی طرح۔ ہلکی سی دستک سے دروازہ وا ہوتا چلا گیا۔

اور ایک دور تھا میری نگاہوں کے سامنے، جو صحن میں پھر سے آباد ہوگیا۔

وہ بچپن کے دن، محبت کرنے والے قیمتی بے لوث رشتے، یادگار تہوار۔۔۔ خوشیاں اور غم بانٹنے والے عزیز۔۔۔ نجانے کہاں گردش دوراں میں کھو گئے تھے۔ جانے والے ہمیشہ آنکھوں میں غم بن کر کیوں ٹھہر جاتے ہیں؟

صحن میں دھوپ پھیلی تھی۔ سرما کی دھوپ نرم اور گرم ماں کی آغوش کی طرح۔ خون میں گردش کرتے رشتوں کی محبت کی طرح۔

مامی کمبل اوڑھے خاموشی سے لیٹی پرندوں کی انجان بولیاں سن رہی تھیں۔ ثنا باجی اداس سی پاس بیٹھی تھیں۔ در و دیوار سے گھر کی خستہ حالی عیاں تھی۔

"بھابی۔"

"آپا!"

امی اور مامی کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ اور دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔ سارے گلے، شکوے، رنجشیں آنسوؤں میں بہہ گئی تھیں۔

مامی کو بھی ایک کندھے کی ضرورت تھی اور امی کو بھی۔ گلے شکوے گونگے ہو کر معدوم ہوگئے اور صرف ایک ہی کلام رہ گیا تھا "اپنائیت کا" دردمندی کا۔ بندہ بندے کا دارو، دکھ درد بانٹنے والا ہوتا ہے اور کوئی ٹیکنالوجی اس کا نعم البدل نہیں ہے۔

رشتوں کو مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دل کے دروازے کھول دیے جائیں۔ صحن کی دھوپ میں آسودگی تھی اور ہنسی کی کھنک نے بتایا تھا کہ اب رشتے مضبوط رہیں گے۔

☆

بی سحر ملک

مشرقی افق کے سرخ کنارے اسے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ ہلکی نرم سی ٹھنڈک والی ہوا پتوں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے الہڑ دوشیزہ کے آنچل کی طرح لہرا رہی تھی۔ فضا میں تیرتے پرندے مختلف بولیاں بولتے رزق کی تلاش میں نکل رہے تھے۔ فجر کے بعد کا یہ منظر ہمیشہ سے اس کی آنکھوں کو بہت بھاتا تھا۔

گئے دنوں کی صبحیں، شامیں سوچتے جانے کب وہ اس گھر کے افراد کی متعین کردہ حد سے نکل کر مہندی کی باڑھ تک پہنچ گئی۔ ہوش تب آیا جب اک زناٹے دار تھپڑ اس کے سنہری گال پر نشان چھوڑ گیا۔

"پہلے سمجھایا تھا آج عملی طور پر بتا رہا ہوں۔ آئندہ اس طرف قدم رکھنے کی ہمت کی تو۔"

"تو کیا؟" اس کی پشت سے نکلنے والے شخص نے اس کی بات کاٹی تھی اس نے نظریں جھکالیں۔ تینوں نفوس جانتے تھے کہ یہ شرمندگی نہیں ہے۔

"چپ کیوں ہو گئے برخوردار؟ مجھے بھی بتاؤ کہ اگر یہ دوبارہ ادھر آئی تو تم کیا کرو گے؟ اسی طرح تھپڑ مار کر اسے ذلیل کرو گے اور ساتھ میں مجھے بھی؟" وہ خاموشی سے کھڑا رہا۔

"نبیل! یہ بہن ہے تمہاری۔"

"یہ بدکردار میری بہن ہے نہ ہو سکتی ہے اور اگر دوبارہ یہ ادھر آئی تو پھر یہ سمجھ لیں میں اس گھر میں نہیں رہنے والا۔"

نخوت سے کہتا تن فن کرتا وہ لان عبور کر کے اندر چلا گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

"ایسے ہوتے ہیں بھائی، کھڑے کھڑے میرے کردار پر کیچڑ اچھال کر مجھے بے قعت کر گیا۔" اس نے

مکمل ناول

دکھ سے سوچا۔

بت بنے پاپا نے اسے سینے سے لگا لیا "تھوڑا صبر کرنا میری بچی۔ اللہ قرآن میں فرماتا ہے 'بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ اس نے یہ پریشانی ڈالی ہے وہی کاٹے گا۔ ان شاءاللہ۔"

ان کی آواز نم آلود تھی' خود اس کی آنکھیں بھی بھیگی تھیں۔ ناکردہ جرم کی سزا جانے کب تک کاٹنی تھی شاید مرتے دم تک۔ وہ دل گرفتی سے سوچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"صدف.... صدف.... یار! اٹھ بھی جاؤ گھڑی دیکھو کتنا وقت ہو گیا ہے۔" شیو بناتے ہوئے وہ واش روم سے مسلسل اسے آوازیں دے رہا تھا۔

"حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔ کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔ کم از کم میرے کپڑے تو پریس کر دو پھر بھلے سوئی رہنا سارا دن۔" جھنجلا کر اس نے صدف کو بری طرح جھنجوڑ ڈالا تھا۔ وہ جمائیاں لیتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"استری کیے ہوئے ہیں۔ الماری میں دیکھ لیں۔" مندی مندی آنکھوں سے اس نے الماری کی طرف اشارہ کیا۔ ناچار خود اٹھ کر اس نے الماری کا پٹ وا کیا۔

"یار! یہ کیا ہے؟ شرٹ کوئی اور پینٹ کوئی اور۔ ٹائی سرے سے ہی موجود نہیں۔"

صبح صبح اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ لائننگ والی پینٹ پر چیک والی شرٹ۔ اسی طرح زچ کرتی تھی وہ اسے۔

"صدف.... صدف اٹھ بھی جاؤ' لیٹ ہو جاؤں گا آج بھی۔" وہ بیٹھی بیٹھی اونگھ رہی تھی اس کی آواز سن کر چوکنا ہو کر بیٹھ گئی۔ بادل نخواستہ اٹھ کر ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس نے پلین شرٹ نکالی اور ہمیشہ کی طرح بے ڈھنگے انداز میں استری کر کے اس پر گویا احسان عظیم کیا۔

"اب ذرا ٹائی اور موزے بھی نکال دو۔" کپڑے غسل خانے میں لے جاتے ہوئے اس نے یاددہانی کروائی۔ تیار ہو کر آیا تو وہ الماری کھول کر سارے کپڑے زمین پر ڈھیر کر رہی تھی۔ "اس کے ساتھ والی ٹائی نہیں مل رہی۔" اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے کہا۔

"اچھا ٹائی رہنے دو۔ موزے دے دو' آل ریڈی اتنا لیٹ ہو چکا ہوں۔" بالوں کی تہ جماتے ہوئے اس نے شیشے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ.... اصل میں.... موزے بھی ایک جیسے مل نہیں رہے۔"

تھوڑا ہچکچاتے ہوئے اس نے دو مختلف موزے اس کے سامنے رکھ دیے۔

نبیل نے اپنی بے بسی پر خود ہی ترس کھاتے ہوئے وہ موزے لے کر پہن لیے۔ ناشتے کا تصور ہی عبث تھا۔ صبح صبح خراب موڈ کے ساتھ وہ آفس کے لیے روانہ ہو گیا۔ طبیعت بری طرح سے مکدر تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اس طرح کب تک چلے گا۔ پاپا کے ساتھ ضد لگا کر اس نے خود سے ہی دشمنی مول لی تھی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں اور باقی رہ گئے تھے پچھتاوے' جو شاید آنے والی ساری زندگی پر محیط تھے۔

☆ ☆ ☆

وسیع و عریض لان میں عین اس کی کھڑکی کے پاس اک پتھر آکر گرا' جو اس نے کھڑکی کھلی ہونے کے باعث دیکھ بھی لیا۔ چند سیکنڈز میں اس نے جا کر اس پتھر سے ننھے رقعے کو پتھر سے الگ کر کے دوپٹے تلے چھپا لیا اور ادھر ادھر دیکھ کر محتاط قدموں سے واپس کمرے میں آگئی۔ کمرہ لاک کر کے اس نے وہ رقعہ کھولا۔

"جان اگر تمہارے پاپا اور بھائی گھر پر نہیں ہیں تو صرف ایک منٹ کے لیے دروازے پر آجاؤ۔ میں باہر

کھڑا انتظار کر رہا ہوں۔"

"تمہارا احمد۔"

رقعہ پڑھ کر اس نے گہری سانس لی اور شیشے میں اپنا ناقدانہ جائزہ لیا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ مین گیٹ کا ذیلی دروازہ کھولتے ہی اسے وہ سامنے دیوار کے ساتھ کھڑا نظر آگیا تھا۔

"کیا ہے؟" نظر بچا کر اس نے اشارے سے پوچھا۔

جوابی اشارے پر اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

حد ہے بے شرمی کی۔ اس نے غصے سے سوچا۔

"اس طرح رقعے مت پھینکا کرو۔" اس نے آہستہ آواز میں کہا۔

"مجھے خود بھی اچھا نہیں لگتا۔ تمہارے پاس میرا نمبر ہے تو سہی۔ تم کسی کے نمبر سے بات کر لیا کرو۔ اگلے مہینے تنخواہ ملتے ہی تمہیں زبردست سا موبائل لے دوں گا۔"

اس کی بات پوری ہوتے ہی اس کی نظر سامنے سے آتی گاڑی پر پڑ گئی۔ وہ جلدی سے دروازہ بند کر کے اندر بھاگ گئی۔

☆ ☆ ☆

حسب معمول شیو بنا کر اس نے شاور لیا۔ آفس کے لیے کپڑے چینج کر کے تازہ دم ہو کر وہ باہر آیا تو دعا حلق پھاڑ کر رو رہی تھی۔

"صدف۔ اِدھر ہو یار۔ پکڑو اسے آکر۔" بچی کو ہلکا سا پچکار کر اس نے صدف کو آواز دی۔ خلاف توقع صدف اسی وقت کمرے کے کھلے دروازے سے برآمد ہوئی۔ اس کے دونوں ہاتھ آٹے سے سنے ہوئے تھے۔

"آٹا گوندھ رہی ہوں ناشتے کے لیے۔"

نبیل نے نظر اٹھا کر گھڑی کی طرف دیکھا "ناشتہ رہنے دو۔ آفس میں ہی کر لوں گا۔ اسے آکر پکڑ لو۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف قدم بڑھایا اور اگلے ہی لمحے ڈگمگاتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے کونے سے سر ٹکرا بیٹھا۔ خون اک دھار کی طرح اس کے ماتھے پر بہہ نکلا۔ تکلیف سے بے پروا اس نے ڈگمگانے کی وجہ پر غور کیا۔ زمین پر خراب دودھ گرا ہوا تھا جس سے اس کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں گھبرائی ہوئی صدف نے بھی دیکھا۔

"رات فیڈر میں دودھ ڈالتے ہوئے گر گیا تھا۔ میں نے سوچا۔ صبح صاف کر لوں گی۔"

"تم اور تمہاری سوچ۔ مائی فٹ۔ ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ تم سے گھر نہیں سنبھالا جا رہا۔ نہ پہننے کو کپڑے ملتے ہیں نہ کھانے کو کھانا۔ ذہنی سکون ہی نہیں تم دے سکتیں تو اور کیا دو گی۔"

پرفیوم کی بوتل اٹھا کر اس نے شیشے پر دے ماری۔ بریف کیس اٹھا کر ایک ہاتھ اس نے خون بہنے کی جگہ پر رکھا اور کڑی نظروں سے اسے گھورتا باہر نکل گیا۔ غصے کے اس مظاہرے پر دعا مزید چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے ٹشو سے ماتھا صاف کیا اور کچھ دیر زخم کو دبا کر رکھا۔ تھوڑی ہی دیر میں خون تو رک گیا تھا لیکن نسبتاً کم گہرا زخم ماتھے پر واضح نظر آ رہا تھا۔ اسے ہمیشہ سے غصہ بہت آتا تھا لیکن وہ اس طرح اظہار نہیں کرتا تھا۔

صدف اس کے غصے کا ہی نتیجہ تھی۔ امی اس کی شادی صدف سے کرنا چاہتی تھیں اور سوئے قسمت انہوں نے ایک بار اس خواہش کا اظہار نبیل کے سامنے بھی کیا تھا۔ پھر اللہ نے انہیں اس خواہش کے پورا ہونے تک مہلت نہیں دی۔ امی کی وفات کے بعد اسے پتا چلا کہ پاپا اس کے لیے رشتہ دیکھ رہے ہیں یا دیکھ چکے ہیں۔

وہ جانتا تھا پاپا امی کے خاندان میں اس کا رشتہ نہیں کرنا چاہتے۔ اسی ضد میں اس نے کسی جھجک کے بغیر دو ٹوک انداز میں صدف کا نام لے دیا۔ مرحومہ ماں کی خواہش کا احترام اپنی جگہ لیکن وہ پاپا کو زک پہنچا کر اپنی تسکین چاہتا تھا۔

جس شخص نے اس کی مشفق ماں کو تادم آخر اذیت میں مبتلا رکھا وہ کیسے اس کا فرماں بردار بن جاتا۔ یہ الگ بات کہ پاپا کو دکھ دینے کے چکر میں وہ اپنی زندگی برباد کر بیٹھا تھا۔ صدف نامی مسلسل عذاب کو پلے باندھ کر اپنی خوشیاں گنوا بیٹھا تھا۔

لنچ ٹائم میں شہریار نے پارکنگ میں آکر اسے کال کی تو چاروناچار اسے بھی آفس سے نکلنا پڑا۔ آفس کے قریبی مال میں فوڈ کورٹ میں کھانا آرڈر کر کے شہری نے اس سے زخم کے بارے میں پوچھا یہ اور بات کہ

اس کا انداز ذرا اوکھرا تھا۔

"نبیل یار! تیرے دل و جگر کے زخم اب تیرے جسم پر پھوڑے بن کر نکلنے لگے ہیں ان کا کچھ علاج کر۔" اتنا مہذب انداز۔ نبیل دانت پیس کر رہ گیا۔

"اوہ۔ کہیں بھابھی پہلوان کے ساتھ اکھاڑے میں ملاقات تو نہیں ہوگئی تھی؟" اس کی خاموشی پر وہ اسے اکسا رہا تھا کہ وہ کچھ کہہ سن کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلے۔

"یار! میں تیرا اکلوتا دوست ہوں تو آج اس زخم کی کہانی کہہ ڈال۔"

وہ اک نئے جوش سے بولا تو نبیل کو بھی چپ کا روزہ توڑنا پڑا۔ جانتا تھا جب تک جواب اور وہ بھی شہری کی مرضی کا نہ دیا تو اس کی بک بک ٹرین یوں ہی چلتی رہے گی۔ مختصراً اس نے صبح والی روداد کہہ ڈالی۔

"ویسے یار اک حل ہے میرے پاس تیری غلطی سدھارنے کا۔" ساری بات سن کر اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "تو دوسری شادی کرلے۔"

اس کے کمینے مشورے پر نبیل کو بری طرح اچھو لگا تھا۔

"لگتا ہے میرے مشورے کی طرح یہ پانی بھی تجھے ہضم نہیں ہوا۔"

"مجھے مشورہ دینے کے بجائے خود پر توجہ دے۔ شادی کی عمر نکلی جارہی ہے تیری۔" ٹشو سے منہ پونچھ کر اس نے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"ہائے۔" شہری نے اک ٹھنڈی آہ بھری۔ "مجھے تو حسرت ہی رہی کب میری ماں کے اکلوتے بیٹے کے سہرے کے پھول کھلیں گے۔" اس کی مسکنیت پر نبیل کو ہنسی آگئی۔

"کیوں؟ آپ کی والدہ محترمہ کو آپ کے سہرے میں لگانے والے پھول نہیں مل رہے۔" وہ شرارتی ہوا۔

"ارے یار! میں تو بغیر پھولوں بغیر سہرے کے بھی بارات لے جاؤں اگر لڑکی اور امی کی اجازت مل جائے۔" دونوں کا مشترکہ قہقہہ گونجا۔

"اور وہ تمہاری شمائل۔ اس کا کیا بنا؟" نبیل نے پوچھا۔

"میری شمائل کہاں سے آگئی؟" اس نے نظریں ترچھی کرکے نبیل کی طرف دیکھا۔ "مجھے وہ پسند ہے۔ کسی بھی باشعور شخص کو وہ پسند آسکتی ہے۔ خوب صورت ہے۔ ذہین ہے باوقار باحیا ہے۔ اس میں ہر وہ خوبی ہے۔ جو کوئی شخص اپنی بیوی بیٹی میں دیکھنا چاہے گا۔ آؤٹ آف فیملی ہے تو امی مانیں گی نہیں ورنہ اس سے اچھی لڑکی کوئی نہیں ہوسکتی۔"

تفصیل سے جواب دے کر وہ اس کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا جو ویٹر ابھی ابھی رکھ کر گیا تھا۔ تائید میں سر ہلا کر نبیل بھی کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ صبح سے کچھ کھایا نہیں تھا اور اب بھوک سے انتڑیاں قل ھواللہ پڑھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"حوریہ بیٹا!"

"جی پاپا!" اس نے سر پر اوڑھے ہوئے دوپٹے کو مزید کس کر باندھا۔

"میں ذرا مارکیٹ تک جارہا ہوں۔ کچھ چاہیے تمہیں۔"

"نہیں پاپا!" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ پاپا کے چہرے پر پھیلی مایوسی مزید بڑھ گئی تھی۔

"میں۔۔۔ ساتھ چلوں۔" کچھ سوچتے ہوئے اس نے پاپا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"ہاں۔ ہاں چلو۔۔ تم خود ہی۔ جو چاہیے' جو دل چاہے اپنی مرضی سے لے لینا۔" وہ ایک دم پرجوش ہوئے تھے۔ حوریہ کو لگا ان کی جھریوں میں جیسے کسی آس کا جگنو چمکا ہے۔

شاپنگ کے لیے وہ قریبی شاپنگ مال میں آئے تھے۔ پاپا ہر چھوٹی چھوٹی چیز کے لیے اس سے مشورہ مانگ رہے تھے۔ بے دلی سے ہوں ہاں کرتے وہ ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی اس طرح غائب دماغی محسوس کرتے ہوئے انہوں نے ریکس میں پڑی اشیاء میں سے خود ہی مطلوبہ چیزیں نکالنا شروع کردیں۔

"حوریہ! ایسا کرو تم اپنے لیے جو لینا چاہو لے لو۔ میں یہ لسٹ والا سامان لے لیتا ہوں۔" ان کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ تھی۔

حوریہ ان سے نظر بچا کر الیکٹرونکس پورشن میں چلی گئی۔ جلدی سے ایک قدرے سستا موبائل خریدا اور پاپا کے علم میں لائے بغیر اپنے ذاتی پیسوں میں سے بل کلیئر کروا کر واش رومز کی طرف چلی گئی۔ جلدی سے ڈبا کھول کر اس نے فون نکالا اور بیگ میں ڈال کر ڈبا وہیں چھوڑ دیا۔ چہرے کو پانی سے تر کرکے وہ باہر آگئی۔ اس کا دل اس چوری پر بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اگر پاپا' سعد بھائی یا نبیل۔۔۔ یا پھر مومنہ بھابھی یا صدف۔۔۔ کسی کو بھی اس موبائل کا علم ہوجاتا تو؟

اس مختصر سے دورانیے کی سوچ نے رگوں میں اس کا لہو منجمد کرنا شروع کردیا تھا لیکن انجام سے بے پروا ہو کر اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔

واپسی پر اسے خالی ہاتھ دیکھ کر پاپا کو یقیناً" خوشی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ مطمئن تھے کہ وہ ان کے ساتھ آئی تو سہی اور حوریہ اس بات پر مطمئن تھی کہ جس کام سے وہ آئی تھی۔ وہ بنا کسی مشکل کے ہوگیا تھا۔ گھر آکر اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر پرانی سم نکالی اور موبائل میں ڈال کر موبائل آن کیا۔ اسکرین روشن ہوتے ہی اس نے سم میں محفوظ دو نمبروں میں سے ایک نمبر ملایا۔

☆ ☆ ☆

آج چھٹی تھی۔ سو وہ دیر سے سو کر اٹھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ صدف بھی ابھی تک سو رہی ہوگی۔ لیکن جب اس نے کروٹ بدلی تو حیران رہ گیا۔ اورنج اور گرین امتزاج کے بے حد فٹنگ والے سوٹ میں ملبوس وہ دعا کو گود میں اٹھائے ادھر سے ادھر پھرتے ہوئے کمرے کا پھیلاوا سمیٹنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

"چلو شکر میری ناراضی کی تھوڑی پروا تو ہے۔"

مندی مندی آنکھوں سے دیکھتے وہ دل ہی دل میں خوش ہوا تھا۔ جس دن سے اس کا ماتھا زخمی ہوا تھا۔ اس نے گھر پر کھانا پینا اور صدف سے بات کرنا چھوڑ رکھا تھا۔ تھوڑی دیر یوں ہی لیٹے رہنے کے بعد وہ نہانے کے لیے چلا گیا تو صدف نے پٹخنے کے انداز میں دعا کو بیڈ پر بٹھایا اور خود بھی اپنا بے ہنگم وجود لے کر دھم سے بیڈ پر گر گئی۔

"کس عذاب میں پھنسا دیا مومنہ بھابھی آپ نے مجھے۔" اس نے کوفت سے سوچا۔

اصل میں ہوا یوں کہ کل شام وہ یوں ہی مومنہ بھابھی کے پاس چلی گئی۔ انہوں نے شاید نبیل کی ناراضی نوٹس کی تھی سوائے گھر گرہستی اور شوہر کے حقوق پر لیکچر دینے بیٹھ گئیں۔ جذباتی ہو کر اس نے خود ساختہ مجبوریوں کی کتھا کہہ سنائی۔ تحمل سے اس کی بات سن کر انہوں نے نبیل کا مزاج مدنظر رکھ کر اسے کچھ ٹپس یا مشورے دیے تھے۔ اور وہ ان کے پہلے مشورے پر ہی عمل کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

چھ سات ماہ کی بچی کے ساتھ اپنے پورے پورشن کی تفصیلی صفائی اسے عذاب نظر آ رہی تھی۔ ایک کمرے کا پھیلاوا سمیٹنے میں ہی وہ ہلکان ہو گئی تھی۔

"یہ سب تو میرے بس کا کام نہیں۔ بھابھی سے کہوں گی کوئی اور حل بتائیں۔" یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ یوں بھی نبیل کا موڈ آج کافی اچھا تھا سو یہ ایک بھرپور دن تھا۔ شام کو نبیل نے اسے باہر ڈنر کا کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"نہیں دعا تنگ کرے گی باہر جا کر۔" جانے کس طرح اس نے انکار کیا تھا حالانکہ بہت دل چاہ رہا تھا کسی اچھے ریسٹورنٹ کا کھانا کھانے کو۔

"اگر مائنڈ نہ کریں تو اسے بھابھی کے پاس چھوڑ دوں؟ یوں بھی اس کے سونے کے وقت ہی تو ہم جائیں گے۔" ڈرتے ڈرتے اس نے حل پیش کیا۔

"ہاں پوچھ لو اگر وہ ایزی ہو کر رکھ لیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے خوش دلی سے جواب دیا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ہاں یہ اس نے جھوٹ بولا تھا کہ دعا جلدی سو جائے گی۔ اصل میں وہ بے حد چڑچڑی بچی تھی۔ سال کی گود میں بمشکل چپ ہوتی تھی اور مومنہ بھابھی کو تو یقیناً" اس نے نچاو دینا تھا۔ لیکن خود غرضی سے سوچتے ہوئے وہ یہ پہلو نظر انداز کر گئی تھی۔

حسب توقع بھابھی نے مومنہ کو رکھ لیا تھا۔ شاکنگ پنک کلر کی فراک میں وہ عجوبہ ہی لگ رہی تھی۔ بے ڈول جسم پر فراک عجیب لگ رہی تھی۔ جھوٹے موتیوں کا سیٹ پہن کر اس نے شاکنگ ہی میک اپ کیا اور جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے ہر ہر زاویے سے خود کو دیکھا اور دل کھول کر سراہا۔

جب نبیل پورچ سے گاڑی نکال رہا تھا تو اسے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ ایسے تیار تھی جیسے کسی شادی میں جانا ہو' ہیوی جیولری اور گہرا میک اپ۔ "جہالت کی انتہا ہے۔" اس نے کلس کر سوچا۔ سارا موڈ غارت ہو گیا تھا۔

اس کا رک کر دیکھنا صدف نے بھی نوٹس کیا تھا۔ "اف۔ آج میں واقعی بہت خوب صورت لگ رہی ہوں تب ہی تو نبیل بھی نظریں ہٹانا بھول گیا تھا۔" اس نے مسرور ہو کر سوچا۔

بے دلی سے نبیل اسے درمیانے درجے کے ایسے ریستوران میں لے گیا جہاں کسی کے ملنے کا امکان نہیں تھا لیکن برا ہو بشری کا جو بوتل کے جن کی طرح پھر حاضر ہو گیا تھا۔ اس طرح معنی خیزی سے دیکھ رہا تھا جیسے ڈیٹ مارتے پکڑ لیا ہو۔

کھانا کھا کر جب وہ واپس پہنچے تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ نبیل گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے اندر چلا گیا تو وہ دعا کو لینے مومنہ بھابھی کے پاس آ گئی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی' جب اس نے دعا کو پرسکون سوتے ہوئے دیکھا۔

"بھابھی یہ۔ کیسے سو گئی آپ کے پاس؟" وہ

پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"محبت کے جادو سے۔" وہ مسکرائیں۔

"کمال ہے ویسے۔۔۔ میں تو سوچ رہی تھی آپ کو خوب تنگ کررہی ہوگی۔"

"نہیں تو۔۔۔ تھوڑا بہت تو بچہ تنگ کرتا ہی ہے، ویسے بھی حوریہ کے پاس تو جادو ہے۔۔۔" غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ خاموش ہوگئی تھیں۔

"حوریہ۔۔۔" وہ زیرلب بڑبڑائی۔

"سوری۔" وہ بلاوجہ شرمسار ہوئیں۔ نبیل کی حوریہ سے چڑ وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔ بھابھی! میں حیران ہوں دعا میرے بغیر کیسے سوگئی؟"

"حوریہ کے پاس تو کھیلتی بھی رہی ہے پھر اس نے کھانا کھلا کر سلادیا۔" اس کے عام رد عمل پر انہوں نے پرجوش ہو کر بتایا۔

"واقعی؟" وہ اور حیران ہوئی تھی۔

"ہاں ناں۔۔۔"

"بھابھی! حوریہ سے کہیں روز تھوڑا وقت میرے پاس آجایا کرے۔ دعا بہل جائے تو میں آسانی سے سارا کام نمٹالیا کروں گی۔"

"ارے وہ آجائے گی، میں کہوں گی اس سے، بلکہ اگر تم کہو تو وہ کام میں بھی تمہاری مدد کروادیا کرے گی۔ بہت اچھی بچی ہے۔ اللہ نصیب اچھے کرے۔" بھابھی نے خوش ہو کر بتایا۔

وہ سن کر خوش ہوگئی تھی۔ بے دام غلام جو ملنے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو۔۔۔" ایئرپیس سے احمد کی آواز ابھری۔

"میں بات کررہی ہوں۔"

"میں کون؟"

"میں۔۔۔ حوریہ۔ حوریہ بات کررہی ہوں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"کون حوریہ؟ آسمانی حور؟" اس کے پھکڑ مذاق پر وہ کھول کررہ گئی۔

"ٹھیک ہے اگر نہیں پہچانتا تو تمہاری مرضی۔ اتنی مشکل سے تو کال کی ہے۔" اس نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

"اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ تم ہو۔ مجھے تمہارا نام ہی نہیں پتا تھا۔۔۔ اور کیسی ہو؟" اس کی دھمکی کام کرگئی تھی۔

"نام نہیں پتا تھا تو کیا آواز بھی نہیں پہچان سکتے تھے؟"

"وہ تو ہزاروں میں بھی پہچان سکتا ہوں میری جان۔" اس طرز تخاطب پر وہ سرتاپا سلگ گئی تھی لیکن ظاہر نہیں کیا۔

"ویسے یہ نمبر کس کا ہے؟"

"گھر کا نمبر ہے۔۔۔ اب خود کال مت ملانے بیٹھ جانا۔"

"جب تم بیل کرو گی تب ہی کال کروں گا میری جان!" لوفرانہ انداز میں بار بار جان کہہ کر وہ اس کی جان جلا رہا تھا۔

"تم مجھے کچھ اور کہہ کر نہیں بلاسکتے؟"

"اور کیا کہوں؟ میری جان کہنا برا لگا؟"

"نہیں لیکن۔۔۔ اتنا اچھا بھی نہیں لگا۔ پتا نہیں کس کس کو کہتے ہوگے۔ میرے لیے کچھ اسپیشل ہونا چاہیے ناں؟" اس کی لاڈ بھری فرمائش پر وہ خوشی سے لوٹ پوٹ ہوگیا۔

"میں ہر کسی کو جان نہیں کہتا پھر بھی تمہاری خاطر تمہیں کچھ اور کہہ لوں گا۔" میری حور" ٹھیک رہے گا؟"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اس پر احسان جتاتے ناز سے اس نے "اوکے" کہا تھا۔ "اچھا میں گھر کے نمبر پر زیادہ بات نہیں کرسکتی۔ ابھی پاپا یا بھائی آجائیں گے۔"

"اوہو۔۔۔ میری حور جی صرف تھوڑے دن انتظار کرلو۔ ایک زبردست ڈبا پیک نیا موبائل دیکھا ہوا ہے میں نے اپنی حور کے لیے۔ بس تنخواہ ملتے ہی اپنی حوریہ وار دوں گا۔"

لفنگے انداز میں وہ بار بار میری حور کی گردان کررہا

تھا۔ وہ شکوہ کر رہی تھی کہ "میری جان" سے تو جان چھوٹی۔ جان بوجھ کر جلدی مچاتے اس نے فون بند کر دیا تھا۔ فون بیڈ پر اچھال کر وہ با آواز بلند "ایسا لگتا ہے میں ہواؤں میں ہوں۔" گنگنانے لگی۔

☆ ☆ ☆
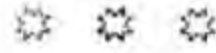
"اور سرکار۔۔۔ کدھر گم رہتے ہیں؟ غریب مریدوں کو بھی درشن دے دیا کریں۔" شیری دھپ سے صوفے پر گرا۔ فائل سے نظریں ہٹا کر اس نے اس کی طرف دیکھا اور پھر فائل بند کر دی۔ شیری کی موجودگی میں کام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"کوئی گم نہیں میں۔۔۔ روز ادھر اسی آفس میں جھک مارنے آتا ہوں اور مقرر وقت پر نکل جاتا ہوں۔۔۔ اب بتاؤ کیا منگواؤں؟"

"اچھا۔۔۔ گرل فرینڈ کے ساتھ ڈیٹس رستوران میں اور ہمیں ادھر سے ٹرخایا جا رہا ہے۔ ویسے نبیل مجھے اندازہ نہیں تھا تمہارا ذوق اتنا بے ہودہ ہو سکتا ہے۔ چربی کی دکان پر ڈھیروں میک اپ' زیور لاد کر کیسے اس اسٹرابیری آئس کریم کو لے کر گھوم رہے تھے۔ تمہیں بھی خیال نہیں آیا کہ لوگ کیا کہیں گے؟" مسکراہٹ دبا کر اس نے شرارت سے کہا۔ نبیل کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

"وہ۔۔۔ صدف تھی۔" شیری کے ہونٹوں سے مسکراہٹ ایک سیکنڈ میں غائب ہوئی تھی۔

"آئم سوری۔" شرمندگی کے مارے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ سمجھا' شاید نبیل کی کوئی کزن ہو گی ورنہ وہ جانتا تھا نبیل ڈیٹنگ بوائے نہیں۔ نبیل کی شادی میں وہ شریک نہیں ہو سکا تھا ورنہ صدف کے بارے میں اس طرح اظہار خیال نہ کرتا۔

"کچھ غلط نہیں کیا تم نے۔ میں جان بوجھ کر اسے اس تھرڈ کلاس ریسٹورنٹ میں لے کر گیا تھا کہ کہیں کوئی جاننے والا نہ مل جائے۔ مجھے کیا خبر تھی تم ادھر بھی پہنچ جاؤ گے۔" زبردستی لہجے میں بشاشت سمو کر اس نے کہا تھا لیکن شیری کے چہرے پر ابھی بھی ڈھیروں شرمندگی بکھری تھی۔

"پھر بھی یار۔۔۔ مجھے بھابھی کے بارے میں ایسے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔۔۔ مجھے لگا' تمہاری کوئی کزن ہے۔ تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔۔۔" جان بوجھ کر اس نے بات ادھوری چھوڑی۔ چاہے اس نے صدف کے پھوہڑپن کے ہزار قصے اس کے گوش گزار کیے ہوں۔ شکل و صورت کے حوالے سے اس نے کبھی شیری سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اسے شکل و صورت سے غرض تھی بھی نہیں۔ اگر ہوتی تو خالہ کی قبول صورت' عام سی شکل والی صدف کو کیوں بیاہتا۔ شادی کے فوراً" بعد دعا ہونے والی ہو گئی پھر صدف کی آرام طلبی اور کام چوری کی وجہ سے وہ مسلسل پھیلتی چلی گئی۔ اسی لیے مختصر سے عرصے میں وہ واقعی گوشت کا پہاڑ بنتی جا رہی تھی۔

"اچھا چھوڑو۔۔۔ تم شائل کا سناؤ۔" اس نے بات پلٹی۔

"ہاں یار' پچھلے کچھ عرصے میں بہت مصروف رہا اس لیے اس سے بات نہیں ہو سکی۔ تازہ ترین یہ کہ اس کی ماں کی فوت ہو گئی ہے اس کا سوتیلا باپ اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ وری سیڈ۔" اسے حقیقتاً" افسوس ہوا تھا۔ سوتیلے رشتوں کا ذائقہ تو اس نے بھی چکھ رکھا تھا۔

"سیڈ تو واقعی ہے۔ فیلنگ بیڈ فار ہر۔ پتا نہیں کیسے لوگ ہوں گے۔ بہت خاموش لگ رہی تھی۔"

"تم ملے اس سے؟" بات بڑھانے کی غرض سے اس نے پوچھا۔

"ہاں کچھ بکس خریدنے آئی ہوئی تھی تو بائی چانس ملاقات ہو گئی۔ فون پر بھی بات ہوئی تھی۔ مجھے تو بہت پریشان لگ رہی تھی' اوپر سے اس کی انوکھی فرمائش نے الجھن میں ڈالا ہوا ہے۔"

"کیسی فرمائش؟"

"وہ کہہ رہی تھی۔ کوئی ایسا شخص ہو جو اس سے

کاغذی شادی کرلے اور پھر اس کے سوتیلے باپ سے بات کر کے رخصتی کروالے۔ وہ ہاسٹل شفٹ ہونا چاہ رہی ہے۔ اس کا کام بن جائے پھر شادی ختم۔" اس نے اطمینان سے بتایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"کیا پاگل ہو گئے ہو تم دونوں؟ اس طرح نہیں ہوتا شہزادے۔"

"پتا ہے مجھے بھی۔۔۔ لیکن وہ لڑکی ہے اور لڑکی کتنی بھی عقل مند کیوں نہ ہو احمق ہی ہوتی ہے۔ وہ بھی ہے تھوڑی سی۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"بھلا ایسا شخص کہاں سے ملے گا جو اس کی مرضی سے شادی کرے اور پھر اسے آزاد کردے۔"

"مجھے کیا پتا۔۔۔ میں نے کون سا دکان کھولی ہے۔" اس نے نقق میں بات اڑائی۔

"لیکن یار! یہ بھی حقیقت ہے کہ میں چاہ کر بھی اس کی کسی قسم کی مدد نہیں کر سکتا۔ پتا نہیں کن حالات سے لڑ رہی ہوگی۔ سوتیلے رشتے بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ اگر اس کے باپ کی بیٹیاں ہوئیں تو اس کا تو جینا حرام ہو گیا ہوگا۔ نہ بھی ہوئیں تو سوتیلی ماں ہی کافی ہوگی۔"

شیری کے تبصرے نے اس کے دل پر اداسی طاری کردی تھی۔ سوتیلی ماں۔۔۔ ماں کے ساتھ لگا یہ لفظ کتنا تکلیف دہ ہے یہ وہ بخوبی جانتا تھا۔ گو کہ کبھی وہ اس ماں کے رحم و کرم پر نہیں رہا پھر بھی وہ جانتا تھا۔ اسے شمائل سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ "بے چاری لڑکی تو سوتیلے رشتوں میں پھنس کر رہ گئی۔ لڑکا ہوتی تو یوں ان کے آسرے پر نہ پڑی ہوتی۔ آئی وش ہم اس کی کچھ مدد کر سکیں۔" اس نے دل سے کہا۔ شیری ایک دم اچھل پڑا۔

"اوہ۔۔۔ پتا نہیں پہلے میرے ذہن میں یہ خیال کیوں نہیں آیا۔" وہ پرجوش ہو کر بولا۔

"کیسا خیال؟" اس نے پوچھا اور پھر شیری کے جواب نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ "تم وقتی طور پر اس سے نکاح کرلو۔ بعد میں طلاق دے دینا۔"

"کیا بکواس ہے یار۔ اگر میں تمہیں اپنی پرسنل لائف میں انوالو کرتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم کچھ بھی کہو۔"

"ایک منٹ یار۔۔۔ ڈونٹ گیٹ ایموشنل۔۔۔ دیکھو۔۔۔ صرف ایک کاغذی رشتہ ہے۔ تم اس کے گھر چلے جانا اور کسی جھنجھٹ میں پڑے بغیر اسے ساتھ لے آنا۔ مجھے یقین ہے وہ لوگ سستے میں جان چھوٹ جانے پر شکر ادا کریں گے۔ وہ ہاسٹل چلی جائے گی اور کاغذی رشتہ بھی ختم۔" اس نے تحمل سے ساری بات سنی۔

"اور پھر وہ کہاں جائے گی؟ میرا مطلب ساری زندگی ہاسٹل میں تو نہیں نہ رہ سکتی؟"

"او یار۔۔۔ وہ سمجھ دار ہے کچھ نہ کچھ تو سوچ رکھا ہوگا اس نے۔ اور ہم ساری زندگی تو اس کا ساتھ نہیں دے سکتے نا۔ تم آل ریڈی میرڈ ہو اور میں بھی بچپن سے انگیجڈ ہوں۔ نیکی کر کے دریا میں ڈال دیں گے۔ سوچیں پالنے کی ضرورت نہیں۔"

اسے شیری پر رشک آیا تھا جو چھوٹی بڑی کسی بات کی پروا نہیں کرتا تھا بلکہ بڑے سے بڑے مسئلے کو چٹکیوں میں اڑا دیتا تھا۔ اتنا بڑا معاملہ اور اس کا اتنا عام انداز۔۔۔ وہ حیران تھا۔

"تم کوئی اور دیکھ لو یار۔ میں پہلے ہی اتنا ڈپریسڈ ہوں اوپر سے تم مجھے ٹینشن دے رہے ہو۔" اس کے لہجے سے رضامندی کی مہک اٹھ رہی تھی۔ اور پھر شیری نے آفس سے اٹھنے سے پہلے اسے شمائل سے کاغذی شادی کے لیے رضامند کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر پہنچتے ہی خوش گوار سی حیرت نے اسے گھیر لیا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے باہر نکلا تو جیسے ہر منظر نکھرا ہو گیا تھا۔ گملے ایک ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ فرش دھلا ہوا بے داغ تھا۔ لان میں کرسیاں بھی سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ درختوں کے اکا دکا پتے گھاس پر نظر آرہے تھے ورنہ تو ان پتوں سے ساری گھاس ڈھکی

ہوتی تھی۔ کافی عرصے بعد ایسا خوب صورت منظر دیکھا تھا۔ ابھی تو اس کی حیرت کے اور بھی سامان تھے۔ اندر داخل ہوا تو لاؤنج میں بھی ہر چیز اپنے ٹھکانے پر نظر آئی۔ صوفوں اور ڈیکوریشن پیسز پر اک عرصے سے جو دھول جمی ہوئی تھی۔ وہ بھی صاف کی جاچکی تھی۔ کشنز بڑے سلیقے سے رکھے تھے۔ اس کی ساری تھکاوٹ کافور ہوگئی تھی۔ وہ خود کو بڑا تروتازہ محسوس کررہا تھا۔ "تو صدف بی بی خیال آہی گیا تمہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ کمرے میں گیا تو ادھر بھی اسی طرح طریقہ سلیقہ نظر آرہا تھا۔ صدف بھی رائل بلو بے حد فٹنگ والے سوٹ میں تیار بیٹھی ہوئی تھی۔ شادی کے شروع دنوں میں وہ اس کے آنے پر یوں ہی تیار ہوتی تھی۔ جانے آج کیسے یاد آگیا تھا اسے۔ نبیل کو دیکھتے ہی ریموٹ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"السلام علیکم۔ اتنے لیٹ آج؟" اس کے ہاتھ سے بریف کیس لیتے ہوئے اس نے کہا۔ نبیل کہہ نہیں سکا کہ اب تو اک عرصے سے وہ اسی وقت آرہا ہے۔

"وعلیکم السلام۔ کام کچھ زیادہ تھا آج اور پھر شہریار کے ساتھ ڈنر کے لیے چلا گیا تھا۔" کوٹ اتارتے ہوئے اس نے کہا تو صدف کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"میں آپ کے انتظار میں تھی اور آپ کھانا باہر کھا آئے۔" پانی کا گلاس دیتے ہوئے اس نے ہلکا سا شکوہ کیا۔ نبیل ایک لمحے کو حیران ہوا تھا۔ "یا اللہ خیر۔" اتنے طویل وقت کے بعد وہ اس کے آنے کا انتظار کررہی تھی، وہ بھی کھانے کے لیے۔ ورنہ تو وہ فون کردیتی تھی "آتے ہوئے کچھ لے آیئے گا۔ طبیعت نہیں ٹھیک تو کھانا نہیں بنایا۔"

"او سوری۔ چلو کل سہی۔" اس نے بشاشت سے جواب دیا۔ "دعا کہاں ہے؟"

"وہ بھابھی کے پاس ہے۔ میں نے نہانا تھا تو ان کو پکڑا آئی تھی۔" بڑے عرصے بعد اسے گھر میں سکون محسوس ہوا تھا۔ ورنہ اسی کے بعد تو یہ سلیقہ دیکھا ہی نہیں تھا اس نے۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ آنے جانے میں نکل گیا۔ پھر دعا ہونے والی ہوگئی تو صدف سے کام کیا نہیں جاتا تھا۔ دعا ہوئی تو صدف سے وہی نہیں سنبھالی جاتی تھی۔ کام تو وہ کیا ہی کرتی۔ نبیل نے تو خود کو سمجھالیا تھا کہ یہ زندگی اب یوں ہی گزرے گی لیکن اب تو واضح تبدیلی آئی تھی۔

نبیل کافی دیر تک دعا سے کھیلتا رہا پھر وہ سوگئی تو صدف سے باتیں کرنے لگا۔ بہت پرسکون اور خوش تھا وہ آج۔ بہت وقت کے بعد اسے ایسی اچھی نیند آئی تھی۔

✡ ✡ ✡

"حوریہ! میں ذرا دعا کو سلادوں تم ادھر سے صفائی رہنے دو۔ کچن صاف کردو میں ابھی آتی ہوں پھر مل کر کھانا بنالیں گے۔" صدف نے روتی ہوئی دعا کو گلے سے لگایا۔ حوریہ جو لاؤنج میں جھاڑ پونچھ کررہی تھی "جی بھابھی" کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بھابھی آج پکانا کیا ہے؟ جتنی دیر کچن میں رہوں گی کوکنگ کا کام بھی ساتھ کرتی رہوں گی۔"

"وہ۔ نہاری اور مٹن پلاؤ باقی رائتہ، سلاد تو ہوتا ہی ہے۔ گوشت فریزر میں رکھا ہوا ہے۔ نکال کر رکھ دینا باقی میں آتی ہوں تو دیکھتی ہوں۔"

صدف چلی گئی تو حوریہ نے کچن میں جاکر فریزر سے گوشت نکالا۔ پگھلنے کے لیے رکھ کر واپس آگئی۔ باہر کا سارا کام نمٹا کر وہ کچن میں چلی گئی۔ اسے کل جتنی محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ کل تو بے تحاشا گند نکالا تھا اس نے۔ آج تو سب صاف تھا۔ کچن میں جاتے ہی اس نے نہاری پکنے رکھ دی اور پھر مسالوں کے ڈبے، برتن اور کنستر میں رکھی اشیاء نکال کر کنستر صاف کیے۔ سارے برتن دھو کر سلیقے سے انہیں مناسب جگہوں پر رکھا۔ ڈنر سیٹ کی ٹوٹی ہوئی پلیٹیں اور کٹوریاں کیبنٹس میں یوں ہی بکھری پڑی تھیں۔ انہیں نکال کر علیحدہ کیا۔ جو برتن عرصہ دراز سے استعمال میں نہیں

تھے انہیں بھی دھو کر رکھا۔ مکڑی کے جالے جگہ جگہ لگے ہوئے تھے وہ صاف کیے۔ پلیٹیں ترتیب سے اسٹینڈ میں رکھیں۔

کافی محنت کے بعد کچن کا حلیہ درست ہوا تھا۔ جو بے ترتیبی اس کے آنے سے پہلے پھیلی ہوئی تھی اس کا اب شائبہ بھی نہیں تھا۔ وہ فرش جو جی بھر کر داغدار تھا اب چمک رہا تھا سب کام سے فارغ ہو کر وہ چولہے کے پاس آ گئی۔ گھر میں وہ دو نفوس ہی تھے پھر بھی صدف پکانے سے جی چراتی تھی۔ جب وہ نیند پوری کر کے آئی تو نہ صرف کچن چمک رہا تھا بلکہ اشتہا انگیز خوشبو بھی کچن سے نکل کر سارے میں پھیل رہی تھی۔

"آج پھر میں سو گئی تھی۔" کچن میں داخل ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں بھابھی!"

اس نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ نہاری اور پلاؤ تیار تھے۔ رائتہ وہ بنا رہی تھی۔ سلاد بھی بن چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ادھر کھڑی رہے یا چلی جائے۔

"تم نے تو سارا کچھ خود ہی کر لیا۔" اس کے لہجے میں ستائش تھی۔ وہ تو اتنے سے کام میں مہینہ لگا دیتی۔

"اچھا اب تم جلدی سے چلی جاؤ' نبیل آنے ہی والا ہو گا۔" نبیل کے آنے میں ابھی بہت وقت تھا پھر بھی اس نے جھوٹ بول کر اسے بھیج دیا۔ نہا کر اس نے میرون شلوار قمیص پہنی اور تیار ہونے لگی۔

کھانے کی میز پہ نبیل حیران رہ گیا۔ صدف ایک دم اتنی سگھڑ لگنے لگی تھی۔ شادی کے بعد آج پہلی بار اسے ایسا کھانا نصیب ہوا تھا۔ پیٹ بھر کر کھانے کے بعد اس نے جی بھر کے تعریف بھی کی تھی۔ رات سونے سے پہلے اس نے صدف کے سدھر جانے پر شکرانے کے نوافل بھی ادا کیے تھے۔

☆ ☆ ☆

"مبارک ہو جی۔۔۔ ایک بار پھر آپ شادی شدہ ہو گئے۔" نکاح نامے کے پیپرز پر دستخط کروا کر اس نے فوراً" پیپر تہ کر کے پاکٹ میں ڈال لیے اور نبیل کو چھیڑنے لگا۔

"بکواس مت کر' تجھے بھی پتا ہے یہ صرف ایک بھلائی اور نیکی ہے۔" اس نے منہ بنایا۔

"نیکیاں گلے بھی پڑ جایا کرتی ہیں۔" وہ پھر باز نہیں آیا۔ نبیل ایک دم پریشان ہو گیا۔ اگر سچ میں ایسا کچھ ہو گیا تو۔۔۔ اس سوچ نے اس کو بے جان کر دیا تھا۔

"کیا ہوا یار! مذاق کر رہا ہوں۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ حق مہر بھی پانچ ہزار لکھا ہے۔ نکاح نامہ بھی ہمارے ہی پاس ہے اور اس کے سوتیلے رشتے دار۔"

"نہیں شیری!" اس نے بات کاٹی۔ "ہم اللہ کے بنائے قوانین کا مذاق بنانے چلے ہیں اگر کچھ ہو ہوا گیا تو کیا ہو گا؟ صدف ویسی بن گئی ہے جیسی میں چاہتا تھا کہ وہ بن جائے۔ گھر سنبھالنے والی' پھر میری بیٹی بھی ہے۔ او خدا مجھ سے کیا ہو گیا۔ کہیں میں زیادتی تو نہیں کر بیٹھا؟" اس کی پریشانی دیکھ کر شیری بھی چپ رہ گیا تھا۔

"او یار! کیوں ٹینس ہو رہا ہے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا جب تک ہم تینوں میں سے کوئی یہ بات نہیں کھولے گا۔"

ہمت کر کے اس نے نبیل کو تسلی دی۔ نبیل گم صم رہ گیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے صدف نے جس طرح سب سنبھالا ہوا تھا اس کے بعد اس کی صدف سے ساری شکایتیں ختم ہو گئی تھیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ اسے صدف کے پہناوے اور اطوار سے ابھی بھی چڑ تھی پھر بھی یہ کوئی ایسی وجہ نہیں تھی جس کی وجہ اسے اتنی بڑی سزا دیتا۔

کہنے کو یہ صرف دستخط تھے جو اس نے ان کاغذات پر کیے تھے۔۔۔ در حقیقت یہ ایک رشتہ تھا جو اس نے اپنی رضا سے قائم کیا تھا۔ شمائل' شہریار کی پسند اور اس کی ایسی نیکی بننے جا رہی تھی جس نے آغاز میں ہی احساس جرم سے اس کے کندھے جھکا دیے تھے۔ اسے عجیب سے احساسات نے گھیر لیا تھا۔ اس کے اعصاب چیخ رہے تھے۔ سوچوں کے دہکتے الاؤ نے دوپہر ہونے تک

اس کا جو جلانا شروع کر دیا تھا۔ پی اے کو بتا کر وہ آفس سے گھر کے لیے نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا اس فاش بے ایمانی کے بعد وہ کیسے صدف کا سامنا کرے گا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ فی الحال سب بھول بھال کر نیند کی آغوش میں پناہ لینا چاہ رہا تھا۔

گھر پہنچ کر گھنٹی بجانے کے بجائے اس نے گاڑی سے نکل کر ماسٹر کی سے دروازہ کھولا اور اندر آگیا۔ وہ سوچ رہا تھا گاڑی بعد میں اندر کرلے گا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس کی نظر دروازے سے کچھ پرے پارسل نما ایک پیکٹ پر پڑی۔ اس نے قریب جا کر اسے اٹھایا اور لے کر اندر آگیا۔ چلتے چلتے اس نے پیکٹ کو کھولا ایک موبائل اور تہ شدہ کاغذ تھا۔ کچن سے برتنوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ صدف کو چائے کا کہنے کے لیے وہ کچن میں ہی چلا آیا۔ تب تک تہ شدہ کاغذ کھول کر وہ اس کی تحریر پڑھ رہا تھا۔ شدید طیش کے عالم میں اس نے مٹھی میں کاغذ بھینچ لیا۔ تب ہی اس کی نظر پیٹھ موڑے کام کرتے ہوئے اس نسوانی وجود پہ پڑی جو صدف نہیں تھی۔ تب ہی اس نے رخ موڑا۔ حوریہ نے دیکھا وہ دروازے میں بت بنا کھڑا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"اوہ۔۔۔ اب میں سمجھا' تمہارا بے غیرتی نامہ اور ضمیر کی قیمت پر حاصل کیا یہ موبائل یہاں کیا کر رہا ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی' نبیل نے موبائل کا ڈبا اور رقعہ اس کے منہ پر دے مارا۔ ابھی وہ اسی سے نہیں سنبھلی تھی کہ نبیل نے ہاتھ مار کر چولہے پر رکھی ہنڈیا نیچے پھینک دی۔ ابلتا ہوا شوربہ حوریہ کی پنڈلی پر گرا تو بے ساختہ اس کی چیخیں نکل گئیں' پورا گھر گونج اٹھا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر میں آکر میری چیزیں چھونے اور ناپاک کرنے کی؟ بد ذات۔۔۔ غلیظ۔۔۔ بد کردار۔" مغلظات بکتے ہوئے وہ اس کی تکلیف کی پروا کیے بغیر اس کے اوپر تھوک گیا تھا۔

سر جھکا ہونے کی وجہ سے تھوک اس کے ماتھے پر گرا تھا۔ اس کی چیخیں اندر ہی گھٹ گئی تھیں۔ وہ مڑا تو اس کے عین پیچھے صدف اور کچھ فاصلے پر مومنہ بھابھی کھڑی تھیں۔

"میرا بس چلتا تو اسے زندہ جلا دیتا۔ جن لڑکیوں کو والدین اور اپنی عزت کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ رحم کے قابل نہیں ہوتیں۔"

مومنہ بھابھی کی طرف منہ کر کے کہتے ہوئے اس نے کندھے سے پکڑ کر صدف کو پرے کیا اور کمرے میں چلا گیا۔ دونوں تیزی سے آگے بڑھیں۔ مومنہ بھابھی نے سہارا دے کر اسے اٹھایا لیکن وہ بنا کسی سہارے کے بہتے آنسوؤں کے ساتھ درد سہتے ہوئے کچن سے نکل کر اپنے پورشن کی طرف چلی گئی۔ "میں نبیل کی گاڑی دیکھ کر حوریہ کو بلانے آئی تھی۔" صدف کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہتے ہوئے وہ بھی حوریہ کے پیچھے چلی گئیں۔ صدف نے لپک کر وہ مڑا تڑا کاغذ اٹھایا۔

"میری جان حوریہ۔۔۔ میری حور۔"

طرز تخاطب سے ہی صدف کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ بقیہ تحریر بھی فحش گوئی اور گھٹیا قسم کے اشعار سے بھری پڑی تھی۔

"اللہ۔۔۔! یہ سب نبیل نے پڑھ کر کیا سوچا ہوگا۔" رقعہ تلف کر کے موبائل اس نے کچن کیبنٹ میں چپکے سے چھپا دیا تھا۔ کمرے میں آئی تو نبیل نہیں تھا' سو وہ بھی مومنہ بھابھی کی طرف چلی گئی۔ تکلیف کی شدت سے برا حال ہونے کے باوجود بھی حوریہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

اس کے چہرے پر پتھریلے سے تاثرات تھے۔ آنکھوں میں عجیب طرح کا سکون تھا۔ صدف نے اس کی ہمت کی داد دی۔ مومنہ بھابھی نے فون کر کے سعید بھائی سے میڈیسن منگوائی تھی۔ اس کی سفید بے داغ پنڈلی کا نچلا حصہ بری طرح جلا تھا۔ ساری جلد جل کر اتر گئی تھی۔ مومنہ بھابھی نے زبردستی اسے دوائی لگائی تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ سعید بھائی پوچھ

رہے تھے کہ یہ سب ہوا کیسے۔ دوسرے کمرے میں جا کر صدف نے خوب مسالا لگا کر داستان بیان کی تو سعید بھائی بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ حوریہ ایسا کر سکتی ہے۔ یہی حال پاپا کا بھی تھا۔ شام کو جب وہ آئے تو صدف ہی نے ان کے ساری کہانی گوش گزار کی تھی۔

"نبیل کہہ رہے تھے کہ وہ دوبارہ اس کا سایہ بھی نہیں پڑنے دینا چاہتے۔ جتنی جلدی ہو سکے اسے یہاں سے نکالیں ورنہ وہ ہمیں لے کر کہیں اور شفٹ ہو جائیں گے۔"

پاپا کی حالت سے بے خبر وہ بول رہی تھی۔ پاپا ایک مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے۔ حوریہ پڑھنے جاتی تھی پڑھانے جاتی تھی لیکن ایسی کسی سرگرمی میں وہ انوالو ہے' یہ وہ نہیں جانتے تھے۔ وہ خود کو مجرم تصور کر رہے تھے۔ حوریہ نے نہ صرف ان کا سر جھکایا تھا بلکہ نبیل کے الزامات کو سچ ثابت کر کے انہیں رسوا بھی کیا تھا۔

"پاپا! جتنی جلدی ممکن ہو حوریہ کی شادی کر دیں۔ یہی اس مسئلے کا واحد حل ہے۔" اتنی محبت اور نرمی سے بولنے والے سعید بھائی کی زبان سے یہ جملے سن کر پاپا مزید زمین میں دھنس گئے تھے۔ اسی لمحے کھلے دروازے سے لنگڑا کر چلتی وہ اندر داخل ہوئی۔

"پاپا...! اگر آپ مجھ پر اعتبار رکھتے ہیں تو یقین کر لیں کہ میرا اس سب سے کوئی واسطہ نہیں۔"

پاپا نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ کچھ بولے ہی نہیں۔ وہ کچھ دیر خود پر جبر کر کے کھڑی رہی۔ مگر صرف ایک خاموشی۔ جو اس بات کا واضح اعلان تھی کہ کسی کو اس پر یقین نہیں۔ وہ چپ چاپ انیکسی میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

چھوٹی سی لائبریری میں سنگل بیڈ پر دراز وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ لائبریری اس نے بہت چاہت سے بنائی تھی۔ اصل میں یہ امی کا کمرہ تھا۔ پاپا سے ناراض ہو کر وہ اسی کمرے میں رہتی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد جب ان کی شادیوں کی باری آئی تو پاپا نے پورشنز الگ بنوا دیے تھے۔ تب اس نے اس کمرے کو لائبریری کی شکل دی تھی۔ قدِ آدم شیشے کی کھڑکیوں پر گہرے اور دبیز پردے تھے۔ ہم رنگ قالین پر چوبی الماریاں ایک قطار میں لگی تھیں۔ الماریوں میں بنے ریکس پر مختلف موضوعات پر کتابیں رکھی تھیں۔ کبھی کتابیں اس کا جنون ہوا کرتی تھیں۔ پھر شادی کے بعد عجیب ہی ماحول بن گیا تو دو دو مہینے تک لائبریری نہیں آتا تھا۔ پڑھنے کے لیے مکمل یکسوئی اور ذہنی سکون بہت ضروری تھا جو فی الحال اسے میسر نہیں تھا۔

آج وہ ادھر پڑھنے نہیں بلکہ سکون کے لیے آیا تھا۔ بلا وجہ کروٹیں بدلتے رہنے پر بھی نیند نہیں آئی تو وہ اٹھ کر الماری کے نزدیک آگیا۔ تب ہی اس کی نظر میز پر پڑی اک کتاب پر پڑی۔ وہ ادھر کرسی پر بیٹھ کر کتاب دیکھنے لگا۔ شاعری کی کتاب تھی۔ عذاب دید۔ محسن نقوی کی یہ کتاب پڑھنا اس کی حسرت ہی تھی۔ پتا نہیں یہ کتاب کہاں سے آئی تھی۔ اس کے پاس تو یہ کتاب تھی ہی نہیں۔ کتاب کے پہلے ورق پر اک کونے میں اک مخصوص انداز میں ایس لکھا ہوا تھا۔ انداز تحریر دیکھا دیکھا تھا لیکن کچھ یاد نہیں آیا تو کتاب اس نے واپس رکھ دی اور باہر نکل آیا۔ صدف مومنہ بھابھی کی طرف سے ابھی آئی ہی تھی۔

"صدف لائبریری میں ایک کتاب پڑی ہے جو میری نہیں۔ کہاں سے آئی ہے اور کس کی ہے۔"

"کون سی؟"

وہ اندر مڑ گیا تو وہ بھی پیچھے ہی چلی آئی۔ "یہ والی۔" نبیل نے کتاب اس کی طرف بڑھائی۔ نئی کتاب تھی۔ صدف نے بغور دیکھا۔

"یہ میں لائی تھی آپ کے لیے۔ شادی سے پہلے آپ کو شاعری اور کتابوں کا شوق ہوا کرتا تھا نا اس لیے۔" دو چار ورق پلٹ کر اس نے کتاب نبیل کے ہاتھ میں دے دی۔ سر ہلا کر نبیل نے کتاب واپس رکھ

دی۔
"چائے بنادوں آپ کے لیے؟"
"ہاں پلیز۔۔۔ اور آتے ہوئے ایک گلاس پانی بھی لادینا۔" وہ چلی گئی تو وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔

☆ ☆ ☆

اگلے چند دن اس کی زندگی کے مشکل ترین دن تھے۔ گھر میں جو عارضی سکون تھا اسے یہ اندازہ لگانے میں وقت نہیں ہوئی کہ وہ حوریہ کی وجہ سے ہی تھا۔ ایک بار پھر وہی چیخ چیخ بخ بخ۔ پھر وہی گرد آلود ویران سا گھر، وہی بے ترتیبی اور وہی بے سکونی تھی۔ دوسرا وہ شمائل سے نکاح کی وجہ سے بھی الجھا ہوا تھا۔ یہ وہ بار تھا جو سوتے میں بھی اس کے اعصاب پر سوار رہتا تھا۔
آج کافی دن بعد شہریار آیا تھا۔ "میں آفس کے کام سے اسلام آباد جارہا ہوں۔ کوئی پتا نہیں کب واپسی ہو۔ سوچا ملتا چلوں۔"
"اچھا کیا آگئے۔ میں خود رابطہ کرنے والا تھا۔" پیون کو انٹرکام پہ چائے کا کہہ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں سوچ رہا تھا شمائل والا معاملہ اب نمٹ جانا چاہیے۔ بلاوجہ کی ٹینشن بنی ہے میرے لیے۔"
"اوہ ہاں یاد آیا تھوڑے دن پہلے میرا رابطہ ہوا تھا۔ وہ بھی یہی چاہ رہی تھی کہ اب بلاوجہ طول دینے کے بجائے اس قصے کو ختم کیا جائے۔"
"ہوں۔۔۔ تو پھر اس سے بات کرو۔ بتاؤ کیا کہتی ہے۔"
"نہیں' ایسا کرو تم اس کا فون نمبر لے لو اور خود بات کر لینا۔ مجھے پتا نہیں اتنا وقت ملے یا نہ ملے تم دونوں معاملات طے کر کے مجھے بتا دینا۔ کاغذی کارروائی بعد میں ہوتی رہے گی۔"
"نہیں یار' کاغذی کارروائی بھی ساتھ ہی نمٹ جائے تو میں ریلیکس ہو جاؤں گا۔" نبیل نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے کہا۔
"چلو جیسے تمہاری مرضی میں تو تمہاری سہولت کے لیے ہی کہہ رہا تھا۔" چائے پی کر شمائل کا نمبر لکھوا کر وہ چلا گیا تو نبیل نے اسی وقت وہ نمبر ملایا۔ کال جارہی تھی۔ تھوڑی دیر میں کال ریسیو ہو گئی۔
"السلام علیکم۔۔۔" ایک مہذب اور شائستہ آواز ایئرپیس سے ابھری تو اس کا دل بے قابو ہو گیا۔ اس نے فوراً" کال کاٹ دی۔ اس کی دھڑکن بلاوجہ تیز ہو رہی تھی۔ فون کے دوسری طرف موجود لڑکی اس کے لیے اجنبی سہی لیکن شرعی لحاظ سے محرم تھی۔ پہلی بار اس رشتے کے لطیف احساس نے اس کا دل چھوا تھا۔ خود پر قابو پا کر اس نے پھر فون ملایا۔
"السلام علیکم!" پھر وہی انداز اور الفاظ۔
"وعلیکم السلام۔۔۔ نبیل بات کر رہا ہوں۔" سلام کا جواب دے کر کچھ وقفے سے اس نے اپنا تعارف کروایا۔
"جی۔۔۔ کہیے؟" وہ لا جواب ہوا۔ شہریار نے اسے بتایا نہیں ہو گا اس نے سوچا۔
"شہریار نے نمبر دیا تھا آپ کا۔۔۔ آپ کے گھر آنا چاہتا ہوں۔ آئی مین کب تک آپ کے گھر آؤں؟" اس نے قدرے اختصار سے بات مکمل کی۔ اک گہری سانس کی آواز فون میں سے ابھری۔ اس کے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ "جب آپ آسانی سے آسکیں۔ دن بتادیں میں آپ کو وقت بتادوں گی اور ایڈریس بھی دے دوں گی۔" اس کی آواز میں کچھ تو تھا جو نبیل بے چین ہو رہا تھا۔
"رائٹ۔۔۔ ویسے آپ اگر کچھ دن ویٹ کر لیں تو مجھے آسانی ہو گی۔ بس مجھے تھوڑا سا وقت چاہیے۔ تو میک مائی مائنڈ۔" جانے کیسے اس کے ہونٹوں سے نکلا ورنہ وہ تو جلد از جلد اس ٹینشن سے چھٹکارا چاہتا تھا۔
"دین ٹیک یور ٹائم مجھے بتادیجیے گا۔ نمبر تو اب آپ کے پاس ہے ہی۔"
"شیور۔ ویسے اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اس کاغذی رشتے کی زندگی تک آپ اس سے رابطے میں رہ سکتا ہوں؟"
"کیوں؟" وہ جی بھر کر حیران ہوئی تھی۔ اس کی آواز سے ظاہر تھا۔

"نہیں اگر آپ کو کوئی پرابلم ہے تو رہنے دیں۔"
"نہیں پرابلم تو کوئی نہیں بس ذرا ان ایکسپکٹڈ بات تھی تو حیران ہو گئی تھی۔"
"چلیں میں فری ہو کر بات کرتا ہوں۔ کچھ ڈیٹیلز چاہئیں مجھے۔ ٹھیک ہے پھر بات ہوگی ان شاء اللہ۔"
"ویسے آپ کو شکریہ کہنا چاہتی تھی آپ نے میری ہیلپ کے لیے اتنا بڑا اسٹیپ لیا۔" وہ مشکور تھی۔
"نہیں ایسی کوئی بات نہیں اصل میں، میں خود سوتیلے رشتوں کو جھیل چکا ہوں اور جھیل رہا ہوں... بس اسی لیے آپ کا احساس دل میں جاگا تھا۔ میں تو مرد ہوں۔ اوہنلی پروٹیسٹ کر سکتا ہوں۔ آپ کی پوزیشن کا اندازہ کر کے ہی یہ اسٹیپ لیا تھا میں نے۔"
"بہر حال یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ خیر اللہ حافظ۔"
"اللہ حافظ۔"

فون بند کر کے اس نے ایک گہری سانس اندر کھینچی۔ اس گفتگو نے اس کو ترو تازہ کر دیا تھا۔ وہ گفتگو کو طول دینا چاہتا تھا پھر جانے کیوں خود ہی مختصر کر دیا۔

شہریار سے جب اس کی دوستی ہوئی تھی تب سے تاحال وہ اسے شمائل کے بارے میں چھوٹی چھوٹی باتیں بتا کر اس کا گرویدہ کر چکا تھا۔ شمائل کے والد کی وفات کے بعد اس کی والدہ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ شمائل کی خودداری نے ان سے لے کر کبھی اپنی ذات پر خرچ کرنا مناسب نہیں جانا تھا سو اس نے پہلے گھر میں بچوں کو ٹیوشنز پڑھانا شروع کر دیا پھر مقامی اکیڈمی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ مضبوط کردار کی حامل شمائل ذہین بھی بہت تھی۔ ہر کلاس میں اس کا رزلٹ شاندار رہا تھا۔ شہریار بتاتا رہتا تھا اسے شمائل کی کامیابیوں کے بارے میں۔

نبیل میں اور اس میں کافی کچھ مشترک تھا۔ حتیٰ کہ کسی حد تک ان کے حالات بھی مماثلت رکھتے تھے۔ اگر پاپا کی ضد میں وہ صدف کو نہ بیاہتا تو شمائل یا شمائل جیسی کوئی اس کے گھر میں ہوتی۔ وہ ایسی لڑکی کو ہی آئیڈیلائز کر سکتا تھا۔ باوقار ذہین، ادبی اور کامیاب... قسمت نے اگر ان کا میل کروایا بھی تھا تو عارضی۔ وہ اس رشتے کو مستقل نہیں رکھ سکتا تھا۔ دوسری عورت کا عذاب وہ دعا پر مسلط نہیں کر سکتا تھا۔

جو بھی تھا شمائل سے بات کر کے اسے، بہت اچھا لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کین آئی کال یو؟" موبائل اسکرین پر میسج نمودار ہوا۔ اس نے پڑھ کر جواباً" نو لکھا۔ اس کے ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔ فوراً" ہی نمبر ملا کر اس نے فون کان سے لگالیا۔
"السلام علیکم۔"
"وعلیکم السلام۔"
"کیسے ہیں آپ؟" رسمی سا لہجہ تھا۔
"میں ٹھیک... آپ کیسی ہیں؟"
"جی الحمدللہ... معافی چاہتی ہوں بے وقت تنگ کیا لیکن بس کام ضروری تھا اس لیے تکلیف دی۔"
"چلیں آپ نے کسی قابل تو جانا... کہیں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے؟" وہ خوش دلی سے گویا ہوا۔ یہ جانے بغیر کہ اس کی خوش دلی شمائل کو الجھن میں مبتلا کر گئی ہے۔
"شہریار سے رابطہ ہے آپ کا؟ میرا مطلب موبائل کے علاوہ کوئی رابطہ نمبر ہے؟" بڑا نپا تلا سا لہجہ تھا۔ جیسے ناپ تول کر بول رہی ہو۔ نہ اخلاق سے اوپر نہ کچھ نیچے۔
"نہیں موبائل پر ہی ہے... کیوں کیا ہوا؟ خیریت؟" لائبریری سے نکل کر وہ سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔
"خیریت تو ہے۔ بس ضروری کام تھا اس سے۔"
نبیل کو لگا وہ فون بند کرنے والی ہے۔
"تو آپ مجھے بتادیں شاید میں کسی کام آجاؤں۔"
"نہیں شکریہ۔ اللہ حافظ۔" قطعیت سے کہتے اس نے فون کاٹ دیا۔
شمائل کو اس کے لہجے کی خوشگواریت، بے تکلفانہ رویہ بہت کھل رہا تھا۔ شہریار نے تو کہا تھا

بہت محتاط قسم کا بندہ ہے۔ کہیں وہ ہمارے پیپر ریلیشن کی بنیاد پر ڈیمانڈ تک تو نہیں ہو رہا۔ یہ سوچ ہی اسے دہلا دینے کے لیے کافی تھی۔ تب ہی دوبارہ فون بج اٹھا۔ اس نے دیکھا نبیل کالنگ کے الفاظ جل بجھ رہے تھے۔

"جی کہیں کیا بات ہے۔" اس کا لہجہ خود بخود اکھڑ ہو گیا۔ نبیل نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اسی لیے محتاط انداز سے بات شروع کی تھی۔

"بات تو کچھ نہیں 'صرف آپ سے جاننا چاہ رہا تھا کام کیا ہے۔ میں ہیلپ کر سکتا ہوں۔" دوسری طرف بالکل خاموشی تھی۔ "میں نہ تو ٹین ایج ہوں اور نہ ہی میرا ارادہ آپ سے فلرٹ کرنے کا ہے۔ میں خود ایسے حالات فیس کر چکا ہوں 'جب میرے پاس خدائے واحد کے علاوہ کوئی سہارا نہیں تھا لیکن میں مرد ہوں معاشرے میں اپنا مقام پانے کے لیے جدوجہد کر سکتا ہوں۔ آپ کے لیے یہ سب اتنا آسان نہیں ہو گا۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ مشکل ہو گا۔ اور ایک بات۔۔۔ آپ کے کام آنا میرا اخلاقی ہی نہیں شرعی فرض بھی ہے۔ چاہے ہمارا رشتہ کاغذی سہی پھر بھی "ہے"۔" اس نے "ہے" پر زور دیا۔

"میں آپ سے ریٹرن میں کچھ مانگوں گا نہیں۔ وہ جائز حق بھی نہیں جو آپ خود ان پیپرز پر سائن کر کے قبول کر چکی ہیں۔ باقی میں آپ کی سوچ پر چھوڑتا ہوں کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچتی ہیں۔ مجھ پر نہ سہی شہریار پر تو اعتماد ہے نا؟ تب ہی تو اتنے بڑے فیصلے کے لیے آپ نے اس سے مدد چاہی۔۔۔ تو اس پر ہی اعتبار رکھیں کہ اس نے آپ کو غلط شخص کو نہیں سونپا۔" اس کی وضاحت پر شائل جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔

"میرے گریز' میری احتیاط کو بیا نہیں آپ نے کیا سمجھ لیا ہے۔ جن حالات سے میں گزر رہی ہوں محتاط رہنا میرے حق میں اس سے بہتر ہے کہ بے احتیاطی سے میں خود پر کوئی داغ لگواؤں۔ مجھے دنیا کا ڈر نہیں کیونکہ کل جب ایک شخص میرے شوہر ہونے کا دعوا کرے گا تو مجھ پر بہت سی انگلیاں بھی اٹھیں گی اور میرے کردار پر کیچڑ بھی اچھالا جائے گا۔ میں صرف اپنے ضمیر کی عدالت میں سرخرو ہونا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی ایک شوہر' ایک باپ سے میرا تعلق اس طرح کا ہو کہ جائز اور شرعی ہوتے ہوئے بھی میں ایک بیوی' ایک بچے کی مجرم بن جاؤں۔" نبیل چپ ہو گیا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ۔ وہ اس کے کردار کا معترف ہوا تھا۔ "اب آپ بتا دیں کام کیا تھا۔"

"شہریار کے پاس میرے ڈاکومنٹس اسکین کیے ہوئے ہیں۔ میں نے اخبار میں ویکنسی دیکھی ہے۔ کل اپلائی کرنے کی لاسٹ ڈیٹ ہے۔ نہ کمپیوٹر ہے نہ نیٹ۔ میں نے سوچا شہریار سے کہہ دیتی ہوں لیکن اس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔"

"اوہو۔ یہ تو واقعی برا ہوا۔ میں کچھ کر سکتا ہوں تو بتائیں۔ مجھے اپنے ڈاکومنٹس دے دیں۔"

"اس وقت؟" شائل نے اس کی بات کاٹی۔ "باہر آسمان پر اوائل تاریخوں کا چاند جگمگا رہا تھا۔ نرم ہوا درختوں کے پتوں سے سرگوشیاں کرتی مسکرا رہی تھی۔ وہ اک لمحے کو کھو سی گئی۔ اپنے آنگن میں لگا امرود کا پیڑ اسے بری طرح یاد آگیا۔ وہ پیڑ جس پر ابو نے اسے جھولا ڈال کر دیا تھا۔ گھر کا کچا وسیع صحن اور اس میں لگے پودے۔۔۔ ماضی نے اک معصوم بچے کی طرح اس کا دامن تھام لیا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں۔۔۔ بس اک شجر سایہ دار یاد آگیا تھا۔"

"جب سورج کی طرح قہر برساتے لوگ ہوں تو یوں ہی ہوا کرتا ہے۔"

"نہیں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ اس کی بات سمجھ گئی تھی۔ "یہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ اتنے ہی اچھے جتنے میرے یا آپ کے والدین ہمارے ساتھ ہو سکتے تھے۔ اپنے خونی رشتوں کے ساتھ بہت اچھے ہیں۔ خود اپنے لیے اچھے ہیں۔ بہ حیثیت انسان۔۔۔ سب اچھے ہیں۔ بس مجھ سے مطابقت نہیں ان کی۔"

"مطابقت؟ کیسی مطابقت؟" اسے شمائل سے گفتگو میں لطف آرہا تھا۔

"جب دو لوگ جدا ہوتے ہیں تو کہیں نہ کہیں وہ کسی اور کے ساتھ بس جاتے ہیں۔ کیونکہ آپس میں مطابقت نہیں تھی لیکن کہیں اور مطابقت پالینے کے بعد اپنی تمام برائیوں اچھائیوں سمیت چاہے جاتے ہیں' سراہے جاتے ہیں۔ کسی طرح مطمئن کرتے اور ہوتے ہیں۔ بس۔۔۔ اسی طرح اگر ان کی مجھ سے مطابقت نہیں تو میں ان پر برے ہونے کا لیبل تو نہیں لگاسکتی ناں۔" وہ بے حد متاثر ہوا تھا۔ کیسے وہ ان لوگوں کو اچھا قرار دے رہی تھی جن کی وجہ سے وہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوئی تھی۔

بات سے بات نکلی تو بہت دور تک گئی۔ اس ٹھنڈی رات نے چاند کی مدھم روشنی میں انہیں دیکھا۔ نبیل چھت پر ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ کبھی زیر لب مسکراتا تو کبھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑتا۔ شمائل کبھی بے خودی میں بال کھول کر انگلیاں چلانے لگتی تو کبھی جھینپ کر بال باندھ لیتی۔

کوئی موضوع نہیں تھا۔ کوئی عنوان نہیں تھا۔ پھر بھی ساری رات باتیں ختم نہیں ہوئیں۔ صرف اسی رات پر بس نہیں ہوئی۔ آنے والی کتنی راتیں ایسی ہی تھیں۔ بے شمار باتیں۔۔۔ صبح سے رات تک زندگی سے موت تک۔ نواز شریف کی سیاست سے عمران خان کے دھرنے تک۔ ہارون رشید کے تبصرے سے حسن نثار کے کالم تک' مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے سے ہاشم ندیم کے ناولز تک' جسٹن باربر سے میڈونا کے گانوں تک۔ ہر بات پر بات کی تھی انہوں نے۔ نہیں بات کی تھی تو وہ تھی محبت۔

پروین شاکر کی "خوشبو" کی طرح محبت ان کے دلوں پر نازل ہو چکی تھی۔

دونوں بے خبر' خوش اور بہت خوش تھے۔ نبیل نے اب صدف اور اس کی حرکتوں پر چڑنا چھوڑ دیا تھا۔ شمائل نے بھی اپنے حالات کو سوچنا چھوڑا ہوا تھا۔ اس کے سوختہ من پر محبت اک ٹھنڈی میٹھی پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ سترہ اٹھارہ کی عمر میں جو خواہش من میں کلیوں کی مانند چٹکتی ہے' وہ اب تیس سال گزرنے کے بعد دل آنگن مہکار رہی تھی۔ اب آئینے میں اپنا عکس بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ حالات کی کرختی بھی اب دکھتی نہیں تھی۔

اک محبت نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ ساری محرومیاں' ناانصافیاں۔۔۔ ڈگریوں پر اے پلس کے نشان سے زیادہ خوشی اسے اس محبت نے دی تھی جس کے اظہار' اعتراف اور اقرار سے دونوں گریزاں تھے۔

لیکن کب تک۔۔۔

جو کچھ میں کہہ نہیں سکتا اسے میں فرض کرتا ہوں
چلو میں فرض کرتا ہوں' مجھے تم سے محبت ہے

نبیل کو ایک دوست نے یہ شعر میسج کیا تھا اس نے شمائل کو فارورڈ کردیا۔ پھر کچھ دیر جواب کا انتظار کر کے اسے کال کی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" "میسج پڑھا میرا اس نے؟" چھوٹتے ہی پوچھا۔

"جی۔۔۔ پڑھا۔" بڑا مختصر جواب تھا۔

"پھر اب۔"

"کیا؟"

پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ کیا سننا چاہ رہا تھا۔

"میں یہ فرض نہیں کرسکتا۔ جانتی ہو کیوں؟"

"آپ خود بتادیں۔" دونوں کی دھڑکنیں ایک ہی لے پر دھڑک رہی تھیں۔

"کیونکہ۔۔۔ حقیقت کو فرض نہیں کیا جاسکتا۔۔۔ شمائل۔۔۔" اس کا لہجہ خوابناک ہوا تھا۔

"جی۔۔۔" جذبوں سے بوجھل آواز۔۔۔ نبیل بے خود ہوا جارہا تھا۔

"بہت پیار کرتا ہوں تم سے۔۔۔ تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ میری قسمت تو بن گئی ہو۔ مجھے کبھی تنہا مت کرنا۔ میرا اندر مرچکا تھا۔ تم نے جلا بخشی ہے اب تم ہی مجھے مت مار دینا۔ میں محبت کے نام سے 'محبت لفظ کی چاشنی سے ناآشنا تھا لیکن تم نے مجھے نہ صرف

محبت سے روشناس کروایا بلکہ۔۔۔ شمائل۔۔۔" بات ادھوری چھوڑ کر اس نے شمائل کو پکارا۔ "میری ہو جاؤ پلیز۔ بس میری۔" وہ جیسے قدموں میں گرنے کو تھا۔

شمائل کے کانوں کی لوئیں تپ اٹھی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا اک لمحہ تاخیر کے بغیر اپنا وجود اس سائل کی جھولی میں ڈال دے جس کی یہ خود سوالی تھی۔ اتنی شدید محبت تو اس نے نہ مانگی تھی نہ چاہی تھی شاید اس نے خود ہی فرض کرلیا تھا کہ محبت اس کے لیے ہے ہی نہیں۔ اقرار ہونے کو تھا۔ اک سوچ کے زہریلے ناگ نے ان کی نئی نویلی محبت کو ڈس لیا تھا۔

"میں وہ بدبخت ہوں جسے صحرا جیسی زندگی میں نخلستان میسر تو آیا لیکن میں تاعمر ٹھہر نہیں سکتی کیونکہ قافلہ حیات کا المیہ ہے 'یہ کبھی بھی من چاہی جگہ نہیں ٹھہرتا۔ میں آپ کی محبت قبول نہیں کر سکتی۔ میں غاصب نہیں کہلوانا چاہتی۔"

"تم غاصب نہیں ہو شمائل۔ تم ملکہ ہو میرے دل کی۔ میں تمہیں ایسی جگہ چھپا کر رکھوں گا۔ جہاں گرد آلود ہوا بھی تمہیں چھو کر میلا نہیں کر سکے گی۔" وہ بے تابی سے بات کاٹ کر بولا۔

"آپ نہیں جانتے" دوسری عورت کی اولاد" کتنا تکلیف دہ تعارف ہے۔ میں یہ تعارف اپنی آنے والی نسل کو تحفہ دے کر روایت نہیں ڈالنا چاہتی۔ میں نے اس تعارف کو اپنی جان پر کئی سال جھیلا ہے۔

میری ماں کمزور عورت نہیں تھی۔ وہ مجھے تنہا سنبھال سکتی تھی لیکن بھلا ہو انکل کا۔ میری ماں کے کلاس فیلو اور میری ماں کی محبت میں مبتلا رہ چکے تھے۔ میری ماں کی عدت کے بعد سے انہوں نے دہلیز ہی پکڑلی تھی میرے ماموں۔ خالائیں سب امی کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے تب انکل کی مرحوم بیوی ہمارے گھر آئیں۔ مجھے آج بھی ان کے الفاظ یاد ہیں۔ انہوں نے امی سے کہا۔

"میں نے بڑوں کے فیصلے کے آگے سر جھکا کر اپنی آدھی زندگی بے رنگ گزار دی ہے اور آنے والی آدھی زندگی میں بھی کوئی رنگ نظر نہیں آرہے لیکن میں چاہتی ہوں میرے ہم سفر کی زندگی میں اس کی مرضی کے گلاب کھلیں تاکہ جب سود و زیاں کا حساب کرنے بیٹھیں تو میرے حصے میں سے یہ پچھتاوا کم ہو جائے کہ میں نے انہیں خوشی نہیں دی۔

وہ بلاشبہ عظیم عورت تھیں جو اپنا شوہر بانٹ کر نہیں گئی تھیں بلکہ بخوشی پورے کا پورا امی کو سونپ گئی تھیں۔

امی کی شادی کے بعد ان کی پہلی بیوی نے بڑے چاؤ سے ہمیں گھر بلایا اور پھر ان کی اولاد نے جو عزت دی۔ مرتے دم تک نہیں بھول سکتی۔ ایسی ذلت سے تو موت بہتر تھی۔ میں آٹھ یا نو سال کی عمر میں سب محسوس کر رہی تھی تو میری ماں نے کیا کچھ نہ سہا ہوگا۔ پھر میں نے اپنی ماں کو مطمئن تو دیکھا لیکن خوش نہیں دیکھا۔ میں اپنی ماں جتنی بہادر نہیں ہوں۔" وہ بلک بلک کر رو دی۔

آج پہلی بار اس نے اپنا ماضی کھولا تھا۔ نبیل کا وجود شل ہو رہا تھا۔ اوہ خدا یہ اک خواب ہو۔ بھیانک خواب۔ آنکھ کھلے تو سب ٹھیک ہو۔ بھیانک حقیقت سے سامنا ہونے پر ہر شخص کی طرح وہ بھی عجیب خواہش کر رہا تھا۔

"حوریہ۔۔۔" بڑے خوف زدہ ہو کر اس کے منہ سے سرسراہٹ کی طرح یہ نام نکلا اور جواباً "جی" سن کر اس کے تمام بدترین خدشات درست ثابت ہو گئے لیکن پھر بھی وہ یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا یہ جانے بغیر کہ غلط فہمی میں تو وہ آج تک گرفتار تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ "جتنی جلدی ہو سکے نیکی مکمل کر کے مجھے آزاد کریں۔ نیکی کا اجر اللہ دے گا۔ میں کچھ نہیں دے سکتی۔ پلیز منزلیں جدا ہیں تو بہتر ہے جلد از جلد راستے بھی الگ کر لیے جائیں۔" اس نے فون بند کر دیا تھا۔

وہ اسی طرح فون کان سے لگائے غائب دماغی میں بیٹھا رہا۔ جانے کتنی دیر یوں ہی گزر گئی۔ انٹر کام پر

کروائی جانے والی میٹنگ کی یاد دہانی پر وہ ہوش میں آیا۔ جیسے تیسے میٹنگ نمٹا کر وہ وقت سے کافی پہلے گھر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

شیری نے اسے نکاح نامہ دیا تھا جو اس نے فائلز میں چھپا کر گھر میں رکھا ہوا تھا۔ وہ جا کر نکاح نامہ دیکھنا چاہتا تھا۔ جانے کیوں اس کا دل ماننے سے انکاری تھا کہ شمائل ہی حوریہ ہے۔ دونوں بالکل مختلف طرح سے اس کے ذہن میں امیج بنائے ہوئے تھیں۔ اب کیسے وہ ان دو تصویروں کو اک تصویر کا الگ رخ مان لیتا۔

گھر پہنچا تو پاپا کی گاڑی باہر کھڑی تھی اور سعید بھائی والے پورشن کا گیٹ بھی کھلا ہوا تھا۔ اس نے بھی اپنی گاڑی وہیں پارک کی اور اندر چلا گیا۔

"السلام علیکم!" لاؤنج میں داخل ہوتے اس نے بلند آواز سے سلام کیا۔ تیمور بھاگ کر اس کی گود میں چڑھ گیا۔

"وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو۔" مومنہ بھابھی نے اس کے لیے جگہ خالی کی۔

"نہیں بھابھی بس جا رہا ہوں۔ پاپا کی گاڑی دیکھی تو ادھر آ گیا۔ پاپا آج آپ جلدی آ گئے۔ خیریت؟"

"ہاں بس اک ضروری کام تھا اور تم بھی جلدی آ گئے۔ طبیعت ٹھیک ہے؟" وہ جانتے تھے نبیل بلاوجہ کام کو اگنور نہیں کرتا۔

"جی پاپا! بس ذرا سر میں درد ہے۔ تھوڑا ریسٹ کروں گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔" تیمور کو مومنہ بھابھی کو پکڑا کر وہ اندرونی گیٹ سے اپنے پورشن میں چلا گیا۔

"مجھے تو پریشان لگ رہا تھا۔ کچھ ورنہ معمولی سر درد پہ تو کام وام چھوڑ کر نہیں آتا۔"

"جی۔" پاپا کی رائے پر مومنہ بھابھی نے یک لفظی جواب پر اکتفا کیا۔

"یوں کرو تم جا کر پوچھو میری عمر کا لحاظ کر کے شاید پریشانی چھپا گیا ہے۔" پاپا نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی ہنس پڑیں۔

"جی بس کچن میں چولہا بند کر دوں تو پھر پوچھ آتی ہوں۔" وہ کچن کی طرف مڑ گئیں تو تیمور اور پاپا ٹل کر اسنیکس کھانے لگے۔

نبیل نے کمرے کا دروازہ کھولا تو صدف کمرے میں موجود نہیں تھی۔ البتہ دعا بیڈ پر سوئی ہوئی تھی۔ جوتے اتارنے کے لیے وہ بیڈ پر بیٹھا تو اس کی ہتھیلی تلے موبائل آ گیا۔ اس نے دیکھا۔ یہ وہی موبائل تھا جس پر چند دن پہلے ہنگامہ ہو چکا تھا۔ پر یہ موبائل تھا کس کا؟ حوریہ کا؟ اور اگر حوریہ ہی شمائل تھی تو وہ قسم کھا کے کہہ سکتا تھا کہ موبائل اس کا نہیں۔۔ اس نے موبائل چیک کرنا شروع کر دیا۔ کال ہسٹری میں ایک دو ہی نمبر تھے۔ میسجز کھولے تو وہ غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنی بے ہودہ زبان، واہیات پیغامات، چھچھورا انداز۔

بھیجی ہوئی تصویروں پر کھلے تبصرے تھے۔ اس نے سینٹ باکس کھولا۔ میسجز چھوڑ کر بھیجی جانے والی تصویریں کھولیں۔۔ غیرت کے مارے اس کا جی چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

موبائل کے پیچھے سے صدف کا چہرا ابھرا۔ "جلدی آ گئے آج آپ؟" اس کے ہاتھ میں موبائل پر توجہ کیے بغیر اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"میرے پاپا نے دوسری شادی کی تھی۔ یہ حق انہیں شریعت نے دیا تھا۔" غیر متعلقہ بات پر اس کی نظریں نبیل کی جانب اٹھیں اور پھر وہ پلکیں جھپکنا بھی بھول گئی۔ "آج تک میں ان کا یہ جائز رشتہ تمہیں قبول کر پایا۔۔ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تمہارے ناجائز تعلقات کے باوجود تمہیں اپنے گھر میں جگہ دوں گا؟ صدف بی بی! میں نبیل جاوید بقائم ہوش و حواس تمہیں اپنی زندگی سے بے دخل کرتا ہوں۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔" وہ ایک دم حرکت میں آئی تھی۔ دوڑ کر اس نے نبیل کے منہ پر ہاتھ رکھنا چاہا' لیکن اس نے پوری قوت سے اسے پرے دھکیل دیا۔ "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ ہاں میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔" وہ ہذیانی انداز میں چلا رہا تھا۔

صدف منہ پر ہاتھ رکھ کر بے ساختہ ابھرنے والی چیخیں دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر کھڑی مومنہ بھابھی سُن ہو کر رہ گئی تھیں۔ تب ہی نبیل کی نظر ان پر پڑ گئی۔

"بھابھی! اسے میری نظروں کے سامنے سے دور کریں۔ اسے کہیں یہاں سے دفع ہو جائے۔ بے حیا عورت۔ بغیر دوپٹے کے گندی تصویریں بنا کر غیر مردوں سے اپنی نسوانیت کی داد وصول کرتی ہے۔ فاحشہ... بھابھی اسے لے جائیں' میں اسے قتل کر دوں گا۔"

کہنے 'سننے' پوچھنے' بتانے کو بہت وقت پڑا تھا۔ نہیں واپس آسکتے تھے تو وہ الفاظ جو وہ ادا کر چکا تھا۔ بھابھی نے بیڈ سے لٹکتا دوپٹا اٹھا کر صدف کے سر پر ڈالا اور سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے اسے باہر کی طرف لے گئیں۔

اندر کی طرف مڑا تو نظر سوئی ہوئی دعا پر پڑ گئی۔ اس کا دل رو دیا تھا تو آنکھ کیوں نہ بہتی۔ اسے اپنے رد عمل پر ملال نہیں تھا۔ وہ کردار کے علاوہ ہر چیز پر سمجھوتہ کر سکتا تھا اور کر بھی رہا تھا۔ دعا کی آنے والی زندگی کبھی نارمل نہیں ہو گی' اس سوچ نے اس کا جگر چھلنی کر دیا تھا۔

شام تک صدف کے گھر والے آکر اسے لے گئے تھے۔ خاندان کے چند بڑوں نے اسے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کا کہا تھا' لیکن اس نے دو ٹوک جواب دیا۔ اگر غصہ نہ بھی ہوتا... کیوں نہ ہوتا؟ یہ ایسا کام تھا کہ کسی بھی غیرت مند کو غصہ آسکتا تھا۔ اسے بھی آیا... ہاں اگر اسے سوچنے کے لیے سو سال بھی دیے جاتے تو وہ یہی کرتا اور یہی اس نے کہہ بھی دیا تھا۔ مذہب میں کوئی گنجائش نکلتی بھی ہو تو اس کے دل میں ذرا بھی گنجائش نہیں تھی۔

اس نے کبھی صدف کے پھوہڑپن کے قصے زبان پر نہیں آنے دیے۔ اس کی کوتاہیاں نظر انداز کرتا رہا' لیکن کردار پر سمجھوتہ وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ کرنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ صدف کے ساتھ اس کا سارا سامان جو وہ جہیز میں لائی تھی وہ بھی چلا گیا تھا۔ کمرہ اجڑا اجڑا ویران لگ رہا تھا۔

دعا کو اس نے جانے نہیں دیا تھا۔ وہ اس وقت مومنہ بھابھی کے پاس تھی۔ خالی الذہن وہ اس وقت لائبریری میں ہاتھوں کے پیالے میں سر گھسائے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اک تسلسل کے ساتھ رونما ہونے والے واقعات کو سوچتے ہوئے اسے پھر سے حوریہ یاد آگئی تھی۔ کتنا کیچڑ اچھالا تھا اس نے اس کے کردار پر۔ اسے کتنی ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچائی تھی۔ بنا کسی ٹھوس ثبوت اس پر الزام لگایا۔ سب کی نظروں میں گرا دیا اسے' لیکن جسے قدرت نہ چاہے اس کو کون رسوا کر سکتا تھا کہ وہ اسی لڑکی کے قدموں پر جھک گیا جس کو وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ حوریہ شمائل سوچتے سوچتے اسے اس سے اپنا تعلق یاد آگیا۔

اٹھ کر اس نے مطلوبہ فائل کھولی اور اپنا نکاح نامہ نکالا۔ "حور شمائل" زیر لب اس نے نام لیا تھا پاپا کو بہت شوق تھا بیٹی کا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ نبیل کے بجائے اگر لڑکی ہوتی تو وہ اس کا نام حوریہ رکھتے اور پھر جب ان کی کلاس فیلو ... سے ان کی شادی ہوئی تو نبیل کو بتایا تھا کہ اللہ نے میری بیٹی کی کمی پوری کر دی وہ ان کے لیے حوریہ بن لے آئے ہیں۔ پھر جب پاپا اپنی نئی بیوی کو گھر لے کر آئے تو اس نے دیکھا تھا عمر میں اس سے کافی چھوٹی لڑکی اس عورت کے ساتھ تھی جو اس کے پاپا کی دوسری بیوی تھی۔

چہرے پر نرم مسکراہٹ جیسے اس کے چہرے کے ساتھ ہی چپکی ہوئی تھی۔ شفاف جلد اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے میں ملبوس وہ عورت اسے زہر لگی تھی۔ اس نے ایک نظر دیکھ کر ہی منہ پھیر لیا تھا۔

پاپا نے بڑے پیار سے اسے پاس بلایا تھا۔ "نبیل' آؤ بیٹا ملو حور سے۔ اپنی نئی ماما کو سلام کرو۔" تب اس نے جی بھر کر بدتمیزی کی تھی۔

"سڑک پر چلتی کسی عورت کو آپ اپنی بیوی تو بنا سکتے ہیں' لیکن میری ماں نہیں۔" نخوت سے کہہ کر اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اس عورت کے چہرے پر وہی مہربان مسکراہٹ تھی شاید وہ بچہ سمجھ کر

کر نظر انداز کر رہی تھی یا شاید وہ اس سب کے لیے تیار تھی جبکہ اس بچی کے چہرے پر تاریکی پھیلتے دیکھ کران کے دل کے کسی کونے میں سکون نازل ہوا تھا۔
"مائی فٹ" کہہ کر پیر پٹختے وہ ان کے قریب سے گزر گیا تھا۔

یہ اس کی حور شمائل سے پہلی ملاقات تھی جو آخری ٹھہری۔ اس کے بعد اس نے کبھی ان دونوں کو نہیں دیکھا البتہ اپنی ماں کو چھپ چھپ کر روتا ضرور دیکھا تھا۔ اس کی نفرت ان دونوں سے مزید بڑھ گئی۔ اس عورت نے اس کی ماں سے اس کا شوہر چھین لیا تھا۔ وہ صرف یہی سمجھ پاتا تھا۔ یہ تو اسے اب پتا چلا تھا کہ اس کی ماں نے خود اپنی خوشیاں پورے حق کے ساتھ اس عورت کو وان کی تھیں۔ اسے خبر نہیں کہ کیسے زندگی اتنی تیزی سے گزر گئی کہ اسے خود پتا نہیں چلا۔ کچھ عرصے پہلے اپنی ماں کھودی تھی تو اب حور شمائل بے آسرا ہو کر اس کے گھر آپڑی تھی۔
ماں کو کھودینے کا دکھ وہ سمجھ سکتا تھا تو پھر حور شمائل کا دکھ کیوں نہیں سمجھ سکا۔ وہ تن تنہا سارے مصائب سے لڑ رہی تھی اس کے ساتھ تو پھر اپنے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ شمائل اور اس کی کہانی میں مطابقت ہے اور انیس بیس کا فرق صرف جنسی فرق کی وجہ سے ہے۔ وہ اس کا دکھ سمجھ رہا تھا تو حور یہ کا دکھ کیوں نہیں سمجھا؟ "مٹی سے بنی ہو شمائل۔" اس نے آزردگی سے سوچا۔
وہ جتنا سوچتا اتنا شرمندہ ہوتا اور اس کے دل میں شمائل کی محبت بڑھتی جاتی۔
وہ حور شمائل جس کو اس نے کبھی نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں۔ اس کے ذہن کے پردے پر حور شمائل کے نام کا سایہ بھی نہیں لہرایا تھا۔ نہ اس کی رنگت آنکھوں میں تھی نہ اس کی آنکھیں دل میں جھانکتی تھیں۔ سب پریشانیاں ذہن سے نکل گئی تھیں۔ تھا تو صرف ایک خیال۔ "وہ کیسی دکھتی ہے؟" وہ اس کی محبت تھی۔ اس کی بیوی تھی۔ اسے حق تھا کہ وہ اسے سوچے بلکہ صرف اسے ہی حق تھا کہ وہ اسے سوچے۔

جس کی یاد اتنی فرحت بخش تھی۔ اس کی محبت اس کا ساتھ کیسا سہانا ہوگا؟
میز پر دھرا موبائل اٹھا کر اس نے بنا کچھ سوچے اس کا نمبر ڈائل کر دیا۔
"السلام علیکم!" ائیر پیس سے مخصوص آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی پیچھے کسی بچے کی قلقاریاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ نبیل ان گنت آوازوں میں بھی دعا کی آواز شناخت کر سکتا تھا۔ ایک گہری سانس اس کے ہونٹوں سے خارج ہوئی۔ دعا وہ چڑچڑی بچی تھی جو کسی اور کے پاس تو کیا کھیلتی اکثر ماں کی گود میں بھی بسورتی پائی جاتی تھی۔
"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو؟"
"میں الحمدللہ ٹھیک۔ خیر سے فون کیا؟" اس کی آواز میں حیرت سی تھی۔ شاید آخری بار جب بات ہوئی تھی اس کے بعد سے اس طرح بے وجہ کال متوقع نہیں تھی۔
"جی خیر ہی ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کب تک آپ کے گھر آؤں ہمارا ریلیشن ڈکلیئر کرنے؟" جانے کیسے اس کے ہونٹوں سے پھسلا۔ اس نے شمائل کو "تم" کہنا شروع کر دیا تھا' لیکن اب اک تکلف سا تھا جو شمائل نے ہی قائم کیا تھا۔ سو وہ پھر "آپ" پر آگیا تھا۔
"مجھے تھوڑا وقت چاہیے' جلد ہی آپ کو بتادوں گی۔"
"پہلے آپ کو جلدی تھی۔ اب مجھے جلدی ہے۔ ویسے آپ کو وقت کیوں چاہیے اب؟" وہ اس کا رد عمل جاننا چاہ رہا تھا۔
"میرے محسن اس وقت تھوڑی مشکل میں ہیں۔ ان شاء اللہ سیٹ ہو جائیں تو میں آپ سے رابطہ کرتی ہوں۔ اللہ حافظ۔" کچھ سنے بغیر وہ فون بند کر چکی تھی۔
"کاش۔ شمائل کاش تم نے اس افتاد پر خوشی کا اظہار کیا ہوتا میرے سامنے اظہار ہی کیا ہوتا۔ کیوں تم مجھ سے پردہ رکھتی ہو کیوں' اب یہ مت کہنا میں انجان ہوں یا غیر' مجھ جیسا مضبوط تعلق کسی سے نہ ہے اور نہ

ہو سکتا ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے تھے۔" وہ تصور میں شمائل کو مخاطب کر کے پوچھ رہا تھا۔ بتا رہا تھا۔

آنے والے دن عجیب سے تھے۔ نہ سکون تھا نہ بے سکونی تھی۔ نہ آباد تھا نہ دل برباد تھا' گھر کی طرح۔ پاپا نے اگرچہ کمرے کو ری سیٹ کروا دیا تھا۔ ساتھ ہی پورے پورشن کو نئے سرے سے مزین کیا تھا۔ سب کچھ تھا۔ پھر بھی' پھر بھی اک اداسی تھی جو گرد کی طرح ہر شے پر جمی ہوئی تھی۔

شام کو جب وہ آفس سے آتا' لگتا کسی ویرانے میں آ گیا ہے۔ دعا مومنہ بھابھی کے پاس ہوتی تھی اور وہ جانتا تھا' مومنہ بھابھی کا صرف نام تھا۔ وہ حوریہ کے پاس ہوتی تھی۔ وہ حیران بھی ہوتا تھا کہ دعا کیسے حوریہ سے اتنی جلدی مانوس ہو گئی تھی۔ اس کی صحت بھی پہلے کی نسبت بہتر ہو گئی تھی۔ وہ سعید بھائی کے پورشن میں کئی بار گیا تھا' لیکن حوریہ نظر نہیں آئی' وجہ اس کے معمولات تھے جس سے سب آگاہ تھے اور حوریہ سے چڑ بھی سب ہی جانتے تھے سو اس کے آنے کے وقت یقیناً" وہ اپنی پناہ گاہ کی طرف چلی جاتی ہو گی۔

آج بھی وہ ادھر ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا' گھر کے ہی لوگ تھے۔ دعا پاس ہی کھیل رہی تھی۔ اچانک اس کے ننھے قدم ڈگمگائے اور وہ سامنے پڑے شیشے کی میز سے جا ٹکرائی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹ ایک لمحے میں خون سے تر ہو گئے تھے۔ نبیل نے بھاگ کر اسے پکڑا۔ مومنہ بھابھی اس کی آواز سن کر بھاگی آئی تھیں۔

دعا مسلسل رو رہی تھی۔ وہ ملا' ملا پکار رہی تھی۔ نبیل کے دل پر گھونسا پڑا۔ اس نے بچی کو سینے سے چمٹا لیا۔ بھابھی نے روئی سے اس کے ہونٹ صاف کر دیے تھے۔ یقیناً" نیا نیا نکلنے والا دانت ہونٹ میں گڑ گیا تھا۔ خون رک گیا تھا' لیکن دعا کی چیخوں میں کمی نہیں آئی تھی۔ سعید بھائی نے بھی اسے گود میں لیا' مومنہ بھابھی نے بھی اسے پیار سے سہلایا' لیکن وہ روتی جا رہی تھی۔

نبیل کو بے چینی ہو رہی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے سوچا کہ صدف کو طلاق دے کر اس نے ٹھیک نہیں کیا جو بھی تھا وہ دعا کی ماں تھی' لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ دعا پہلے کی طرح زور و شور سے رو رہی تھی۔

"نبیل مجھے دو۔ میں بہلاتی ہوں۔" مومنہ بھابھی اس کی گود سے اسے لے گئیں تو وہ بھی ان کے پیچھے دعا کی آواز کا تعاقب کرتا ہوا چلا آیا۔ فاصلے پر لمبی سیاہ چادر میں لپٹا ہوا وجود حوریہ کا تھا وہ کچھ فاصلے پر گلاب کے پودے کے پیچھے ہو گیا۔

حوریہ نے روتی ہوئی دعا کو گلے سے لگایا اور کچھ گنگنانے لگی۔ دعا جیسے جادوئی اثر کے تحت چپ ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ مومنہ بھابھی پلٹ کر واپس آتیں وہ جلدی سے ادھر سے چلا گیا۔

"تو کیا دعا حوریہ کو ملا کہہ رہی تھی' یا۔ یا ماں کو پکارتے اس حوریہ میں ماں کا لمس ڈھونڈ رہی تھی بلکہ پا چکی تھی۔" ساری رات اسے اس سوچ نے ہی بے چین رکھا۔

وہ عجیب سے احساسات سے دوچار ہوا تھا۔ ایک بار پھر حوریہ کو دیکھنے کی خواہش دل میں زور پکڑ رہی تھی۔ آج اس نے دیکھا بھی تو پشت سے۔ عجیب بے بسی تھی۔ وہ اسے اپنانا چاہتا تھا' لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔

"اس وقت صدف میری بیوی کے روپ میں میرے گھر میں تھی۔" اس نے سوچا۔ اس سوچ نے اک لمحے کے لیے اس کی بے رنگ زندگی میں من چاہے رنگ بھر دیے تھے۔ اب جب اس کی زندگی میں صرف وہی تھی تو کیا اب بھی انکار کی کوئی وجہ کوئی جواز باقی تھا؟ یقیناً" نہیں' وہ اس وقت اس کے ساتھ دوسرا تعلق قطعی فراموش کر بیٹھا تھا۔

وہ یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ شمائل انکار کر سکتی ہے۔ "ہاں اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔ پاپا کو بتا دوں کہ میں حوریہ سے شادی کر چکا ہوں۔" اتنا سوچ کر ہی اسے ایک خیال آیا کہ حوریہ سے اس کا دوسرا تعلق کیا ہے اور اس تعلق کی بنا پر وہ اس کے ساتھ کیا سلوک

کرچکا ہے۔ کیا وہ مجھے قبول کرلے گی؟

ساری رات سوچوں کے جلتے برزخ نے اس کا جسم بھی تپا دیا تھا۔ فجر کی اذان کے وقت وہ اک دکھ کے نشے میں بے سدھ ہو رہا تھا۔ "میرے اللہ میں انسان ہوں۔ خطاکار' سیاہ کار ہوں۔ مجھے معاف کردے اور حوریہ کا دل میرے لیے وسیع کردے۔" بہت شدت سے ٹوٹ کر اس نے یہ دعا مانگی تھی۔

صبح آفس کے وقت آنکھ کھلی تو سہی' لیکن نہ جانے کی ہمت تھی نہ کام کرنے کی۔ گیارہ بجے کے قریب اٹھ کر اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور سعید بھائی کی طرف چلا گیا۔ روز صبح وہ ناشتا ان ہی کے پاس کرنے جاتا تھا۔ آج وہ نہیں گیا تو ادھر سے بھی کوئی نہیں آیا تھا۔ پچھلے ہفتے سے اس کا یہی معمول تھا۔ صبح صبح طبیعت اتنی بے زار ہوتی تھی کہ وہ ناشتا کیے بغیر ہی آفس چلا جاتا تھا۔ آج بھی ادھر سب یہی سمجھ رہے ہوں گے۔

رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سرخی سی اتر آئی تھی۔ منہ پہ پانی کے چھینٹے مار کر تولیے سے منہ صاف کرکے وہ سعید بھائی کی طرف آگیا۔ دعا کی ہلکی سی آواز آرہی تھی جو ایک دم بند ہوگئی تھی۔ اسے لگا آواز انیکسی سے آرہی ہے۔ دعا کو دیکھے بھی دو تین دن ہوگئے تھے۔ کچھ سوچے سمجھے بنا وہ ادھر چلا گیا۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اس نے ہلکا سا دباؤ ڈالا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔

اس اجلی صبح میں بھی کمرے میں رات کا ماحول بنا ہوا تھا۔ ہلکی زرد روشنی پورے کمرے میں سائے کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ دعا ادھر نہیں تھی۔ وہ جان چکا تھا پھر بھی اس کے قدم واپس نہیں مڑے' بلاوجہ ہی وہ اس کمرے میں داخل ہوگیا اور اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے لائٹ آن کی۔

سامنے بیڈ پر بے شکن صاف ستھری چادر بچھی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر پانی کا جگ اور ایک گلاس پڑا ہوا تھا۔ دیوار گیر شیشے کے سامنے دروازوں پر ایک خوب صورت گل دان رکھا ہوا تھا۔ صوفوں کے سامنے شیشے کی اسٹائلش ٹیبل پر بھی ایک گلدان پڑا ہوا تھا۔

تقریباً" سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ بیڈ کے دائیں ہاتھ اور اس کے بالکل سامنے لکڑی کی ایک کتابوں کی الماری تھی اس نے قریب جاکر دیکھا۔ اکثر کتابیں وہ تھیں، جو وہ پڑھ چکا تھا یا پڑھنا چاہتا تھا۔

تب ہی اس کی نظر "پہلی بارش" پر پڑی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس نے کتاب کو شیلف سے نکال لیا۔ اسے یاد آیا پچھلے سال ان ہی دنوں میں اس نے یہ کتاب شیری کے پاس دیکھی تھی۔ دونوں آفس سے گھر جارہے تھے ب اس نے شیری کے پاس کتابوں میں موجود یہ کتاب دیکھی تھی۔ ایک صفحہ پر مخصوص انداز میں لکھا ہوا "S" دیکھ کر اس نے شیری سے پوچھا تو اس نے بتایا یہ کتاب شمائل کی ہے۔ کچھ دن پہلے کوچنگ میں وہ بھول گئی تھی۔ ہاں۔ شمائل اس کے ساتھ کسی کوچنگ میں شام کو پڑھاتی تھی اور یہ "S" وہی تھا جو عذاب دید یہ بھی مہر کی صورت موجود تھا۔

اس لمحے لائٹ چلی گئی اور بالکل اسی وقت کھلے دروازے سے داخل ہوکر حوریہ کے منہ سے "لو ہو" نکلا۔ دروازہ بند کرکے اندازے سے ٹٹولتی وہ اندھیرے میں آگے بڑھ رہی تھی جب کہ وہ شل ذہن کے ساتھ کچھ بھی نہ سوچتے اور سمجھتے ہوئے چپ چاپ وہیں کھڑا تھا۔

میز کی دراز سے موبائل نکال کر جیسے ہی حوریہ نے ٹارچ جلائی تھی کہ بتی بھی آگئی۔ موبائل کی ٹارچ بند کرکے اس نے دوبارہ دراز میں ڈال دیا۔ بے دھیانی میں پلٹی تو پیچھے کھڑے نبیل سے ٹکرائی —— اس نے حیران ہوکر نبیل کو دیکھا اور کترا کر وہاں سے گزرنا چاہا' لیکن نبیل نے جانے کس جذبے کے تحت بازو پھیلا دیا۔ نبیل کے بازوؤں کے حصار میں کھڑی وہ بے حد خوف زدہ تھی۔

نبیل کو نظر آرہی تھی تو صرف وہ لڑکی جس کی ذات سے اس نے محبت کی تھی۔ شفاف آنکھوں والی اس لڑکی کی معصومیت مجھے پہلے نظر کیوں نہیں آئی۔ اس کے دل میں سوال اٹھا تھا۔ سنہری رنگت اور سیاہ

آنکھوں والی یہ لڑکی میری محرم ہے۔ میری ذات کی محرم ہے۔ محرم۔ لفظ نے اس کے اندر رقص شروع کردیا تھا۔ پیاسی نظروں سے وہ اسے تکتا ہی چلا جاتا اگر اس کی بھنورا آنکھوں سے موتیوں کی لڑی نہ ٹوٹ کر بکھرنے لگ جاتی۔ اک خواب کی کیفیت میں وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اک لمحے میں وہ ہوش کی دنیا میں واپس آگیا۔

"اللہ کا واسطہ مجھے جانے دیں۔" الفاظ بھی موتیوں کی لڑی جیسے تھے۔ اسے چھوڑ کر وہ تیزی سے مڑا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ تقریباً" بھاگتے ہوئے کسی کی بھی نظروں میں آئے بغیر وہ لائبریری میں جا پہنچا۔ اس کا فون بج رہا تھا۔ مدہوش سا وہ بستر پر گر گیا۔ "شمائل! تم میں اگر کوئی کمی ہوتی تب بھی میں تمہیں ایسے ہی قبول کرلیتا۔" اس نے زیر لب کہا اور ان قیامت خیز لمحات کو سوچنے لگا۔

اس کا فون مسلسل بج رہا تھا۔ بے مزہ ہو کر اس نے ٹیبل پر پڑا فون اٹھایا۔ شمائل کالنگ یہ لفظ فون کی اسکرین پر جگمگا رہے تھے۔ اس نے کال کاٹ کر دوبارہ کال کی۔

"جتنی جلدی ہوسکے، آپ مجھے یہاں سے لے جائیں پلیز۔" سلام دعا کے بغیر اس نے بات شروع کی تھی۔ بلاشبہ آواز میں نمی تھی۔

"کیا ہوا شمائل! آر یو او کے؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"میں خود پر اٹھنے والی انگلیاں برداشت کرسکتی ہوں، لیکن اپنی طرف بڑھتے ہاتھ نہیں۔" وہ بری طرح رونے لگی۔ نبیل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا کہے۔ کیسے تسلی دے۔

"اچھا۔ اچھا۔ تم روؤ مت۔ میں جلد ہی تمہیں اس عذاب سے نجات دلا دوں گا۔ ساتھ میں خود کو بھی۔" آخری فقرہ اس نے دل میں کہا۔

"شمائل میری بات سن رہی ہو؟ شمائل۔"

"جی۔۔۔ سن رہی ہوں۔" سسکیوں میں اس کی آواز ابھری۔

"مجھے صرف ایک بات کا جواب دو۔ تم میرے ساتھ زندگی گزار سکتی ہو؟ دیکھو مجھے غلط مت سمجھنا۔ میں نہیں چاہتا کہ جلد بازی میں۔ زندگیاں داؤ پر لگادوں۔ ایک بار تم اس دوزخ سے نکل جاؤ پھر مل کر سوچیں گے اور فیصلہ کریں گے۔ میری بات سمجھ میں آرہی ہے؟" اس نے نرمی سے پوچھا تو اس کی سسکیاں تھمنے سی لگیں۔

"ہم۔۔۔ ٹھیک ہے جیسے آپ بہتر سمجھیں، لیکن پلیز جلدی۔۔۔ جتنی جلدی ہوسکے۔" نبیل کو اس روتی ہوئی لڑکی کی جلدی سمجھ میں آرہی تھی۔

"اب اک آخری بات۔۔۔ مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

دونوں طرف خاموشی تھی۔ "صرف آپ سے ہی۔" ادھوری بات کہہ کر اس نے لائن کاٹ دی۔

"چلو اک مرحلہ تو سر ہوا۔" بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے سوچا۔ اب اس میں ڈو اور ڈائی والی کیفیت پیدا ہوچکی تھی سو تیار ہو کر وہ پاپا کے پاس آفس میں چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سامنے بیٹھ کر بات آسانی سے سمجھا سکے گا۔ آفس میں بات کرنا مناسب نہیں لگ رہا تھا اس لیے پاپا کو لے کر قریبی ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ ادھر بھی بنا کچھ کھائے پیے مضطرب بیٹھے رہنے کے بعد اس کے دل نے کہا کہ گھر میں بات کرنا زیادہ بہتر اور آسان ہوگا سو اب وہ پاپا کو گھر لے کر جارہا تھا۔ پاپا حیران تھے کہ پچھلے کچھ سالوں سے اینگری برڈ کی طرح بات بات پر چونچیں مارنے والا ایک دم سے اتنا نرم خو کیسے ہوگیا وہ بھی بے وجہ۔ وجہ تو خیر تھی جو وہ نہیں جانتے تھے۔

کچھ ہی دیر میں دونوں پاپا کی اسٹڈی میں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ پرسکون ماحول کا اثر تھا کہ نبیل خود بھی پرسکون ہوگیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے بولتے ہوئے الف سے ے تک پوری کہانی پاپا کے گوش گزار کردی۔ اب اس کی نظریں پاپا کے قدموں سے اوپر نہیں اٹھ سکیں ورنہ وہ ان کے چہرے پر خوشی، غمی، بے بسی جیسے مختلف رنگ آتے جاتے ضرور دیکھ

لیتا۔ نکاح ساتھ اس نے حالات اور کسی حد تک جذبات بھی بیان کر دیے تھے۔

"آپ کیا چاہتے ہو؟" ساری بات سننے کے بعد پاپا نے کہا تو اس نے تیکھی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"ابھی بھی پوچھنا باقی ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔" وہ مصنوعی ناراضی دکھا رہا تھا۔

پاپا نے بے یقینی اور محبت سے اسے دیکھا۔ اک عورت سے محبت یا شاید شادی نے ان کا بیٹا چھین لیا تھا ان سے۔ اور ابھی اسی عورت کی بیٹی کے توسط سے انہیں ان کا بیٹا واپس ملا تھا۔ وہ کیسے اس لڑکی کو اپنی زندگیوں سے جانے دیتے؟

"پاپا۔۔۔ آپ اسے سمجھائیں نا پلیز۔ میری تو وہ بات تب تک ہی سنے گی جب تک اسے یہ نہیں پتا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔" وہ فکرمندی سے بولا۔

"ہاں اب سارا الزام باپ کے سر ڈال دو۔ شاباش۔" پاپا مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں جاکر بلاتا ہوں اسے۔" وہ دروازے کی طرف بڑھے تو وہ بھی دوڑ کر ان کے پیچھے سے آکر ان سے لپٹ گیا۔

"پاپا۔۔۔ مجھے معاف کردیں۔ پلیز معاف کردیں مجھے۔۔۔ پلیز۔"

"ہو گئے ہوئے۔" پاپا نے اسے چھیڑا۔ "جب اولاد تائب ہو کر ماں باپ کے گلے آلگے تو اس کے بعد معافی لفظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔" پلٹ کر انہوں نے نبیل کی کشادہ پیشانی سے بال ہٹا کر بوسہ لیا اور باہر چلے گئے۔

ماں اور باپ دونوں ہی گھنی چھاؤں ہوتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں انہیں کتنا ہی غلط سمجھیں، وقت ہمیشہ انہیں صحیح ثابت کر دیتا ہے۔ اس کا دل محبتوں کی شدت سے بھر گیا تھا۔ پہلے شمائل اور اب پاپا۔۔۔ دونوں سے اسے شدید محبت محسوس ہو رہی تھی۔ آنے والے وقت کا خیال ہی بہت خوش کن تھا۔ کھڑکیوں پر چھائے اندھیرے اسے بہت بھلے لگ رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں ہی پاپا واپس آگئے۔ "ھومنہ سے کہہ آیا ہوں بھیجتی ہے ابھی اسے۔"

"جی پاپا۔۔۔" اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

کچھ دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ پاپا آرام کرسی پر آنکھیں بند کر کے بیٹھے تھے۔ وہ ان کے مشفق چہرے کے نقوش میں گزرے سال کے اثرات دیکھنے لگا۔ چند منٹ بہت خاموشی سے ان کے پاس بیٹھا رہا۔۔۔ دروازے پر ہلکی سی دستک پر پاپا نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"آجاؤ بیٹا۔ اندر آجاؤ۔" فطری نرمی سے انہوں نے کہا تو دروازہ کھول کر وہ اندر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چائے کا ایک بڑا مگ اور ایک کپ تھا۔ اس نے آہستہ سے وہ ٹرے میز پر رکھی تب ہی اس کی نظر نبیل پر پڑ گئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ "اب کوئی نیا الزام۔" اس نے سوچا۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا۔۔۔ مجھے بات کرنی ہے تم سے۔"

قدرے فاصلے پر رکھی کرسی پر وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے کسی طالب علم کو کمرۂ امتحان میں بٹھا دیا جائے۔

رونے کی شدت سے آنکھیں سرخ تھیں۔ پپوٹے بھی سوجے ہوئے تھے۔ کپڑوں پر دھیان کھینچ لینے والی بے تحاشا سلوٹیں تھیں۔ اس کے باوجود اس نے نماز کی صورت دوپٹا بالوں اور چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔

"طبیعت ٹھیک ہے؟"

"جی۔" یک لفظی جواب دے کر اس نے نظریں پھر سے زمین پر گاڑ دیں۔

نبیل نے سب کچھ بتایا تھا آج صبح والے واقعہ کے سوا۔ وہ جانتا تھا۔

؎ ساری بات بتانے والے کچھ کچھ پاگل ہوتے ہیں

اور وہ پاگل بالکل نہیں تھا۔ لاپروائی سے وہ ادھر ادھر دیکھتا ایک سادہ سا چور نظر آرہا تھا۔

"اچھی بات ہے۔" پاپا نے جواب دیا۔ "ایک اچھی بات اور بھی مجھے پتا چلی ہے تمہارے بارے

میں۔ جو تم نے نہیں بتائی۔"
اک لمحے کے لیے نظر اٹھا کر اس نے دیکھا اور پھر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔
"تم بالغ ہو اپنی مرضی کر سکتی ہو، لیکن... مجھے یہ یقین نہیں آرہا۔ شادی مبارک ہو بیٹا! جس شخص کو تم نے چنا ہے وہ بلاشبہ اک بہترین آدمی ہے۔"
حوریہ کے دل سے ہوک اٹھی' بہترین شخص میری قسمت میں ہے کہاں؟"
"میرے لیے اب وہ شخص عزیز ترین ہے جسے تم نے چنا دکھ بس یہ ہے کہ تم مجھ پر بھروسا نہیں کر سکیں۔ میں یقیناً" تمہارے لیے اس شخص کو منتخب نہیں کرتا' لیکن سوچ سمجھ کر ہی..."
"میں نے بھی سوچ سمجھ کر انتخاب کیا ہے۔ پاپا... اللہ نہ کرے کہ میرا انتخاب غلط ہو' لیکن اگر ایسا ہوا' تب بھی میں آپ لوگوں میں سے کسی کے پاس نہیں آؤں گی۔" وہ بات کاٹ کر بولی تھی۔ وہ نبیل کی موجودگی میں ان باتوں پر الجھ رہی تھی ورنہ بدحواسی میں اس طرح بات نہ کاٹتی۔
"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ تم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔" وہ خوش ہو کے بولے۔ "پھر اب دولہا میاں تو جلدی رخصتی چاہ رہے ہیں۔" نظریں ترچھی کر کے پاپا نے کہا تو اس نے گھبرا کر نبیل کی طرف دیکھا حسب سابق وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔
"دراصل میں، میں چاہتا ہوں کہ تم میری اکلوتی بیٹی ہو تو تمہاری شادی میں دل کے ارمان پورے کروں' خوب دھوم دھام سے تمہاری رخصتی کروں۔
"نہیں نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔" وہ ایک دم بول اٹھی۔ "پلیز آپ سادگی سے سارا معاملہ ختم کریں۔ مجھے دھوم دھام نہیں چاہیے۔" لہجہ اور آواز حتی الامکان دھیما رکھ کر اس نے کہا۔
وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایک شادی شدہ شخص کی زندگی میں اس کے ساتھ کی جانے والی نیکی کی وجہ سے طوفان کھڑا ہو اس لیے وہ اس بات کو بھی فراموش کر بیٹھی تھی کہ یہ اس کی اپنی شادی کی بات چل رہی ہے اور وہ کھلم کھلا ان معاملات پر اظہار خیال کر رہی تھی۔
"چلو بھئی جیسے تم لوگوں کی مرضی' جو بھی طے کرو مجھے بتاؤ بنا۔" پاپا نے طمانیت سے کہا تو جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ سرک گیا۔
"پاپا... اسے کہہ دیں مجھے آکر لے جائے۔" گود میں ہاتھ رکھتے اس نے آہستگی سے کہا تو پاپا اور نبیل دونوں کے چہرے پر بیک وقت مسکراہٹ پھیل گئی۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ چلو نبیل میری بہو کو لے جاؤ کمرے میں۔" پاپا نے بمشکل مسکراہٹ دبا کر کہا۔
نبیل بھی فرمانبرداری سے "جی پاپا" کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ حوریہ نے ناسمجھی سے دونوں کی طرف دیکھا۔ دونوں کی چمکتی آنکھیں اس کی غلط فہمی کو کم فہمی ثابت کر رہی تھیں۔
"نن... نہیں... نہیں۔" اضطرابی حالت میں کہتے وہ اٹھ کر دو قدم پیچھے ہٹی اور پھر چکراتے سر کے ساتھ کرسی کو سہارے کے لیے تھامتے ہوئے اس نے نبیل کو اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ بے ہوش ہونے سے قبل اس کے ذہن کے پردے پر اک آخری منظر اس کی ماں کی میت کا تھا۔ اس نے آہستہ سے "ماں" پکارا اور ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

اسے تو موت کا پتا بھی نہیں تھا جب موت دیمک کی طرح اس چھوٹے سے خاندان کی خوشیوں کو چاٹ گئی۔ صحن کے عین وسط میں بچھی چارپائی پر ابو سو رہے تھے اور لوگ جنازہ جنازہ پکار رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی پتا نہیں جنازہ کیا ہوتا ہے۔ چارپائی کے اطراف میں دور نزدیک کے سب ہی رشتہ دار جمع تھے اس کی ماں رو رہی تھی۔ بہت بری طرح سے رو رہی تھی۔
وہ کمرے میں سو رہی تھی جب شور کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ دروازے کے بیچ کھڑی حیرت سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ تب ہی کسی کی نظر اس پر پڑی۔ کسی نے اسے ساتھ چمٹا کر پیار کیا۔ سب رو

رہے تھے اور اسے ہنسی آ رہی تھی کہ سب رو کیوں رہے ہیں۔ تب کسی رشتے دار خاتون نے اسے اٹھا کر اس کے ابو کی چارپائی کے نزدیک کھڑا کر دیا۔

وہ کہہ رہی تھیں "تمہارے ابو جا رہے ہیں اور اب کبھی واپس نہیں آئیں گے۔" وہ سوچنے لگی کہ اس کے ابو تو سو رہے ہیں اور سوئے ہوئے کہاں جائیں گے۔ اور پھر اس دن کے بعد جب ابو واپس نہیں آئے تو اس نے ماں سے بھی نہیں پوچھا۔ ابو کی کوئی بات ہوتی تو وہ رونے لگ جاتیں۔ ماموؤں نے بہت ضد کی وہ لوگ ان کے پاس چلیں لیکن ماں نہیں مانیں۔ خود وہ بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ ابو کی پنشن اور ماموؤں کی مدد سے گھر کا خرچ چلنے لگا۔ نہ اس کے پاس کھلونے تھے اور نہ ہی خوب صورت کپڑے۔ ماموں پوچھتے کچھ چاہیے یا کیا لینا ہے تو وہ آہستہ نفی میں سر ہلا دیتی۔

زندگی کچھ سال اسی طرح گزری پھر اک دن اس کی طبیعت خراب ہونے پر اسے اسپتال لے جایا گیا جہاں پر ایک انکل نے اسے پیار کیا۔ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھیں، کہانیاں سنائیں اور کھلونے لا کر دیے۔ اسے پتا تھا کہ ماں کو برا لگ رہا ہے لیکن اسے انکل کا آنا اچھا لگ رہا تھا۔ پھر گھر آنے کے بعد بھی وہ انکل ماموں کے ساتھ آئے تھے۔ گھر میں اک دبا دبا سا شور تھا۔ وہ صحن میں کھڑی تھی کہ بیٹھک سے اپنی ماں کی آواز سنی۔

"بھائی جان اگر میں آپ پر بوجھ ہوں تو مجھے بتا دیں۔" تب ماموں نے جواب دیا۔

"بھلا بہنیں بھی بھائیوں پر بوجھ بنی ہیں۔"

"تو پھر آج اس موضوع کو ختم ہو جانا چاہیے۔ میں اپنی بچی کے ساتھ خوش ہوں، مطمئن ہوں۔ دوبارہ مجھ سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا۔" اس کے بعد کچھ عرصہ سکون سا رہا پھر ایک دن ایک عورت ان کے گھر آئی۔ قیمتی لباس میں آنے والی اس خاتون کے چہرے پر اک اداسی سی تھی۔ وہ چند منٹ بیٹھک میں بیٹھی اور چند باتوں کے بعد ہی چلی بھی گئی۔

اس نے کہا تھا۔ "میں نے بڑوں کے فیصلے کے آگے سر جھکا کر اپنی آدھی زندگی بے رنگ گزار دی ہے اور آنے والی آدھی زندگی میں بھی کوئی رنگ نظر نہیں آ رہے لیکن میں چاہتی ہوں میرے ہم سفر کی زندگی میں اس کی مرضی کے گلاب کھلیں، سود و زیاں کا حساب کرنے بیٹھیں تو میرے حصے میں سے یہ پچھتاوا نکل جائے کہ میں نے انہیں خوشی نہیں دی۔" اس کے بعد اسے خبر نہیں سوائے اس کے کہ اب انکل اکیلے ہی گھر آنے جانے لگے تھے۔

اس کے لیے ٹافیاں بھی لاتے اور کھلونے کپڑے وغیرہ بھی۔ اسے عجیب سا لگتا تھا پھر انکل ان دونوں کو لے کر اپنے گھر گئے۔ وہاں جو ہوا اس سے اس نے سمجھا کہ وہ کسی کے حق پر بلاوجہ قابض ہو رہی ہے۔ اور یہ بھی کہ ان کا انکل سے رشتہ ٹھیک نہیں۔ اس لڑکے کی باتیں بھلے وہ اس وقت سمجھی تھی یا نہیں مگر اس کے لہجے میں نفرت اور لفظوں میں حقارت وہ جان گئی تھی۔ بعد ازاں اسے از خود سمجھ میں آنے لگا تھا۔

میٹرک کے بعد اس نے انکل سے کچھ بھی لینا بند کر دیا تھا۔ گلی کے چند بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اپنی ضرورتیں پوری کرنے لگی۔ اللہ بھلا کرے ہمسائے میں قدرے بعد میں آکر آباد ہونے والے شہریار کے خاندان کا کہ جس نے اس کی پوری طرح مدد کی۔ وہ جو کام ہوتا سہولت سے شہریار کی امی سے جا کہتی اور وہ شہریار سے کہہ کر وہ کام کروا دیتیں۔ رفتہ رفتہ امی کی بجائے وہ ڈائریکٹ شہریار سے کہنے لگی۔

نوٹس کاپی کروانے ہیں۔ ایڈمیشن فیس جمع کروانی ہے۔ کتاب منگوانی ہے۔ ٹیوشن پڑھائی اکیڈمی میں سی وی ڈراپ کرو وغیرہ وغیرہ شہریار بھی بنا کسی حیل حجت اس کے کام کروا دیتا تھا۔

اکثر جب وہ نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو شہریار کے لیے دعا ضرور کرتی۔ اللہ نے اگر بھائی نہیں دیا تھا تو شہریار ضرور دیا تھا۔ اصل کارساز تو اللہ ہوتا ہے وسیلہ شہریار بنا پھر وہ اس قابل ہو گئی تھی کہ کسی پر انحصار نہیں کرتی تھی بلکہ اکثر کی ضروریات بھی اپنے

پیسوں سے پوری کرتی تھی۔ جب دل میں سکون
اترنے لگا تب ہی ایک بار پھر وہ تنہا ہو گئی۔ ماں کی موت
نے اسے گم صم ہی کر دیا۔

چند دن خالہ کے ساتھ رہی۔ ابھی اس کے دل و
دماغ نے اس صدمے کو قبول نہیں کیا۔ ایک دن خالہ
نے فون کر کے انکل کو بلا لیا۔

"بھائی صاحب آپ کی بیٹی آپ کی امانت ہے' میں
مجبور ہوں اسے اپنے پاس مستقل نہیں رکھ سکتی۔"

وہ ذہنی طور پر اتنی گم صم تھی کہ ان الفاظ کو سن کر
بھی سمجھ نہیں سکی۔ جب واپس گھر پہنچی اور حسب
سابق بے عزتی سے استقبال ہوا تب بولتے بولتے بھی
وہ چپ کر گئی۔ اس نے زمانے کی آنچ پر خود کو پگھلا کر
اپنا وجود خود ڈھالا تھا۔ اس کی انا اور عزت نفس کا قد خود
اس کے قد سے بھی کئی گنا اونچا تھا ایسے میں وہ کیسے
کسی غیر متعلقہ شخص کو اپنی ذات' اپنے کردار کی
دھجیاں بکھیرنے دیتی۔ خود کو مزید ذلیل ہونے سے بہتر
عملی طور پر جواب دینا مناسب سمجھا اس گھر میں پہلا
قدم رکھتے ہی اس نے اپنے لیے واپسی کا راستہ بھی
سوچ لیا۔

اور پھر موبائل خرید کر اس نے شہریار سے رابطہ کیا
اور روئے پیٹے بغیر مختصر انداز میں اپنا مدعا بیان کیا۔ اب
اسے نہیں معلوم شہریار نے کیسے اور کسے تیار کیا اسے
نہ نام سے غرض تھی نہ ذات سے۔ پیپر سائن کر کے
دیتے ہوئے بھی تفصیل پر نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہیں
کیا۔ شہریار نے بتایا تھا اک دوست شادی شدہ ہے
سو طلاق والا معاملہ آسانی سے نمٹ سکے گا۔ پھر جب
اس کے کردار پر انگلی اٹھائی گئی تو اس کے ضبط کا پیمانہ
صرف اتنا بھرا کہ جسمانی تکلیف بھلا کر اس نے اپنے
نام نہاد باپ سے کہا میرا اعتبار کریں۔ وہ کیوں کرتا اس
کا اعتبار؟

وہ روئی۔۔۔ اس دن بے حد ٹوٹ کر روئی۔ لیکن
صرف اس رات۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جلد از جلد
اس گھر سے چلی جائے گی۔ کسی ایسی جگہ۔ جہاں اسے
کوئی نہ جانتا ہو۔ جہاں کوئی اپنی آنکھوں پر بے
اعتباری کی پٹی باندھ کر اس کے کردار پر نا دیدہ داغ نہ
دیکھے۔ وہ چاہتی تھی رخصتی کے نام پر اس گھر سے نکل
کر کسی ہاسٹل چلی جائے۔ طلاق لے کر وہ تن تنہا
زمانے کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا
اللہ ہوتا ہے اور اللہ اس کا بھی تو ہے۔ یہی سوچ اسے
ہارنے نہیں دیتی تھی اس کے ہر زخم کا مرہم یہی سوچ
بنتی تھی۔

جب اس کی پہلی بار اپنے محرم انسان سے بات
ہوئی اس نے اپنا لہجہ بھی لچک دار نہیں رکھا۔ اپنی کسی
بات سے وہ اس بندے کے دل میں شک پیدا نہیں
ہونے دینا چاہتی تھی لیکن آہستہ آہستہ نہ جانے کیسے
وہ اس نرم لہجے اور سلجھے لفظوں میں الجھی کہ اپنی سوچ
سمجھ بھول بیٹھی۔

ان میں کلی قدریں مشترک تھیں جن میں سب
سے پہلی قدر کتابیں تھیں' کتابیں دونوں کا جنون
تھیں۔ دونوں کی معلومات قابل قدر تھیں۔ اور
تبصرے لاجواب تھے۔ دونوں اک دوسرے میں الجھ کر
اپنا آپ بھولتے تھے۔ لیکن اظہار آیا تو وہ اقرار کرنا چاہتی
تھی۔ ریگستان کی تپتی ریت کے سفر زیست میں وہ
شخص اک گھنی چھاؤں جیسا تھا۔ اگرچہ کوئی حد اس
رشتے میں لاگو نہیں تھی پھر بھی۔۔۔ پھر بھی وہ اس مقام
تک نہیں آیا جہاں اس کا کردار۔ اس کا اخلاق حوریہ
کی نظر میں گرتا۔ وہ پیاسی مٹی تھی۔۔۔ جانتی تھی اک
اقرار اسے تا عمر سیراب کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
پھر بھی اس نے اقرار نہیں کیا۔

وہ جھیل چکی تھی دوسری عورت کی اولاد ہونا۔ اپنی
ماں کے آنسو وہ اپنی آنکھوں سے رونے کی صلاحیت
نہیں رکھتی تھی۔ وہ آج ہاں کر کے غاصب نہیں کہلوانا
چاہتی تھی۔ اس نے اس سوالی کو خالی لوٹایا تھا۔ وہ خود
سوالی تھی۔ اس کے بعد اس نے ہی نہیں پورے گھر
نے دیکھا کیسے اللہ کی ذات نے اس کے دامن کی پاک
دامنی کا ثبوت دیا۔

اسے دعا سے ہمدردی تھی اسے لگا اک اور حوریہ
تخلیق ہونے جا رہی ہے۔ وہ معصوم بچی تو کچھ جانتی

نہیں تھی۔ اس نے اسے توجہ دی' پیار دیا صرف اس لیے اس سے نفرت نہ کی کہ یہ اس شخص کی بیٹی ہے' جس نے ہر بار سامنا ہونے پر اسے ذلت سے دوچار کیا۔ اور آج صبح جو ہوا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ شخص اتنا بھی نیچے گر سکتا ہے۔

اس گھر میں اسے اتنا سکون تو تھا کہ اس گھر کے مکینوں کے کام کرے' ذلت سہ کے۔ اس کی عزت اس گھر میں محفوظ تھی آج اس کا یہ وہم بھی دور ہو گیا تھا۔ اور اب جب وہ خود کو اس گھر اس ماحول سے نکلنے پر پوری طرح تیار کر چکی تھی اسے کہا جا رہا تھا کہ اسے ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ اس کے فرار کی راہ اسے واپس یہیں لے آئی۔ کیسا بھدا مذاق کیا تھا۔ قسمت نے اس کے ساتھ۔

"حوریہ۔۔۔۔ حوریہ اٹھو۔" مومنہ بھابھی کی آواز اسے ماضی سے حال میں لے آئی تھی۔ حال بھی ایسا کہ وہ یہ بھی نہیں سوچ سکی کہ کاش یہ خواب ہوتا۔ بے دلی سے آنکھیں کھول کر اس نے ان کی طرف دیکھا۔

"تم نے کیا اتنے دن فاقہ کیا تھا۔ اتنا بی پی لو کہ ڈرپ لگوانی پڑ جائے۔ لڑکی! تم یہ تو ثابت نہیں کرنا چاہ رہیں نا' کہ میں تمہاری سوتیلی بھابھی ہوں؟" انہوں نے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ سجا کر تازہ جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھایا جسے اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہی منع کر دیا۔

"بھابھی! ویسے سگی بھابھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے کیونکہ اس کے اپنے کچھ خدشات ہوتے ہیں۔" جواباً" اس نے بھی نقاہت زدہ لیکن مزاحیہ لہجے میں جواب دیا۔ دونوں ہی ہنس پڑیں۔

"اچھا یہ جوس تو پیو۔ اب دوبارہ ڈرپ نہیں لگوانی تمہیں۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔ پلیز" روکتے روکتے بھی آنسو اس کی گالوں پہ بہنے لگے۔

"پاگل ہو تم۔۔۔" انہوں نے تیزی سے اس کے آنسو پونچھے۔ "ویسے مجھے تو بہت خوشی ہوئی ہے۔"

"تو تو انہیں بھی سب پتا ہے۔" اک تھکی سی سانس بھر کر اس نے تکیے پر سر ٹکا دیا۔ وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں اور تھوڑی دیر بعد پھر اندر آ گئیں۔

"تمہارے لیے کچھ رکھ کر جا رہی ہوں دیکھ لینا اور ہاں جوس ضرور پی لینا۔"

ان کے جانے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ سائیڈ ٹیبل پر گلابوں کا گلدستہ تھا اور اس میں تہ شدہ رنگین کاغذ بھی۔ جیسے تیسے سہارا لے کر وہ بیٹھی تھوڑا سا کھسک کر اس نے وہ کاغذ نکالا۔

ہم بھی شکستہ دل ہیں' پریشان تم بھی ہو
اندر سے ریزہ ریزہ میری جان تم بھی ہو
ہم بھی ہیں ایک اجڑے ہوئے شہر کی مثال
آنکھیں بتا رہی ہیں کہ ویران تم بھی ہو
مل جائیں ہم تو کیسا سہانا سفر کٹے
گھائل ہیں ہم بھی سوختہ سامان تم بھی ہو

اس کا دل چاہا اس کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ لیکن اس شخص کے ساتھ گزری راتوں کی باتیں یاد آ گئیں تو بے بسی کے احساس سے آنکھیں چھلک اٹھیں۔ یوں ہی کتنی دیر وہ کاغذ ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ اچانک پاپا کے کھنکارنے کی آواز سن کر اس نے کاغذ تیزی سے چھپا دیا۔

"السلام علیکم پاپا۔"

"وعلیکم السلام بیٹا۔ خوش رہو آباد رہو۔ کیسی طبیعت ہے؟"

"جی بہتر ہے۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ پاپا پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"اصولاً" رات کے اس پہر مجھے اس طرح بات کرنے کے لیے آنا نہیں چاہیے تھا۔ جب مومنہ نے بتایا کہ تم اٹھ گئی ہو تو سوچا ساری رات طرح طرح کی سوچیں تمہیں پریشان کریں گی تو کیوں نہ کچھ دیر تم سے بات کروں۔ تاکہ دونوں کو اچھی نیند آنا چاہیے۔"

وہ چپ بیٹھی رہی۔

"وجہ مجھے بھی نہیں پتا لیکن تم جو فیصلہ کرو گی میں اس سے نہ صرف اتفاق کروں گا بلکہ نبیل بھی اس

فیصلے کو مانے گا اور اسے ماننا پڑے گا یہ میرا تم سے وعدہ
ہے لیکن کچھ بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اک بار سوچنا
کہ میں اور نبیل نئے تعلق کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔
مومنہ اور سعید بھی اور..... اور خود تمہارا اپنا دل بھی۔"

جانتی ہو تمہاری ماں اور میری یہی خواہش تھی
لیکن نبیل کی بے جا ضد سے مجبور ہو کر میں نے اس کی
بات مان لی تھی۔ مجھے دکھ دینے کے لیے اس نے مجھ
سے ضد باندھی تھی۔ خدا گواہ ہے میں نے کبھی اسے
بددعا نہیں دی لیکن میں جانتا تھا کہ میرے بیٹے جیسے
نفیس ذہن کا مالک صدف جیسی لڑکی کے ساتھ گزارا
نہیں کر سکتا لیکن..... خیر..... تم یہ بالکل مت سمجھنا کہ
میں اپنے بیٹے کا وکیل بن کر آیا ہوں۔ میں صرف چند
حقائق شیئر کرنا چاہتا ہوں۔

بسمہ خالصتاً" میری اپنی پسند تھی لیکن گھر والے
نہیں مانے۔ سب کو یہی لگتا تھا کہ چار دن کا فتور ہے
میری محبت..... شادی کے بعد میں نے نبیل کی ماں کو
بہت عزت دی۔ بہت مان دیا..... نہیں دے سکا تو وہ
تھی محبت۔ میں بے بس تھا۔ پھر جب اسپتال میں مجھے
تم لوگ ملے تو مجھے پتا چلا تمہارے ابو کی وفات کا "بسمہ
کو ایک بار میں کھو چکا تھا۔ دوسری بار اگر قسمت نے
موقع دیا تھا تو میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ سچ کہوں تو
مجھ میں حوصلہ ہی نہیں تھا۔ میری ہر پیش قدمی پر وہ
میری حوصلہ شکنی کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک روز
اسے میری قسمت بننا پڑا۔

میں نے اسے بے حد محبت دی۔ عزت دی.....
لیکن اسے عزت دلوا نہیں پایا۔ وجہ ہمارا معاشرہ..... وہ
معاشرہ جو نام نہاد اسلامی ہے۔ اسلام چار شادیوں کی
اجازت دیتا ہے اور معاشرہ دوسری شادی بھی قبول
نہیں کرپاتا۔ دوسری شادی کرنے والوں کو آج بھی اس
طرح دیکھا جاتا ہے۔ جیسے ناجائز تعلق میں بندھے
ہوں۔ یہی احساس بسمہ کو اندر سے ختم کر گیا۔

میرا بیٹا اسی معاشرے میں پلا بڑھا ہے۔ جہاں کوئی
بھی دوسری شادی کرے اسے غلط نظروں سے ہی دیکھا
جاتا ہے۔ مصلحت آڑے آئے تو دل سے برا سمجھا
جاتا ہے اور بات جب اپنی ماں، بہن، بیٹی کی آجائے تو
دوسری شادی کو اک ناقابل معافی جرم تصور کرلیا جاتا
ہے۔ ناجائز تعلقات کو معاف کردیا جاتا ہے۔ بعد ازاں
بھلا بھی دیا جاتا ہے لیکن دوسری شادی سانسوں کو ختم
ہونے تک اک گالی کی طرح ساتھ رہتی ہے۔

نبیل اک حساس بچہ تھا۔ اس معاشرے کے زیر
اثر اس نے یہی سوچا کہ اس کی ماں کے ساتھ زیادتی
ہوئی ہے۔ وہ مجھے مجرم تصور کرتا تھا اور میرے ساتھ
بسمہ اور تمہیں بھی۔ تم دونوں کو اس گھر میں لے کر
آنا میری زندگی کی ناقابل تلافی غلطی تھی۔ نبیل کی
باتوں نے تمہیں مجھ سے دور کردیا۔ میں جانتا ہوں۔
پہلے میرے تحائف پر تمہاری آنکھوں میں اک ممنون
سی چمک ابھرتی تھی جو بعد میں احسان کے اندھیرے
بن گئی۔ تم مجھ سے میری لائی چیزوں سے کترانے لگیں
بسمہ پریشان ہوتی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ
تمہیں اپنا راستہ کھوجنے دو۔ خود اپنی ذات تک پہنچنے
کی کوشش کرنے دے۔ ہم دونوں اگر تمہیں اپنی
مرضی سے بنانے کی کوشش کرتے تو تمہاری مزاحمت
تمہارے خدوخال بگاڑ دیتی۔ ہم نے اپنے تئیں
تمہاری راہ ہموار کی۔ تمہیں وہ سب کرنے دیا جو تم
چاہتی تھیں۔ کبھی بڑے پن کی دھونس جما کر کیوں؟
کیا؟ جیسے سوال نہیں اٹھائے۔ ہاں یہ دکھ ضرور ہوتا تھا
کہ تم نے خود کو تنہا کرلیا ہے۔ اپنی طرف سے تم نے
خود کو ہم سے توڑ لیا تھا۔" وہ سانس لینے کو رکے۔

"لیکن بھلا بچے بھی ماں باپ سے علیحدہ ہو سکتے
ہیں؟ مجھے تم ایسے ہی عزیز تھیں اور ہو جیسے میری اپنی
بیٹی۔ ہاں میں شرمندہ ہوں جب تم پر بدکرداری کا الزام
لگا تب میں خاموش رہا۔ وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے تم پر
اعتبار نہیں تھا۔ اعتبار کی بات تو بعد میں آتی ہے مجھے
پتا تھا تم جیسی سلجھی اور باکردار لڑکی اتنی پیچ حرکت نہیں
کرسکتی لیکن بنا کسی ثبوت کے میں تمہارے حق میں
بولتا تو تنگ دل تمہارے لیے گھیرا مزید تنگ کردیتے۔
میری غلطی ہے۔ مجھے بولنا چاہیے تھا۔ بنا ثبوت کے
بھی مجھے بولنا چاہیے تھا۔ میں شرمندہ ہوں۔ مجھے

معاف کرو بیٹا۔۔۔" انہوں نے ہاتھ جوڑے تو بے اختیار اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

"بیٹی کہہ کر معافی مانگتے ہیں؟ مجھے شرمندہ نہ کریں۔"

نظر بھر کر اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔ "مجھے شرمندہ ہونا ہی چاہیے۔ میں نے دعا کی تھی کہ اللہ تمہیں پاک دامن اس گھر سے رخصت کرے اور دیکھو اللہ کی ذات نے کیسے تم کو پاک ثابت کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ نبیل صدف کو طلاق دے۔ لیکن طلاق ہو گئی۔ میں کبھی نبیل کے لیے تمہارا ساتھ چاہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اپنی اس خواہش سے میں بہت پہلے دستبردار ہو چکا تھا لیکن قربان جاؤں اس ذات کے جس نے تمہیں ذریعہ بنا کر دلوں کے میل صاف کیے۔

تمہیں مان لینا چاہیے کہ ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوا۔ یہ اللہ نے لکھا ہے۔ تمہارا رشتہ اللہ نے جوڑا ہے۔ ظاہری تعلق کے پس پشت تم دونوں اک دوسرے کی ذات تک پہنچے ہو۔ اور ذات تک راستے یوں ہی نہیں ملا کرتے اور نہ ہی ہر کسی سے ملا کرتے ہیں۔ میں اپنی غرض اور چاہت اک طرف رکھ کر تمہیں اس تعلق سے آزاد کروا کے نئی جگہ نئے تعلق سے باندھ دوں تو کیا گارنٹی ہے وہاں کوئی تم تک تمہاری ذات تک پہنچے گا۔

تم نے خود کو پہلے بھی تنہا کر لیا تھا اور پھر اب وہی کرنے جا رہی ہو۔ اور اک بات۔۔۔ تم چلی جاؤ تو دعا کے لیے اور کوئی نہیں آئے گی؟ کیا وہ بھی حوریہ کی طرح تنہا جیے گی۔"

"اللہ نہ کرے۔" نہایت سرعت سے اس نے جواب دیا۔

"میری باتوں پر غور کرنا اور پھر کوئی فیصلہ کرنا۔ بسمہ کی قسمت میں لکھنے والے نے یہی لکھا تھا۔ مرنے والوں کے پیچھے زندہ لوگوں سے بدلے نہیں لیتے۔" آخری فقرہ انہوں نے شگفتہ لہجے میں کہا تھا۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اب تم سو جاؤ۔۔۔ صبح ناشتے پر ملیں گے ان شاء اللہ۔ اللہ حافظ۔"

وہ گم صم بیٹھی رہی۔ وہ اتنا تھک چکی تھی کہ اتنے سوالوں میں سے کسی ایک کا بھی جواب نہیں ڈھونڈنے کی کوشش نہ کر سکی۔ صد شکر کہ نیند نے ترسایا نہیں۔

صبح جب آنکھ کھلی تو اذان ہو رہی تھی۔ وہیں بستر پر بیٹھ کر اس نے اذان سنی۔ نماز کے لیے وضو کرنے گئی تو آئینے پر نظر پڑتے ہی جانے کیوں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ساری رات پُرسکون سونے کے بعد اب وہ تازہ دم ہوتی لیکن جانے کیوں دل گھٹا ہوا سا تھا۔ نماز پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ تو اٹھا لیے لیکن مانگا کچھ بھی نہیں گیا۔ خالی ہتھیلیوں کو تکتے رہنے کے بعد بے بسی کے احساس سے وہ پھر رو پڑی۔

کیا ہو جاتا اگر وہ اس کا محرم اور محرم ذات نہ ہوتا؟ کیا ہو جاتا اگر اس کا محرم اور محرم ذات کوئی اور ہوتا؟ رونے کی انتہا تک جا کر جانے کیسے دل پر سکون ہو گیا تھا۔ جائے نماز لپیٹ کر وہ لان میں چلی گئی صبح کی ٹھنڈی تازہ ہوا ہر موسم ہر موڈ میں اس کی پسندیدہ رہی تھی۔ ننگے پاؤں چند قدم نم آلود گھاس پر چلنے کے بعد وہ بادام کے پیڑ سے کمر ٹکا کر زمین پر ہی بیٹھ گئی۔

"تم یہاں بیٹھی ہو اور میں تمہیں پاگلوں کی طرح اندر ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔" اس نے حیرت سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

"اب ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ بہت پیارا لگ رہا ہوں؟" اس نے اتنے اشتیاق سے پوچھا تھا کہ اس نے ایک دم نظر کا زاویہ بدل لیا۔

"نہیں مجھے کوئی مسئلہ نہیں دیکھتی رہو۔۔۔ حق ہے تمہارا۔ بلکہ صرف تمہارا ہی حق ہے۔"

کیسی باتیں کر رہا تھا وہ اس سے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا وہاں۔ اس نے تیزی سے وہاں سے اٹھنا چاہا لیکن

نبیل نے اس کا ارادہ بھانپ کر ایک سیکنڈ سے پہلے اس کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس حرکت پر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

"پہلی بار نہیں چھوا تمہیں۔ رات جب خوشی سے بے ہوش ہو گئی تھیں تو میں نے ہی تمہیں اپنی بانہوں میں بھر کے۔"

"پلیز اسٹاپ اٹ۔" اس نے جھٹکے سے ہاتھ کھینچ کر بات کاٹی۔ "آپ کے لیے مذاق ہے یہ سب؟......" وہ ابھی اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن آنسو بہنے لگے تو اسے چپ ہونا پڑا۔

"میرے لیے کبھی کچھ مذاق نہیں رہا۔ اگر تم مجھے اپنے ماں کے سوتیلے رشتے سے جاننا چاہ رہی ہو تو ہاں میں انتہائی نفرت کرتا تھا اس دوسرے رشتے سے۔ اگر تمہارے لیے تمہاری ماں کو تکلیف دینے والے کو معاف کرنا ممکن ہے تو کیا مجھے میری ماں کے لیے کوئی جذبہ رکھنے کا حق نہیں؟

میں شروع سے ہی پاپا سے زیادہ اٹیچ تھا لیکن ان کی دوسری شادی نے مجھے ان سے دور کر دیا۔ مجھے بٹے ہوئے رشتے پسند نہیں۔ میں بغیر رشتوں کے رہنے کو زیادہ ترجیح دوں گا بہ نسبت بٹے ہوئے رشتوں کے اور اگر تم مجھے اپنے شوہر کے حوالے سے جاننا چاہ رہی ہو تو میں قسم کھا سکتا ہوں کہ ۔ تمہارے علاوہ مجھے کوئی اتنا نہیں جانتا۔" بات ختم کر کے وہ اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔

"شمائل...... صرف ایک بار سب دن بھلا کر وہ راتیں یاد کرنا جو ہم دونوں نے بے خواب رہ کر خوابوں میں گزاری ہیں۔ سچ بتاؤ تمہیں نہیں پتا میں کتنا چاہتا ہوں تمہیں؟ چلو میرا چھوڑو اپنا بتاؤ۔ اپنا تو تم جانتی ہی ہو ناں کتنا چاہتی ہو مجھے......" اس کی جذبوں سے بوجھل آواز نے اسے پتھر کیا ہوا تھا۔ "کاش میں یہیں مر جاؤں۔ کیسے رہ سکتی ہوں میں اس شخص کی محبت اور اس شخص کے بغیر۔" شدت کرب سے اس نے آنکھیں موند لیں۔

"مان جاؤ پلیز ضد چھوڑو اب...... چھوڑ دو خود کو اور مجھے سزا دینا......" وہ اس کے اتنا قریب کھڑا تھا کہ اس کے وجود کی مہک اسے اپنے وجود پر چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"مان جاؤ ناں۔ ورنہ شادی کا ڈریس اورنج کلر میں لے آؤں گا۔" اس نے تیزی سے بات پلٹی۔ حوریہ نے ایک بار اسے بتایا تھا کہ اسے اورنج کلر بہت برا لگتا ہے۔

"میں بھی شادی نہیں کروں گی۔" اس نے بھی تیزی سے جواب دیا تھا۔ پھر اسی تیزی سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

نبیل کے چہرے پر پر سکون سی چمک اور خوب صورت سی مسکراہٹ تھی۔ "یعنی اورنج کے علاوہ کوئی اور کلر لے آؤں تو شادی کرو گی۔؟ ویسے شادی کا تکلف کیوں کرنا۔ وہ تو ہو چکی اور رخصتی تو تم یوں بھی سادگی سے کرنا چاہ رہی تھیں اور پاپا...... انہوں نے بھی اجازت دے دی تھی کہ تمہیں کمرے میں لے جاؤں۔ وہ مسکرا رہا تھا اور وہ خفت آمیز تاثرات سجائے زمین کو گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا جو نبیل نے سرعت سے ہاتھ آگے کر کے ہاتھ پر لے لیا۔

"بہت برے ہیں آپ......" اب اس کی بات میں تکرار نہیں تھی۔

"جو بھی ہوں، جیسا بھی ہوں...... تمہارا ہی ہوں۔" آگے بڑھ کر اس نے حوریہ کو پہلو سے لگا لیا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

نبیل نے نرمی سے اس کے گال صاف کیے۔

"وعدہ کر رہا ہوں کبھی میری وجہ سے یہ آنسو نہیں بہیں گے۔" اس نے خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔

"بندہ رومانس تو کمرے میں جا کر کرے" ٹیرس پر کھڑے پاپا نے کہا تو وہ ایک دم اس سے دور ہوئی۔

"پاپا" نبیل نے منہ بسورا تو پاپا اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسنے لگے۔

☆

ایمل رضا

کال بیساکھی

پیاری زارا!

امید ہے خیریت سے ہوں گی۔

تمہارا شکوہ بجا کہ تمہارے خط دو سے تین ' تین سے چار ' پھر چار سے پانچ ہوگئے اور میرے نوک قلم نے اتنی جنبش نہ کی کہ میں تمہیں سادہ کاغذ پر انگوٹھا چھاپ کر جوابی رسید کے طور پر ہی بھیج سکتی۔ لیکن یقین جانو۔ اس کوتاہی کے پیچھے تمہیں نظرانداز کرنا یا کمی وقت ہرگز پنہاں نہیں۔ تمہارے خطوط ابھی بھی میرے لیے اس پھوار کی طرح ہیں جس کے لمس کو چمن میں کھلنے والے گل ہی محسوس کرسکتے ہیں۔

اور وقت کی کمی کا ملال بھی کیا کروں' لگتا ہے کہ میرا دور جیسے مجھ سے کھو گیا اور اب میں دوسری دنیا میں بوکھلائی سی پھرتی ہوں یا جیسے اکثر انسان جیٹھ کی دوپہر میں سو کر سرشام اٹھے اور باہر غروب ہوتے دن کو دیکھے تو محسوس ہوتا ہے کہ دنیا لٹ گئی۔ وہ سوتا رہ گیا اور وقت کہیں دور۔۔۔ سرپٹ بھاگ گیا۔

تمہارے پہلے خط کا جواب دینے کے لیے جو گوشۂ تنہائی مجھے درکار تھا۔ وہ مجھے پچھلے ماہ میسر تھا۔ ستمبر کے آخری عشرے میں۔ وہی عجیب بے کل سے دن۔۔۔ جیسے مرتبان میں بند کرکے کوئی سانسیں گھونٹ رہا ہو۔ ایک جاتے اور دوسرے آتے موسم کا درمیانی وقت۔۔۔ وحشت بھرا۔۔۔ خودکشی پر اکسانے والا۔ میں ابھی خط کی ابتدائی سطریں ہی لکھ سکی تھی کہ وہ گوشۂ تنہائی اچانک افتاد اور زلزلے کے باعث مجھ سے ادھر ادھر ہوگیا۔ مانو جیسے مٹی کے فرش پر سوئی گر جائے اور پھر مل کے نہ دے۔ یا جیسے بوڑھی نانیاں' دادیاں اپنے پہلے نواسے' پوتے کے جھنڈ کے بال پرانے کپڑے کے چیتھڑے میں لپیٹ کر رکھتی ہیں اور پھر رکھ کر خود بھی بھول جاتی ہیں۔

میری طرح وہ خط بھی وکرم بیتال کی کہانیوں کی طرح آدھا ادھورا رہ گیا۔ (معذرت چاہتی ہوں۔ وہ خط چاہ کر بھی مکمل نہ کرسکی اور تمہیں نیا خط لکھنے بیٹھ گئی۔) ایک آندھی جو چلی تو وہ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کال بیساکھی بن گئی۔

تمہیں یاد ہوگا۔ ایک بار جب تم ہمارے گھر رہنے آئی تھیں اور تم نے پچھلے کمرے کی صفائی اپنے ذمے لے لی تھی۔ تین گھنٹے بعد جب تم باہر نکلی تھیں تو کمہاروں کے چاک کی طرح مٹی مٹی ہورہی تھیں۔

"اللہ۔۔۔ تھکا دیا تمہارے کمرے کی صفائی نے تو۔۔۔ حالانکہ میں تو پورے گھر کی صفائی کرتے نہیں تھکتی۔ اتنی دھول' اتنی مٹی۔۔۔"

تم نے گندے پانی کی بالٹی اور پرانے سویٹر کا پانی سے تر بتر پوچا باہر صحن میں لاکر دے مارا تھا اور تھکن کے مارے خود بھی وہیں بیٹھ گئی تھیں۔ اماں' رضیہ باجی' میرا اور اقرا کا ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا تھا۔

"لگتا ہے کال بیساکھی تمہارے گھر پڑاؤ کرتی ہے۔" تم نڈھال تھیں۔

پھر میرے استفسار پر تم نے بتایا تھا کہ بیساکھ کے مہینے میں میدانی علاقوں میں اٹھنے والی خوف ناک آندھی۔۔۔ جس میں بے تحاشا دھول ہوتی ہے۔ مٹی اور بھیانک آوازیں۔۔۔ اور جو انتہائی تیز رفتار ہوتی ہے اسے کال بیساکھی کہتے ہیں۔

تب میرے دل میں اچانک سے خیال آیا تھا کہ یہ خوف ناک آندھی میدانی علاقے سے مستعار لی مٹی'

دھول یقیناً ”نشیبی پہاڑی یا اونچائی والے علاقوں پر جاکر ٹھہراتی بھی ہوگی۔ یہ آندھی کہیں تو رکتی ہوگی۔ کہیں تو ٹوٹتی ہوگی۔ چاہے اپنے آغاز پر ہی۔ پھر وہاں کے مکینوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ اتنی دھول مٹی میں کیا وہ قبروں کا ذائقہ نہیں چکھ لیتے ہوں گے۔

میں جنم جلی، کرم جلی۔۔۔ خیالات اور سوچ جلی بھی۔۔۔ کہاں جانتی تھی کہ ایسی باغیانہ باتیں، نادان لڑکیوں کو نہیں سوچنی چاہئیں۔ تقدیر ظرف دیکھ لیتی ہے اور پھر ان ہی حالات سے دوچار کردیتی ہے۔

”تمہارے ادھر سڑک نہیں نہ بنی ہوئی۔ اس لیے دھول بہت اڑتی ہے۔“ رضیہ باجی نے تمہیں وضاحت دی تھی۔ لیکن یہ وضاحت تمہارے چہرے سے دھول اور تھکن نہ اتار سکی تھی۔

تمہیں تو پتا ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے کی سڑک

مدتوں سے چوڑی پگڈنڈی بنی رہی ہے... آدھی کیچڑ، آدھی پتھر اور تھوڑی کوڑے کرکٹ سے بھری... ہوا کا تیز جھونکا یا کسی مسافر گاڑی کا ہلکا سا فراٹا اتنی دھول اڑاتا جیسے بہار کی آمد پر ڈوڈیاں پھٹتی ہیں اور رواں رواں چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔ گرد اندر فرنیچر کی درازوں تک میں بھر جاتی تھی۔ اسی باعث تو علاقے کے لوگ اپنے کھڑکیاں دروازے بند رکھتے تھے۔ لیکن اب سڑک بن گئی ہے۔ دھول، مٹی، گرد نہیں اڑتی، ہوا نے نمی کو سمیٹ کر ماحول کو بارش کے بعد کی طرح صاف ستھرا کر دیا ہے۔ پھر بھی عجیب بات ہے۔ کواڑ نہیں کھل رہے، کوئی اتنی ہمت ہی نہیں کر رہا۔ سب جیسے اسی مٹی کے عادی تھے۔ کنویں میں بند تھے۔ نیند ٹوٹی تو بدحواس ہو گئے۔

اس سڑک کی بدحالی کی وجہ دو سیاسی پارٹیوں کا آپس میں جھگڑا تھا۔ دونوں اسی کوششوں میں رہے کہ سڑک ان کی زمینوں کے آگے سے گزرے۔ تاکہ ان کی زمینوں کی قیمتیں بڑھیں۔ پتا نہیں دونوں کا مقصد اپنی اپنی جاگیروں کا شملہ اونچا کرنا تھا یا دوجے کا نیچے گرانا۔ اسی چکر میں سال پہ سال، دن پہ دن بارش کے قطروں کی طرح ایک پر ایک کرتے رہے۔ لوگ بھی چھچھوندر، گیدڑ نے اس سارے معاملے سے لاتعلق رہے۔ پھر شاید اللہ کو ہی رحم آ گیا۔ سڑک بن گئی۔

کیچڑ، گارے، دھول، کوڑے کے اوپر بجری ریت اور روڑے کی تہہ بچھائی گئی۔ پھر تار کول کا لیپ کر کے بلڈوزر پھیرا گیا۔ کناروں کناروں پر پیلے پینٹ کی پٹی بھی بچھائی گئی۔ پچھلے ماہ 24 ستمبر کو اسی سڑک کا افتتاح تھا خوب رونق رہی۔ تنبو قناتیں لگائی گئیں۔ سیاسی گروپ کی جانب سے دیگیں چڑھیں۔ علاقے والوں نے ایک روز میلے کا مزہ لیا... ہولی کھیلی گئی۔

پورا علاقہ اپنے اپنے گھر فراموش کر کے باہر سڑک پر نکل آیا۔ میں نے اسی رازداری والی تنہائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تمہیں جوابی خط لکھنے کے لیے کاغذ قلم سنبھال لیا اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ صرف ابتدائی سطریں ہی لکھ پائی تھی کہ... سب گھروں کو واپس ہوئے اور تب نجانے کیوں میں نے گھر سے باہر نکلنا چاہا کہ میں بھی باہر جا کر دیکھوں کیا ہو رہا ہے۔

"تو کہاں جا رہی ہے؟" اپنے پیچھے مجھے اماں کی پکار سنائی دی۔

"میں... باہر... وہ..." نجانے بعض اوقات مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میرا اندر فوجی جنرل کی طرح پُرتحمل ہونے کے بجائے اس ادنیٰ سپاہی کی طرح کا ہو جاتا ہے جو حالات و واقعات پر اپنی حیثیت سے بڑھ کر جلتا کڑھتا ہے۔

"تیرا کیا کام باہر...؟" اس بار ابا گرجے۔

ابا اماں دونوں نساور کے جوڑے کی مانند ہیں۔ نرم گرم، خوش رنگ، روئی دار، اور میں اس نساور کے جوڑے کی اولاد ہوتے ہوئے بھی چیل کا روپ دھار گئی۔ تیز پنجوں اور غصیلی آنکھوں والی چیل کا روپ... میرے اندر کی ساری نوکیں میری زبان پر اگ آئیں۔ اور ابا نے ایک پورے ہاتھ کا طمانچہ میرے منہ پر دے مارا۔

تجھے تو پتا ہے نازارا... میرا ابا کیسا شفیق، کیسا مہربان قسم کا انسان ہے۔ عجوہ کی طرح بے شک و شبہ میٹھا... ہم تینوں بہنوں اور اماں سے انہوں نے کبھی تیز آواز میں بات نہیں کی۔ اپنے ہی گھر میں دستک دے کر داخل ہوتے ہیں۔ اماں کا تو وہ ایسے احترام کرتے ہیں جیسے وہ ان کی بیوی نہیں بلکہ استانی ہوں اور استانی بھی حفظ و ناظرہ والی... نظریں جھکائے رکھتے ہیں ان کے آگے۔ آپ جناب سے بات کرتے ہیں۔ ابا اپنی ساری کمائی اور بازار سے لایا سودا سلف اماں کے ہاتھ پر ایسے رکھتے ہیں۔ جیسے کوئی فرماں بردار بیٹا اپنی ماں کے آگے جھکتا ہی چلا جائے۔ دونوں کی محبت پنجابی کڑھائی کی طرح بڑی واضح واضح ہے۔

ابا کی سست چال میں عاجزی ہے۔ سرمہ لگی آنکھوں میں اطمینان قلب اور بھیگے ٹپ ٹپ کرتے لہجے میں قرب الٰہی کا خواب... ابا ان پرندوں میں سے ہیں جو کبھی ہجرت نہیں کرتے۔ کونے میں دبکے وہ ہر مصیبت ہر پریشانی کو رضائے خداوندی سمجھ کر سہہ جاتا

چاہتے ہیں۔ ابا کے ماتھے کا محراب ہمارے گھر کا علم بنا ہوا ہے۔ یہ آدھ انچ کا سیاہ گول نشان ہمیں اپنے محلے، علاقے، خاندان، برادری میں دیوار کے درخت کی طرح ممتاز کردیتا ہے۔ مجھے اکثر لگا کہ رشتے داروں کے گھروں میں ہماری عزت افزائی میں اس محراب کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ ہمارے ناموں میں بھی بنت کے بعد ابا کا نہیں۔ بلکہ اس محراب کا ذکر ہی ملتا ہے۔

عزت، قدر، مرتبہ، حکمران، توقیر، وارث، سرپرست ابا بیک وقت ہمارا بہت بڑا اثاثہ ہیں۔

گھر میں تینوں بیٹیوں کی ایک کے بعد ایک پیدائش کے بعد بھی انہوں نے کبھی بیٹے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ جب کبھی کوئی بے تکلف آس پاس والا اس طرف اشارہ کرتا تو ابا آڑو کی گوند جیسی لجلجی سی مسکراہٹ کے ساتھ بات ٹال دیتے۔ یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چار بیٹیوں کی پیدائش کے بدلے جنت کمانے والا واقعہ بیان کرتے۔ یہ واقعہ ہر آئے گئے کو بہت بار سنایا جا چکا تھا۔ اور سب کو باور بھی کروایا جا چکا تھا۔ جو سنتا سر دھنتا اور ابا کے عجز کو مزید ایک نمبر آگے کا مرتبہ دے جاتا۔

بہن بھائیوں میں چھوٹے ابا، خاندان میں بہت بڑے بن گئے۔

اس واقعے میں رتی، تولے، ماشے کا حساب کتاب بہت پہلے شاید چھوٹی اقرا کی پیدائش کے وقت ہی لگا لیا گیا تھا۔ اور اب اسے ایسے سنایا جاتا ہے جیسے ماہر سنار زیور کی پوری پوری قیمت نکالتا ہے۔ نہ ادھر نفع نہ ادھر نقصان یا جیسے موسموں کا تغیر رک جائے اور ہر سال گندم کی کی فصل ایک جیسی ہو۔ اضافے سے مبرا، فقدان سے پرے۔

ابا اکثر افسوس بھی کرتے کہ ان کے گھر چوتھی بیٹی کیوں نہ ہوگئی۔ وہ ایک درجہ پیچھے کیوں رہ گئے۔ ایسے موقعوں پر اماں انہیں میت کے سرہانے بیٹھنے جیسا دلاسا دیتی ہیں۔ کہ جنت کا وعدہ تو تین بیٹیوں کی پیدائش اور تربیت کے بدلے بھی ہے، دو اور ایک کے بدلے بھی۔۔۔ پھر آپ کیوں افسوس کرتے ہیں؟

میری اماں بڑی ہی دار قسم کی عورت ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کا گھر پہاڑ کے نظر نہ آنے والے غار کے اندر ہے۔ جہاں بارش، سردی گرمی کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ وہ مشکلات و آفات میں دل سے تسبیح پھیر لینے کے بعد اللہ پر کامل یقین رکھنے والی عورت ہے۔ شکر گزاری اس کے سر کے بالوں کی اگلی سفید جڑوں کی طرح اس کے چہرے سے ہر وقت جھلکتی نظر آتی ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں اس زعم کی تاپ ہے کہ اس کا مرحوم بھائی مشہور ادارے میں قرآن مجید لکھا کرتا تھا۔

ابا نے جو دیا۔ جتنا دیا۔ اماں نے ہمیشہ اسی میں گزارا کیا۔ کبھی خواہشوں کو مارنے اور سوکھی نگلنے والی فضا گھر میں قائم نہیں ہونے دی۔ اماں کو فلکیوں کے ڈبے میں ہاتھ ڈال کر سارے دھاگے سلجھانے کا فن آتا ہے۔

ابا اماں دونوں میں وہ فرق ہے۔ جو چیری اور بیری میں ہوتا ہے۔ ابا کے منصب پر آنچ برابر کی کمی کردو تو اماں کی حیثیت نکل کر سامنے آجاتی ہے۔ جو کہ ایک "مقرب" کی سی ہے۔ ہمارے گھر میں روز رات کھانے کے بعد اکثر میٹھی سویّوں کے ساتھ وعظ بھی ملتا ہے۔ خطیب ابا اسلامی تاریخ، فتوحات، غزوات، مذہبی، دل گداز و دل کش، واقعات اس ترکیب سے سناتے ہیں کہ ہم سب کی آنکھیں اشک بار، دل روئی کے پھائے جیسے بے وزن اور چہرے ایسی صورت اختیار کرلیتے ہیں جیسے مدتوں سے مسکرا کر نہیں دیکھا۔

"مقرب اماں" اپنے فرائض اگلے دن انجام دیتیں۔ اپنے راج کی پرات میں گوندھے آٹے سے پیڑا پیڑا لیتی کڑیوں سے کڑیاں ملاتی وہ شوہر اور بیوی کے رشتے پر جا کر چولہے میں آگ بھڑکاتیں۔

"اللہ کے بعد اگر کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو بیوی کو حکم ہوتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔" بات جتاتے اماں ہارے ہوئے جواری کی طرح کنگال نظر آتیں۔

"ہائے رضیہ! میں تو دل ہی دل میں اکثر اللہ سے یہ

شکایت کرتی ہوں کہ پھر یہ اجازت دے کیوں نہ دی؟ میں تو تیرے ابا کے آگے سے پھر شاید سجدے سے اٹھتی ہی ناں.... "اماں اپنے شکوے کی مدھم سُروں کی بین تان اٹھاتیں اور رضیہ باجی بڑی مہارت سے اسے تاسف کے لحاف میں لپیٹ دیتیں۔

رضیہ باجی بھی پوری اماں کی نقل ہیں۔ صبح اکثر چولہے کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہوئے مجھے اس بات کا احساس تک نہ ہو پاتا کہ دو دو اینٹ جوڑ کر بنائے گئے چولہے کے پاس آج اماں بیٹھی ہیں کہ رضیہ باجی....

"لعنت بھیجی گئی.... جو ماں باپ کو بڑھاپے میں پائے اور ان کی خدمت کر کے جنت نہ کما سکے۔" باجی رضیہ پر اماں ابا کا خوب اثر ہوا ہے۔ وہ ابھی سے اپنے عہدے کی تیاری کرتی اپنی عمر سے میل کھاتے واقعات ازبر کرنے لگی ہیں۔

باجی رضیہ میں ایک وصف خوب ہے۔ وہ باتوں سے آنکھوں کی جھڑی نہیں لگواتیں۔ بلکہ لہجے سے اوس نچھاور کرتی ہیں۔ جیسے مقفعہ اکثر پانی پلاتے' پنکھا جھلنے کے ساتھ ساتھ کسی خاص محفل پر عطر کا مینہ برساتا بھی نظر آتا ہے۔ اور اس کے جیسے تیسے لباس' حلیے کو غیر اہم جانتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی حرکت سے نکلتی یہ ننھی ننھی بوندیں بڑی مقدس لگتی ہیں اور انہیں سمیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔

رضیہ باجی مذہبی مدرسے کا طاقچہ ہیں۔

ابا' اماں' رضیہ باجی تینوں اجتماعی طور پر اس آرزو کے ساتھ نتھی ہیں کہ کوئی معجزہ ہو۔ کوئی درویش اپنی کرامت دکھاوے۔ کچھ وقت کی حدود سے ہٹ کر ظہور ہو اور وہ چودہ سو سال پہلے چلے جائیں۔ نبی آخری الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کریں۔ ان کے ساتھ ہجرت کی صعوبتیں کاٹیں۔ غزوات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ تینوں عجائب گھر کا وہ خفیہ گوشہ ہیں جہاں اسلامی ورثے کے نمونے بڑے شان کے ساتھ رکھے جاتے ہیں اور جہاں ہر خاص و عام کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔

رفتہ رفتہ میں بھی اسی عجائب گھر کا ایک ٹوٹا پھوٹا' کچا پکا جھروکا بننے جا رہی تھی۔

پتا نہیں اچانک کیا ہوا۔ کل سیاہ دیوار میں روشنی کا آنکھ کسی کوتاہ اندیش مستری نے کیوں کر چھوڑ دیا۔ یا بانس کا وہ ڈنڈا ہی سازشی تھا جو خود رونمائی کی بنتی چٹان میں "وہ" کا حصہ تو بن گیا تھا۔ لیکن پھر بڑی چالاکی سے اپنے حصے کا سوراخ چھپا گیا اور اس کے پیچھے کا سورج نظر آیا بھی تو مجھے میں صرف گھپ اندھیرا دیکھنے کی عادی تھی۔ اپنی ذات کا بھیانک پن مجھ پر اسی وقت آشکار ہوا۔

چھوٹی اقرا کہتی ہے۔ تاریکی وسوسے کی طرح انسان کے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ پھر بڑھتے بڑھتے بصارت' بصیرت' سماعت' نظریے' سوچ' خیالات ہر چیز پر حاوی ہو جاتی ہے۔

اقرا نہیں دیکھتی کہ اگلے کا ضمیر ایسی بھاری باتوں کو سہارنے جوگا ہے بھی کہ نہیں۔ اس کی باتوں کی کیاری ڈرانے' دم گھونٹنے والے بیجوں سے ہی پروان چڑھتی ہے۔ خود بھی کھجور کے پتے کی طرح ہے۔ سخت اور نوک دار' جنگل کی کسی پر جاتی کے ساتھ جس کا میل نہیں ہوتا اور اپنی اسی خامی کے باعث وہ اکلاپے کی زندگی گزارتا ہے۔ شاید باجی رضیہ کا اقراء کو پرائیویٹ اسکول میں داخل کروانے کا فیصلہ ہی غلط تھا۔

سردیوں میں گرم رضائی میں دبکے۔ مونگ پھلیاں چھیل چھیل کھاتے اور تسلے میں سوکھی لکڑیاں جلا کر آگ سینکتے ہوئے یا گرمیوں میں باہر صحن میں چھڑکاؤ کر کے خوب ٹھنڈ پیدا کر کے' چارپائیاں بچھا کر' سفید چادروں' گول تکیوں کے بستر لگا کر کھل کر سانس لیتے ہوئے۔ ابو کے وعظ کے وجدان میں جب جب بہتے' اقرا کو ایسے موقعوں پر ہمیشہ غیر حاضر پاتے۔

پڑھائی میں تو وہ اتنی اچھی نہیں ہے لیکن بس دوسری الٹی سیدھی کتابیں پڑھنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ لائبریری کارڈ بنوا رکھا ہے اس نے اور اس کا یہ ریکارڈ ہے کہ وہ موٹی سے موٹی کتاب ایک رات میں ہی ختم کر لیتی ہے۔ شروع شروع میں ابا اس کی کمی

کو برا محسوس کرتے تھے۔

"بھئی اقرا کہاں ہے۔۔۔ اس کو بھی بلالاؤ۔۔۔ کیا ہر وقت پڑھتی رہتی ہے۔ گھر والوں سے اتنی بے زاری اچھی نہیں۔"

میں ہی اقرا کے پاس جاتی۔

"تم چلو میں آتی ہوں۔" اور ایسے وقت میں اقرا مجھ پر حاوی ہو جاتی۔ مجھے لگتا میں اپنے سے چھوٹی اقرا سے نہیں بلکہ مرحوم دادی کی روح سے بات کر رہی ہوں۔ وہ آتی اور لپک لپک کر اس دریا میں غوطہ بھی نہ لگا سکتی جس میں میں، رضیہ باجی اور اماں پہلے سے ہی ڈوبی ہوتیں۔

"ابو جو باتیں بتاتے ہیں۔ وہ میں بہت بار کتابوں میں پڑھ چکی ہوں۔" اس کا عام سا لہجہ میری سماعت کو خود سر لگتا اور مجھے لگتا کھجور کے پتے کی نوک نے اس کی زبان کی جگہ لے لی ہے۔ کہاں ہم کہ ہماری اتنی ہمت نہ ہوتی کہ سرگوشی میں ابا کو بولنے سے ٹوکتے ہوئے کسی صحابی کا نام، جگہ، وقت وغیرہ کا پوچھ سکتے اور کہاں وہ تھی کہ روبرو مناظرہ شروع کر دیتی۔

"آج کا انسان فریب کار ہو چکا ہے ابا جی! لوگوں نے مقدس شخصیات کے واقعات ازبر کر لیے ہیں۔ ان واقعات کو سناتے ہوئے، سنتے ہوئے، ان پر سر دھنتے ہوئے وہ خود کو مقدس کرنے کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ ایک ایسی نیکی کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں ہیں جس کی رونمائی ان کی پوری حیات پر چھائی رہے اور بھینس کی گھنٹی کی طرح وہ اسے ہر دم بجاتے رہیں۔ ایک لوٹا پانی سے لوگ اپنی زندگی بھر کے گناہ دھو لینا چاہتے ہیں۔"

"عمل اللہ کی ہدایت ہے اقرا بیٹی! اور مذہب سے شناسائی ہمارا فرض۔۔۔ ذات کی تکمیل کے لیے اپنا فرض نبھانا ضروری ہوتا ہے۔"

"ہزاروں بون سائی بھی مل جائیں تو ایک جنگل نہیں بنا سکتے۔۔۔ آپ اقوال رٹ لینے کو ذات کی تکمیل کہہ رہے ہیں۔۔۔ ذات کی تکمیل کے لیے عمل کے پل صراط پر سے گزرنا ہوتا ہے۔ لیکن بدنصیب انسان نے مذہب سے منافق ہونے کو سرشت سمجھ لیا ہے۔ اور چھوٹی چھپکلی کر اس ہدایت کی آس لگائے پھرتا ہے جو اللہ نے اس کی فطرت میں پہلے سے ہی ڈال رکھی ہے۔" اقرا مجلد کتاب کے سارے صفحے ادھیڑ ڈالتی ہے۔

میرے ابا کی بڑی اچھی عادت ہے۔ ایک تو انہیں غصہ آتا نہیں۔ دوسرا آ بھی جائے تو وہ چہرے سے ظاہر نہیں کرتے۔

"تو کیا تم اپنے باپ کے بارے میں بھی یہ ہی سوچ رکھتی ہو کہ وہ عمل کے میدان میں صفر ہے۔" ابا پوچھتے۔

"لو بھلا کیا یہ عمل نہیں کہ انسان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق زندگی گزارے۔ گھر بار، آس پاس، رشتے داروں سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ عاجزی سے رہے۔" اماں بھی بولتیں۔

"عمل کا میدان حشر کے میدان کی طرح ہے۔۔۔ اس کا وقت، جگہ متعین نہیں۔۔۔ زندگی گزارنے کے بندھے اصولوں پر کاربند رہنے کو عمل نہیں کہا جا سکتا۔ ایک تو یہ اصول کسی نہ کسی شکل میں ہر معاشرے، تہذیب میں موجود رہے ہیں۔ دوسرا ان پر چلنا خود انسان کے لیے ہی فائدہ مند ہے۔ عمل تو وہ ہے کہ انسان برے وقت میں، آزمائش میں، جان، دولت، گھر بار کی پروا نہ کرتے ہوئے اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرے۔ بنا کوئی شکوہ کیے۔"

"جو ایسی ہی بات ہے تو تم دیکھنا اقرا بیٹی۔۔۔ کہ جب کبھی عمل کا وقت آیا۔ سلطان مجید اپنی جان کی پروا بھی نہیں کرے گا۔" ابا جذباتی ہو جاتے اور دو عالموں کی گفتگو میں ہم ایک عالم ابا کے حق میں ووٹ ڈال دیتے۔

بہار کی رخصتی کی طرح بڑی خاموشی سے۔ بنا چاپ کیے اقرا ہم سے دور ہو گئی۔ ہمارے ساگوان کے چوکھٹے میں وہ کیڑا لگنے لگنے کے پھوک کا ورق ٹھونکنا چاہتی تھی۔

"بس کتابوں نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔"

کتابوں نے کم اور اس ناس پٹی فرزانہ نے زیادہ۔۔۔ جس نے ماں باپ کی ناک کٹواتے ہوئے بھی ذرا نہ سوچا۔" رضیہ باجی نخوت سے ہاتھ چلاتی کہتیں اور مجھے ہنسی آتی۔ جو باتیں اقرا کہتی ہے۔ وہ بھلا فرزانہ کیونکر سوچ بھی سکتی ہے۔

فرزانہ ہماری پڑوسن ہے۔ گلی کے پچھلی طرف والی پڑوسن۔ جب تم یہاں آئی تھیں تو وہ رمضان کی نیاز دینے آئی تھی۔ سفید چنے والے چاول۔۔۔ شاید تمہیں یاد ہو۔ تب وہ چھوٹی سی بچی تھی۔ پھر اس کے جوان ہونے کی خبر پورے علاقے کو ہوئی۔

ویسے فرزانہ بڑی سیدھی سادی ہے۔ برہم بوٹی کی طرح پتلی اور سنہری۔۔۔ ملتی ہے تو بے غرض ہو کر۔۔۔ بات کرتی ہے تو ایسے جیسے کسی چیز کی محتاج نہیں۔

لیکن پچھلے دنوں اس نے ایک بہت بڑا گناہ کر لیا۔۔۔ بہت ہی بڑا' اس نے محبت کر لی۔ نکڑ والے چوک پر نصب۔۔۔ کھوکھے والے کریم سے وہ جذبوں کے ساتھ چھپن چھپائی کھیلنے کی عادی نہیں تھی۔ اس بات کا اور اک مجھے تب ہی ہوا۔

کریم اونچا لمبا پیارا سا لڑکا ہے۔ ویسے ہی جیسے دوسرے لڑکے جوانی میں ہوتے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ علاقے میں اس کا وجود رضائی کے استر کی طرح ضروری لیکن غیر اہم ہے۔ یہ پہلی کوتاہی تھی جو اس کے گلے پڑی اور اس کی محبت کو وہ زمزمہ سرائی نصیب ہوئی کہ وہ ہفت اقلیم کی طرح سب کو مطلوب ہو گیا۔

دونوں کی جوڑی ویسے بڑی اچھی لگتی تھی مجھے تو۔۔۔ لیکن میرے اچھا لگنے سے کیا ہوتا ہے۔ مسئلہ تو دونوں کے گھر والے تھے۔ جو اس رشتے پر راضی نہ ہوتے تھے۔ فرزانہ کے ابا کا مسلک کریم کے ابا کے مسلک سے بڑا زبردست ٹکراؤ کھاتا تھا۔ وہ تو اکثر کریم کے گھر والوں کو بے دین ہو جانے کا خطاب تک دے ڈالتے تھے۔ پھر ایسے خطاب والوں کو اپنی بیٹی کیونکر دیتے۔ پتا نہیں ان مسلکوں کو پیدا کرنے اور پھر پروان چڑھانے میں کسی کا کیا نفع نقصان جڑا ہوا تھا۔ اور پھر ٹکراؤ کرانے میں بھی کسی کو کیا تسکین ملتی ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے۔ ایک مذہب' ایک کتاب کو سب نے اپنے اپنے طریقے سے اس طرح پڑھا ہے کہ اپنی اپنی الگ مسجد بنا لی ہے اور ان مسجدوں کی تعداد اب لاتعداد ہے۔

یہ مسئلہ زحل کی گردش میں جکڑا' بڑے عرصے مشکلات میں گھرا رہا۔ لے دے ہوتی رہی۔ پھر ایک روز فرزانہ اور کریم دونوں محبت کے پجاری' ذات پات' مسلک کو نہ ماننے والوں نے نیا سورج طلوع کیا۔ پانچ گھنٹے کے لیے دونوں غائب ہوئے۔ واپس آئے تو دونوں نکاح کر چکے تھے اور کریم فرزانہ کو اس کے باپ کے حوالے نہ کرتا تھا کہ اب وہ اس کی بیوی ہے۔ تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ وہ دن ہمارے علاقے کے لیے کیسا ہو گا۔ مانو جیسے حلیم کی دیگ صبح سے رات گئے تک پکتی بھک بھک کرتی رہی ہو۔

"محبت چیز ہی ایسی ہے۔ بڑی انوکھی سی طاقت بھر دیتی ہے انسان میں۔۔۔ اب یہ زمانے اور وقت پر منحصر ہے کہ وہ اس طاقت کو کیا رنگ دیتا ہے۔ ہمت کا' جرأت کا یا بغاوت کا۔"

فرزانہ کے ابا جی بڑی بڑی کتابیں پڑھنے والے یہ ادنیٰ سی بات نہ سمجھ سکے جو انہیں مولوی صدیق صاحب نے سمجھائی اور پھر دونوں خاندانوں کو اس طرح سمجھائی کہ دونوں گھرانے گھڑونچی کے پانی کی طرح ٹھنڈے میٹھے ہو گئے۔

فرزانہ واپس اپنے باپ کے گھر آئی۔ تین دن بعد کریم کے گھر سے بارات فرزانہ کے گھر گئی اور فرزانہ کی کریم سے اعلانیہ رخصتی ہوئی۔

پورا محلہ مولوی صدیق صاحب کا عقیدت مند ہو گیا۔

مولوی صدیق صاحب ہمارے محلے کی مسجد کے امام ہیں۔ نیکی ان کے چہرے سے نور کی طرح برستی ہے۔ ہاتھ میں چھوٹی مروارید کی تسبیح' سر پر ٹوپی' اونچی شلوار' اس حلیے میں ان پر انسان نہیں فرشتہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ہلکے رنگوں کے کپڑے پہنتے ہیں۔ جن

میں وہ اپنی تسبیح کے موتی کی طرح چمکتے رہتے ہیں۔ بات سمجھانے کا فن تو ان کو واقعی بہت اچھا آتا ہے۔

رمضان کی طاق راتوں' شب معراج' شب برات' جب گھروں سے نیاز کی پراتیں دائیں بائیں جارہی ہوتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر ان کی مسجد میں عورتوں کے لیے پردے کا الگ سے انتظام کیا جاتا ہے۔ میں بھی ہر بار اماں اور رضیہ باجی کے ساتھ جاتی ہوں۔

مولوی صدیق صاحب الفاظ سے روح کی نبض پر ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ بنا لے اور تال کے ہی قوالی کا سماں بندھ جاتا ہے۔ جس پر ہر شخص جھومنے لگتا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے رومی' شمس کے زمانے کا کوئی ولی ان کی زبان سیکھا ہوا' وقت کے پل کو عبور کرکے اس زمانے میں ہم گناہ گاروں کے درمیان چلا آیا ہے۔ سراپا عجز' جھلکاتے مولوی صدیق صاحب مٹی کا وہ آب خورہ ہیں' جس میں سادہ پانی بھی میٹھا لگتا ہے۔

اب پچھلے سال سے ان کا بیٹا بھی ان کے ساتھ وعظ کرنے لگا ہے۔ حارث نام ہے اس کا۔۔۔ وراثتی آواز میں جیسے ایک اور دریا نے رخ موڑ لیا ہے اور دو دریا مل کر سات سمندر بن گئے ہیں۔

بازار کے بالکل آغاز میں حارث کی زنانہ کپڑوں کی دکان ہے۔ پہلے صرف اس کا ماموں بیٹھتا تھا وہاں۔ لیکن حفظ اور تعلیم مکمل کرلینے کے بعد اب وہ بھی وہاں بیٹھتا ہے۔ میں' اماں یا رضیہ باجی کے ساتھ جب جب بازار جاتی ہوں' اصرار کرکے انہیں حارث کی دکان پر ہی لے جاتی ہوں۔ بڑا شریف ہے۔ مستورات کو نظریں اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ بس اپنے ہی پاؤں یا فرش کو گھورتا رہتا ہے۔ مسکراتا چہرہ ہے اور یہ مسکراہٹ ساکن پانی کی طرح ہے۔ نہ لہر نہ طوفان۔۔۔ بالکل ہموار۔۔۔

آواز کی ڈوری پر وہ تھان نکالتا ہے۔ انگلی کے اشارے کو بھی نہیں دیکھتا۔ بہت سا وقت تو اس سے مطلوبہ کپڑا نکلواتے نکلواتے ہی گزر جاتا ہے۔ ہائے۔۔۔ میرا تو دل کرتا ہے کہ اسے مزید تنگ کروں۔ جان بوجھ کر کپڑوں کے رنگوں کے نام بدلوں۔۔۔ دکان کا ایک ایک تھان اتروا کر دیکھوں۔۔۔ کپڑا اور اس کا چہرہ۔

اسے دیکھ کر پتا نہیں کیوں' مجھے کتاب والا شہزادہ سلیم یاد آجاتا ہے۔۔۔ لیکن یہ کیسا شہزادہ سلیم ہے' جو کنیزوں کو نظر بھر کر تو کیا' سرسری یا الوداعی نظروں سے بھی نہیں دیکھتا اور تمام کنیزیں اس کے بند قلعے کی فصیلوں سے سر پھوڑ پھوڑ کر یک طرفہ محبت کی دیوار میں چنی جارہی ہیں۔

اس کا چہرہ ہر وقت تازہ کیے وضو کا تاثر دیتا ہے۔ جیسے ٹھوڑی' ناک' پلکوں سے کوئی قطرہ اب گرا کہ اب گرا۔۔۔ بڑی مدت سے میں اس آرزو کے لمحوں میں قید ہوں کہ وہ قطرہ گرے تو میرے ہاتھ کی ہتھیلی پر گرے اور میں اسے اپنی مانگ۔۔۔

نہ جانے کتنی ہی اس سوچ سے اب تک بیاہتا ہوچکی ہوں گی۔

اماں کہتی ہیں' چچا اسلم اپنے شلوکے کی جیب میں باسی اچار لیے گھومتے ہیں۔ ان سے کسی کی خوشی' راضیت دیکھی نہیں جاتی اور دل کھٹا کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ اچار بیچ بیچ کر یہ شخص خود بھی اندر تک کھٹا ہوچکا ہے۔ اب میٹھے مربوں جیسی رنگ برنگی فضا میں اس کا دل گھبرانے لگتا ہے۔

"لو۔۔۔ اب مسجدوں کی بھی رجسٹریاں بنیں گی۔۔۔ کوئی بتائے مجھے۔۔۔ یہ جو پچھلے ایک سال سے صدیق کا بیٹا حارث بھی باپ کے ساتھ مل کر نمازیں پڑھانے' وعظ کرنے لگا ہے تو کیا یہ دونوں باپ' بیٹے کا منصوبہ نہیں کہ مسجد اور حجرہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ باپ کے بعد بیٹا سنبھال لے۔۔۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ انجمن نے کیوں آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ وہ کیوں جلد فیصلہ نہیں کرتی کہ صدیق کے بعد مسجد پر کس کا حق ہے۔" شاپروں میں سودے سلف کی طرح ابا ہنستے ہوئے ایک دن اس بات کو بھی گھر لے آئے۔

"مسلم تو اپنی عادت سے مجبور ہے۔ اس کا بس چلے تو یہ فرشتوں پر بھی فتویٰ لگادے کہ وہ اپنا کام ٹھیک سے نہیں کر رہے۔ خود ایسا ہی اصول پرست تھا تو پہلی بیوی کو کیوں مارتا پیٹتا تھا۔ وہ بے چاری تو اب بھی مل

جائے تو پوچھتی ہے کہ یہ "سوڈی" مرا نہیں ابھی تک۔۔۔" اماں کو محلے کی تاریخ نہ صرف پتا ہے' بلکہ یاد بھی ہے۔

"میں کہتی ہوں حارث کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے وارث مسجد کا۔۔۔ کیا سوز ہے اس کی آواز میں۔۔۔ بقرہ عید پر جب اس نے حضرت اسماعیل کا واقعہ بیان کیا تھا تو ایسے لگا جیسے چھری ہماری گردنوں پر چلنے والی ہو۔"

میں اماں کی بات سے مکمل اتفاق کرتی ہوں۔ وہ چھری تو نہ جانے کتنوں کے دلوں میں اتر بھی گئی ہوگی۔

"امامت' وراثت نہیں اماں۔۔۔"

اف۔۔۔ یہ اقرا۔۔۔ میرا دل کیا کوئی وزنی کتاب آج اس کے سر پر دے ماروں۔۔۔ پھر کہوں۔۔۔ لے آج تو رات کے اندر اندر نہیں۔۔۔ بلکہ لمحے بھر میں ہی پڑھ۔

"ابا آپ تایا امیر کے حق میں بات کیجیے گا۔ جب انجمن والے پوچھیں تو۔۔۔"

"ہائے۔۔۔ وہ منافق۔۔۔ اب سفاری سوٹ پہننے والے ہماری مسجدوں میں نمازیں کروایا کریں گے۔"

"ہمارے اسکول میں لیکچر دینے آئے تھے۔ مجھے تو ان میں کوئی برائی نظر نہیں آئی۔"

"وہ تو داڑھی بھی چھوٹی رکھتا ہے۔ سر پر ٹوپی بھی نہیں پہنتا۔۔۔ اور اللہ توبہ۔۔۔ مہندی کو پیروں کے تلووں پر لگاتا ہے۔" اماں ناکردہ گناہ کے احساس سے لرز گئیں۔ اقرا آگے سے کچھ نہ بولی۔۔۔ وہ چپ چاپ اندر چلی گئی۔ لاکھ کوشش کی میں نے' پر اقرا کا یہ انداز مجھ سے ہضم نہ ہو سکا۔ ایسے موقعوں پر وہ خیال احترام یا احساس ندامت کے باعث خاموش نہ ہوتی تھی۔ بلکہ تفاخر کا ایک جلوس ہوتا تھا۔ جو اس کے ساتھ ساتھ اس کی تقلید میں چلتا تھا۔ اسی جلوس کی قیادت کے باعث وہ زمین سے فٹ فٹ اوپر ہوا میں چلتی جاتی تھی۔ جیسے اس کے خیال میں' ہم سب کند ذہن تھے اور وہ خود عقل کل۔۔۔ فرزانہ سے جان چھوٹی تو مس ساجدہ چمٹ گئیں اس کے دماغ پر۔۔۔ رضیہ باجی ہانڈی میں نمک ملاتی۔۔۔ مس ساجدہ کے خلاف چپقلش کا چمچہ چلاتی جائیں۔"

"لیکن مس ساجدہ تو بہت اچھی ہیں باجی۔۔۔ برقعہ پہنتی ہیں۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور ہاتھوں پر دستانے چڑھا کر اسکول آتی ہیں۔"

ان سب باتوں کے علاوہ مس ساجدہ بیگ میں وہ فخر بھی بھر کر لاتی تھیں کہ ان کے جسم کا رواں بھی آج تک کسی غیر مرد نے نہیں دیکھا۔

سوچتی ہوں۔ میرا فہم جو عرصے سے غٹرغوں غٹرغوں کرتا ایک ہی جگہ پر دانہ چگ رہا تھا۔ لمبی پرواز کر کے لوٹا بھی تو کبوتر کی طرح۔۔۔ واپس اپنے ہی پنجرے میں۔۔۔

اقرا سے پہلے میں دو سال تک مس ساجدہ کے پاس پڑھ چکی ہوں۔

مس ساجدہ پیشے کے ایمان میں بے ایمانی نہیں برتتیں۔ کوتاہی کے رائی برابر دانوں کے پہاڑ بنانے اور پھر انہیں پہاڑوں تلے لانے سے بچتی ہیں۔ اسی باعث اپنے عہدے کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے ان کا مقصد اپنی طالبات کو صرف پڑھانا نہیں۔ بلکہ ان کی اعلا تربیت کرنا' ان کی شخصیت کی پیوند کاری کرنا اور ان کے اندر نئے عزائم بھرنا بھی ہے۔

مس ساجدہ کی باتیں پُررونق چوراہے کی مانند ہیں۔ دل میں ہلچل اور بے چینی بھر دینے والی۔

"یہ دنیا جتنی مردوں کے لیے بنائی ہے اللہ نے۔۔۔ اتنی ہی عورتوں کے لیے بھی بنائی ہے۔۔۔ لیکن بدقسمتی سے ہم عورتوں نے اپنے گھروں کو بل بنا لیا ہے۔ ہم گھاؤں کی عادی ہو گئی ہیں۔ اب ہم سے پرانے کھنڈرات کی بدحالی کی بو آتی ہے۔ لاشوں کے گلنے سڑنے کی۔۔۔ اندر کہیں ہم مر گئے ہیں۔ یا ہم نے اپنی بہت سی خواہشوں' جذبوں کو ختم کر لیا ہے اور ہمارا ذہن ان جذبوں' خواہشوں کی لاشوں کو دفنانے پر بھی آمادہ نہیں۔ اس لیے امید و آس کا مسالا لگا کر ہم نے ان لاشوں کو تبدیلی کی دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔"

مس ساجدہ ایم اے اردو تھیں اور ان کے الفاظ کا

گودام اس قدر بھرا ہوا تھا کہ وہ پرانی باتوں کو بالکل نئے حروف میں ڈھال کر بیان کرتی تھیں۔

پاکستان بنا تو عورتوں نے مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا۔۔۔ الیکشن میں مسلم لیگ کو سپورٹ کیا۔ گھر گھر جاکر عورتوں کو ووٹ ڈالنے کا طریقہ سمجھایا۔ پھر قیام پاکستان کے وقت کس کس طرح قربانیاں دیں۔

مس ساجدہ کے گھر کی ایک دیوار میں ان کے فوجی آباؤ اجداد کے تمغوں کا ڈھیر سجا ہوا ہے۔ وہ ہر روز ان تمغوں کی چمک کو آنکھوں میں سمو کر اسکول آتی ہیں۔ پیریڈ کے لیے ہی سہی۔۔۔ مس ساجدہ کی باتیں ہم سب میں بڑا جوش بھر دیتی تھیں۔ کچھ کر گزرنے۔۔۔ اسکول کی دیواریں توڑ ڈالنے۔۔۔ باغ کی گھاس اکھاڑ ڈالنے کو دل کرتا تھا۔

مس ساجدہ لڑکیوں کو علی بابا چالیس چور کی مرجینا بنانا چاہتی تھیں۔ جو ڈرموں میں گرم پانی ڈال ڈال کر ڈاکوؤں کو جلاتی رہی تھی۔ ہر سیزن میں یقیناً" ایک دو لڑکیاں مرجینا بن بھی جاتی ہوں گی۔ انہیں میں سے ایک اقرا بھی تھی۔ جس نے پانی کو گرم کرنے کے لیے بڑی کڑاہی کے نیچے بہت سی آگ جلا رکھی تھی اور اس دن ڈاکو بن کر کال بیساکھی آئی اور اس سے پہلے کہ گرم پانی ڈال کر اسے نیست و نابود کیا جاتا' وہ کال بیساکھی آگ ہی بجھا گئی۔

خود میں نے بھی پچھلے ماہ چوبیس تاریخ کو مس ساجدہ کی ساری زرنگار چمک کو پیتل کی چمک پایا۔ پیتل بھی وہ جس میں قلعی کا سایہ آجائے اور سایہ بھی ایسا کہ بازار کے سارے موس حیرت سے اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔

دن کی شروعات سہانی تھی اور میں یہ فراموش کیے رہی کہ دن جتنا روشن ہو رات اتنی ہی تاریکی لاتی ہے۔

سڑک کا افتتاح تھا۔ صبح ہی صبح نئی سڑک پر تنبو' قناتیں نصب ہو گئیں۔ دو روز پہلے ہی اطراف پر پیلے رنگ کی پٹی بچھائی گئی تھی جو افتتاح سے پہلے ہی گندی ہو چکی تھی۔

سیاسی گروپ کی جانب سے سب کو رات کے زبانی دعوت نامے دیے گئے تھے۔ اس لیے سب ہی چلے گئے۔ دیگوں پر کفگیر کی کھنک' سیلے کی خوشبو' دم کی بھاپ' گوشت چاول کی ملی جلی مہک' ہر چیز فضا میں اونچی آواز میں گونجتے ملی نغموں کے ساتھ ساتھ پھیل رہی تھی۔

خاموشی تو میسر نہ تھی۔ جو تنہائی ہاتھ لگی میں نے اسی سے فائدہ اٹھا لینا چاہا۔ تمہارے جوابی خط کی ابتدائی سطریں ہی کاغذ پر اتار پائی تھی کہ شور میں ایک اونچا شور دھک سے دل دہلا گیا۔

اسپیکر پر چلتے قومی نغمے کی آواز دوسرے فائر پر بند ہوئی اور اس آواز نے فضا کو گونگا کر دیا۔ لیکن لمحے بھر کے لیے۔ پھر اس گونگے کو دجال کی آواز ملی۔ شور جو اٹھا تو وہ پھر ساتویں آسمان میں بھی سوراخ کرنے لگا۔ تیسرا فائر ہوا۔ چوتھا۔

بھگدڑ ایسی مچی جیسے بن کے سارے ہی ہاتھی ہجرت کر کے ادھر آ گئے ہوں۔ آوازوں۔۔۔ شور و غل میں کھڑکیوں کے پٹ تڑاتڑ بند ہونے کا عمل پھیلا اور پھیلتا چلا گیا۔ گھروں کے دروازے بھیڑ دیے گئے۔ کنڈیاں ٹھک ٹھک لگتی گئیں۔۔۔ زنجیریں چڑھا دی گئیں اور جس جگہ انتہا کا شور تھا وہاں عذاب کے بعد والی اجاڑ تصویر باقی رہ گئی۔

"کیا ہوا؟" میں چارپائی سے چھلانگ مار کر اتری۔ کاغذ' قلم' دوپٹا' مجھ سے کہیں دور جا گرا۔ اماں اندر آئیں۔ پیچھے ابو تھے۔ جلدی سے دروازہ بند کیا گیا۔

"فائرنگ ہو گئی۔" اماں نے بتایا۔ وہ جیسے ابھی بھی پنڈال میں ہی تھیں۔ ان کا ہاتھ ان کے دل کی دھڑکنوں کی طرح پھڑپھڑایا۔

"یقیناً" گلزار کے آدمیوں نے کی ہوگی۔" میں بدحواس کچھ سمجھی' کچھ نہ سمجھی۔

زندگی بھی اپنی چالوں میں بڑی بدچلن ہے۔ یہاں ہنسنے' رونے' گانے' جینے' مرنے کا کوئی ٹائم ٹیبل مرتب

نہیں کیا جاسکتا۔ پھر دتوں سے دریاؤں میں کھبے ہیں۔ جوں ہی ہم نے ان پر پاؤں رکھا' وہ کھسک گئے ہیں۔ نصیب نصیب کی بات ہے۔ میری نانی بتاتی تھیں کہ ان کا تایازاد بھائی کس طرح مرا۔ گھر کے آگے ریل کی بہت سی پٹڑیاں بچھی تھیں۔ جہاں ٹرین کے بہت سے پرانے ڈبے بھی عرصے سے کھڑے تھے۔ بچے وہیں کھیلتے کودتے رہتے تھے۔ ماؤں نے کبھی فکر نہ کی۔ تایا کا گھرانہ چھٹیاں گزارنے آیا تو چھوٹا تایازاد بھی دوسرے بچوں کے ساتھ نکل گیا اور تب ہی ٹرین کے زنگ آلود ڈبے اپنی جگہ سے کھسک گئے اور چھوٹے تایازاد کی سانسوں کے ساتھ ساتھ اس کا نصیب بھی ٹرین کے نیچے آگیا۔

سوچتی ہوں اس رات بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ ٹرین کے جو ڈبے ساکت تھے' وہ فائر کی آواز سے اپنی جگہ سے کھسک گئے اور ان کے نیچے آکر کچلے گئے تمام منافق اور دوغلے چہرے۔

نویں یا پھر دسویں فائر کی آواز کے ساتھ ہی پٹڑی تھرتھرائی اور ایک اور آواز سب کے کانوں میں پڑی۔

"دم کبر۔" مضبوط مردانہ آواز تھی۔ "دم کبر ویرے۔" جیسے کوئی توانا شیر جھٹکے سے شکنجے میں آجائے۔ اس آواز نے مجھے سراپا سوال کردیا۔

"لوگوں میرے ویرے کو گولی لگ گئی۔" اگلے ہی پل میرے وجود کو سارے جواب ملے۔ آواز بدلی اور التجا کرنے لگی کہ سب جلد سمجھ جائیں' ورنہ دیر ہوجائے گی۔ میں اماں' ابا کی طرح ساکت و جامد وہاں کسی کے حاضر ہونے کا انتظار کرنے لگی اور میرے انتظار کے لمحے روز قیامت سے جالگے۔ آواز نے پھر اپنی التجا کا اعادہ کیا۔

کیا باہر پنڈال خالی ہوچکا تھا۔ جوان' نوجوان' دھیمے دھیمے بچوں کی طرح چلنے والے علاقے کے بزرگوں نے بھی گھروں میں پہنچنے میں لمحے لیے تھے۔ یا میرے کان جواب کی آواز سننے سے بہرے ہوگئے تھے۔

"دم کبر ویرے۔ کوئی میرے ویر کو بچائے۔" رفتہ رفتہ آواز میں کنکر پروئے جانے لگے اور ایک ایک کر ایک ایک دماغ کے بند کواڑ پر جاکر لگے۔ لیکن دروازے نہ کھلے۔ آہنی کنڈیوں کو زنگ لگ گیا۔ دلوں کو شاید تالے ہی لگ گئے۔ میں جلدی سے اپنے دروازے کی طرف بڑھی۔

"تو کہاں جارہی ہے؟" اماں نے گالی دے کر میری چوٹی کو پیچھے سے پکڑا۔ گالی اور چوٹی یہ دونوں کام ہی آج پہلی بار ہوئے تھے۔

"میں وہ باہر۔۔۔"

"تیرا کیا کام باہر۔۔۔" ابا جو بڑے مدھم انداز میں بات کرنے کے عادی تھے' اس بار وہ گرجے۔

ناک اور کان۔۔۔ اور میں مادہ چیل کی طرح اپنی آنکھوں کی وحشت خود تک نہ رکھ سکی۔ جن کا کام تھا باہر۔ وہ بھی تو موجود نہیں تھے۔ نہ جانے بعض اوقات میں اتنی خود سر کیوں ہوجاتی ہوں۔

"مجھے باہر جانا ہے۔" میرے اندر کی بغاوت میری آواز میں سما گئی۔ اس آواز میں التجا بھی تھی۔ دونوں کو پھلانگ کر جو میں پھر آگے بڑھی تو ابا نے ایک پورے ہاتھ کا طمانچہ میرے منہ پر دے مارا اور طمانچے کی آواز سے بنا سناٹا میرے کانوں میں اتر گیا۔

مجھے طمانچے کا ملال نہیں۔ وقت سے شکوہ ہے۔ جو عرصہ دراز سے میرے لیے ایک پٹاری لیے گھوم رہا تھا۔ اس رات وہ پٹاری کھلی۔ اندر سے ایک سانپ نکلا۔ اس نے مجھے ڈسا اور حیرت کا سارا زہر میری رگوں میں اتار دیا۔ مجھے اپنوں کے وہ چہرے نظر آئے۔ جو آج سے پہلے کبھی نظر نہیں آئے تھے۔

"دم کبر ویرے۔ اکھاں کھول۔۔۔" باہر کوئی روتے ہوئے اور چیختے ہوئے کہنے لگا۔ لیکن کس سے؟ میں کھڑے کھڑے فیصلہ نہ کرسکی۔ اپنے مرتے ہوئے بھائی سے یا ہم سب سے۔ دونوں نے ہی اس کی بات نہ مانی۔ اس نے آنکھیں نہ کھولیں اور علاقے والوں نے کان' دل' دماغ' آنکھیں اور قید ضمیر کے تالے۔۔۔

ابا' اماں نے میری بات کی نقل اتاری اور مجھے

کمرے میں لا کر دھکیلا۔ جہاں اقرا چکر پہ چکر کاٹ رہی تھی۔

ایک تو بہت بار دل کیا اس کمبخت اقرا جیسی ہی بن جاؤں۔ کتابیں پڑھ پڑھ یا شاید ہر طرح کے جذبے کے لیے پتھر ہو چکی ہے۔ یا شاید جذبوں کو چھپانا جان گئی ہے۔

ابا کمرے سے واپس جانے لگے تو جانے کیسے اقرا سے نظریں چار کر بیٹھے۔ نظروں کا یہ زاویہ ابا کو پسینے پسینے بھگو گیا اور مجھے جلا گیا۔

"باہر نکلیں۔ خدارا مدد کرو۔" ویر کے ویر نے آخری کوشش کی تھی اور گھروں کے دروازے کھٹکھٹانے لگا تھا۔ کیسی قبیح حرکت۔

"خدا کے واسطے باہر نکلو۔۔۔" گھروں میں کوئی ہوتا تو دروازے کھلتے۔ اندروں تو سب مردہ تھے۔۔۔ مردہ۔۔۔ مجھے ہنسی آئی۔ پاگلوں والی ہنسی۔ بے وقوف' جاہل نہ ہو تو۔۔۔ اللہ کے واسطے تو صرف بھیک دی جاتی ہے یا پرانی' غیر ضروری استعمال میں نہ رہنے والی چیزیں۔ ایسی خوف ناک صورت حال میں بھلا کوئی کیونکر اللہ کے نام پر کسی کا کشکول بھر سکتا ہے۔

ہمارے گھر کے پچھلے کمرے کی کھڑکی فرزانہ کے گھر کے پچھواڑے کی طرف کھلتی ہے۔ اکثر وہ لوگ وہاں بات چیت کریں تو آوازیں سیدھی ہمارے کمرے میں اترتی ہیں۔ میں کھڑکی کھول کر وہاں آواز لگا دیتی۔ اگر اقرا مجھے منع نہ کر دیتی۔

"محلے کا کوئی شخص بہرہ نہیں ہے۔ کان سب رکھتے ہیں۔ جب وہ باہر کی آواز نہیں سن رہے تو تمہاری کیونکر سنیں گے۔ تم فرزانہ کے ابو کو احساس جرم مت دلاؤ۔۔۔ وہ جو باہر مدد کے لیے پکار رہا ہے شاید ان کے مسلک کا نہ ہو" اور آج پھر اقرا چھوٹی ہونے کے باوجود مجھ پر حاوی ہو گئی۔ مرحوم دادی کی طرح۔۔۔

ہاں۔ اقرا ٹھیک کہتی ہے۔ جو مر رہا ہے۔ جو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ دونوں شاید فرزانہ کے ابو کے مسلک کے نہ ہوں۔ شاید اسی وجہ سے تو کریم کے ابو بھی باہر نہیں نکل رہے۔ پر کریم تو کسی ذات' پات' مسلک' فرقے کو نہیں مانتا۔ پھر وہ کیوں نہیں باہر نکلتا' پر وہ عشق کو تو مانتا ہے نا۔۔۔ اتنی بڑی جرات کیسے کرے۔ اپنے عشق کو چھوڑ کر کیسے باہر نکلے۔ جب فائرنگ کی آواز تو بند ہو گئی ہو۔۔۔ لیکن دلوں پر طاری وحشت چھٹتی نہ ہو اور مدد کی فریاد سنائی نہ دیتی ہو۔

فرزانہ۔۔۔ وہ تو لڑکی ذات ہے نا۔۔۔ گھر سے بھاگ سکتی ہے۔ نکل نہیں سکتی۔ اتنے اعلا وصفوں کے ساتھ ساتھ اس میں آنکھوں پر پٹی باندھ لینے کا ادنیٰ وصف بھی تھا۔ مجھے اس بات کا گمان تک نہ تھا۔

مولوی صدیق صاحب۔۔۔ کیا ضمیر نامی شے یہاں بھی ناپید ہے؟ آپ تو سوز کے رسیا ہیں۔ روتے ہوئے کے آنسو بھی صاف نہیں کریں گے۔

"حارث تم۔۔۔؟ وہ جو سڑک پر جان کنی کے درد سے گزر رہا ہے۔ نامحرم نہیں ہے۔ نظریں اٹھاؤ۔۔۔ خدارا

آج تو نظریں اٹھالو۔ یا آج بھی تم اپنے پاؤں اور فرش کو ہی گھورتے ہو گے۔"

چچا اسلم۔ آج آپ بھی اصولی' بے اصولی کو بھول گئے۔ یہ بھی معاملہ آپ کے لیے پرایا ہوتا تھا۔ باہر جا کر کس کو مدد کرنی ہے۔ آپ اس کے لیے بھی انجمن بٹھائیں گے کیا؟

تایا امیر۔ آپ تو اسلام کو صرف عبادت کا مذہب نہیں مانتے۔ آپ تو کہتے ہیں اسلام میں عبادت کے علاوہ اور بھی ہزاروں احکامات ہیں۔ پھر جلدی سے اپنی لائبریری کی موٹی کتابوں کو کھولیں۔ شاید کسی مرتے ہوئے کی مدد کرنے کے احکام بھی درج ہوں۔

مس ساجدہ۔ آپ نے آج کیوں اپنے گھر کو بل بنا لیا ہے۔ کیا آپ بھول گئیں کہ قیام پاکستان کے وقت عورتوں نے کس طرح قربانیاں دی تھیں۔ کربلا کے میدان میں کس طرح مصیبتوں کو جھیلا۔ غزوات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جان کی پروانہ کرتے ہوئے۔

پھر بدکی آواز جب تھک ہار گئی تو ایک آواز میرے کانوں کے پردے پھاڑ گئی۔ ایسی آواز جو میں نے زندگی میں آج تک نہ سنی تھی۔ موت کو سامنے دیکھ لینے والی آواز جو لرزہ طاری کردے۔ لسن پھانک لینے جیسی جھرجھری میرے پورے بدن میں بھر گئی۔

ایک شخص اپنی زندگی سے روٹھ گیا۔ دوسرا اس پر آنسو بہانے لگا۔ اپنی مکمل طاقت سے۔ اپنی آواز حلق سے نکالتے ہوئے۔ جیسے صحرا کے جھکڑ گلستان میں آگئے ہوں۔ اب وہ آخر کیا چاہتا تھا؟ کیا مقوم سڑک پر مرتسم نہ ہو چکا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

پھر وہ آواز آنا بھی بند ہوئی۔ سب کے دلوں پر جو احساس جرم بڑھ رہا تھا وہ گردش تمام ہوئی۔ طمانیت چھا گئی۔ پھر بھی دل وحشی گھوڑوں کی مانند دھڑکنوں کو اکھاڑنے لگے۔

گھر کا دروازہ ذرا سا کھول کر ابو نے سفید چادر کا گولا بنا کر باہر پھینک دیا۔ "بے ادبی ہوتی ہے میت کی۔۔۔ اس طرح پڑے رہنے سے۔ اسلام میں ہے کہ۔۔۔"

میرے جسم نے جان چھوڑ دی۔ سانسوں کی طرح میرا وجود بھی ہوا میں معلق ہو کر میری دسترس سے دور نکل گیا۔

رضیہ باجی پندرہ روز قیام کر کے کراچی واپس چلی گئی ہیں۔ میرا بخار جو اُتر نہیں رہا تھا' اب قدرے نارمل ہو چکا ہے۔ رضیہ باجی جتنے دن رہیں' ہر روز یہ ہی کہتی رہیں۔

"پاگل! تو کیوں حساس ہو رہی ہے۔ وہ تو خوش قسمت تھا جو شہید ہوا۔۔۔ شہادت تو کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔"

میں انہیں کچھ نہ سمجھا سکی۔ سب کو سمجھ جانے کے بعد ایک یہ خامی انسان میں نہ جانے کہاں سے عود آتی ہے۔

وہ جو مرا اس کا نام اکبر۔۔۔ تھا۔ اگلے دن ریڈیو پر خبر نشر ہوئی۔ اماں' ابا نے بڑے افسوس سے خبر سنی۔ پھر اماں اپنی چادر کے پلو سے آنکھیں صاف کرتی رہیں۔ جیسے ان کا جوان بیٹا ان کی آنکھوں کے سامنے مر گیا ہو اور وہ اسے بچانہ سکی ہوں۔

کسی چھوٹے گاؤں کے تھے دونوں بھائی۔۔۔ میلہ دیکھنے آئے تھے۔ دیکھ بھی گئے اور دکھا بھی گئے۔ سڑک کا نام اکبر شہید روڈ رکھ دیا گیا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔ وہ مر کر بھی زندہ رہ گیا اور ہم زندہ ہو کر بھی مر گئے۔

"تم کہتی تھیں ناکہ تمہارے گھر میں بہت دھول مٹی ہے۔ جیسے کال بیساکھی تمہارے گھر میں ہی پڑاؤ کرتی ہے۔ میں کہتی تھی سڑک بن جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اب سڑک بن گئی ہے۔ لیکن پھر بھی کال بیساکھی روز اسی سڑک سے چڑھتی ہے اور روز یہاں ہی ٹوٹتی ہے۔ اس کال بیساکھی میں دھول ہوتی ہے۔ مٹی اور خون کے چھینٹے' جو ہم سب پر گرتے ہیں۔ خود کو صاف کرتے کرتے ہم ہلکان ہو جاتے ہیں۔ روز قبروں کا ذائقہ چکھتے ہیں۔ ہمیں بخشوانے کے لیے کسی اجتماعی دعا کی ضرورت ہے۔ تم بھی ہمارے لیے دعا کرنا۔

فقط
رابعہ والی
اکبر شہید روڈ

مصباح نوشین

اسے ٹھنڈ میں پسینہ آیا تھا۔ اس نے اپنی سانسوں کو ہموار کیا۔ اور پانی پی کے دوبارہ لیٹ کے چھت کو گھورنے لگا۔ وہ ایک ڈراؤنی یاد تھی جو اسے

مکمل ناول

اپنے ماضی سے پیچھا نہیں چھڑانے دیتی تھی اور پھر ایسے میں وہ ایک اور کام کیا کرتا جو اسے پُرسکون کر دیتا اور اسے اس کام میں مزہ بھی آتا۔ وہ مستقبل کے حسین خواب دیکھنے لگتا۔

"خواب آپ کے اندر زندگی کی علامت ہوتے ہیں۔ خوابوں کو کبھی مرنے نہیں دینا چاہیے۔" اس نے زندگی سے یہ سبق سیکھ لیا تھا اسی لیے بہت خواب دیکھا کرتا تھا' خوب صورت دل فریب اور جادوئی خواب۔

یک دم ایک سوچ اسے بے چین کر گئی' جس نے اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر دیں اس کے خواب دھندلانے لگے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آہ ماضی سفاک ہے اور وقت سفاک تر۔

✿ ✿ ✿

"میں اس دنیا کی بدصورت ترین لڑکی ہوں جس کا اس دنیا میں آنے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔"

رات کے دس بجے وہ خود کو نفرت کی نگاہ سے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ خود سے نفرت بہت عجیب ہوتی ہے' اس میں بیک وقت ترحم' دکھ اور بے بسی ہوتی ہے۔

اس نے ہمیشہ اپنے لیے یہی سب محسوس کیا تھا۔ دنیا میں شاید ہی کسی انسان کو اپنے آپ سے اتنی نفرت ہو جتنی اسے تھی۔

اس جیسی بدصورت لڑکی کا دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ روزانہ کتنے ہی پہر وہ آئینے کے سامنے خود سے نفرت کرتے ہوئے' وہ یہ سوال کرتی۔ کوئی جواب نہ ملنے پہ وہ تنگ آ کے آئینے کے سامنے سے ہٹ

جانے سے پہلے اور دوبارہ کبھی آئینہ نہ دیکھنے کا خود سے عہد کرتے ہوئے جواب سوچتی بستر کی پائنتی پہ ٹک جاتی۔ ایسے کہ آئینے میں وہ دکھائی نہ دے۔ کمرہ نیم تاریکی میں ڈوب جاتا اور کمرے کی سیاہی میں اس کا وجود بھی۔

جواب آج بھی نہیں ملا، یہاں تک کہ وہ تھک کے آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تب ہی اس کی نگاہ وال کلاک پہ پڑی تھی دس بج رہے تھے۔ اس نے جلدی سے اپنے لمبے سیاہ پیروں میں چپل پہنی اور ان کی جانب دانستہ دیکھے بغیر ہی باہر کی جانب بڑھ گئی۔ اسے اپنے پاؤں دیکھتے ہوئے موریا د آجاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے گلے میں سچے موتیوں کی مالا ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بلیک ساڑھی میں اس کا سفید جسم سنگ مرمر کی طرح تراشا ہوا لگتا تھا۔ سلطان نے اپنی نصف بہتر کو مسکرا کے دیکھا۔ وہ شادی کے دس سال گزر جانے کے بعد بھی اتنی ہی حسین تھی جس قدر پہلے دن تھی، ایسا لگتا تھا جیسے وقت اسے چھوئے بغیر گزر گیا ہو بلکہ ایسا ہی تھا۔

سلطان اٹھے اور اس کے پیچھے جا کے کھڑے ہو گئے۔ فارہ نے آئینے میں نظر آتے ان کے خوبرو عکس کو دیکھا آئینے میں ان دونوں کا وجود مکمل تصویر کی صورت اختیار کر گیا۔ فارہ نے مسکرا کے تفاخر سے انہیں دیکھا۔ بلاشبہ وہ دونوں دنیا کے حسین جوڑوں میں سے ایک تھے۔

دونوں میاں بیوی خوش اخلاقی اور اپنی خوب صورتی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ فارہ کو ہم آئینے میں ان کے ساتھ اپنا عکس دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ سلطان نے مسکرا کے فارہ کے گلے میں ہار پہنا دیا۔ فارہ کے حسن کے ساتھ ہی تصویر مکمل ہو گئی۔ ایسی تصویر جس میں کوئی خامی نہیں تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں میں...؟" فارہ نے اٹھلا کے سوال کیا۔

"ہمیشہ کی طرح قیامت خیز۔" سلطان مسکرائے، انہوں نے سائیڈ ٹیبل سے گجرے اٹھا کے اس کی نازک مرمریں کلائیوں میں پہنا دیے۔

"عبیر تیار ہو گئی کیا؟" سلطان کو اپنی اکلوتی بیٹی یاد آئی۔ فارہ نے مسکرا کے انہیں دیکھا۔

"ابھی جا کے معلوم کرتی ہوں۔" وہ ساڑھی سنبھالتی ہوئی باہر جانے لگی تو انہوں نے ٹوک دیا۔

"تم رہنے دو... وہ تیار ہو گئی تو خود ہی آجائے گی۔ ابھی آئینے میں دیکھو تم آج کتنی حسین لگ رہی ہو۔" انہوں نے مسکرا کے اس کی جانب دیکھا لیکن فارہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کے تصحیح کی۔

"ہم آج کتنے حسین لگ رہے ہیں۔" فارہ نے اپنے ساتھ سلطان کے لیے بھی آج بلیک ڈنر سوٹ ہی نکالا تھا وہ دونوں آج خاندان کی ایک شادی میں جا رہے تھے۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور عبیر اندر آئی۔ اس نے اپنے ماں باپ کو آئینے کے سامنے کھڑے دیکھا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں میں ایک دم سے مرچیں سی بھرتی محسوس کی تھیں۔

"ارے عبیر! تیار ہو گئیں بیٹا!" سلطان کی نظر بیٹی پہ سب سے پہلے پڑی تب ہی فارہ نے اس کی جانب دیکھا اور اس ایک نظر میں کیا تھا جو عبیر سلطان کو جلا کے راکھ کر گیا تھا۔ عبیر کی نگاہ اس کے وجود سے ہوتی ہوئی فارہ کے سفید پیروں پہ ٹک گئی۔ اس نے وہی بلیک شوز پہن رکھے تھے۔ عبیر کی آنکھیں ایک بار پھر جلنے لگیں۔

"چلیں بابا!" عبیر نے باپ کی جانب دیکھ کے پوچھا۔

"ہاں ہاں بس تمہاری ماما تیار ہو جائیں۔" سلطان اسے دیکھ کے محبت سے مسکرائے تھے۔

"میں تیار ہوں۔" فارہ نے اپنا نازک موتیوں والا پرس اٹھایا اور ساتھ ہی اپنا قیمتی موبائل بھی، سلطان باہر کی جانب بڑھنے لگے کہ فارہ نے انہیں پکارا۔

"سیلفی ٹائم سلطان۔" فارہ نے ایک ادا سے کہا۔

سلطان مسکرا کے واپس پلٹے۔ فارہ ایک ادا سے ترچھی ہو کے ان کے کسرتی کشادہ سینے کے سامنے آئی اور پوزیشن کرنے لگی تھی کہ سلطان نے اسے پکارا۔ جو ڑھواں ہوتے وجود کے ساتھ باہر جا رہی تھی۔

"عبیرہ بیٹا! آپ بھی آؤ۔" سلطان نے اسے پکارا۔ وہ منع کرنا چاہتی تھی لیکن نہیں کر پائی وہ بھلا اس قدر خوب صورت تصویر کو خراب کر سکتی تھی۔

"آؤ نا بیٹا... رک کیوں گئیں۔" عبیرہ اپنے آنسوؤں کا گلا گھونٹتی باپ کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی۔ انہوں نے مسکرا کے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ فارہ نے سیلفی لی اور عبیرہ نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس سے زیادہ وہ اپنی نظروں میں نہیں گر سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پروین چچی ناشتہ لاویں پلیز..." نیلم دن کے گیارہ بجے اٹھی تھی۔ روز وہ اتنی ہی دیر سے اٹھا کرتی تھی۔ کالج سے آج بھی اس نے چھٹی کی تھی جبکہ ایسا تو ہفتے میں چار دن ہوتا کہ وہ کالج سے چھٹی کرلیتی۔ اس کی والدہ تو ویسے ہی اس پر روک ٹوک کرنے کی قائل نہیں تھیں جبکہ باپ سے وہ ڈرتی تھی اور وہ صبح ہی اپنی زمینوں اور ہونے والے الیکشن کی مہم کی غرض سے حذیفہ کے ساتھ نکل جاتے اور اکثر رات گئے ہی لوٹا کرتے "اسی لیے نیلم کی موجیں تھیں۔ آج کل وہ ساری ساری رات جاگتی اور فون پہ لگی رہتی اور دن چڑھے تک سوتی۔

"جی بیٹا! ابھی لاتی ہوں۔" گھر میں ڈھیروں ملازمین ہونے کے باوجود بھی کچن کا سارا انتظام و انصرام پروین بیگم جو کہ راحت اکبر کی بیوہ بھابھی تھیں، نے سنبھال رکھا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوہ بھابھی اور یتیم بھتیجے کو اپنے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ یہ الگ بات کہ ان کی حیثیت اس گھر میں نوکروں سے بڑھ کے نہیں تھی۔ لیکن پروین بیگم پھر بھی ان کی احسان مند رہتی تھیں جبکہ حذیفہ بھی بھی ان سے خائف ہو جایا کرتا تھا۔

پروین بیگم نے نیلم کا پسندیدہ ناشتہ تیار کرکے نیلم کے سامنے لا کے رکھا لیکن اس کا منہ بن گیا۔

"یہ کیا چچی! ناشتہ تو ڈھنگ کا دے دیا کریں۔" نیلم نے اندر آتی اپنی ماں فرزانہ بیگم کو دیکھ کے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا ہوا نیلی؟" فرزانہ بیگم فوراً" ایسے آگے بڑھیں گویا جانے کتنی بڑی زیادتی ہو گئی ہو ان کی بیٹی کے ساتھ۔

"آپ ہی پوچھیں ان سے مما... کہ ساتھ میری چائے کیوں نہیں لائیں، جبکہ یہ جانتی بھی ہیں کہ چائے کے بغیر میرے حلق سے ایک نوالہ بھی نہیں اترتا۔ یہ پھر بھی بھول جاتی ہیں۔" نیلم نے تیز تیز بولتے ہوئے ماں کو بتایا تو وہ تیکھے انداز میں پروین کی جانب مڑیں۔

"کیا مسئلہ ہے پروین، میری اکلوتی بیٹی سے کیا پرخاش ہے تمہیں کسی نہ کسی بہانے تم اسے کوئی نہ کوئی ٹینشن دیے رکھتی ہو؟ وہ اپنے بھاری طلائی کنگنوں والے ہاتھ نچا نچا کے ان سے پوچھ رہی تھیں۔

"مم مجھے بھلا کیا پرخاش ہوگی، میری بھی بیٹی ہے یہ۔" پروین بیگم رائی کا پہاڑ بنتے دیکھ کے ہکلا سی گئی تھیں۔

"نہیں، اسے تم اپنی بیٹی سمجھتیں تو اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتیں یہ اتنی کمزور نہ ہوتی۔" انہوں نے اچھی خاصی موٹی تازی نیلم کی جانب دیکھ کے کہا ان ہی کی تقلید میں پروین نے بھی دیکھا اور لب بھینچے۔

"چائے دم پہ رکھی ہے، میں ابھی لاتی ہوں... میں نے سوچا کہ پڑا ٹھنڈا ہو جائے گا۔" اسی وقت ملازمہ چائے ٹرے میں رکھ کے لے آئی تھی لیکن پروین کی مزید شامت آگئی۔

"اے بی بی! بس کردو تم۔ تم سے ہم نہیں جیت سکتے۔" فرزانہ بیگم نے ماتھے کو مسلتے ہوئے انہیں مزید

بات کرنے سے روکا۔ تب ہی ملازمہ شریفاں نے نیلم کے سامنے چائے رکھی اور نیلم ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"یہ تم کیوں لائی ہو میری چائے' مجھے تمہاری شکل سے بھی نفرت ہے، میں تمہارے ہاتھ کی چائے پیوں گی بھلا؟" نیلم نے شریفاں کی کلاس لینا شروع کی تو

پروین نے بے بسی سے آنکھیں موند لیں۔ اب یقیناً" اس کی خیر بھی نہیں تھی۔

"دیکھا مما! یہ یہی کرتی ہیں۔ اب یہ کارنامہ بھی دیکھیں ان کا' یہ جانتی بھی ہیں کہ میں ان کے علاوہ کسی ملازمہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس بھی لے کے پینے کی عادی نہیں ہوں پھر بھی انہوں نے شریفاں کو میرے لیے چائے لانے کا کہہ دیا۔"

"ہاں بیٹا! میں بھی خوب سمجھتی ہوں اس کی بدنیتی کو۔۔۔ یہ جان بوجھ کے ہمیں اذیت دینے کو ایسا کرتی ہے حالانکہ اگر اسے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ ہم نے اسے اس گھر میں رکھ کے کتنا بڑا احسان کیا ہے تو یہ کبھی ایسی گری ہوئی حرکتیں نہ کرتی۔" فرزانہ بیگم نے آگے بڑھ کے نیلم کو چمکارتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ چھوٹی بی بی! آپ چائے کے لیے غصہ ہو رہی تھیں تو میں نے سوچا کہ میں چائے دے آؤں آپ کو' پروین باجی نے مجھے نہیں کہا۔" شریفاں نے جلدی سے پروین کا سیاہ پڑتا چہرہ دیکھتے ہوئے بتایا تھا لیکن ان ماں بیٹی کو عادت نہیں تھی کہ اپنے کسی خیال کی تردید کریں یا اپنی کہی ایک بار کی بات کی نفی۔۔۔ سو انہیں نہیں ماننا تھا۔

"تم تو مجھے اپنی بدصورت شکل مت دکھایا کرو۔ کالی کلوٹی، ڈائن کہیں کی۔" نیلم نے شریفاں کو دیکھ کے غصے سے کہا تھا "اور یہ چائے کا کپ اٹھاؤ' یہ بھی اٹھاؤ۔۔۔ مجھے نہیں پینی نجانے تم ہاتھ بھی دھوتی ہو کہ نہیں۔" شریفاں نے اپنی سیاہ رنگت کا نشانہ بنتے ہی وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

"بیٹا! میں اور بنا کے لاتی ہوں چائے۔" پروین نے جلدی سے کہا تو نیلم نے ٹوک دیا۔

"بس بس رہنے دیں' اب میرا جی بھر گیا۔ اب چائے بنے گی تو بڑا اٹھا ٹھنڈا ہو جائے گا۔۔۔ مجھے نہیں کرنا ناشتہ۔" یہ کہہ کے وہ غصے سے کمرے سے ہی نکل گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد فرزانہ بیگم نے پروین کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

"بس ہو گئیں خوش۔۔۔ یہیں چاہتی تھیں نا تم، چلی گئی وہ بھوکی۔ نجانے کون سا عذاب ہو تم ہم پہ اف!" فرزانہ بیگم نے انہیں کلس کے دیکھا تھا۔ اسی وقت پورچ میں راحت اکبر کی لینڈ کروزر رکنے کی آواز آئی تھی۔ فرزانہ بیگم کے چہرے کے تاثرات یک لخت بدلے تھے۔ پروین مڑ کے کچن میں جانے لگی تو انہوں نے اسے پکارا۔

"سنو۔۔۔"

"جی۔۔۔" پروین نے مڑتے ہی سوال کیا۔

"چودھری صاحب کو مت بتانا کہ نیلم آج کالج نہیں گئی۔" فرزانہ بیگم نے اسے احتیاطاً" روکا تھا۔ ویسے وہ پروین سے اتنا ہم کلام ہوتے تو نہ تھے لیکن پھر بھی وہ کسی بھی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھیں راحت اکبر ویسے بھی غصے کے تیز تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ نیلم اچھی اور اعلا تعلیم حاصل کرے اسی لیے انہوں نے اسے شہر کے سب سے اچھے اور مہنگے کالج میں داخلہ دلوایا تھا لیکن نیلم کا پڑھائی میں دل کہاں لگتا تھا۔ اس کی تو کچھ اور ہی دلچسپیاں تھیں اور وہ ان ہی میں مگن رہا کرتی تھی۔

"جی۔۔۔ میں کیوں بتانے لگی۔" یہ کہہ کے وہ کچن میں چلی گئی جہاں یہ اسے دوپہر کا کھانا تیار کرنا تھا۔ راحت اکبر کے مردانے میں کوئی خاص مہمان آنے والے تھے اسی لیے انہیں خاص اہتمام کرنے کو کہا گیا تھا۔ وہ کچن میں آئی تو شریفاں سارا مسالا تیار کر چکی تھی اور اس نے اپنے لیے اور پروین بیگم کے لیے چائے بھی تیار کر لی تھی۔

"میری وجہ سے آج آپ کی اتنی بے عزتی کر دی نیلم بی بی نے۔" اسے دکھ ہوا' ویسے بھی پروین بیگم کے حالات سے سب ہی واقف تھے۔

"یہ میں نے آپ کے لیے چائے بنائی تھی۔ نیلی بی بی دیکھ کے پوچھا۔
بے شک ہم غریبوں سے نفرت کریں لیکن آپ بہت اچھی ہیں۔ آپ تو میرے ہاتھ کی بنی چائے پی لیں گی ناں۔" پچیس سالہ شریفاں نے آس بھری نگاہوں سے پروین کے سفید اور اداس سے چہرے کی جانب دیکھا۔

"میں بہت شوق سے پیتی ہوں تیرے ہاتھ کی بنی چائے، تجھی تو اور نیلم کی باتیں دل پہ نہ لیا کر۔ بچی ہے ابھی۔ اسے سمجھ ہی نہیں کہ کس وقت کیا بات کرنی ہے۔" پروین بیگم نے اسے تسلی دی۔ تب ہی حذیفہ کچن میں آیا تھا۔ وہ اکثر اپنے تایا جان کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ زمینوں کی ساری دیکھ بھال وہی کر رہا تھا حالانکہ راحت اکبر نے اسے بی اے کروایا تھا لیکن اسے شہر میں جاب نہیں کرنے دی تھی بلکہ اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا۔

"امی جان! کھانا بن گیا کیا؟" حذیفہ نے اندر آتے ہی پوچھا تھا۔ پروین نے اسے مسکرا کے دیکھا۔ ان کی نظر جب بھی اپنے بیٹے پہ پڑتی تھی وہ یوں ہی خوش ہو جایا کرتی تھیں۔

"کیوں کیا بھوک لگی ہے تمہیں؟" پروین بیگم نے چائے کا کپ ابھی اٹھایا ہی تھا فوراً" ہی رکھ دیا۔

"نہیں، مجھے نہیں لیکن تایا جان پوچھ رہے تھے۔ آپ تو جانتی ہیں، وہ شوگر کے مریض ہیں۔ بار بار بھوک لگتی ہے انہیں۔" حذیفہ نے فریج کھول کے کچھ کھانے کے لیے ڈھونڈتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اچھا رک جاؤ میں کچھ بنا دیتی ہوں۔" وہ اٹھ کے اس کے قریب ہوئیں۔

"نہیں۔ آپ چائے پئیں، یہ شریفاں بنا دے گی۔" اس نے فریز کیے ہوئے کباب نکالتے ہوئے شریفاں کو دیکھ کے کہا تھا۔

"نہ جی نہ... میں تو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔ باجی ہی بنا دیں گی۔" شریفاں نے بے ساختہ ہری جھنڈی دکھائی تھی۔ حذیفہ نے حیران ہو کے اپنی ماں کی جانب

"اسے کیا ہوا اچانک...؟"

"نیلم نے اسے ڈانٹا ہے۔" پروین نے گہری سانس بھری۔

"کیوں؟" حذیفہ نے ابرو اچکا کے پوچھا۔ ویسے بھی وہ غصے کا بہت تیز تھا۔

"بس ایسے ہی... تم تو جانتے ہی ہو اس کی عادت کو۔" پروین نے فوراً" بات بدلی۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں شریفاں اپنی سادگی میں اسے کوئی بات نہ بتا دے لیکن وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

"لیکن انہوں نے تو آپ کا غصہ میرے پہ نکالا تھا باجی۔" شریفاں نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو حذیفہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

"امی جان... کیا بات ہوئی ہے۔ یہ شریفاں کیا کہہ رہی ہے کیا کہا ہے نیلم نے آپ سے؟" حذیفہ نے سنجیدہ ہو کے پوچھا تھا۔

"بس بیٹا! وہ میں اسے چائے دینا بھول گئی تھی تو اسے غصہ آگیا تھا۔ اتنی سی بات تھی لیکن یہ شریفاں تو فلمیں ڈرامے دیکھ دیکھ کے بات کا بتنگڑ بنانا سیکھ گئی ہے۔"

"پھر بھی اس کی اتنی ہمت کہ وہ آپ سے بدتمیزی کرے۔ اس کے ہاتھ ٹوٹ گئے تھے جو وہ اپنے لیے چائے نہیں بنا سکتی تھی۔" حذیفہ سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔

"اچھا چلو کوئی بات نہیں... بچی ہے لاڈ میں کہہ جاتی ہے وہ سب۔" پروین بیگم نے بات بنانی چاہی۔

"تو یہ لاڈ جا کے اپنی ماں سے کرے۔ لگتا ہے تایا جان سے بات کرنی ہی پڑے گی۔" وہ غصے میں وہاں سے چلا گیا تھا۔ پروین بیگم سر پکڑ کے بیٹھ گئیں۔ کینہ توز نگاہوں سے شریفاں کو دیکھا جو بلاوجہ مسکرا رہی تھی۔

"اب تو کیوں دانت نکال رہی ہے۔" پروین بیگم نے اسے دیکھا۔

"اب آئے گا مزہ، جب حذیفہ بھائی نیلی بی بی کی

طبیعت درست کریں گے۔" وہ مزے سے سر دھنتے ہوئے کباب فرائی کرنے لگی تھی۔

"اسی بات کا تو ڈر ہے مجھے 'اگر اس نے غصے میں کچھ جا کے اسے بول دیا تو نیلم تو طوفان اٹھا دے گی۔" وہ حذیفہ کے غصے سے بہت خائف رہا کرتی تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پہ وہ یونہی اکھڑ جایا کرتا تھا۔

"اچھا ہے ناں.... نیلی بی بی بھی تو ان ہی سے ڈرتی ہیں۔" شریفاں تصور میں ہی نیلم کی عزت افزائی دیکھ کے محظوظ ہوئے جا رہی تھی۔ اسے بھی نیلم پہ آج کچھ زیادہ ہی غصہ ---- آرہا تھا۔

☆ ☆ ☆

مہندی کا فنکشن تھا۔ سب لڑکیاں ناچنے گانے میں مصروف تھیں۔ لڑکوں نے مہندی کی مناسبت سے ---- گانوں پہ بہترین ڈانس تیار کیے تھے۔ آج وہ لڑکیوں کو خاصا ٹف ٹائم دینے والے تھے۔ فارہ 'سلطان کے ساتھ تتلی بنی سب سے مل جل رہی تھی اور وہ کونے میں چھپ کے بیٹھی تھی 'ایسے کہ کسی کی اس پہ نظر نہیں پڑ رہی تھی۔ جس جگہ وہ بیٹھی تھی اس جگہ کافی اندھیرا تھا اور سامنے اسٹیج پہ سلطان 'اور فارہ کھڑے ہوئے تھے۔ فارہ 'سلطان کی کسی بات پہ مسکرا رہے تھے اور فارہ بے تحاشا ہنستے ہوئے ان کے کندھے پہ ہاتھ مار رہی تھی" بھرپور منظر تھا 'ایسا منظر جسے وہاں موجود کوئی شخص اگر رشک کی نگاہ سے نہیں بھی دیکھ رہا تو پسندیدگی سے ضرور دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اپنے ماں باپ اور ان کے خوب صورت حسین وجود کو رشک کی نظر سے دیکھ رہی تھی ہمیشہ کی طرح۔

"سلطان! تمہاری بیٹی نہیں آئی کیا؟" خولہ آپا کی بیٹی کی شادی تھی اور سلطان ان کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ لیکن سالوں بعد ملنا ملانا ہوتا تھا۔

"آئی ہوئی ہے آپا۔" سلطان بیٹی کے ذکر پہ مسکرائے تھے۔

"تو پھر ملواؤ ناں اب تو خیر سے جوان ہو گئی ہو گی 'میں نے تو بہت بچپن میں دیکھا تھا اسے۔" فارہ نے مسکرا کے خولہ کو دیکھا تھا۔

"جی ماشاء اللہ کافی بڑی ہو چکی ہے میں ملواتی ہوں۔" کسی اور کی نظر ہو نہ ہو فارہ کی نظر ضرور اس پہ ہوتی تھی چاہے وہ جہاں پہ بھی ہوتی۔

"آؤ عبیر! تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔" فارہ مسکراتے ہوئے اس اندھیرے کونے کی طرف آئی تھی جہاں عبیر اپنے تئیں سب سے چھپ کے بیٹھی تھی۔

"مجھے کسی سے نہیں ملنا۔" عبیر نے منہ چھپایا۔

"کیوں نہیں ملنا؟ آؤ ناں یہ سب تمہارے اپنے رشتہ دار ہیں۔ ان سے نہیں ملوں گی تو یہ سب مجھے بلیم کریں گے کہ شاید میں ملوانا پسند نہیں کرتی۔" فارہ نے ساڑھی کی فال سنبھالتے ہوئے اسے ڈپٹا۔ عبیر ناچار اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔ اس کا انداز اعتماد سے بالکل عاری ہو گیا۔ اسے لگا ہال میں موجود ہر شخص اسی کی جانب دیکھ رہا ہے۔ وہ فارہ کے ساتھ چل کے وہاں سامنے تک نہیں جانا چاہتی تھی۔ بہت ہی مشکل لگتا تھا اسے کسی سے ملنا۔ ماں باپ کی موجودگی میں اپنا تعارف کروانا۔

"آپ چلیں میں آتی ہوں۔" عبیر نے فارہ کو ٹالنا چاہا۔

"میں تمہیں لے کے جاؤں گی اپنے ساتھ۔" فارہ نے مسکرا کے بظاہر محبت سے کہا تھا لیکن عبیر جانتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔ بس ایک وہ ہی تو جانتی تھی اسے۔ عبیر کو ناچار اٹھنا پڑا 'وہ اس کے ساتھ چل پڑی 'ابھی دو قدم بھی نہ اٹھنے پائے تھے کہ فارہ کی عزیز سہیلی کی بہن سے ٹکراؤ ہو گیا۔ دونوں ایسے ملیں جیسے برسوں بعد ملی ہوں۔

"ارے فارہ... کیسی ہو؟ کس قدر حسین ہوتی جا رہی ہو دن بدن۔" سہیلی کی بہن نے پیار سے کہا تو فارہ مسکرادی۔

"بس آپا... آپ کی محبت ہے۔" فارہ نے عاجزی سے کہا تو عبیر نے فارہ کے خوب صورت چہرے کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

جانب دیکھا۔ ہر ادا اس پہ بجتی تھی۔ ہر انداز میں وہ حسین لگتی تھی۔

"یہ لڑکی کون ہے۔" سہیلی کی نظر اب عبیو پہ پڑی تھی۔ عبیو نے کرب سے اپنی آنکھیں میچ کے اپنے وجود کو ہوا میں تحلیل ہو جانے کی دعا کرنی شروع کر دی۔

"یہ میری بیٹی ہے۔ عبیو!" فارہ نے بہت محبت سے اس کا تعارف کروایا تھا۔ عبیو دیکھے بغیر بھی جانتی تھی کہ اس جواب پہ فارہ کی سہیلی کا حال کیا ہوا ہوگا اور فارہ کی گردن کسی راج ہنس کی مانند تن گئی ہوگی۔

"یہ تمہاری بیٹی ہے؟ اوہ خدایا۔" سہیلی کو واقعی شاک لگا تھا۔

"الحمدللہ" فارہ مسکرا کے اس کا ہاتھ پکڑ کے آگے بڑھ گئی۔ عبیو بے جان وجود کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں کوئی شرم لحاظ بھی ہے کہ نہیں کسی کے کمرے میں یوں بھی آتا ہے کوئی؟" نیلم جو بیڈ پہ اوندھے لیٹے فون پہ گپ شپ کرنے میں مصروف تھی ایک دم حذیفہ کو اپنے کمرے میں دیکھ کے چونکی۔ جلدی سے فون بند کرکے تکیے کے نیچے رکھا اور کینہ توز نگاہوں سے اسے گھورا۔

"یہ سوال میں تم سے کروں تو؟" حذیفہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا تمیز سے بات کرو۔" نیلم نے نظریں چراتے بظاہر مضبوط لہجے میں کہا۔

"جو جس زبان میں بولنے کا عادی ہو اس سے اسی زبان میں بات کرنی چاہیے۔ تم نے میری ماں کے ساتھ اتنی بدتمیزی سے بات کیوں کی بولو؟" نیلم نے اسے اس بات پہ اور بھی غصے سے دیکھا تھا۔ وہ جیسے ساری بات لمحوں میں سمجھ گئی تھی۔

"اوہو۔۔ تو تمہیں چچی نے بھیجا ہے کہ تم مجھ سے اس بے عزتی کا بدلہ لے سکو۔ میرے باپ کے ٹکڑوں پہ پلنے والوں کی یہ جرات؟" نیلم آگ بگولہ ہوئی۔

"زبان سنبھال کے بات کرو ورنہ کھینچ لوں گا۔" حذیفہ اور بھی بپھرا۔

"میں چاہوں تو ابھی کہ ابھی تمہیں اور تمہاری ماں کو اس گھر سے نکلوا دوں اور تم میری زبان کھینچنے کی بات کر رہے ہو۔" نیلم کو عادت تھی بات کا بتنگڑ بنانے کی ساتھ ہی اونچا اونچا بولنے کی۔ اسی لیے وہ اپنی غلطی نہ ماننے کی عادت کی وجہ سے ابھی بھی بات کو بڑھاوا دینے کے چکر میں تھی۔

"آہستہ آواز میں بات کرو۔۔ اپنے باپ کا کھاتا ہوں۔ تمہارا باپ مجھے بالکل بھی اس گھر میں نہ رکھتا اگر اس کے پاس میرے باپ کی چھوڑی ہوئی زمینیں نہ ہوتیں جن کا حساب میں نے یا میری ماں نے بھی نہیں لیا اور ہاں، میری ماں کے ساتھ تمیز سے پیش آیا کرو، وہ اس گھر کی ملازمہ نہیں ہیں، وہ صرف اپنی محبت اور سادگی میں سب کچھ سہ جاتی ہیں۔"

"تمہارا باپ تو سب کچھ جوئے میں اڑا گیا تھا، ارے وہ تو میرے باپ نے ہی تم لوگوں پہ ترس کھایا اور تمہیں اپنے گھر میں لے آئے۔ تم نہ سہی مگر تمہاری ماں یہ بات جانتی ہے۔ اسی لیے وہ ہمارے سامنے نہیں بول سکتی۔ آج بابا آتے ہیں تو اس کا بھی فیصلہ بھی ہو جائے گا۔" نیلم نے بدتمیزی کی آخری حد پار کرتے اسے مزید طیش دلایا۔

"چچا جان باہر ہال میں بیٹھے ہیں۔ چلو آجاؤ۔ ان ہی کے سامنے بات کر لیتے ہیں۔ اچھا ہے تمہیں حساب دیتے ہوئے مجھے بھی پتا چل جائے گا کہ میرے باپ کا اس جائیداد میں کچھ حصہ ہے کہ نہیں؟" حذیفہ نے نیلم کے چہرے کے اڑتے رنگ کو استہزائیہ انداز میں دیکھ کے بات مکمل کی۔

"چلو ہم تم رک کیوں گئیں؟" نیلم کے قدم زمین میں جم گئے اگر جو بابا جان کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ آج کالج نہیں گئی تو وہ اس کا کیا حشر کریں گے؟

"کیا ہوا نیلی بی بی تایا جان اس کے ساتھ اتنے اچھے تھے کہ وہ ان سے کوئی لین دین کسی حساب کتاب کی بات نہیں کیا کرتا تھا۔ پھر اس کی والدہ بھی اسے روکے ہوئے تھیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنی یا اپنی ماں کی بے عزتی ہونے دیتا۔

"میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی۔" اس نے بات بنائی اور واپس جا کے بیڈ پہ جا کے بیٹھ گئی۔

"اچھی بات ہے، تم اب میری ماں کے بھی منہ لگنے کی کوشش نہ کرنا اور ان سے بدتمیزی کرنے کا تو سوچنا بھی مت کیونکہ اس کے بعد میں چچا جان کو تمہاری ساری کالج رپورٹس دکھاوں گا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دوں گا کہ تم کتنے دنوں سے کالج نہیں گئیں۔" اس نے اسے اچھا خاصا خوف زدہ کر دیا تھا۔ نیلم واقعی اس کے سامنے اس سے زیادہ بول نہیں پائی۔

"تم جاؤ یہاں سے۔" نیلم نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ آخر تم میری کزن ہو، میں تم سے بات کیوں نہ کروں کیا تم مجھے اپنے کمرے سے نکلنے کو کہہ رہی ہو؟" حذیفہ نے اسے معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو نیلم کا جی چاہا کہ وہ اس کا سر پھاڑ دے۔

"کیا چاہتے ہو تم۔۔؟" نیلم نے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"میری ماں سے جا کے معافی مانگو ابھی۔" نیلم نے حیرت سے اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پہ شبہ ہو۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے یا بھنگ پی کے آئے ہو؟" نیلم نے غصے سے کہا تھا۔

"میں بالکل ہوش و حواس میں ہوں اور تمہارے بابا جان کے ساتھ ہی واپس آیا ہوں۔ اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کسی بھی قسم کا نشہ نہیں کرتا۔" حذیفہ پُرسکون انداز میں اس کا سکون غارت کر رہا تھا۔

"ان سے معافی مانگتی ہے میری جوتی!" نیلم نے پاؤں پٹخے۔ "اب نکلو میرے کمرے سے۔"

اس کا جی چاہا کہ وہ دھکے دے کے اسے کمرے سے نکال دے لیکن وہ ڈھیٹ بنا کھڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ حذیفہ اسے کوئی جواب دیتا، اسی وقت اس کے سیل پہ بیل ہوئی تھی۔ اس کے چچا جان کی کال تھی، وہ یوں ہی اس کے آگے پیچھے ہونے پہ پریشان سے ہو جایا کرتے تھے۔ اسی لیے ابھی بھی فوراً" کال کر لی تھی۔

"جی چچا جان۔۔۔ جی میں یہیں پہ ہوں۔ ارے نہیں، وہ نیلم نے بلایا تھا۔ وہ آج کالج نہیں گئی نا تو کالج میں چھٹیوں کی درخواست بھجوانے کی بات کر رہی تھی۔ پتا نہیں چچا جان مجھے نہیں پتا کہ وہ یہ چھٹیاں کس سلسلے میں کر رہی ہے۔" نیلم کا حلق خشک ہو گیا۔ اب وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے بابا جان عدالت لگائیں گے اور اس کی خیر نہیں ہوگی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ جا کے پروین بیگم سے معافی ہی مانگ لیتی۔ اس نے اپنی انگلیوں کو مسلتے ہوئے فکرمندی سے سوچا۔

"جی چچا جان۔۔۔ میں ابھی بھیجتا ہوں آپ کے پاس اسے۔" فون بند کر کے جیب میں رکھتے اس نے مسکراتے ہوئے نیلم کی جانب دیکھ کے کہا تھا۔

"چلیے نیلم بی بی۔ آپ کو آپ کے بابا جان بلا رہے ہیں۔" نیلم نے کھا جانے والے انداز میں اسے دیکھا تھا۔

"اللہ کرے کہ تم مر جاؤ حذیفہ اکبر۔۔۔" بددعا دیتی وہ اپنی متوقع عزت افزائی سے کھولتی ہوئی وہاں سے پیر پٹخ کے چلی گئی تھی۔ حذیفہ کے لبوں پہ بڑی جان دار مسکراہٹ کھلی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ چچا جان اب اس کے سارے اگلے پچھلے حساب برابر کریں گے۔ اپنے یا اپنی ماں کے ساتھ وہ زیادتی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ نیلم کو سزا ملنی ضروری تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہے۔ سنو۔۔۔" وہ چھت پہ کپڑے ڈالنے کے لیے آئی تھی جب اسے رکزی کی آواز سنائی دی تھی۔ عبیر نے مڑ کے دیکھا اور بے دلی سے اس کی جانب آئی۔

"کیا ہے؟" عبیر نے کوفت و بےزاری سے پوچھا اسے رکزی کافی چھچھوری لگا کرتی تھی۔ خوب صورت اتنی نہیں تھی جتنی وہ خود کو سمجھا کرتی تھی۔

"ادھر آؤ گی تو بتاؤں گی نا۔"

"مجھے کام ہے۔" عبیر جانے لگی۔

"ارے رکو تو۔۔۔ نخرے ایسے کرتی ہو جیسے میں

تمہاری عاشق ہوں۔" رکزی نے بھونڈے انداز میں مذاق کیا تو ناچار عبیر کو آنا پڑا۔

"بولو۔۔۔ کیا مسئلہ ہے؟" عبیر نے ناگواری سے پوچھا۔

"یہ دیکھو کیسی ہیں؟" اس نے گہرے جامنی رنگ کی چوڑیاں اس کے سامنے کیں جن پہ مینا کاری کا بہت خوب صورت کام تھا۔

"اچھی ہیں۔" عبیر نے ہاتھ لگائے بغیر بس ایک نظر دیکھ کے کہا۔ گہرے رنگوں سے وہ یونہی بھاگنے لگی تھی۔

"تمہارے لیے ہیں۔" رکزی مسکرائی۔

"کیوں میرے لیے کیوں؟" وہ شاکی ہوئی۔

"اپنے لیے لی تھیں تو تمہارے لیے بھی لے لیں۔ تم پہنتی تو نہیں ہو یہ سب لیکن کبھی دل تو چاہتا ہو گا نا تمہارا بھی۔"

"نہیں میرا دل نہیں چاہتا۔" وہ کہہ کے جانے لگی۔

"غلط بالکل غلط۔۔۔ تمہیں فارہ نہیں پہننے دیتی۔ وہ صرف خود حسین لگنا چاہتی ہے۔"

رکزی نے منہ بنا کے سچ بولا۔ وہ فارہ کی فطرت کو بہت جلد سمجھ گئی تھی ویسے بھی گزرتے وقت کے ساتھ وہ فارہ کو کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھی اور عبیر کو لگتا تھا کہ وہ اسے فارہ کے خلاف بھڑکانا چاہتی ہے۔

"میں جاؤں اب؟" عبیر نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

"رکو نا۔۔۔ اتنا کتراتی کیوں ہو مجھ سے؟" اس کا لہجہ دکھی ہو گیا۔

"اب گلے شکوے شروع کر دیے تم نے۔"

"تو کیا نہ کروں؟ میں تمہارا اتنا خیال رکھتی ہوں اور تم بجائے خوش ہونے کے مجھ سے چڑتی ہو۔" رکزی نے منہ بنایا۔

"یہ خیال نہیں ہمدردی ہے تمہاری جو کہ مجھے نہیں چاہیے۔"

"اللہ کی قسم یہ ہمدردی نہیں ہے۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو سادہ اور بے ریا۔ میرا دل کرتا ہے کہ تم خود کو ایسے ضائع مت کرو۔ خیال رکھا کرو اپنا دھیان دو خود پہ۔" اس نے اس کا ہاتھ تھام کے نرمی سے کہا تو عبیر سن ہو گئی وہ اس سے اپنا ہاتھ چھڑا نہیں پائی۔

"دیکھو ناں زندگی پہ تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرا فارہ یا ۔۔۔۔ کسی اور کا۔۔۔ مگر تم تو ایسی ہو گئی ہو جیسے۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے خاموش ہو گئی شاید عبیر کا چہرہ زیادہ ہی سیاہ پڑ گیا تھا۔

"میں جاؤں اب۔" عبیر بمشکل کہہ پائی۔

"ہاں چلی جانا لیکن یہ پہن لو اور یہ بھی رکھ لو۔" اس نے ایک کریم کی ڈبیہ اسے تھمائی۔ وہ رنگ گورا کرنے والی کریم تھی۔

"یہ عنایت آخر کس لیے؟" عبیر تڑخے بغیر رہ نہیں سکی حالانکہ وہ اکثر ہی اس کے لیے کچھ نہ کچھ لایا ہی کرتی تھی اور عبیر ہر بار یہی کیا کرتی تھی۔

"مجھے پتا ہے تمہیں ان سب چیزوں کی ضرورت نہیں ہے لیکن۔۔۔" رکزی نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"تم میرا صاف انداز میں مذاق اڑا لیا کرو رکزی! اس کے لیے یہ اوچھے ہتھکنڈے اپنانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں بد صورت ہوں بد شکل ہوں مگر خوددار ہوں مجھے کسی کے ترحم یا ہمدردی میں دی ہوئی کوئی چیز نہیں چاہیے میرا باپ ابھی زندہ ہے۔ مجھے جو چاہیے ہو گا وہ مجھے لا دے گا۔"

یہ کہہ کے وہ وہاں رکی نہیں ۔۔۔ حالانکہ رکزی اسے روکتی رہ گئی تھی۔ نیچے اپنے کمرے میں آکر پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی صاف دکھائی دے رہا تھا کہ رکزی نے اس کا بہت مذاق اڑایا تھا وہ اکثر ہی اس کے لیے کچھ نہ کچھ لا کے اسے یونہی ہرٹ کیا کرتی تھی۔ حالانکہ سلطان روز ہی آفس جانے سے پہلے اس سے پوچھتے کہ کچھ چاہیے تو نہیں۔ فارہ بھی بری نہیں تھی وہ بھی اس کا خیال رکھ ہی لیا کرتی تھی۔ بازار جاتی تو اپنی شاپنگ کے ساتھ اس کے لیے بھی ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ لازمی لاتی۔ اس کے کپڑے کم قیمت تو نہ ہوتے

لیکن ویسے خوب صورت بھی نہ ہوتے جیسے فارہ کے ہوتے لیکن عبیر کو برا نہیں لگتا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کمی کپڑوں یا کے ڈیزائن میں نہیں بلکہ اس کی اپنی شخصیت میں تھی۔ خودترسی اور احساس کمتری کی ہر حد جہاں پہ ختم ہوتی ہے اسے عبیر سلطان کہا جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"ہائے ہینڈسم!" وہ لیپ ٹاپ پہ جھکا کام میں مصروف تھا کہ اس کا سریلا لہجہ سنائی دیا' وہ نظریں اٹھائے بغیر بھی جانتا تھا کہ آنے والی ہستی کس کی ہے۔

"کیسے ہو۔۔۔؟ اب یہ مت کہہ دینا کہ خود ہی دیکھ لو۔ کبھی خود بھی جواب دے لیا کرو۔" وہ کرسی گھسیٹ کے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولی۔

"کافی پیو گی؟" اب کی بار اس نے سر اٹھایا۔

"لیس۔۔۔ آف کورس۔۔۔ مگر پہلے اسے تو بند کرو۔" اس نے اس کے لیپ ٹاپ کی جانب اشارہ کیا جس پر وہ اس کی آمد کے بعد بھی یونہی کام میں مگن رہا کرتا تھا جو کہ ظاہر ہے کہ زویا کو برا لگتا تھا۔

"بس یہ ایک پریزنٹیشن تیار کرنی تھی' وہی کر رہا تھا۔ تم بیٹھو' میں کافی منگواتا ہوں۔" زویا نے اسے ملامتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"میں آل ریڈی بیٹھ چکی ہوں ہینڈسم!" اس کے ایسا کہنے پہ ہینڈسم نے آنکھیں اوپر اٹھا کے دیکھا اور مسکرا دیا۔

"اوہ گڈ' یہ بتاؤ کہ کیسے آنا ہوا؟" اس نے لیپ ٹاپ کو لاگ آف کر دیا تھا۔

"اس لیے کیونکہ آج میں بہت خوش ہوں۔" زویا نے آنکھیں میچ کے بتایا۔ وہ نہ بھی بتاتی تب بھی وہ جانتا تھا کہ وہ بہت خوش ہے کیونکہ اس نے آج ریڈ لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی اور زویا خود کہتی تھی کہ جس روز میں ریڈ لپ اسٹک یا ریڈ جوڑے میں نظر آوں' سمجھ جایا کرنا کہ میں بہت خوش ہوں یا میری زندگی میں کوئی خاص لمحہ آیا ہے۔

"بابا آرہے ہیں نیکسٹ ویک۔۔۔ اور بس' اس بار مجھے کچھ نہیں سننا۔۔۔ تمہیں ان سے ہر حال میں ملوانا ہے بس۔"

"کیوں بھئی۔۔۔ مجھے ان سے کیوں ملوانا ہے؟" ہینڈسم نے اپنی ہیزل براؤن آنکھیں اس پہ جمائیں زویا نے اسے ایک بار پھر ملامتی نظروں سے ہی دیکھا۔

"تم میرے بہت اچھے دوست ہو اسی لیے اور تم جانتے ہو کہ بابا ہماری دوستی کے دو سال بعد پہلی بار پاکستان آرہے ہیں تو مجھے تمہیں ان سے ملوانا ہی ہے ناں۔"

"اوہ! تو یہ تو کوئی اسپیشل بات نہیں ہے کہ خوش ہوا جائے اور وہ بھی اتنا۔" اس نے اس کی تیاری پہ چوٹ کی۔ زویا نے آج فل امبر ائڈری کا گلابی سوٹ پہن رکھا تھا۔ بالوں کو وہ ہمیشہ ہی کھلا رکھتی تھی مگر آج اس نے انہیں باندھ کے ان میں پھول لگا رکھا تھا۔ ساتھ ہی کانوں میں آویزے تھے۔ وہ ایک بہت اچھی پیاری لڑکی تھی اسی لیے آج بھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے کہ بڑی بات ہی ہو' کسی چھوٹی بات میں چھپی ہوئی۔" اس نے مسکرا کے میز بجایا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے اس سب میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔" اس نے کہہ کے پھر سے لیپ ٹاپ آن کیا۔

"تو تمہاری بات یہاں کر ہی کون رہا ہے۔" زویا فورا" فارم میں آئی تھی۔ "کیا مجھے تمہاری اجازت درکار ہے؟" ہینڈسم نے اسے ایک نظر دیکھا۔ ایک خائف نظر جو زویا کو کھلکھلانے پہ مجبور کر گئی تھی۔

"تم کبھی نہیں سدھرو گی۔" اس نے سر جھٹکا۔

"تم جانتے ہو کچھ جذبوں میں بے ایمانی نہیں چلتی۔" اس نے شرارت سے آنکھ میچ کے گہری بات کہی۔

بھلا وہاں آفس میں موجود کون اس بات سے واقف نہیں تھا کہ زویا وقار اس بے حد نخریلے لیکن ہینڈسم لڑکے پہ مرتی تھی جو اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور بے حد محنتی تھا اور بہت کم وقت میں اس نے اپنا اس آفس میں ایک نام اور وقار قائم کر لیا تھا۔ جو فالتو بات کرتا تھا

نہ کسی کے مسئلے میں زبردستی ٹانگ اڑاتا تھا۔ جو سب کے کام آتا تھا لیکن خوامخواہ کا حاتم طائی بننے کی کوشش کرتا تھا نہ ہی ہیرو ازم جھاڑتا تھا۔ زویا کو اس کی یہی بات سب سے اچھی لگتے لگتے اسے اس کا دیوانہ کر گئی تھی۔

"بے ایمانی کرنے کو کون کہہ رہا ہے... لیکن بات یہ نہیں ہے۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ زویا پوری طرح متوجہ تھی لیکن وہ کچھ بولتے بولتے رک گیا۔ وہ بہت اچھا رازدان تھا جو اپنے راز اپنے ہی سینے میں دفن کیے رکھتا تھا۔ زویا الجھ سکتی تھی لیکن اس کے اندر اتر کے سب کچھ جان نہیں سکتی تھی۔ دو سال میں اپنی جان توڑ کوششوں سے وہ بس اسے اپنے دل کا حال بتانے کی ہمت کر سکی تھی۔

"تم سمجھا کیوں نہیں دیتے وہ بات جسے نوک زبان پہ لا کے روک دیتے ہو؟" وہ زچ ہوئے بغیر بولی۔

"میں تمہیں کافی پلانے کی بات کر رہا ہوں اور تم بات کو کس رخ پہ لے گئی ہو۔" وہ پرسکون مسکراہٹ چہرے پہ سجانے میں کامیاب ہوا۔

"کچھ تو ہے جسے تم اپنی ذات کے نہاں خانوں میں چھپائے پھرتے ہو لیکن میں کھوج لگاؤں گی۔" اس نے عزم کیا۔

"مجھے تمہاری جیت کا انتظار رہے گا اور میں تمہاری کامیابی کی دعا بھی کروں گا۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ چڑ جاتی لیکن ابھی اسے چڑنا نہیں تھا۔

"اور جو تم نے اپنی ذات کے اردگرد اتنی اونچی فصیلیں کھڑی کر رکھی ہیں وہ...؟ تم مجھے اپنے اندر آنے کا رستہ کیوں نہیں دیتے۔" زویا کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی شکایت آ گئی تو ہینڈسم مسکرایا۔

"راستے خود تلاش کیے جاتے ہیں محترمہ! ان کے لیے کوئی سمت یا اشارہ نہیں دیا جاتا سوائے لگن اور عزم کے۔" وہ مسکرایا۔ زویا اس کے بعد پھر کچھ نہیں بولی جب تک کہ کافی نہیں آ گئی۔ دونوں نے خاموشی سے کافی پی اور زویا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آج کی ملاقات سے ایک بات تو میں جان چکی ہوں۔"

ہینڈسم نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ کہ تم پاپا سے ملنا نہیں چاہتے بلکہ تمہارے لیے میں یا میری ذات سے وابستہ کوئی بھی خوشی اہم نہیں ہے۔ تم ایک خود غرض شخص ہو اور قدرے خود پسند بھی... جسے شاید اپنے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔" زویا نے دل کی بھڑاس دل کھول کے نکالی اور ہینڈسم نے وہ سارے الزامات مسکرا کے سنے۔ زویا نے بیگ کاندھے پہ ڈالا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے نہیں روکے گا اسی لیے ایک بار پھر پوچھا۔

"مسز عاطف نے آج اپنے گھر دعوت دی ہوئی ہے تم بھی انوائیٹڈ تھے چلو گے؟" اب اسے زویا کی اتنی تیاری کا پتا چلا۔ اس نے گہری سانس لے کے سر نفی میں ہلایا۔

"میں ان کی بیٹی کے عقیقہ کے فنکشن میں جا کے کیا کروں گا۔" اس نے بے چارگی سے کہا تھا۔ زویا پاؤں پٹخ کے رہ گئی۔ اس سے کوئی بھی بات کرنا فضول تھی۔ ہینڈسم نے ایک بار پھر سر جھکا اور کام میں مگن ہو گیا یوں جیسے زویا وہاں آئی نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

"ماں اس کی بچپن میں مر گئی تھی باپ نے اپنے سے کہیں کم عمر لیکن حسین لڑکی سے شادی رچالی اور اس کی زلف کا اسیر ہو کے وہ باقی دنیا یہاں تک کہ اپنی بیٹی کے وجود سے ہی بیگانہ ہو گیا۔

"نہ نہ' اس کی خود سے نفرت کرنے کی یہ وجہ نہیں ہے۔ بس وہ ایسی ہی ہے' احساس محرومی' خود ترسی اور احساس کمتری کی ماری ہوئی ایک حساس لڑکی ہے جسے اپنی زندگی میں موجود کوئی کمی کمی نہیں لگتی سوائے حسن کے... اس کی ماں مر گئی۔ باپ وجود سے غافل ہو گیا۔ سوتیلی ماں کی زیادتیاں' سگے رشتے داروں کی بدسلوکی یا ایسا کوئی بھی... غم دکھی نہیں کرتا نہ ہی وہ اس کا شکوہ کسی انسان یا اپنے رب سے کرتی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنے باپ اور سوتیلی ماں کی طرح

حسین کیوں نہیں ہے۔

وہ اپنے نین نقش' اپنے وجود سے بالکل بھی مطمئن نہیں ہے' اسے اپنے وجود میں کچھ بھی پسند نہیں ہے۔

اس کا قد ــــ پانچ فٹ اور آٹھ انچ ہونے کے ساتھ جسامت بے حد دبلی پتلی ہے۔ یہ کوئی اتنا بھی لمبا قد نہیں ہے لیکن اسے اپنا قد کسی زرافے کی مانند لگتا ہے۔ رنگت سانولی ہے سیاہ نہیں' آنکھیں بڑی اور روشن ہیں لیکن چہرہ دبلا نظر آنے کی وجہ سے وہ اس کے چہرے پہ کافی بڑی نظر آتی ہیں ہاتھ پیر لمبے پتلے جن کی ہڈیاں اور نسیں اوپر کو ابھری ہوئی ہیں۔ بال بے حد گھنگھریالے جس کی وجہ سے اسے اپنا آپ بے حد برا لگتا ہے۔

بے حد بدصورت....

وہ خود کو دیکھ دیکھ کر رویا کرتی جب کبھی اسے کوئی اس کی کم مائیگی کا احساس دلا دیتا تو اس کے اپنے رب سے شکوے میں شدت آجاتی۔ وہ کتنے ہی گھنٹے روتے ہوئے اسی شکوے میں گزار دیتی۔ جائے نماز بچھاتی اور گھٹ گھٹ کے روتی۔ کاش وہ بھی اس جیسی حسین ہوتی۔

اس کے حسن کا معیار' اس کا وجدان جیسے اس نام پہ آکے مکمل ہو جاتا۔ ہاں' کاش کے وہ اس جیسی حسین ہوتی' کاش کے وہ اس کے جیسی نہ سہی لیکن اس سے کم ہی سہی مگر حسین ہوتی' کاش کاش کاش' کی بازگشت اس کے خالی وجود سے ٹکراتے اسے نیم جان کرنے لگتی۔ وہ سجدے میں سر گرائے رونے لگتی اتنا کہ اس کی ہچکیاں بندھ جاتیں ــــ وہ اس کے جیسی کیوں نہیں ہے۔ وہ اس جیسی حسین کیوں نہیں ہو سکتی۔

حسن کی ملکہ' اس گھر کی ملکہ' اس گھر' اس محلے کی خوب صورت ترین عورت' اپنے حسن پہ نازاں' اداؤں میں بے باک' نگاہ اپنے حسن سے آگاہ۔ جب جب اس کی مخروطی گداز گلابی ناخنوں والی انگلیاں ابٹن کے آمیزے میں گھلتیں تو اس کی نگاہ بے ساختہ اپنی

بے حد لمبی سوکھی اور چرخ انگلیوں پہ ٹھہر جاتیں' نفرت کے سنپولیے جیسے اس کے وجود سے لپٹنے کو تیار ہو جاتے ــــ وہ آنسو پی کے رہ جاتی۔

اس کی ماں کی رنگت سانولی تھی۔ وہ ایک بے حد عام سے نقوش کی مالک تھی مگر اس کا باپ بے حد خوب صورت' اونچا لمبا گورا ــــ حسین نوجوان' جہاں سے بھی گزرتا لڑکیاں ٹھنڈی آہیں بھرنے لگتیں۔ اس کا صدائے شکوہ بلند ہوتا' کاش کہ وہ اپنے بابا پہ چلی جاتی حسین اور سحر طراز۔

لیکن سارے نقوش و رنگت ماں کی لینے کے بعد باپ سے ورثے میں اس نے صرف قد و قامت ہی پائی تھی۔ کاش وہ یہ بھی نہ لیتی کم از کم اتنی لمبی تو نہ ہوتی۔

لمبے قد کے اس کی نظر میں کئی نقصانات تھے۔ سب سے بڑا تو یہی تھا کہ وہ ہیل نہیں پہن سکتی تھی۔ اپنی ہم عمر سہیلیوں میں وہ عمر میں بڑی نظر آتی۔

حسن کی ملکہ ہنستی "تمہاری ٹانگیں اتنی لمبی ہیں ہیل پہن کے کیا لگو گی؟" سینڈل وہ سامنے ریک میں واپس سجا دیتی۔ اور سوچنے لگتی واقعی میں اس کی ٹانگیں اتنی لمبی کیوں ہیں۔

اسے حسن کی ملکہ کی طرح شوخ اور گہرے رنگ اچھے لگتے جو اس کے پہننے پہ کھل اٹھتے۔ اپنے لیے وہ ایسا ہی کوئی جوڑا خریدنے کی بات کرتی تو ملکہ کا فلک شگاف قہقہہ وہیں اسی کپڑے کی دکان میں ہی بلند ہوتا۔

"ارے یہ گہرا جامنی رنگ پہنو گی کیا تم اب؟ لوگ پہچانیں گے کیسے کہ تمہارا چہرہ کہاں ہے اور جوڑا۔ یہ گہرے رنگ گوری رنگت پہ ہی جچتے ہیں' کالی پہ نہیں۔" وہ اس کے ہاتھ سے جوڑا لیتے ہوئے واپس کاؤنٹر پہ رکھتی تو اس کی نگاہ اس کے گورے گلابی ہاتھوں پہ ٹک جاتیں جو واقعی میں اس جوڑے پہ ہیرے کی مانند چمکتے دکھائی دیتے۔ اسے ملکہ کی بات سچ ہی لگتی۔ اسے کوئی حق نہیں کہ وہ ایسا کوئی بھی رنگ پہننے کی خواہش کرے۔

اس کے نزدیک دنیا میں خوش اور کامیاب ہونے کا گر

صرف خوب صورتی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور سوچ وہ کبھی سوچ ہی نہیں پائی۔ اسے اس قابل چھوڑا ہی نہیں گیا۔

اگر غیر جانب داری سے دیکھا جاتا تو وہ کوئی اتنی بھی بدصورت لڑکی نہ تھی' نمکین رنگت رکھنے والی، بہت اچھی نہیں تو قبول صورت تو وہ تھی ہی۔ قد لمبا تھا مگر اس کا جسم ماڈلز جیسا تھا۔ جیسے ریمپ پہ چلنے والی ماڈلز مہینوں بلکہ سالوں فاقے کر کر کے اور یوگا آسن جما جما کے حاصل کیا کرتی تھیں' وہ بنی بنائی ایسی تھی۔ سانولی رنگت کو میک اپ آرٹسٹ بہت پسند کرتے ہیں کیونکہ ان پہ میک اپ بہت اچھا ہوتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ ماڈل تھی نہ ہی کوئی سلیبریٹی' جسے روزانہ گھنٹوں مہنگے ترین میک اپ آرٹسٹ کے ہاتھوں کے جادو سے حسین تر ہو کے کسی اپسرا کی مانند اسکرین پہ جلوہ گر ہونا ہوتا۔ وہ تو بے حد عام سی تھی اور پھر اسے کون سمجھاتا۔ اس کے اندر احساس کمتری اس قدر شدت سے اپنے پنجے گاڑ چکا تھا کہ وہ یقین ہی نہ کرتی کہ اس میں کوئی خوبی ہے۔

ویسے آج تک یہ جان توڑ کوشش کسی نے کی ہی نہ تھی سوائے عاشو کے وہ اس کی معصومیت کی دیوانی تھی۔

اپنی اس خامی کے باوجود اس میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ وہ بہت محبت کرنے والی' بہت ہی صاف گو لڑکی تھی۔ تیز تیز بولنے والی اور بے حد سادہ گوئی سے اپنی شخصیت کے بخیے ادھیڑنا اس کا من پسند مشغلہ تھا۔

عاشو اس سے عمر میں کافی بڑی تھی اور صحیح معنوں میں اس نے اس کا خیال ہمیشہ بڑی بہنوں کی طرح رکھا تھا' وہ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی' اس کی فرمائشیں پوری کرتی لیکن جب وہ آٹھ سال کی ہوئی تو عاشو کی شادی ہو گئی اور وہ بیاہ کے سعودیہ چلی گئی۔ وہ اس کی شادی پہ بے حد روئی۔ یہاں تک کہ بارات میں آئی ہر عورت نے اس کے متعلق سوال کیا۔ عاشو چلی گئی اور وہ صحیح معنوں میں ملکہ کے رحم و کرم پہ آگئی۔

اور یہ حسن کی ملکہ کون تھی؟

☼ ☼ ☼

صبح کا وقت تھا۔ فارہ ابھی سو رہی تھی لیکن عبیر چائے بنا رہی تھی۔ اسے شروع سے ہی عادت ہو گئی تھی صبح سویرے چائے پینے کی۔۔۔ سو اس نے ابھی چائے بنائی ہی تھی کہ اپنی پشت پہ سلطان کی آواز سنی۔ وہ حیرت سے پلٹی' بابا اتنی صبح تو نہیں اٹھا کرتے تھے پھر آج کیا ہوا؟

"عبیر بیٹا! میرے کپڑے تو پریس کر دو۔ مجھے ذرا جلدی نکلنا ہے۔" وہ کہہ کے پلٹ گئے تھے لیکن عبیر جلدی سے چائے کا بنا بنایا کپ رکھ کے استری اسٹینڈ کی جانب بڑھی اور اپنے بابا کی سیاہ پینٹ شرٹ نکال کے پریس کرنا شروع کی۔ اسے اپنے بابا ہمیشہ ہی سیاہ رنگ میں بے حد خوبرو لگتے تھے سو اسے جب بھی ان کے کپڑے پریس کرنے کا موقع ملتا وہ سیاہ ہی نکالا کرتی۔

کچھ ان کی رنگت بھی سرخ و سفید تھی جو کہ گردش حالات سے بھی ماند نہیں پڑی تھی۔ جسم قدرتی کسرتی اور بھرا بھرا تھا۔ موٹے تو وہ کبھی زندگی میں نہیں ہوئے تھے حالانکہ فارہ اکثر موٹی ہو جایا کرتی اور کھانے کی میز پہ سلطان اور عبیر کو ڈٹ کے کھاتا دیکھ کے حسرت سے کہا کرتی۔

"اف توبہ ہے سلطان! تم دونوں باپ بیٹی کتنا کھاتے ہو لیکن موٹے نہیں ہوتے' ایک میں ہوں کہ پانی بھی ایک دن جی بھر کے پی لوں تو موٹی ہو جاتی ہوں۔" نخوت سے منہ چڑھا کے پانی کا گلاس لبوں سے لگا کے بظاہر حسرت سے کہتی۔

"ہم مزدور لوگ ہیں بیگم صاحبہ! جبکہ تم ملکہ' مزدور دن بھر کام کرنے کے بعد پیٹ بھر کے روٹی کھاتا ہے تو اسے اچھی نیند آتی ہے۔" وہ مسکرا مسکرا کے جواب دیتے۔ خاموشی سے کھانا کھاتی عبیر اس تکرار سے محظوظ ہوتی۔

"تو آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ میں کام نہیں کرتی۔" وہ شاکی ہوتی۔

"نہیں بھئی ہماری مجال کہ ہم ایسی جرأت کا مظاہرہ کر سکیں۔" وہ شرارت کرتے مسکراہٹ کو لبوں میں دبا لیا کرتے اور عبیر کو ایسا کرتے ہوئے وہ اتنے پیارے لگتے کہ وہ کھانا چھوڑ کے انہیں دیکھنے لگتی۔

"تو پھر؟" بچوں کی مانند منہ پھلا کے اس کی جانب سے اگلا سوال آتا۔

"تو پھر عیش کرو کیونکہ تم ہر روپ میں حسین اور باکمال ہو میرے لیے۔" وہ اس کا گال تھپتھپا کے اٹھ جاتے لیکن ہمیشہ ایسا بہت کم ہوا تھا کہ فارہ سلطان کا کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہ کرے۔ وہ بلاشبہ ایک اچھی بیوی تھی۔ سلطان کی دیوانی اسے اکثر میرا سلطان کہہ کے چھیڑتی۔

کھانا پکانے سے لے کر ان کے جوتے پالش کرنے تک وہ ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی۔ اگر کبھی سلطان کوئی کام اپنے ہاتھ سے کر لیتے تو وہ ان سے اتنے سوال کرتی کہ وہ بے چارے اپنا کام کرنے سے توبہ کر لیتے۔ فارہ کو لگتا کہ وہ ان سے ناراض ہو گئے ہیں اسی لیے اپنا کام خود کرنے لگے ہیں یا اگر کبھی سلطان کھانا کم کھاتے یا دل جمعی سے نہ کھاتے تو فارہ اتنی بے چین ہو جاتی گویا سلطان کو کوئی ہی بڑی مہلک بیماری کا اندیشہ ہو اتنے سوال کرتی کہ سلطان اس کی محبت کے آگے گھٹنے ٹیکنے پہ مجبور ہوتے ہوئے دوبارہ کھانا کھانے بیٹھ جاتے تب جا کے فارہ پُرسکون ہوتی اور سلطان اس

کی محبت پہ اور بھی خوش ہو جاتے۔ وہ ان کا اتنا خیال جو رکھا کرتی تھی۔

ابھی عبیر نے ان کا سوٹ پریس کر کے لٹکایا ہی تھا کہ فارہ اٹھ کے باہر آ گئی۔

"کیا کر رہی ہو؟" اس نے اپنے لمبے بالوں کو جوڑے کی صورت لپیٹتے ہوئے سوال کیا۔

"بابا کے کپڑے پریس کر رہی تھی۔" عبیر مسکرائی۔ آج اس کے سانولے چہرے پہ عجیب سی خوشی اور چمک تھی۔

"وہ تم کیوں کر رہی تھیں؟ سلطان کدھر ہیں؟ انہوں نے مجھے کیوں نہیں جگایا؟" وہ ایک دم ہی پریشان ہو گئی تھی۔ آخر سلطان نے فارہ کو کیوں نہیں کہا تھا کپڑے پریس کرنے کو؟

"بابا واش روم میں ہیں۔ انہیں آفس جانا ہے شاید کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہے۔" عبیر کے لہجے میں سادگی تھی۔

"اللہ نہ کرے، کیسی منحوسوں والی باتیں کر رہی ہو۔ ایمرجنسی کیوں ہو گی بھلا؟"

فارہ اسے ڈپٹ کے الٹے قدموں واپس مڑی۔

"نن نہیں، وہ بابا کسی سے فون پہ بات کر رہے تھے تو میں نے سن لیا۔" اس نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی تاکہ فارہ کو غصہ نہ آئے۔

"کس سے بات کر رہے تھے تمہارے بابا۔ اور کیا تم بابا کی باتیں چھپ چھپ کے سن رہی تھیں؟" فارہ نے تیکھے چتون اس کے چہرے پہ گاڑے، عبیر نروس ہو گئی۔ سمجھ نہ سکی کہ پہلے کس بات کا جواب دے۔

"وہ یہیں برآمدے میں ہی بات کر رہے تھے تو میں نے سن لیا۔" اس نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی اور مڑ کے استری کا پلگ اتار دیا۔ فارہ اندر بڑھ گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک اور جوڑا تھا۔ عبیر سمجھ گئی کہ اب وہ نیا جوڑا استری کرے گی۔ عبیر والا جوڑا وہ سلطان کو نہیں پہننے دے گی۔

"لائیں میں کر دوں؟" عبیر آگے بڑھی۔

"رہنے دو، میں خود کر لوں گی۔" وہ کہہ کے استری کا

پلگ لگانے لگی اور پھر مڑی۔ "سنو! جب تمہیں پتا بھی تھا کہ تمہارا باپ پریشان ہے اور کسی مشکل کی بات کر رہا ہے تو کیا ضروری تھا کہ تم اس کے لیے یہ کالا رنگ ہی نکالتیں۔ تم بھی ناں اپنی ماں کی طرح سے ایک عذاب مسلسل ہو اپنے باپ کے لیے۔"

فارہ بلاوجہ ہی چڑ گئی۔ عبیر خاموش ہو گئی اسے لگا فارہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ فارہ کہتی تھی کہ کالا رنگ بھاری ہوتا ہے، جب بھی گھر کا مرد یا سربراہ کسی خاص

مقصد یا کام کے لیے نکلے تو کالا رنگ نہ پہن کے جائے۔ اب اللہ جانے اس میں کتنی سچائی تھی مگر عبیو نے کبھی مخالفت یا اختلاف رائے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے پاس نہ تو اتنی ہمت تھی نہ ہی سوچ' وہ فارہ سے اتنی مرعوب تھی کہ ایسا لگتا تھا کہ وہ فارہ سے کبھی اختلاف کر ہی نہیں سکتی۔ سلطان احمد نہا کے نکلے تو فارہ ان کے کپڑے اور ناشتہ تیار کر چکی تھی لیکن سلطان نے ناشتہ نہیں کیا اور چلے گئے۔ فارہ پریشانی سے سارا دن بولائی بولائی پھری۔ بلاوجہ ہی اس دن عبیو کی بھی شامت آتی رہی۔

☆ ☆ ☆
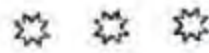
"اس بار الیکشن کی کیا پوزیشن ہے۔ تم نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہوئی ہیں ناں۔"

چچا جان فون پہ بات کر رہے تھے اور وہ ان کے ساتھ بیٹھا سیب کھا رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ شہر سے لوٹا تھا۔ کپاس کی فصل کے لیے اسے اسپرے اور کھاد چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ بھی الیکشن کی تیاری کے سلسلے میں بھی بھاگ دوڑ ہی کر رہا تھا روز ہی اسے انتخابی مہم کرنے کے لیے بھی جانا پڑتا۔ وہ تھک تو جاتا تھا لیکن چچا جان کی محبت اس کی ساری تھکن اتار دیا کرتی تھی۔ ابھی بھی انہوں نے اسے آتے ہی اپنے پاس بٹھا کے ملازم سے اس کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لانے کے لیے کہا تھا۔ اسے بھوک نہیں تھی لیکن چچا جان کی محبت اور دل رکھنے کے لیے اسے سیب کھانا ہی پڑ رہا تھا۔ جبکہ وہ فون پہ اپنے کسی دوست سے بات کر رہے تھے۔

"ہاں ہاں میرے گاؤں کی تم فکر مت کرو۔ وہ سب حذیفہ نے سنبھال رکھا ہے۔ خیر سے۔ بہت ہی سلجھا ہوا ہے میرا بھتیجا۔ ہاں بالکل بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتا۔"

حذیفہ نے اس بات پر فخر سے اپنے چچا جان کی جانب دیکھا تھا۔ وہ اس کی یوں ہی تعریف کیا کرتے تھے اور اسی لیے وہ بہت دل لگا کے ان کے سارے کام کیا کرتا تھا ویسے بھی وہ ہی ان کا جانشین ہوگا۔ اسی لیے تو راحت اکبر بھی اسے اپنے ساتھ ہی رکھا کرتے تھے۔

چاہے سیاست کی بات ہوتی یا زمین داری کی' انہوں نے سب کچھ اس کے حوالے کر دیا تھا حالانکہ وہ جاب کرنا چاہتا تھا۔ ذہین تھا اسی لیے تو اسے بی اے کے بعد ایک ملٹی نیشنل فرم میں بہت اچھی جاب مل رہی تھی لیکن اس کے چچا جان نے اسے یہ کہہ کے نہیں کرنے دی تھی کہ میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ تمہیں جاب کی کیا ضرورت' جو بھی پڑھ لکھ کے سیکھا ہے اسے یہاں استعمال کرو۔ سو اس نے اپنے شہر شفٹ ہونے کی خواہش کو ختم کرتے ہوئے سارے انتظامات سنبھال لیے تھے۔

"کون تھا چچا جان....؟" راحت اکبر نے فون بند کیا تو اس نے سوال کیا۔

"چوہدری مہر کا فون تھا۔ الیکشن میں ہماری پوزیشن پوچھ رہے تھے۔"

"آپ سے سُن گن لینے کے بعد جا کے اپوزیشن کے لیے ہمارے ووٹ خریدنے کی کوشش کرے گا۔" حذیفہ طنزیہ ہنسا تو راحت اکبر چونکے۔

"کیا مطلب' تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اس لیے کیونکہ میں نے کل رات ساتھ والے گاؤں سے واپسی پہ اسے ملک ریاض کے ڈیرے سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کی جیپ کئی بار کھڑی دیکھی گئی ہے وہاں۔" حذیفہ نے عام سے لہجے میں بتاتے ہوئے راحت اکبر کا سکون غارت کیا۔

"لیکن وہ تو مجھے ڈھائی سو ووٹ دلوانے کا وعدہ کر چکا ہے۔"

"وہ اس کے بدلے پانچ سو ووٹ توڑے گا آپ کے۔ بالکل بھی اعتبار مت کریں اس پہ۔" راحت اکبر نے اس بار اسے مسکرا کے دیکھا تھا۔

"یہ سیاست کی باریکیاں تمہیں کیسے سمجھ میں آگئیں۔ ہوں۔"

"آخر بھتیجا کس کا ہوں۔ آپ کے نقش قدم پہ نہیں چلوں گا تو کس کے چلوں گا۔ کل کو مجھے ہی تو یہ سب سنبھالنا ہو گا ناں۔" حذیفہ کو پورا یقین تھا کہ وہ اپنے چچا کا جانشین بنے گا اور ان کی سیاست کی گدی بھی وہی سنبھالے گا لیکن راحت اکبر مسکرا کے اس کی بات کا جواب نہیں دے سکے۔

"چچا جان! میرے سارے دوست کہہ رہے تھے کہ ضمنی الیکشن میں آپ مجھے بھی کوئی سیٹ دیں اس بار' میرا اپنا تو کوئی ارادہ نہیں الیکشن لڑنے کا لیکن اس طرح سے ایک اور سیٹ ہماری پکی ہو جائے گی۔"

کچھ دیر بعد اس نے ایک بار پھر ایسی بات کی تھی۔

"یہ آج تم سیاست میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو۔ ابھی میں مرا تو نہیں۔" راحت اکبر نے بظاہر مسکرا کے کہا تھا۔

"ارے اللہ نہ کرے چچا جان! آپ کو میری عمر بھی لگ جائے۔ میں تو ایسی کوئی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔" اس نے فوراً ہی تردید کی تھی۔

"تو پھر بے فکر رہو' وقت آنے پہ میں تمہیں کوئی چھوٹا موٹا نہیں بلکہ ایم پی اے کا الیکشن لڑواؤں گا۔"

انہوں نے جیسے اس کا دل رکھا تھا بس وہ ہی جانتے تھے۔ انہوں نے تو کبھی یہ بات سوچی ہی نہ تھی کہ کبھی ان کی جگہ ان کے بھائی کا بیٹا جسے وہ بس دنیاداری اور دکھاوے کی وجہ سے رکھے ہوئے ہیں' کبھی لے سکتا ہے۔ جس وقت حذیفہ کا باپ مرا اس وقت اس کی عمر کوئی سات برس ہو گی۔

جاوید اکبر ایک پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے انسان ہونے کے ساتھ ایک ہمدرد انسان تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ شرابی اور جواری بھی۔۔۔ اسی وجہ سے آئے دن وہ اپنی زمینیں ______ بیچتے رہتے اور اس شراب کی لت نے ہی تو ان کی جان لے لی تھی۔ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں وہ موقعے پہ ہی ہلاک ہو گئے تھے ان کی بیوی اور بیٹا اس وقت لاہور میں رہا کرتے تھے۔ جاوید کی وفات کے بعد وہ اپنی بھابھی پروین اور بھتیجے حذیفہ کو اپنے ساتھ گاؤں لے آئے تھے۔ حذیفہ کو انہوں نے کافی عرصہ ہاسٹل میں رکھا' اچھا اسے کھلایا پلایا' پہنایا۔

اس کے بعد جب نیلم کی اسکولنگ شروع ہوئی تو پھر وہ بھی گاؤں شفٹ ہو گیا تھا اور وہیں سے ہی روزانہ یونیورسٹی جاتا تھا۔ نیلم اس سے آٹھ برس چھوٹی تھی اور حذیفہ یہ شاید نہیں یقیناً" انہوں نے اتنی محنت کی ہی اسی لیے تھی کہ گھر کی دولت گھر میں ہی رہ جائے۔ لیکن اس کا احساس انہوں نے باقی کسی کو بھی کبھی ہونے ہی نہیں دیا تھا اور آج حذیفہ کی کہی بات بھی انہیں اچھی نہیں لگی تھی۔۔۔ وہ بے چین ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

شام کو سلطان بہت دیر سے لوٹے۔ پورے صحن میں بار بار چکر لگا کے چلتے چلتے فارہ کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ فارہ کو ہول اٹھ رہے تھے سلطان اسے کچھ بتائے بغیر پہلے تو کبھی نہیں گئے تھے اور ایسا بھی کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ناشتہ کر کے نہ جائیں۔ فارہ بے حد ڈری ہوئی تھی اور عبھو اسے دیکھ کے ہول رہی تھی۔

"باجی پلیز' بیٹھ جائیں ورنہ آپ تھک جائیں گی۔" عبھو نے اس کے کراس چپل میں مقید دودھیا پیروں کو دیکھا جن پر اب ہلکا سا ورم سا آنے لگا تھا۔

"تمہارے بابا نجانے کہاں رہ گئے۔" فارہ فکرمند تھی سو اسی لیے تمہارے بابا کہہ گئی ورنہ تو وہ میرا سلطان کہا کرتی تھی۔

"ہو سکتا ہے کہ آفس میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہو۔" عبھو نے تسلی دی۔

"پہلے تو اس وقت تک آجایا کرتے تھے' اور پھر میں نے اتنی کالز بھی کیں مگر انہوں نے میری کال بھی پک نہیں کی۔" وہ اور بھی فکرمند ہوئی۔

"اچھا آپ بیٹھ تو جائیں۔ دیکھیں نا کتنی سوجن آ گئی ہے آپ کے پیروں پہ۔" عبھو لپک کے کرسی

لے آئی تاکہ وہ بیٹھ جائے۔ فارہ کو ناچار بیٹھنا پڑا۔
"چائے لاؤں آپ کے لیے۔" عبھو کو باپ سے زیادہ شاید فارہ کی فکر تھی۔
"نہیں، تمہیں پینی ہے تو پی لو۔ میرا تو دل ہی نہیں چاہ رہا۔" فارہ نے گیٹ کی جانب دیکھتے ہوئے جیسے اسے اجازت دی۔
"میرا بھی دل نہیں چاہ رہا۔" عبھو خاموش ہو کر وہیں ان سے تھوڑی دور بیٹھ گئی اور دن والے واقعے کے متعلق سوچنے لگی۔
اسے رکزی کی حرکت نے بہت ہرٹ کیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا اب وہ اسے یہ سب چیزیں خرید کے دکھائے گی کہ وہ کسی خیراتی ادارے میں پلنے والی حسرتوں کی ماری بھوکی لڑکی نہیں ہے۔ وہ عبھو سلطان ہے۔ جس کا باپ بادشاہ وقت کو مات دے دے۔ جو اس کی بن کہے۔ ہر خواہش پوری کردے۔ وہ بھلا یہ عام سی 'عام سستی سی منیاری کی چیزیں نہیں لا کے دے سکے گا کیا' اسے آج سلطان احمد کی واپسی کا انتظار تھا اس لیے بھی کیونکہ اسے جا کے وہ ساری چیزیں لینی تھی مگر سلطان احمد تو آج آنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ دونوں ماں بیٹی کی نگاہیں دروازے پہ ہی جمی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"سنو لڑکے..." وہ جو اپنے کمرے سے تیار ہو کے نکل رہا تھا، چچی جان کی آواز پہ پلٹا۔
"جی چچی جان؟" وہ مڑ کے کچھ کچھ حیران ہوتا ان کی جانب بڑھا۔
"کہاں جا رہے ہو؟" انہوں نے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔
"ساتھ والے گاؤں میں چچا جان کا جلسہ ہے' وہیں جا رہا ہوں۔ یہ دیکھنے' تیاری ٹھیک سے ہوئی کہ نہیں۔" اس نے مودبانہ انداز اپنایا۔
"چلے جانا لیکن اس سے پہلے میری ایک بات غور سے سن لو۔" چچی نے گہری سانس بھر کے کہا۔ "جو خواب تم دیکھ رہے ہو نا بہتر ہے کہ اپنی آنکھیں کھول لو کیونکہ حقیقت کچھ اور ہے۔ تمہیں راحت اگر اپنے ساتھ رکھتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ تمہارا باپ اپنی عیاشیوں کے باوجود بھی تمہارے لیے کوئی قارون کا خزانہ چھوڑ کے مرا تھا۔ یہ راحت کی اعلا ظرفی ہے کہ انہوں نے تمہیں اپنا بیٹا بنایا ہوا ہے لیکن..." وہ سانس لینے کو رکیں تو ان کی نظر حذیفہ کے چہرے پہ پڑی جو شدت ضبط سے سرخ ہو رہا تھا۔ چچی کو کوئی بھی بات کرنی ہوتی ان کا آغاز ان ہی جملوں سے ہوتا تھا۔
"جی میں جانتا ہوں۔" اس نے دھیرے سے اعتراف کیا۔
"جانتے ہو تو پھر ایسی حرکتیں کیوں کرتے ہو۔ راحت اکبر کی تمام جائیداد کی مالک نیلم ہے تم نہیں اور راحت کے بعد اگر وہ چاہے گی تو ہی تم یا تمہاری ماں اس گھر یا اس گاؤں میں رہ پاؤ گے۔" وہ گرجیں حذیفہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بے وقت کی تقریر کا آخر مقصد کیا ہے۔
"جی میں یہ بھی جانتا ہوں۔" اس نے اپنے لہجے کی بےزاری کو چھپایا۔
"تو پھر اپنے آپ میں رہو' راحت جتنا کام کہیں بس اتنا ہی کیا کرو۔ میری بیٹی کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کیا کرتی ہے کیا نہیں کب کالج جاتی ہے یا پڑھائی میں کتنی اچھی ہے' یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ ابھی اس کی ماں زندہ ہے۔"
حذیفہ نے لمحوں میں جیسے ساری بات سمجھی تھی انہیں اس روز راحت اکبر کے ہاتھوں ہوئی نیلم کی عزت افزائی یاد آئی تھی۔ اس روز اسی کے بتانے پہ ہی تو راحت اکبر کو پتہ چلا تھا کہ وہ کتنے دنوں سے کالج نہیں جا رہی تھی اور اسی دن انہوں نے نیلم کو ڈانٹنے کے ساتھ اس کے ڈرائیور کو بلا کے بھی ہدایات دی تھیں کہ اگر نیلم کالج نہ جائے تو وہ انہیں آ کے لازمی بتائے۔

"تو یہ تو اچھی بات ہے نا کہ میں اس پہ نظر رکھوں۔ چچا جان اتنے بزی ہوتے ہیں' آپ گھر سے باہر نکلتی نہیں تو ایسے میں کوئی تو ہو جو نیلم پہ نظر رکھے۔" حذیفہ نے پرسکون انداز میں ——— چچی جان کی جانب دیکھ کر کہا تھا جو کہ اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں گویا کچا ہی چبا ڈالیں گی۔

"تمہاری حیثیت اس گھر میں ہے ہی کیا۔ جو تم اتنی جرات کا مظاہرہ کر رہے ہو۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس کی تذلیل کرنا ضروری سمجھی۔

"میری اس گھر میں حیثیت جو بھی ہو چچی جان! لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ چچا جان کی عزت میری عزت ہے۔"

"تمہارا کہنے کا مطلب ہے کہ میری بیٹی اپنے باپ کی عزت خاک میں ملا رہی ہے۔" وہ اونچی آواز میں گرجیں اور بات کا غلط مطلب لیا۔

"میں ایسا کیوں کہوں گا چچی۔۔۔ میں تو بس یہ۔" مگر انہوں نے اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی پہلے ہی شور مچا دیا تھا۔

"تو اور کن الفاظ میں کہو گے۔ تمہیں شرم نہیں آئی میری معصوم بیٹی پہ الزام لگاتے وقت' اپنے چچا کا ہی لحاظ کر لیتے۔ آخر کیا دیکھ لیا تم نے میری بیٹی میں جو تم اتنی بڑی بات کہہ گئے۔" چچی جان نے اونچی آواز میں کہہ کے نیلم کو بھی آواز دے ڈالی۔

"چچی جان میں نے ایسا نہیں کہا' آپ کیوں غلط بات کر رہی ہیں۔" حذیفہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اس نئی گلے پڑ جانے والی مصیبت سے جان چھڑائے۔

"ہاں ہاں اب تو تم یہی کہو گے ناں' میری بیٹی بدکردار اور میں جھوٹی سارے زمانے میں ایک تم ہی اچھے' ایک تم ہی سچے۔" انہوں نے جاہلانہ انداز میں کہتے ہوئے پروین کو دوبارہ آواز لگائی۔ وہ بے چاری ہڑبڑا کے باہر آئیں' ساتھ ہی نیلم بھی نکل آئی۔

"کیا ہوا' کیوں جھگڑا ہو رہا ہے؟" نیلم دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکلی۔

"آؤ آؤ' تم بھی سن لو۔ تمہارے چچا کے لاڈلے نے تمہارے بارے میں کیا فرمایا ہے۔" چچی جان نے نیلم کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ نیلم کا رنگ اڑ گیا۔

"کیا بات ہے حذیفہ! تمہاری چچی اتنا غصہ کیوں کر رہی ہیں۔" پروین نے ان دونوں ماں بیٹی کے بگڑے تیور دیکھ اپنے بیٹے سے پوچھا تھا جو اس سارے قصے سے خاصا بے زار نظر آ رہا تھا۔

"اس سے کیا پوچھتی ہو مجھ سے پوچھو۔ تمہارا بیٹا میری بیٹی پہ بدکرداری کا الزام لگا رہا ہے۔" پروین بیگم نے بے ساختہ اپنے منہ پہ ہاتھ رکھا تھا اور پھر حذیفہ کی جانب دیکھا تھا۔

"اس سے پوچھو کیا دیکھ لیا اس نے میری بیٹی میں آخر اس کی جرات کیسے ہوئی میری بیٹی پہ اتنا بڑا الزام لگانے کی۔" وہ بھپر چکی تھیں۔

"حذیفہ! تمہاری چچی ٹھیک کہہ رہی ہیں؟" پروین بیگم نے سرسراتے لہجے میں پوچھا تھا۔

"ان ہی سے پوچھ لیں۔ میں آل ریڈی لیٹ ہو چکا ہوں۔" یہ کہہ کے وہ ایک کینہ توز نگاہ چچی پہ ڈال کے چلا گیا تھا۔ چچی کو اس کی اس حرکت نے مزید تاؤ دلایا تھا یعنی کہ اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

"دیکھ لی اپنے بیٹے کی اکڑ ذرا جو اسے پچھتاوا ہو دیکھا' کیسے چلا گیا۔" چچی نے بھپرتے ہوئے پروین بیگم سے کہا تھا جو بلاوجہ ہی ڈرے جا رہی تھیں۔

"حذیفہ کی جانب سے میں معافی مانگتی ہوں بچہ ہے ایسے ہی الٹا سیدھا منہ سے نکل گیا۔ اس کے پروین نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"بچہ ہے تو کیا جو بھی منہ میں آئے گا یہ بول دے گا وہ بھی اول فول میری بیٹی کے کردار پہ بات کی ہے اس نے۔ آ جائیں آج چوہدری صاحب' وہی نپٹیں گے اس سے۔" پروین بیگم کی جان پہ بن آئی ساتھ ہی نیلم کی۔ اسے اپنی ماں کی کم علمی پہ شدید غصہ آیا۔ اس کے بابا کو ساری بات بتانے کا مطلب تھا کہ نیلم کو گھر پہ

بٹھا دیا جائے۔ ساتھ ہی اس کے روز و شب اور اس کی تمام حرکات و سکنات پہ نظر رکھی جائے۔

"ماما کیا ہو گیا ہے آپ کو، ہو سکتا ہے حذیفہ کی بات کا مطلب وہ نہ ہو جو آپ نے سمجھا ہو؟" نیلم نے آگے بڑھ کے اپنی ماں کو سمجھانے اور انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی، پروین بیگم نے حوصلہ افزا نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس کا جو بھی مطلب تھا میں اچھے سے سمجھتی ہوں۔ تم نے اس لڑکے کی آنکھوں میں ابھی بے شرمی نہیں دیکھی۔ ہمارے ہی ٹکڑوں پہ پل کے وہ ہمیں آنکھیں دکھانے لگا ہے۔" وہ غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بول رہی تھیں۔

"ماما پلیز۔" نیلم نے بے بسی سے ماں کی جانب دیکھا۔

"اس کی ہمت بھی کیسے ہوئی کہ تم پہ نظر رکھنے کی بات کرے، آج چودھری صاحب کو آجانے دو۔ فیصلہ ہو کہ رہے گا۔ زندہ زمین میں نہ گڑوایا تو میرا نام بھی چاندنی بیگم نہیں۔" وہ آگ بگولہ ہو گئیں۔

"میں سمجھا دوں گی اسے۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔" پروین بیگم نے اپنے آنسو پیتے ہوئے کہا۔ "بھائی صاحب کو کچھ مت بتائیں پلیز۔"

"تو کیا معاف کر دوں تمہارے بیٹے کو۔" چاندنی بیگم نے پروین بیگم کی جانب غصے سے دیکھ کے چبا چبا کے کہا تھا۔

"کچھ زیادہ ہی اڑنے لگا ہے چودھری صاحب سے الیکشن لڑنے کی بات کر رہا تھا۔ ہونہہ الیکشن پہ پیسہ اس کا باپ لگائے گا کیا۔ وہ باپ، جو شراب پیتے پیتے مر گیا۔" پروین بیگم نے اس طعنے پہ تڑپ کے چاندنی بیگم کی جانب دیکھا اور ضبط سے اپنی آنکھیں موند لیں۔ ان کے پاس الفاظ تھے نہ ہی بولنے کی طاقت اور جب طاقت نہ ہو تو خاموشی بہتر ہوتی ہے کیونکہ الفاظ اپنی اہمیت کھو جاتے ہیں۔

"ماما! آپ آئیں میرے ساتھ چلیں۔ اپنے کمرے میں ایسے ہی بول بول کے بی پی ہائی مت کریں اپنا۔"

نیلم ماں کو سمجھا بجھا کے کمرے سے باہر لے گئی تھی پروین بیگم تنہا کھڑی رہ گئی تھیں۔ نجانے اب کیا ہونے والا تھا۔ وہ آنے والے وقت سے خوف زدہ تھیں۔

☼ ☼ ☼

سلطان احمد رات بہت دیر سے گھر لوٹے۔ دونوں ماں بیٹی بھوکی پیاسی دروازے کے آگے کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ جس وقت وہ تھکے ہارے سے گھر میں داخل ہوئے فارہ انہیں دیکھ کے بڑی بے تابی سے ان کے سینے سے جا لگی اور عبیر تو اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکی تھی۔ حالانکہ ــــ باپ کے ــــ تھکا ہارا پریشان و متفکر سا گھر لوٹنے پہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی فارہ کی طرح اپنے بابا کو اپنی بے تابی کے بارے میں بتائے، ان سے پوچھے کہاں رہ گئے تھے بابا! میں نے اتنا انتظار کیا آپ کا۔ اور نہیں تو ان کے سینے میں سر چھپا کے فارہ کی طرح رو ہی لے مگر وہ فارہ جیسی نہیں تھی وہ اس کی طرح کھلم کھلا جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی تھی اسے آتا ہی نہ تھا۔ اسی لیے خاموشی سے اپنے لب کاٹتے ہوئے فارہ کو روتے اور چھوٹی موئی ہوتے دیکھتی رہی۔

"اچھا اب بس بھی کر دو۔۔۔ کیوں رو رہی ہو فارہ؟" سلطان احمد نے تھکے تھکے انداز میں اسے خود سے دور کیا۔ ان کے لہجے میں اتنی تھکن تھی جیسے وہ کچھ بھی کہے بغیر بس اب لمبی تان کے سو جانا چاہتے ہوں لیکن کیا فارہ کے ہوتے ایسا ممکن تھا؟ ہرگز نہیں۔

"نہیں، پہلے مجھے بتائیں کہ آپ صبح سے کہاں تھے اور نمبر کیوں آف کر رکھا تھا اپنا؟"

"فون گر کے ٹوٹ گیا تھا۔" انہوں نے آہستہ سے کہہ کے اسے خود سے الگ کیا اور آگے بڑھ گئے عبیر جو کچن سے اپنے بابا کے لیے پانی لینے گئی تھی انہوں نے اسے دیکھ کے فوراً اپنے پاس بلایا۔

"عبیر بیٹا! بابا کے پاس آؤ۔" عبیر تیزی سے اپنے باپ کے پاس آئی انہوں نے اسے اپنے گلے سے لگا

کے اس کا ماتھا چوما تو عبیرہ کی آنکھوں کی نمی اس کے سانولے چہرے پہ درد بن کے پھیلتے دیکھی اور پھیکے سے مسکرا دیے۔

"ایک دن مجھے گھر آنے میں دیر کیا ہوئی تم دونوں نے تو اپنا حشر کر لیا اور جو اگر مجھے کہیں دور جانا پڑے تو۔" سلطان نے بات ادھوری چھوڑ کے اس کے آنسو پونچھے' عبیرہ باپ کی اتنی سی شفقت پہ ہی نثار ہو گئی اس کا جی چاہا باپ کے قدموں سے لپٹ جائے۔

"کہیں مت جائیے گا بابا۔ ہم نہیں رہ سکتے آپ کے بغیر۔" عبیرہ نے بمشکل یہ بات ان سے کی۔ یہی بات اس کے چہرے پہ بھی تحریر تھی۔ ان کی بہت اچھی بات یہ تھی کہ وہ عبیرہ کے وجود سے چاہے کتنا ہی لاتعلق نظر آتے یا رہتے' اس کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی وہ اس کے متعلق سب جان لیا کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر نرمی سے عبیرہ کو گلے لگایا۔ باپ کے سینے سے لگتے ہی عبیرہ نے آنکھیں موند لیں اور پرسکون ہو گئی۔ سکون صرف ماں کی گود میں ہی نہیں ملا کرتا وہ باپ کی آغوش میں بھی ہوتا ہے۔ عبیرہ کو اس روز احساس ہوا تھا۔

حیرت تھی کہ فارہ نے بھی اس روز کوئی طوفان کھڑا نہیں کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اب کیا ہو گا؟" جو خوف عبیرہ کی آنکھوں میں اترا' وہی فارہ کے لہجے میں لرز رہا تھا۔

وہ تینوں اس وقت ______ صحن کے بیچوں بیچ چارپائی ڈالے بیٹھے تھے۔ رات کی سیاہی ان سب کے چہرں پہ بہ آسانی دیکھی جا سکتی تھی اور تین نفوس کے ہونے کے باوجود بھی اس گھر پہ موت کی سی ویرانی اور سناٹا تھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے سلطان' اتنا بڑا الزام۔" فارہ کی زبان ایک بار پھر ہکلا گئی۔ "ہمارا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

"ہمارا سب کچھ ختم ہو چکا ہے فارہ۔" سلطان احمد بہت دیر بعد بولنے کے قابل ہوئے تھے۔

"آپ بیس سال سے اس کمپنی میں جاب کرتے ہیں سلطان۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی آپ کی بے گناہی کا یقین نہ کرے۔ آپ کو کیس کرنا چاہیے۔"

"پندرہ کروڑ کا غبن ہوا ہے فارہ اور میری بے گناہی سے کوئی بھی لاعلم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود بھی یہ اتنا آسان نہیں کہ میں جاب کر سکوں۔ میرا یاس جانتا ہے کہ میں اس چوری میں ملوث نہیں ہوں لیکن میں جانتا ہوں جن لوگوں نے یہ سب کیا ہے' تمہیں کیا لگتا ہے وہ مجھے وہاں ٹکنے دیں گے۔ انہیں یہی خوف رہے گا کہ شاید میں' دیکھو فارہ! مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں ہے لیکن میں تم دونوں کا کیا کروں۔ میرے علاوہ تم لوگوں کا تو کوئی سہارا بھی نہیں ہے۔"

"تو اب آپ کیا کریں گے؟" فارہ نے خوف و ہراس بھرے لہجے میں سوال کیا اس کی حالت اس ہرنی جیسی تھی جو جنگل میں اچانک ہی کسی شکاری کے ہتھے چڑھ جائے اور کہیں سے جائے فرار نہ پا سکے۔

"میں ریزائن کر آیا ہوں۔" سلطان احمد نے بہت دیر سے اٹکی سانس بحال کرتے ایک دم سے بتایا تھا۔

عبیرہ نے بے ساختہ اپنے باپ کا چہرہ دیکھا جس پہ کرب و اذیت کا ایک جہاں آباد تھا' وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ اس وقت کس قدر اذیت میں تھے۔ کل تک سب کچھ ٹھیک تھا اور اب کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ ان کی جاب ختم ہو چکی تھی۔ وہ بہت بے عزت ہو چکے تھے بے شک وہ چور نہیں تھے لیکن پھر بھی ان پہ شک تو کیا گیا تھا۔

"تو پھر ہم کیا کریں گے' اب ہمارے پاس تو کوئی جمع جتھا بھی نہیں کہ کوئی کاروبار ہی کر سکیں سوائے ان چند زیورات کے جو میں نے اپنے لیے بنا رکھے ہیں۔" فارہ متفکر انداز میں جوڑ توڑ کرنے لگی تھی۔

"میں نے ایک دوست سے بات کی ہے' وہ مجھے کینیڈا بھجوا سکتا ہے۔" انہوں نے کہہ کے ایک دم ہی دھماکا کیا تھا فارہ اور عبیرہ جیسے ہل کے رہ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ٹیپو سے اس کی ملاقات کالج کے گیٹ کے باہر ہوئی تھی۔ اس روز اس کی دوست نائلہ کی طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی تھی وہ اور اس کی تین اور دوستیں مل کے بیمار نائلہ کو ہسپتال لے کے گئی تھیں۔ اس کا بی پی لو ہو گیا تھا۔ ٹیپو نائلہ کا ہی کزن تھا جو اپنی پھپھو کے گھر میں رہا کرتا تھا اور روزانہ نائلہ کو لینے اور چھوڑنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ جس دن نائلہ کی طبیعت خراب ہوئی اس دن ٹیپو ذرا لیٹ پہنچا تھا۔ نیلم اسے اپنی گاڑی میں اپنی باقی دوستوں کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ وہیں پہ ٹیپو اور اس کی بات چیت شروع ہوئی تھی ایک دوسرے کو دیکھ تو وہ تقریباً" سال بھر سے رہے تھے کبھی کبھار سلام دعا بھی ہو جایا کرتی لیکن اس سے زیادہ ان کے درمیان کوئی بات چیت نہ ہوتی تھی۔ لیکن اس دن جب وہ نائلہ کو اپنی گاڑی میں ڈاکٹر کے پاس لے کے گئی اور پھر واپسی پہ گھر بھی چھوڑنے کے لیے آئی تو اس سارے عرصے میں ٹیپو کو اس سے کافی ساری باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ ٹیپو نیلم کو اچھا لگتا تھا۔ وہ چوبیس پچیس سالہ لڑکا تھا جس نے ایم بی اے کیا تھا اور جاب کی تلاش میں تھا۔ زیادہ کھاتے پیتے گھر کا نہیں تھا لیکن دیکھنے میں بہت ہینڈسم تھا اور خوب صورتی نیلم کی کمزوری تھی۔ وہ خود بھی اچھی شکل و صورت کی لڑکی تھی۔ پڑھائی میں دل بھلے نہیں لگتا تھا لیکن اس کا دل فیشن میوزک اور دیگر چیزوں میں بہت لگنے لگا تھا۔ باپ کی اکلوتی تھی تو اسی لیے وہ اس پہ پیسہ پانی کی طرح بہایا کرتا تھا اور وہی پیسہ نیلم اپنی دوستوں اور بعد ازاں شامل ہونے والا ٹیپو پہ بارش کی طرح بہانے لگی تھی۔

ٹیپو اسے پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ان کا گاؤں لاہور سے کوئی ایک گھنٹے کی مسافت پہ تھا اور ٹیپو اکثر ہی نیلم سے محبت نبھانے کے چکر میں رات کے وقت ایک گھنٹے کا سفر اپنی بائیک پہ کر کے آیا کرتا تھا۔ نیلم سے اس کی محبت اتنی گہری ہو چکی تھی کہ اگر ایک دن بھی نیلم سے اس کی بات نہ ہوتی تو پاگل ہونے لگتا اور ہفتے میں ایک بار مل نہیں لیتا تو مانو قیامت ہی آجایا کرتی۔ نیلم کو اس کی دیوانگی پہ ہنسی بھی آتی اور رشک بھی۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا جو اس پہ مرتا بھی تھا اور اسے مار کے بھی رکھتا تھا۔ ٹیپو کو اچھا نہیں لگتا تھا کہ نیلم اس کے علاوہ اور کسی کی طرف دیکھے اور اسی لیے نیلم نہیں دیکھا کرتی تھی۔

ٹیپو کو پسند نہیں تھا کہ نیلم کا سوشل اکاؤنٹ اس کے نام سے ہو اور اس میں کوئی میل ایڈ ہو۔ نیلم نے اپنا اکاؤنٹ ڈی ایکٹیویٹ کر کے ایک فرضی نام سے اکاؤنٹ بنایا جس میں سوائے ٹیپو کے کوئی اور ایڈ نہیں تھا۔ ٹیپو کو پسند نہیں تھا کہ وہ اپنی کسی دوست کی پوسٹ یا اسٹیٹس پہ کوئی کمنٹ یا لائک کرے کہ وہ کسی مرد کی نظروں میں آئے۔ نیلم نے ایسا کرنا بھی چھوڑ دیا وہ سر تا پیر اس کی پسند میں ڈھل چکی تھی۔

دونوں ہی ایک دوجے پہ جان دیتے تھے بلکہ ٹیپو تو نیلم کے بغیر رہنے کا اب سوچنے سے بھی ڈرتا تھا اور یہی باتیں نیلم کو اندر ہی اندر گھائل کیے اس کا دیوانا کیے جا رہی تھیں۔ پچھلے ایک ہفتے سے نیلم کالج نہیں جا رہی تھی اور پچھلا ایک ہفتہ اس نے سارا سارا دن ٹیپو سے ہی باتیں کر کے گزارا تھا لیکن ٹیپو تھا کہ بس ایک ہی رٹ لگائے جا رہا تھا کہ اسے دیکھنا ہے۔

شام سے اس نے یہی رٹ لگائی ہوئی تھی، وہ نیلم کو کسی بھی طرح گھر سے باہر نکلنے کو کہہ رہا تھا۔

"میں اپنے دوست کی گاڑی لاتا ہوں تم کسی بھی طرح بہانہ کر کے نکلو۔ بس ایک گھنٹے کے لیے۔" ٹیپو کے لہجے کی بے قراری اس کے اندر ہونے والے تلاطم کی خبر دے رہی تھی۔

"میں اس وقت نہیں آسکتی ٹیپو! تم جانتے بھی ہو کہ میرا اس طرح سے گھر سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔" نیلم کو اس کی دیوانگی دیکھ کے افسوس ہوا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر تم نہ آئیں تو میں اپنی جان دے دوں گا، تم جانتی ہو مجھے۔" وہ بہت

جذباتی تھا اور اسی طرح نیلم کی جان ہولائے جاتا تھا۔
"میں نہیں آپاؤں گی ٹیپو! آج بابا جان کا دوسرے گاؤں میں جلسہ ہے' میں گھر سے کوئی بہانہ کر کے نہیں نکل سکتی۔" نیلم بے چارگی سے بولی تھی۔
"ارے یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہارے بابا لیٹ آئیں گے گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔ میں گاڑی لاتا ہوں۔ ایک گھنٹے بعد تمہیں واپس چھوڑ جاؤں گا آئی پرامس۔" ٹیپو نے فوراً" ہی پروگرام ترتیب دے ڈالا تھا۔
"میں صبح آؤں گی نا کالج۔"
"صبح ہونے میں تو ابھی بہت ـــ گھنٹے باقی ہیں اور اگر اس دوران میں مر گیا تو؟"
"اللہ نہ کرے' کیسی باتیں کرتے ہو۔" نیلم دہل گئی۔
"تو پھر اگر مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ورنہ یاد رکھنا۔ تمہارے گھر کے سامنے جان دوں گا۔" ٹیپو نے مزید دھمکایا تو نیلم کو ہنسی آگئی۔
"بڑے ہی ڈرامہ باز ہو قسم سے۔۔۔ مگر یہ بتاؤ کہ اب مما سے کیا کہوں؟" نیلم کو پھر الجھی۔
"تمہاری طبیعت بہت زیادہ خراب ہے اور تم سونے جا رہی ہو' دو گھنٹے تمہیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔" ٹیپو نے فوراً" ہی حل ڈھونڈ نکالا۔ نیلم کو سن کے اور بھی ہنسی آئی۔
"تم کتنے چالاک ہو' لیکن تم جانتے ہو مما پریشان ہو جاتی ہیں۔ وہ مجھے سونے تو کیا دیں گی' الٹا مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گی یا پھر دم درود کروانے۔۔۔ نہ بابا نہ میں یہ سب نہیں کر سکتی۔" اس نے ہاتھ جھاڑے۔
"تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔ ٹھیک ہے میں ہی پاگل ہوں جو تمہارے لیے جان تک دینے کو ہمہ وقت تیار رہتا ہوں۔" ٹیپو کا لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا اور وہ دکھی ہو گیا۔
"اچھا میں کچھ کرتی ہوں۔" اس کی آخری بات تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی اور نیلم اس سے ملنے پہ راضی ہو گئی۔ ٹیپو نے بے ساختہ مسکرا کے اپنے سیل فون کو چوما۔ نیلم فون بند کر کے تیار ہونے چل دی تھی۔

☆ ☆ ☆

تیار ہونے کے بعد وہ اپنی مما کے پاس آئی تھی جو کہ اپنی ذاتی ملازمہ سے پاؤں دبوا رہی تھیں۔ نیلم نے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل کیا اور گہری سانس بھر کے بات بنائی۔
"مما! کل میرا پیپر ہے۔ ابھی زارا کی کال آئی ہے۔ میں اپنے کمرے میں پڑھنے کے لیے جا رہی ہوں۔ پلیز مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔" چاندنی بیگم نے بیٹی کی شکل پہ چھائی بے زاری اور ٹینشن دیکھ کے پاؤں دبوانا بند کیے۔
"کس چیز کے پیپر۔۔۔ تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"
"بس ایسے ہی کلاس ٹیسٹ ہوتے ہیں' میں ایک ہفتے سے چھٹی پہ ہوں نا تو اس لیے پہلے پتا نہیں چل سکا۔"
"تو تیاری ہو جائے گی کیا تمہاری میں ایسا کرتی ہوں کہ تیرے لیے گرم دودھ جلیبی منگوا لیتی ہوں زیادہ پڑھو گی تو دماغ میں خشکی ہو جائے گی؟" چاندنی بیگم کو لگتا تھا کہ ان کی بیٹی بہت پڑھائی کرتی ہے۔ اسی لیے انہیں اس کی صحت کی بہت فکر رہا کرتی تھی۔
"نہیں ہو گی مما۔۔۔ تھوڑا سا ہی کام ہے۔ میں بس دو گھنٹے سکون کے ساتھ بیٹھ کے پڑھوں گی تو بالکل بھی مشکل نہیں ہو گی۔" نیلم جبراً" مسکرائی تھی۔
"اچھا تو پھر بتاؤ۔۔۔ رات کو کیا کھاؤ گی۔۔۔ میں وہی بنوا لیتی ہوں۔"
"جو بھی بنے گا میں کھا لوں گی اور پلیز۔۔۔ میں خود ہی کھانا باہر آ کے کھا لوں گی۔ میں کمرہ بند کر کے پڑھ رہی ہوں۔ کوئی مجھے بار بار ڈسٹرب نہ کرے۔" نیلم نے حفظ ماتقدم کے تحت کہا تھا کیونکہ جب بھی کبھی وہ پڑھنے بیٹھتی تھی' چاندنی بیگم سارے گھر کے ملازمین کو الرٹ کر دیتی تھیں۔ نیلم تو پہلے ہی کبھی کبھار کتابیں کھولا کرتی تھی۔ بار بار ملازمین کی دخل اندازی پہ کسی

ایک بھی مضمون پہ توجہ قائم نہیں رکھ پاتی تھی۔ چاندنی بیگم ملازمہ کے ہاتھوں کبھی اسے دودھ جلیبی بھجواتیں، کبھی ابلے انڈے اور دودھ پتی، کبھی بھنے چنے کبھی بادام۔۔۔ نیلم پڑھنے سے زیادہ کھانے پہ توجہ دیے رکھتی یا سوشل میڈیا پہ دوستوں سے چیٹ میں وقت گزار دیتی۔ اسی لیے آج اس نے پہلے ہی چاندنی بیگم کو روک دیا تھا۔ انہیں بھی لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی بہت ہی اہم ٹیسٹ ہے کہ ان کی بیٹی کسی کو اپنے کمرے میں آنے کی اجازت ہی نہیں دے رہی۔

انہوں نے نیلم کے سامنے ہی ساری ملازماؤں کو بلا کے نیلم کو ڈسٹرب نہ کرنے کی ہدایت دی تو نیلم نے شکر کا سانس لیتے ہی ٹیپو کو اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس آجانے کا میسج کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے اس کا ملگجی روشنی میں چھپا چہرہ اوپر کیا تو وہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"تم رو رہی ہو فارہ؟" سلطان احمد کے لہجے میں حیرت تھی۔ فارہ نے اپنے آنسو بے دردی سے صاف کرتے نفی میں سر ہلایا اور ان کا ہاتھ جھٹکا۔

"تو پھر کیا سوچ رہی ہو؟"

اس نے جواباً انہیں ایسی نظروں سے دیکھا کہ سلطان احمد دہل گئے۔ ان آنکھوں میں انہیں موت نظر آئی تھی۔

"کیا بات ہے کیا چھپا رہی ہو تم؟" وہ اس کی خاموشی سے ڈر گئے۔

"میں نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر، مرجاؤں گی اگر آپ نے مجھ سے دور جانے کا سوچا بھی تو۔" اس نے سسکتے ہوئے ان کے سینے پہ ہاتھ رکھا اور سلطان احمد تو نثار ہی ہو گئے۔

"میں جانتا ہوں۔" انہوں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"نہیں جانتے آپ۔۔۔ کچھ بھی نہیں جانتے۔۔۔ ورنہ اتنی دور جانے کی بات کرتے بھلا۔" اس نے نروٹھے پن سے ان کے ہاتھ ایک بار پھر جھٹکے۔

"میں وعدہ کرتا ہوں وہاں سیٹل ہوتے ہی تمہیں جلد بلالوں گا۔" ان کا انداز تسلی دینے والا تھا اور فارہ کی تو بس یہی بات سوچ کے جان نکل رہی تھی کہ سلطان نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

"آپ مجھے بہلائیں مت، آپ جانتے ہیں کہ فیملی کو بلانا اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ بھول جائیں گے ہمیں وہاں جا کر۔" فارہ نے ایک بار پھر اپنے آنسو صاف کیے۔ اس بار سلطان تادیر ہنستے رہے یہاں تک کہ فارہ شاکی ہو گئی۔

"تمہیں لگتا ہے کہ میں ایسا کر سکتا ہوں؟"

"ہاں، جب مجھے چھوڑ کے جانے کی بات کر سکتے ہیں تو کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" وہ اور بھی اینٹھ گئی۔ سلطان اس پہ جان دیتے تھے اور وہ سلطان پہ۔۔۔ اس محبت کا نشہ ہی تو تھا جو فارہ کے سر چڑھ کے بولتا تھا۔

"اچھا اپنا ہاتھ لاؤ ذرا۔۔۔ لاؤ نا۔" فارہ نے ان کے اصرار پہ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا تھا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں ہم اپنے جانے کے چھ ماہ بعد ہی تمہیں وہاں بلالوں گا۔ چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے میں کر گزروں گا۔" سلطان احمد نے جیسے ہی اپنی بات مکمل کی۔ فارہ نے ایسے ہاتھ چھڑایا جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"نہیں۔۔۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اگر آپ گئے تو میں آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔" فارہ نے ضد کی۔

"میں وعدہ کر رہا ہوں نا۔" سلطان نے مضبوط لہجے میں کہا تو فارہ نے ان کی جانب دیکھا۔

"اور عبیرہ، اس کا کیا ہو گا؟"

"اس کا بھی حل ہے میرے پاس۔" فارہ نے اس بات پہ اپنی آنکھوں میں چمک بھر کے سلطان کی جانب دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے گاڑی کھڑکی کے سامنے روک دی اور نیلم کی جانب مسکرا کے دیکھا۔

"بہت حسین لگ رہی ہو آج۔" ٹیپو نے اپنی آنکھوں میں وارفتگی بھری۔

"تمہیں دو گھنٹے میں اب نظر آیا کیا؟" نیلم نے نروٹھے پن سے کہا تو وہ مسکرایا۔

"نہیں' میری تو نظریں ہی نہیں ہٹ رہی تھیں تمہارے چہرے سے بس کہا اس لیے نہیں کہ کہیں تم مکھن بازی نہ سمجھ لو۔" وہ شرارت سے بولا۔ نیلم ہنس دی۔ وہ ٹیپو کی بہت زیادہ تعریف کرنے پہ اسے یہی کہا کرتی تھی۔

"اب تم جاؤ۔" نیلم نے مسکرا کے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اسے جانے کا عندیہ دیا۔

"میرا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا۔"

"پھر بھی جاؤ' اگر کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔" نیلم کو یکدم ہی خوف آیا۔ اگر واقعی میں اسے کسی نے دیکھ لیا تو۔

"تو کیا ہو جائے گا محبت جرات ہی تو مانگتی ہے۔" ٹیپو کی آنکھیں اس کے چہرے پہ پڑتے ہی خمار آلود ہو گئیں۔

"قیامت سے پہلے قیامت آجائے گی۔ بابا مجھے اور تمہیں یہیں زندہ زمین میں گاڑ دیں گے' سمجھے تم۔"

"اوہ۔۔۔ تو کیا ڈر گئی ہو تم۔" ٹیپو مسکایا۔

"نہیں' میں صرف تمہارے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔" نیلم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کے دبایا۔

"تو بے فکر رہو۔ تم جیو گی میرے ساتھ۔"

یہ کہتے ہی اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تھا۔ نیلم اسے خدا حافظ کہہ کے کھڑکی سے اندر کود گئی۔ ٹیپو گاڑی آگے بڑھا لے گیا تھا۔ نیلم کمرے میں آئی اور بھرپور انگڑائی لے کے اپنا پرس بیڈ پہ پھینکا اور خود واش روم کی جانب بڑھ گئی۔ منہ دھو کے میک اپ صاف کرنے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑے ہو کے برش اٹھایا ہی تھا کہ لائٹ چلی گئی۔ اسے بے طرح غصہ آیا اس نے ایمرجنسی لائٹ اٹھانے کے لیے جیسے ہی قدم اٹھایا، کسی نے اسے پیچھے سے آ کے جکڑا تھا۔

نیلم کی آنکھوں میں بے ساختہ خوف اترا تھا۔ اس کی چیخیں اس کے حلق میں ہی دم توڑ گئی تھیں۔ اس نے آنے والے کو آنکھیں پھاڑ کے دیکھا تھا۔

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ آنے والے نے اس کے منہ پہ بہت زور سے ہاتھ رکھ کے اس کی چیخیں تک دبا دی تھیں' نیلم کی جان پہ بن آئی' کس کی اتنی جرات ہوئی تھی کہ اس کے کمرے میں گھس آیا تھا۔ اس نے ہاتھ پاؤں مار کے چلانے کی کوشش کی' لیکن بے سود۔

"شی۔۔۔ آواز نیچے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" نیلم نے آواز پہ چونک کے دیکھا' وہ اس کے ساتھ ہی گھٹتی چلی گئی تھی۔ بتی جلی تو ایک روشن چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ نیلم کی جان میں جان آئی۔

"اف تم نے تو میری جان ہی لے لی تھی۔"

اس نے روشن چہرے پہ نگاہ ڈالی اور اندر تک سیراب ہو گئی۔

"جان لینے ہی تو آیا ہوں۔" وہ اس پہ جھکا۔ نیلم چالاکی سے پیچھے ہٹی۔

"واپس کیوں چلے آئے۔"

نیلی کو حیرت نہیں خوشی ہوئی تھی' ورنہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسی کے لیے واپس آیا ہے۔

"دل نہیں چاہ رہا تھا جانے کو۔" ٹیپو نے بے چارگی سے کہا۔

"مگر جانا تو پڑے گا کیونکہ رات بہت ہو گئی ہے اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو ہماری خیر نہیں ہو گی۔" نیلی کو ایک دم حالات کی سنگینی کا احساس ہوا تو بول اٹھی۔

"چلنے دو سب کو پتا۔ میں بھی دنیا والوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔" وہ مخمور انداز میں گویا ہوا۔

"اچھا اب جاؤ پلیز۔" نیلی کو کسی عجیب سے احساس نے اپنی لپیٹ میں لیا۔

"کیوں۔۔۔ ابھی تو بابا بھی نہیں آئے تمہارے۔۔۔ تھوڑی دیر تو رہنے دو' ابھی تو میں نے تمہارا کمرہ بھی نہیں دیکھا۔" ٹیپو جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"ٹیپو پلیز۔" اس نے بے چارگی سے ٹیپو کی جانب دیکھا تو وہ بمشکل ہی سہی، لیکن جانے کو راضی ہوا۔
گیراج میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تو نیلی کی جان سولی پہ ہی اٹک گئی، لیکن اس سے بھی پہلے ٹیپو کھڑکی پھلانگ چکا تھا، نیلم فوراً" کمبل اوڑھ کے سوتی بن گئی۔
گاڑی سے نکل کے گھر کے اندرونی حصے کی جانب آتے حذیفہ نے کسی کو دیوار پھلانگتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ تیزی سے نیلم کے کمرے کی جانب بڑھا۔ نیلم کے کمرے کی کھڑکی اچھی طرح سے بند تھی۔ حذیفہ چند لمحے وہیں کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے چوکیدار کو بلا کے فوراً" باہر بھیج کے معلوم کرنا چاہا، لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ تیزی سے گھر کے اندر داخل ہوا تھا۔ سامنے لاؤنج میں دس بجے کا ڈراما دیکھتے ہوئے چاندنی بیگم چونکی تھیں۔
"الٰہی خیر! کیا تمہارے پیچھے چور لگے ہیں جو ایسے بھاگ رہے ہو؟" چچی نے ناگواری سے کہتے ہوئے بظاہر فکر مندی سے پوچھا تھا مگر ابھی حذیفہ ان کی باتوں کی طرف دھیان نہیں دے سکتا تھا۔
"چچی جان! نیلم کہاں ہے؟" حذیفہ نے تیزی سے پوچھا تھا۔
"کیوں ہم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟" چچی نے تیکھے ابرو اچکائے۔ بھلا وہ کون ہوتا تھا ان کی نیلی کے بارے میں اس طرح سے بات کرنے والا۔ ہونہہ۔۔۔
"مجھ سے سوال مت کریں، بس بتائیں کہ کہاں ہے وہ؟" حذیفہ کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی اور وہ اپنی جیب سے موبائل نکال کے نمبر ملانے ہی والا تھا کہ چچی کو کسی سنگینی کا احساس ہوا۔
"کیا ہوا۔۔۔ خیریت؟ کچھ پھوٹو بھی۔" وہ چڑ گئیں۔
"نیلی کے کمرے میں کوئی تھا چچی جان۔" حذیفہ نے آہستہ سے دھماکا کیا، چچی نے بے ساختہ دہل کر اپنے منہ پہ ہاتھ رکھا۔
"میں نے ابھی اس کے کمرے کی کھڑکی کے پاس کسی کو دیکھا ہے۔ میرے پہنچنے تک وہ دیوار پھلانگ گیا۔ لیکن میرے بندے اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔" حذیفہ نے جیسے ہی بات مکمل کی۔ چچی تڑپ کے نیلم کے دروازے پہ جا پہنچیں۔
"نیلی! نیلی۔۔۔ دروازہ کھولو بیٹا۔ ماں صدقے۔" زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے کے باوجود بھی نیلم نے جب کافی دیر دروازہ نہیں کھولا تو انہیں حذیفہ کی بات میں صداقت نظر آئی۔ وہ اور بھی بے چینی سے دروازہ دھڑ دھڑانے لگیں۔
"نیلی، دروازہ کھولو، نیلی۔" اندر بیٹھی نیلی کو یقین تھا کہ اس کے کمرے سے نکلتے ٹیپو کو اس کے باپ یا کزن نے دیکھ لیا ہے۔ وہ ڈر کے مارے دروازہ نہیں کھول رہی تھی۔ قریب تھا کہ چچی دروازہ تڑوا دیتیں۔ ان کا واویلا سن کے پروین اور گھر کی دیگر ملازمائیں بھی آگئی تھیں۔ اچانک ایک ہنگامہ کھڑا ہو چکا تھا۔
"نیلی! دروازہ کھول دے ورنہ میں توڑ دوں گا۔" حذیفہ نے بالآخر غصے سے کہا تو نیلی جل تو جلال کا ورد کرتی دروازے تک آئی، لیکن انداز ایسا تھا جیسے گہری نیند سو رہی تھی۔
"کیا ہے ماما! کیوں اتنا شور کر رہی ہیں؟" اس نے اپنی نیند سے بھری مندی مندی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے سوال کیا۔
"میرا بچہ ہم ٹھیک تو ہو نا۔" چچی نے آگے بڑھ کے جب چٹاچٹ اسے چوم ڈالا تو نیلم کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے ماں کو حیرت و خوشی کے ملے جلے جذبات میں گھر کے دیکھا۔
"میں سو رہی تھی ماما، آئم سوری۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" اس نے حذیفہ، پروین اور گھر کے ملازمین کی طرف توجہ کیے بغیر ماں سے کہا تھا جو اس پہ ایسے واری صدقے ہو رہی تھیں جیسے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔
"بیٹا! حذیفہ نے ابھی تمہارے کمرے سے کسی کو

نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"کک کسے؟" نیلی نے گھبراتے ہوئے حذیفہ کی جانب دیکھا جو بغور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"کک کون تھا ماما... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" نیلی نے اپنی اداکاری کے بھرپور جوہر دکھانے کے لیے مزید ڈرنے کا ناٹک کیا۔

"جو بھی تھا' وہ چلا گیا۔ تم آرام سے سو جاؤ اب۔" حذیفہ نے بغور اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں' میں نہیں سوؤں گی' اگر وہ دوبارہ آگیا مجھے مارنے تو... ماما مجھے ابھی نہیں مرنا' پلیز مجھے بچالیں۔"

"ہاں بیٹا! کوئی کچھ نہیں کہے گا تمہیں... تم خود کو سنبھالو۔ خواہ مخواہ ہم نے تمہیں یہ بات بتا کے ڈرا دیا۔"

"ماما! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" نیلی رو رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوگا میری بیٹی کو تم آؤ' میرے ساتھ میرے کمرے میں سو جاؤ۔ آؤ۔" وہ اسے چمکارتے ہوئے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئی تھیں۔ حذیفہ کسی نتیجے پہ پہنچے بغیر وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

پریشانی سے ساری رات وہ سو نہیں سکا۔ جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا اسے بھلانا اتنا آسان نہیں تھا کہ وہ نئے سرے سے اپنے کام دھندوں میں لگ جاتا۔ اگر نیلی کے کمرے میں کوئی آیا تھا تو یقیناً" نیلی اسے جانتی تھی اور نہیں آیا تھا تو یہ اس سے بھی زیادہ خطرناک بات تھی کیونکہ سیاسی مخالفین الیکشن جیتنے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے بھی آزماتے ہیں۔ اسے پہلے سے زیادہ نظر رکھنا تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھا۔ الیکشن میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔

دوسرے دن صبح ناشتے پہ چچا جان نے اسے مردانے میں بلوا کے ساری بات سنی تھی؟ اگرچہ وہ اپنی بیوی سے ساری بات سن چکے تھے' لیکن وہ جانتے تھے کہ رونما ہونے والے واقعات کو دیکھنے اور سمجھنے میں مرد اور عورت کی بصیرت میں فرق ہوتا ہے' اسی لیے

انہوں نے حذیفہ سے پوچھنا مناسب سمجھا تھا۔
"تم نے خود اسے نیلم کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا؟"
"نہیں جس وقت میں پہنچا' وہ دیوار پھلانگ چکا تھا۔"
"کیا اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا؟"
"نہیں' یہ میرا خیال ہے۔"
"آدمی تھا یا لڑکا؟"
"لڑکا لگ رہا تھا۔"
"وہ تمہیں دیکھ کے بھاگا تھا یا تمہارے آنے سے پہلے ہی دیوار پھلانگ چکا تھا؟"
"میرے پہنچنے تک وہ جا چکا تھا۔"
"تم نے باہر کسی کو نہیں بھیجا اسے ڈھونڈنے کے لیے؟"
"میرے بندوں کے پہنچنے سے پہلے وہ وہاں سے جا چکا تھا۔"
"نیلم کے کمرے کی کھڑکی تمہیں کھلی ملی یا بند؟"
"بند تھی۔"
"اور نیلم... وہ کہاں تھی؟"
"وہ سو رہی تھی۔"
"تو پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ نیلم کو نقصان پہنچانے ہی آیا تھا؟" چچا جان نے اس بار بڑی ہی مشکل بات کہہ دی تھی۔ واقعی اس بات کا حذیفہ کو بھی پورا یقین نہیں تھا۔
"اس لیے کہ دیوار کے پاس ہی نیلم کا کمرہ ہے اور اس کی کھڑکی شاید کھلی تھی۔" حذیفہ نے آہستگی سے اپنے ذہن پہ زور دیتے ہوئے ساری بات دوبارہ سے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کہیں وہ بھول تو نہیں رہا۔
"دیکھو حذیفہ... تم پر یقین نہیں ہو کہ وہ آدمی نیلم کے کمرے میں نقصان اسے پہنچانے آیا تھا یا ہمیں... اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا نہ ہی تمہارے علاوہ اسے وہاں سے جاتا کسی نے دیکھا۔" چچا جان نے اس کی جانب دیکھ کے توقف کیا تو حذیفہ کی نظر بلا ارادہ ان کے چہرے کی جانب چلی گئی۔ وہاں اسے بہت سے شکوک و شبہات نظر آئے تھے۔
"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں چچا جان؟" اس نے نرمی سے سوال کیا۔
"صرف یہ کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی نشئی یا چور اچکا چوری کی غرض سے گھر میں گھسا ہو' لیکن جیسے ہی اس نے تمہاری گاڑی کی آواز سنی ہو' وہ بھاگ نکلا ہو۔ ایسے میں تم اگر یہ کہو گے کہ وہ نیلم کو مارنے آیا تھا یا اس کے کمرے سے نکلا تھا تو اس میں تو بدنامی میری بیٹی کی ہے نا؟"
اس بار بھی بات میں توقف کرتے ہوئے انہوں نے اس کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے کی ساری رگیں تنی ہوئی تھیں اور لب بھینچے ہوئے تھے یوں جیسے وہ اپنے غصے کو دبا رہے ہوں۔
"لیکن چچا جان!" ابھی حذیفہ شاید اپنی صفائی میں کچھ بولتا کہ انہوں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے ہولے لیکن سخت گرفت سے دبایا تھا۔
"دیکھو... ایم این کی سیٹ لاکھ میری ضرورت سہی' لیکن ایسے نازک وقت میں' میں اپنی بیٹی کا کوئی اسکینڈل نہیں بنوا سکتا۔ بات جب گھر سے نکلے گی تو دور تک جائے گی' اسی لیے میں نہیں چاہتا کہ اس بات کا ایشو بنایا جائے۔"
"جی میں سمجھ گیا۔" حذیفہ نے آہستہ سے کہا' وہ سمجھ گیا تھا کہ چچا جان براہ راست نہ سہی' لیکن اسے خبردار کر رہے ہیں۔ اسے دکھ ہوا' کیا وہ اسے ایسا سمجھتے ہیں' اس نے تو صرف ایک تجویز دی تھی کہ پہرہ بڑھا دیا جائے' جب تک کہ الیکشن کی سرگرمیاں سرد نہیں پڑ جاتیں' اسے کیا معلوم تھا کہ چچا جان اسے ہی غلط سمجھنے لگیں گے۔
"ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے کہ ہماری عقل کو پہنچ سکو۔ نیلم میری اکلوتی بیٹی ہے اور اس کی بدنامی مجھے کسی صورت گوارا نہیں ہے' سمجھے۔ میں وہ زبان کاٹ دینا پسند کروں گا جس سے میری بیٹی کے لیے برے الفاظ نکلیں۔"
انہوں نے بہت محبت سے اسے بہت سی باتیں

بتلا دی تھیں۔ مگر حقیقت تو یہ تھی کہ وہ خود بھی ڈبل مائنڈڈ ہوچکے تھے۔ حذیفہ کو آج پہلی بار ان کا رویہ خاصا عجیب سا لگا تھا۔ اجنبی اور مشکوک سا۔

"نیلم میری بھی کچھ لگتی ہے اور ایسا میں بھی نہیں چاہتا چچا جان۔ میں تو بس احتیاط کرنے کو کہہ رہا تھا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ میں نے کہا نا تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں سب سنبھال لوں گا۔" انہوں نے اس کے کاندھے پہ تھپکی دی تو حذیفہ کاندھے پر شال درست کرتا باہر چلا گیا۔ راحت اکبر کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔

☼ ☼ ☼

اس کی خامی یہ تھی کہ اس کے دل سے جلدی بات نکلتی ہی نہیں تھی۔

اچھی بات پہ دنوں سرشار رہنا اور دل دکھانے والی باتوں پہ مہینوں دل گرفتہ رہنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ گو کہ چچا جان نے اس سے بظاہر ایسی کوئی بات نہیں کی تھی، لیکن کچھ ایسا ان کے لہجے میں ضرور تھا جو کانچ بن کے حذیفہ کے دل میں چبھا تھا اور پھانس بن کے تکلیف دیتا تھا۔ اس روز یکلخت ہی وہ کھانا کھاتے ہوئے چونک گیا۔ اس کا چونکنا اس کے لیے اچھا ثابت نہیں ہوا۔ کاش وہ بے خبر ہی رہتا۔

اگلے دو دن اس نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سوچتے ہوئے گزارے تھے۔ بالآخر تیسرے دن وہ اس کے سامنے اس کے روبرو بیٹھا تھا۔

"مجھے تم سے صاف صاف بات کرنی ہے۔" اس نے نیلم کی بھاری لائنز اور مسکارے سے سجی آنکھوں اور ہونٹوں پہ لگی ہلکی لپ اسٹک کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ کالج جا رہی تھی اور وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا، اس دن نیلی کو چھوڑنے کا فیصلہ اس نے اسی لیے کیا تھا۔

"پوچھو۔۔۔ اب پھر کوئی اور الزام لگانا ہے مجھ پر۔" نیلی نے بے زاری سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا تم ایسا سمجھتی ہو؟" حذیفہ چونکا تھا۔

"تو تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم کوئی بھی ایسی گری ہوئی حرکت کرو گے تو ہمیں پتا نہیں چلے گا، ہے نا؟" وہ اور بھی تیکھی ہوئی۔ ویسے بھی اسے پھپو نے ہی سمجھایا تھا کہ اگر اب حذیفہ اس سے ایسی ویسی کوئی بات کرے تو اسے سختی سے ڈانٹ دے۔۔۔ تاکہ آئندہ اسے ایسی جرات نہ ہو سکے۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں بس ڈر گیا تھا کہ کہیں کوئی تمہیں نقصان نہ پہنچا دے۔"

"اوہ نقصان جیسے اتنی ہی پروا کرتے ہو نا میری۔ تم تو ہماری جائیداد پہ راج کرنے کے خواب دیکھتے ہو۔ کیا پتا مجھے بدنام کروانے کی بھی تمہاری ہی کوئی سازش ہو، تاکہ غیرت کے نام پہ بابا جان مجھے قتل کر دیں اور ان کی تمام جائیداد کے تم وارث بن جاؤ۔"

نیلی نے جی بھر کے زہر اگلا تھا، جس نے حذیفہ کے وجود کو نیل و نیل کر دیا تھا، ذہن کی ساری پرتیں ایک ایک کر کے کھل رہی تھیں۔

"تو تمہیں لگتا ہے میں نے جھوٹ بولا ہے؟؟" حذیفہ نے کسی خدشے کے تحت سوال کیا تھا۔

"مجھے کیا، سب ہی کو یہی لگتا ہے کہ تم نے جھوٹ بولا ہے، جبکہ میں تو سو رہی تھی۔" نیلی کا لہجہ تیز ہو گیا تھا اور حذیفہ کا تنفس۔۔۔ تو اس کے چچا اب اس پہ شک کرنے لگے تھے۔ انہیں اس پہ بھروسا نہیں رہا تھا، اسی لیے تو وہ اب بہت ضروری باتوں میں اس کے ساتھ مشاورت سے گریز کرنے لگے تھے۔ حذیفہ کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ کاش کہ وہ مر ہی جاتا۔ "میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میں نے اس لڑکے کو تمہارے ہی کمرے کی کھڑکی سے پھلانگ کے دیوار پہ چڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"کسی لڑکی کے کمرے میں کوئی لڑکا کھڑکی پھلانگ کے کیوں آتا ہے۔ کیا تم نے اس بات پہ غور کیا۔" نیلی نے اس کی خاموشی کو شرمندگی پر محمول کرتے ہوئے اسے مزید شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

"بابا اس دن سے کس قدر دکھی ہو گئے ہیں حذیفہ۔ جب سے انہیں چوکیدار نے بتایا کہ تم اس رات نشے میں تھے اور وہ جاگ رہا تھا۔ اس نے تو کسی کو نہیں

دیکھا تھا۔" حذیفہ اس الزام پہ باقاعدہ تڑپا تھا۔

"کیوں کیا تم نے ایسا۔ تمہیں مجھ سے میری بدتمیزیوں کا بدلہ لینا تھا تو لے لیتے لیکن بابا کو دکھی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے تو تمہیں ہمیشہ اپنا بیٹا ہی سمجھا ہے۔" نیلم مزید کہتی جارہی تھی لیکن حذیفہ سن نہیں سکا۔ اس کے تو اردگرد دھواں بھرنے لگا تھا جس میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼
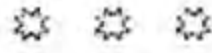
اس کی والدہ نے اس سے پھر ایک عہد لیا۔

اور عہد جان کی پروا کیے بغیر بھی نبھائے جاتے ہیں سو اس نے بھی عہد نبھانے کی قسم کھالی۔

"کیا بات ہے۔ کچھ پریشان لگ رہے ہو؟"

"نہیں کچھ نہیں ہے۔" اس نے اپنی ماں کے بوڑھے چہرے کی جانب دیکھا اور پھیکے سے انداز میں مسکرایا کہ جانے کب وہ اپنی ماں کی زندگی آسان کرپائے گا۔

"تو پھر کھانا کیوں نہیں کھایا تو نے؟" ماں کو تو بس ایک ہی فکر تھی کہ وہ بھوکا نہ سوجائے۔

"بھوک نہیں تھی مجھے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اور تیری بھوک کیوں اڑ گئی؟" ماں نے اس کے ماتھے پہ آئے بال ہٹائے۔

"امی جان! آپ میرا یقین کرتی ہیں نا؟" اس نے جانے کیوں، مگر یہ سوال پوچھا تھا' نہ پوچھتا تو شاید دل پھٹ جاتا اور ماں دہل گئی' یہ سوال پوچھنے کی نوبت کیوں آگئی تھی' وہ بھی اتنی جلدی۔ ابھی تو بہت سفر باقی تھا۔

"ہاں بہت کرتی ہوں۔" ماں نے اس کا ماتھا چوما۔

"کیا میری کہی ہر بات آپ کو سچ لگتی ہے۔ چاہے میں جھوٹ ہی کیوں نہ بول دوں؟" وہ ابھی بھی بے یقینی کی سیڑھی پہ کھڑا تھا۔

"نہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرا بیٹا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں نے اس کی ایسی تربیت ہی نہیں کی۔" ماں کے لہجے میں اپنی تربیت کا فخر اور اپنی ذات کا یقین بول رہا تھا۔

"تو پھر باقی لوگ میرا یقین کیوں نہیں کرتے۔ مجھے کیوں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں' جو میرے وجود کے اندر تک زہر بھر دیتی ہیں۔ میرے تن بدن میں سوئیاں چبھنے لگتی ہیں۔"

"ایک دن آئے گا جب سب یقین کریں گے تمہارا۔ تم بس اپنی ذات پہ یقین ختم نہ ہونے دینا۔ خود سے نفرت کبھی نہیں کرنا' ہمیشہ خود پہ بھروسا کرنا اور جب کوئی شخص ایسا کرنے لگتا ہے نا تو دنیا اس کی سچائی کو مان لیتی ہے' وہ اس کے وجود کو تسلیم کرتے اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔"

"امی جان! میں نے وہ سب نہیں کیا۔ میں وہ سب کرہی نہیں سکتا۔" وہ ماں کی گود میں پھوٹ پھوٹ کے رویا۔

"جانتی ہوں۔" ماں کی بنجر ہوتی آنکھوں سے آنسو لہو بن کے نکلے۔

☼ ☼ ☼

اس کا خوب صورت چہرہ کسی مسمار شدہ عمارت کی طرح ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا جس کے ٹھیک ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اسے سامنے کھڑا پایا۔

نیلی جینز پہ پیازی کلر کی بڑے کالرز والی شرٹ میں وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔

"اندر آنے کو نہیں کہو گی؟" ہینڈسم بھی جانتا تھا کہ وہ اس وقت مقابل کو متاثر کرنے کی پوزیشن میں ہے' اسی لیے لہجے میں تفاخر آپ ہی آپ سمٹ آیا تھا۔

"آجاؤ۔" وہ مسکرا کے پیچھے ہٹی' تاکہ وہ اندر آسکے۔

"ہوں' خوشبو تو کافی اچھی آرہی ہے' لگتا ہے بابا کی لاڈلی اچھی کوکنگ کرنا سیکھ گئی ہے۔"

"یہ بات تم مجھے کھا کے بتاتے تو مجھے اور بھی اچھا لگتا۔" وہ کچن کا کیبنٹ کھولے کچھ تلاش کرتے

ہوئے بولی تھی۔ اس بار وہ مسکرایا۔
"تم بھی نا، کسی بھی حال میں خوش نہیں ہوتی ہو۔" سلاد کی پلیٹ سے گاجر اٹھاتے ہوئے اس کے لہجے میں افسوس تھا۔
"خبردار... اگر ایک بھی چیز کو ہاتھ لگایا تو... جان سے مار دوں گی۔"
"ارے گھر آئے مہمان کے ساتھ اتنی زیادتی۔" اس نے گاجر واپس پلیٹ میں رکھ کے دکھ سے کہا۔
"یہی سمجھ لو' مگر سلاد سے پیٹ بھرنے کی میں تمہیں اجازت نہیں دے سکتی۔ یہ اتنا سارا کھانا میں نے تمہارے لیے ہی بنایا ہے' سمجھے۔ پچھلے تین گھنٹے سے کچن میں کھڑی ہوں۔" بے چاری لڑکی کو غصہ آیا تو وہ ہینڈسم پہ برس گئی۔
"اوہو... تو یوں کہو نا کہ پچھلے تین گھنٹے سے تم کچن میں کھڑی ہفتے بھر کا کھانا فریز کر رہی تھیں۔" وہ تو شریر ہوا تھا' لیکن بے چاری غصہ کر گئی تھی۔
"جسٹ شٹ اپ یار! میں نے یہ سب واقعی میں تمہارے لیے ہی بنایا ہے۔" بے چاری کا منہ بھی بن گیا۔
اس کے بعد وہ جا کے ٹی لاؤنج میں بیٹھ گیا' کھانا لگنے پہ ہی واپس آیا۔ اس نے پاپا کی لاڈلی کو تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔
"ارے واہ... مجھے تو لگتا تھا کہ تمہیں صرف منہ ہی بنانا آتا ہے' مگر تم تو کھانا بھی اچھا بنانے لگی ہو ڈیٹس گریٹ۔" کھانے کے بعد اس نے سچے دل سے اس کی تعریف کی تھی' بے چاری کھل کے مسکرائی۔
"بے چاری خوش ہوئی ہنڈسم..." ہینڈسم کی مسکراہٹ نے اس کا ساتھ دیا' لیکن محبت کی تتلیوں نے کورنش بجالانے سے انکار کر دیا۔ وقت کے ساتھ نے ان کی اس حرکت کو ناپسندیدگی سے دیکھا' کچھ تھا جو خلش دل پہ بغیر کسی وجہ کے چھوڑتا تھا۔
"کیا پلان ہے اب پاپا کی لاڈلی کے پاس؟" اس نے نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔
"تم اپنے وقت کا بتاؤ' میرے پاس پلانز ہی پلانز ہیں۔ اتنی ڈھیروں موویز لا کے رکھی ہیں جو مجھے صرف تمہارے ساتھ بیٹھ کر دیکھنی ہیں' ایک میوزک کنسرٹ کے پاسز بھی ہیں۔
جو تم کہو' یا جو تم کر سکو۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ کے خود کو سوالی بنا دیا۔
"روزی روٹی کا سوال ہے بی بی۔ اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس' صرف کل کا دن ہے میرے پاس' پرسوں سے پھر آفس کی مصروفیت۔"
"میرے لیے کبھی وقت نہیں ہوتا تمہارے پاس۔" بے چاری کے شکوے پہ ہینڈسم نے قہقہہ لگایا۔
"اب تم بالکل بیویوں جیسے منہ بنا رہی ہو۔"
"کاش تم بھی روایتی شوہر کی طرح مجھے منا سکتے۔" بے چاری کے دل کا درد اس بار شکوہ بن کے چہرے کے حسین نقوش پہ پھیلا۔ مگر ہینڈسم کے چہرے کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔
"ارے ہینڈسم... مذاق کر رہی تھی یار... ڈونٹ بی سیریس... اب پلیز ناراض ہو کے واپس مت چلے جانا۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے بمشکل تمام کہا تھا۔ ویسے بھی اتنی مشکل سے تو وہ یہاں آیا تھا' ورنہ تو وہ کہیں جاتا ہی نہ تھا۔
"اب اتنا بھی برا نہیں ہوں میں۔" اس نے اپنا دفاع کیا۔
"اچھے سے جانتی ہوں تم کتنے اچھے ہو۔" اس نے کافی پھینٹتے ہوئے اسے یاد دلایا۔ "یاد ہے مجھے۔" اس نے مبہم انداز میں کہتے ہوئے اسے کچھ جتلایا تو وہ مسکرایا۔
"جانتا ہوں۔ میں تم سے چھپ نہیں سکتا۔"
"تم کھلتے ہی کہاں ہو مجھ پہ' جو چھپنے کی نوبت آئے۔" پھینٹی ہوئی کافی میں دودھ اور کریم ڈالتے ہوئے اس نے بس ایسے ہی کہہ دیا تھا' کیونکہ جانتی تھی کہ وہ جواب نہیں دے گا۔
"کیا کرو گی مجھے جان کے... سوائے دکھوں کے کچھ نہیں ہے میری کہانی میں۔" وہ درد سے مسکرا بھی

نہیں سکا۔ ایک درد بھری یاد نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا تھا۔

"درد میں کمی اسے بانٹنے سے آیا کرتی ہے اور تم شیئر نہیں کرو گے تو وہ کم نہیں ہو گا' بلکہ تمہارے اندر گھٹن بھر دے گا۔" اس نے کافی کا مگ اسے تھماتے ہوئے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ رات کے دوسرے پہر ٹیرس پہ کھڑے اس نے آسمان کی چھت پہ سجے ستاروں کو دیکھنے کے بعد اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ اسے جیسے کسی نے آفاقی بصیرت عطا کردی تھی' اس نے ہینڈسم کے چہرے کی جانب دیکھا' اس کے چہرے پہ بے تحاشا خراشیں نظر آرہی تھیں۔ اس کا خوب صورت چہرہ کسی مسمار شدہ عمارت میں بٹ چکا تھا' جس کے ٹھیک ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔

"تم ٹھیک ہونا؟" وہ اس کے پاس آئی' اس کا جی چاہا اس کے خراشوں والے چہرے کو چھو کے دیکھے اور اس کا سارا درد اپنے انگلیوں کی پوروں کی مدد سے اپنے اندر اتار لے۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے بے چارگی لیکن اپنے بابا کی لاڈلی کی جانب دیکھنے سے گریز کیا جو نہ جانے کب سے اس کے ہر دکھ درد میں اس کے ساتھ آکے کھڑی ہونے لگی تھی۔ اس کے غصے اور بے زاری کے باوجود بھی وہ اپنی انا کو مارے' اس کے پاس مسکراتی کھڑی ہوتی تھی۔ اس کی ٹیبل کے بلاوجہ چکر لگانے والی' اپنی فائل جان بوجھ کے اس ٹیبل پہ رکھ کے بھول جانے والی' بالآخر اس کے پاس اس کے ٹیبل پہ بیٹھ کے ایک کپ کافی پینے میں تو کامیاب ہو ہی گئی تھی۔

"ہاں تم ٹھیک ہو اور تمہیں ہونا بھی چاہیے۔" اس نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ ہینڈسم نے نہیں' لیکن آسمان پہ سجی کہکشاں کے ستاروں نے سوچا وہ کس قدر پیاری اور پُرخلوص لڑکی تھی جو بڑی بڑی باتوں کو چٹکیوں میں اڑاتی تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پہ بچوں کی طرح خوش ہو کے ناچتی تھی۔

"تم بہت اچھی ہو اور تمہیں اتنا اچھا نہیں ہونا چاہیے۔" ہینڈسم نے کافی کا مگ خالی کرتے اسے ٹیرس کی گرل پہ رکھا۔

"وہ مجھ سے بھی زیادہ اچھا ہے' جس کے لیے مجھے بنایا گیا ہے' اس لیے مجھے اچھا ہی رہنا چاہیے ورنہ اس کا دل برا ہو جائے گا۔"

"تمہاری ناک کی لونگ چمک رہی ہے۔" ہینڈسم نے جان بوجھ کے موضوع بدلا۔

"ڈائمنڈ کی ہے' اس لیے۔" بابا کی لاڈلی نے جوش سے بتایا اور ہینڈسم تو جانتا ہی تھا کہ وہ ڈائمنڈز کی کتنی دیوانی تھی۔ اور وہ اسے یہ نہیں بتا سکی کہ اس کی ناک کی لونگ نہیں چمک رہی' بلکہ اس کا پورا وجود چمک رہا تھا' محبت کی روشنی سے' جو اس کی قربت میں اس کے چہرے سے پھوٹتی تھی۔

☼ ☼ ☼

شب گزیدہ کی آہ کی طرح وہ قطرہ قطرہ موم بن کے پگھلتی تھی۔

"یہ لیں۔" فارہ نے ایک سرخ رنگ کی مخملی پوٹلی ان کے سامنے کی۔ سلطان نے چونک کے انہیں دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"زیور ہے۔" فارہ نے آہستگی سے کہا تھا۔

"وہ کس لیے اور تم نے یہ لاکر سے کب نکلوایا؟" سلطان احمد نے حیرت سے پوچھا تھا۔ وہ آج کل اتنے زیادہ پریشان تھے کہ دماغ زیادہ تر ماؤف ہی رہنے لگا تھا۔

"یہ میں آپ کے لیے لائی تھی سلطان۔ آپ انہیں بیچ کے کوئی کاروبار شروع کرلیں' لیکن باہر جانے کا پروگرام مت بنائیں' پلیز۔" اور وہ جیسے لمحوں میں ساری بات سمجھے تھے۔ فارہ زیور کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھی' گھر کے خرچے کی مد میں وہ جو پیسے اسے دیتے تھے فارہ ان ہی کی کمیٹیاں ڈال کے زیور بنوایا کرتی تھی اور خاندان کی تقریب میں بڑے اہتمام سے پہن کے جایا کرتی تھی۔ جب ہی تو سب جگہ فارہ

کی واہ واہ ہوا کرتی تھی۔
"تم انہیں اپنے پاس رکھو۔۔۔ میں کچھ نہ کچھ انتظام کرلوں گا۔"
"وہ صرف آپ اپنے لیے کریں گے، لیکن اگر آپ یہاں نہیں رہے، باہر گئے تو میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔" فارہ نے ہٹ دھرمی سے کہا۔
"میں ابھی نہیں جارہا فارہ۔۔۔ میں ایسے کیسے جاسکتا ہوں جب تک عبیہ کا فرض ادا نہ کرلوں۔" فارہ نے اس بات پہ انہیں چونک کے دیکھا تھا اور چونک تو کچن میں چائے بناتی عبیہ بھی گئی تھی۔
"عبیہ کی شادی؟" فارہ کے لہجے میں حیرت زیادہ تھی یا حقارت۔۔۔ عبیہ فیصلہ نہیں کرپائی۔
"ہاں۔۔۔ عبیہ کی شادی۔" سلطان احمد نے ایک بار پھر دہرایا۔
"کرے گا کون آپ کی بیٹی سے شادی؟"
"جہاں نصیب ہوا ہو ہی جائے گی۔" سلطان احمد بھی کچھ خاص پُرامید نہیں تھے۔
"یہ بات تو پھر رہنے ہی دو۔۔۔ آج کل خوب صورت لڑکیوں کے رشتے ملنا مشکل ہیں اور آپ عبیہ کی شادی کرنے کی خواہش پالے ہوئے ہیں۔۔۔ ہم تو پیسے والے بھی نہیں ہیں کہ جہیز کے لالچ میں آکے کوئی اس سے شادی کرلے ہاں لیکن اگر اس کے نصیب اپنی ماں جیسے نکلے تو شاید آپ جیسا ہینڈسم کوئی مل ہی جائے۔" فارہ نے ایک ہی سانس میں طنز کے سارے تیر اپنی کمان سے نکالے تھے۔
"کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائے گا۔" سلطان احمد نے گہری سانس بھری۔
"ہاں! لیکن ایک فارہ کی حسرت دل میں دبائے ہوئے۔ خوب صورت بیوی ہر مرد کی اولین ترجیح ہوتی ہے سلطان احمد! اور یہ بات تم کبھی بھی اپنی بیٹی کی شادی کرتے ہوئے بھولنا مت۔"
"تم خالہ رشیداں سے بات کرو کہ کوئی رشتہ تلاش کرے، میں اب عبیہ کا فرض جلد سے جلد ادا کردینا چاہتا ہوں۔"
"کہہ دوں گی، لیکن یاد رکھیے گا یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔" فارہ نے ایک بار پھر تلخی سے کہا، وہ یوں ہی تلخ ہوجاتی تھی، اگر سلطان اس کے علاوہ کسی اور کو ذرا سی توجہ دیتے۔
"تم کہہ دوگی یا میں خود بات کروں؟" سلطان احمد نے اس بار غصے سے کہا تو فارہ تھم سی گئی۔ کچن میں کپوں میں چائے ڈالتی عبیہ کے ہاتھوں سے چائے چھلکی۔
اس کے اندر حسرت جاگی جو ہمیشہ کی طرح درد بن کے پورے وجود میں سرائیت کرگئی۔ احساس کمتری، اپنی کم مائیگی کا دکھ اور حسرتوں اور ناتمام خواہشات کا درد سب ایک ساتھ اکٹھے ہو کے اس کے پاس دو زانو ہو کے بیٹھ گئے۔ اس کے دکھ پہ گریہ وزاری کرنے کے لیے۔" عبیہ کا وجود موم بن گیا اور موم بن کے پگھلتا رہا۔ اس کا دل شب گزیدہ کی آہ کی طرح جلتا رہا۔

☆ ☆ ☆

وہ اگر حسن کی ملکہ تھی تو وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھی۔
اس نے بہت سوچ سمجھ کے اسے حسن کی ملکہ کا خطاب دیا تھا، لیکن اس کے باوجود بھی وہ تمام رات جلتی رہی تھی۔
"تم تو خیر اس کی سوتیلی ماں ہو فارہ۔۔۔ تم پہ تو یہ کیا جاتی، یہ تو اپنے باپ پہ بھی نہیں گئی، پوری اپنی ماں پہ پڑی ہے۔ ویسے ہی عام نقوش اور سانولی رنگت۔۔۔ سلطان کا تو کچھ بھی نہیں چرایا اس نے۔۔۔" کورس کی صورت کف افسوس ملا جاتا۔
عبیہ کا سر اس ناکردہ گناہ پہ جھک جھک جاتا، بس زمیں نہ پھٹتی کہ اپنے وجود کو چھپا سکتی۔
"چرایا کیوں نہیں۔۔۔ سلطان کا لمبا قد چرایا ہے ناں اس نے۔۔۔" اور پھر ایک چنگھاڑ کی مانند ان سب کے حلق سے نکلتا قہقہہ۔
لیکن گھر آکے فارہ اسے غصے سے دھکا دے کر خود سے دور کرتی، کبھی کبھی دو ہاتھ بھی جڑ دیتی۔
"تم ضرور کروایا کرو مجھے ہر جگہ شرمندہ۔۔۔ تمہیں

لازمی جانا ہوتا ہے ہر جگہ میرا دم چھلا بن کے۔ تمہیں اندازہ بھی ہے کہ مجھے کتنی شرمندگی ہوتی ہے تمہارا تعارف کرواتے ہوئے'' وہ چلاتی۔

''مجھے ڈر لگتا ہے امی جان!'' وہ بمشکل منمنا کے کچھ کہنے کی جرات کرتی۔

''اے خبردار۔۔۔ خبردار جو مجھے امی کہا تو۔۔۔ کچھ نہیں لگتی میں تمہاری۔ تمہاری ماں مر چکی ہے اور تم میرا نام لیا کرو یا پھر مجھے باجی کہا کرو۔''

اس دن سے وہ اس کی باجی ہو گئی' لیکن اس سے پہلے ایک دفعہ عبیر کو شادی والے گھر میں بھی فارہ سے مار پڑی تھی جب وہ کسی خاتون کو اپنے اور سلطان کے بارے میں فخریہ بتا رہی تھی' تب عبیر کی بدقسمتی کہ اس نے اسے۔۔۔ وہاں بھی امی کہہ دیا تھا' اس عورت نے حیران ہو کے پوچھا تھا۔

''یہ بچی کس کی ہے فارہ۔۔۔ تمہاری شادی کو تو ابھی آٹھ نو ماہ ہی ہوئے ہیں نا؟؟''

''آ۔۔۔ یہ سلطان کی پہلی بیوی سے ہے۔'' وہ اٹک اٹک کے بتانے پہ مجبور ہو گئی۔

''مگر ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ سلطان کنوارہ تھا' پھر یہ اتنی بڑی لڑکی کہاں سے آ گئی اور یہ تو کہیں سے بھی سلطان کی بیٹی نہیں لگتی۔ وہ تو ابھی تک بانکا جبیلا ہے۔'' تب فارہ کو منہ بنا کے سلطان کی پہلی شادی کی تاریخ دہرانی پڑی۔

'' وہ سلطان کی خالہ زاد تھی۔ والدہ ماجدہ نے مرتے وقت قسم دے کے اس۔۔۔ کے پلے باندھ دیا تھا بے چارے سلطان کو' وہ بے چارے تو میٹرک میں تھے اور اس کی ماں خاصی پکی عمر کی۔۔۔ ایک ہی گھر میں رہنے کی وجہ سے سلطان کو ماں کی خواہش پوری کرنی پڑی' لیکن وہ خوش نہیں تھے۔ زیادہ وہ بھی نہیں جی پائی ایک ہی بیٹی کے بعد کینسر ہو گیا اور مر گئی۔''

نخوت سے گردن کو جھٹکا دیتے اس نے کہانی کو عام سے انداز میں مکمل کر دیا' ایسے میں ماں کے بارے میں ہونے والی باتوں پہ غور کرنے کی بجائے عبیر' فارہ کے انداز بیاں اور حسین چہرے کے اتار چڑھاؤ میں گم رہی۔ وہ صحیح معنوں میں ماں' باپ دونوں کی دیوانی تھی اور ان جیسا بننے کی حسرت دل میں دبائے پھرتی تھی۔

عبیر تھوڑی بڑی ہوئی تو حالات و واقعات کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے قابل ہوئی' ساتھ ہی اپنی کم مائیگی کا احساس اور احساس کمتری پختہ تر ہو گیا اور اس میں زیادہ ہاتھ خود فارہ کا تھا۔ فارہ کی خود پسندانہ فطرت چاہتی ہی نہ تھی کہ وہ کبھی ابھر کے سامنے آئے یا اپنی ذات سے آگاہی حاصل کرے' فارہ چاہتی تھی کہ ہمہ وقت ایک جہان اس کی مدح سرائی میں مصروف رہے اور یہ کام آنکھوں میں شوق جہاں آباد کیے' عبیر بخوبی سرانجام دیتی۔

وہ اکثر شام کے وقت اپنے بابا کی آمد سے پہلے فارہ کے تیار ہونے پہ آنگن میں لگے گلاب چنبیلی کے پھولوں سے گجرا تیار کر کے اس کے ہاتھوں میں پہناتی' اسے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھتی خوب سراہتی اس نے بہت کم عمری سے یہ محسوس کیا تھا کہ فارہ اپنی تعریف سن کے خوش ہوتی ہے۔ اس وقت جب وہ ساتویں جماعت کی طالبہ تھی اور اپنی ایک دوست کو اپنے گھر لے آئی تھی اور جس وقت اس نے بہت فخر سے فارہ کا تعارف اپنی اسکول کی سہیلی سے یہ کہہ کے کروایا تھا کہ۔۔۔۔

''میری فارہ باجی اس دنیا کی حسین ترین لڑکی ہیں۔ ان جیسا کوئی نہیں' دیکھا میں غلط نہیں کہتی تھی۔''

اس کی دوست اس دن یہی دیکھنے آئی تھی اور جاتے ہوئے اس نے فارہ کی خوب تعریفیں بھی کی تھیں۔ اسی شام عبیر نے نوٹ کیا کہ فارہ کا رویہ اس کے ساتھ کافی اچھا ہے اور اس کا موڈ بھی کافی اچھا ہے۔ اس نے خلاف عادت اس کی دوست کی خاطر بھی کی اور جاتے ہوئے اسے دوبارہ آنے کی دعوت بھی دی اور دوسرے دن اس سے پوچھا بھی کہ تمہاری دوست نے تمہاری کلاس کی لڑکیوں کو میرے بارے میں کیا بتایا۔

عبیر نے بہت جوش سے اس کی باتیں اور کچھ خود سے

گھر کے سنائی تھیں، فارہ سن سن کے ہنستی رہی۔
اس دن عبیر کی پسند کا کھانا بھی بنا اور فارہ نے اسے سلطان کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے بھی کہا۔ سلطان کے سامنے وہ ایک بہت اچھی ماں تھی، جسے عبیر کی بہت فکر تھی۔ سلطان اپنی زندگی میں فارہ اور عبیر کے حوالے سے ایک بے حد اچھی اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔
"فارہ باجی کل جو آپ نے کالا سوٹ پہنا تھا نا وہ تو آپ پر اتنا خوب صورت لگ رہا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ آپ کو نظر نہ لگ جائے۔ وہ پڑوس کی خالدہ تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے آپ کو دیکھے جا رہی تھی۔" اپنی طرف سے وہ اسے میلاد سے واپسی کی تازہ ترین خبریں دے رہی تھی، مگر فارہ ایسے موقعے کو اس کی محبت میں بھی جانے نہ دیتی۔
"بھئی مجھے یہ نظر وظر کا کوئی نہیں ہے۔ میرے ساتھ نظر بٹو کے طور پہ تم جو ہوتی ہو۔" وہ اس کے سیاہ پڑتے چہرے کو دیکھ کے قہقہہ مار کے مذاق کا رنگ دیتی۔ مگر عبیر سنجیدگی سے اعتراف کرتی۔
"ہاں یہ بھی ہے۔" عبیر سلطان سفاکی کی آخری حد تک حقیقت پسند تھی۔ لیکن اپنے کمرے میں آکے وہ بے ساختہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ قدرے لمبے چہرے پہ موٹی موٹی آنکھوں کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ لمبا قد، سوکھا جسم، رنگت بھی دھوپ میں پھرنے کی وجہ سے مزید جل گئی تھی۔ ویسے بھی فارہ اسے کوئی بھی کریم یا لوشن لگانے نہیں دیتی تھی کہ اسکن نہ خراب ہو جائے، خود وہ دیسی ٹوٹکوں سے لے کے نہ جانے کتنی ہی مہنگی کریمیں اپنی دراز میں لاک کیے رکھتی اور ہاتھ لگانا تو دور وہاں تو عبیر کی نظر بھی نہیں جا سکتی تھی۔
وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کے پہروں وقت کا حساب کیے بغیر رونے لگتی اور پھر —— رب سے شکوے شروع ہو جاتے۔ کیا جاتا کہ اگر وہ بھی تھوڑی سی حسین ہوتی۔ کم از کم ان کے گھر میں آنے والا کوئی

مہمان اس قدر اچنبھے کا اظہار تو نہ کرتا۔ ابھی تو شکر تھا کہ فارہ کی کوئی اولاد نہیں تھی اس ڈر، خوف اور احساس کمتری نے اس کی شخصیت میں کئی جھول پیدا کر دیے تھے۔ اسکول سے آگے وہ کوئی دوست نہ بنا سکی، حالانکہ وہ پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ لڑکیاں اس کی ذہانت سے متاثر ہو کے اس سے دوستی کی خواہش بھی کرتیں، لیکن وہ اس ڈر سے رک جاتی کہ اگر وہ اس کے گھر والوں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کریں گی تو وہ کیسے انہیں منع کر پائے گی۔
فارہ تو چھا جانے کا ہنر رکھتی تھی۔ ویسے بھی وہ اپنا اتنا خیال رکھتی تھی کہ شادی کے اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی اتنی حسین اور جوان تھی۔ وقت بخوشی اپنی گرد اس پہ ڈالے بغیر ٹھہر سا گیا تھا، جیسے وقت کو بھی اس سے محبت ہو گئی ہو اور وہ مرعوب ہو کے کہتا ہو۔
"کہ فارہ تمہارا حق ہے کہ وقت تم پہ مہربان ہو اور تم آب حیات کا جام نوش کر کے سدا حسین و جوان دکھائی دیتی رہو۔"
عبیر میٹرک میں آگئی تھی، پھر اس نے بی اے بھی کر لیا۔ آگے پڑھنے کو دل نہیں چاہا، اسی لیے گھر پہ بیٹھ گئی۔ گھر کے سارے کام کاج کے علاوہ سلائی کڑھائی میں بھی طاق ہو چکی تھی۔ وہ ذہین تھی، لیکن کبھی بھی اسے اپنی اس خوبی کا احساس نہ ہوا، نہ دلایا گیا۔ کبھی جو اس کی نظر کسی کم صورت لڑکی پہ پڑتی تو عبیر کا دل چاہتا، وہ بے ساختہ اس سے لپٹ کے رو دے، اسے اپنا دکھ کا ساتھی مل جاتا، عبیر کے قدم اس وقت زنجیر ہوتے جب وہ ان ہی کم صورت لڑکیوں کے پُراعتماد چہرے دیکھتی۔ ان کے مسکراتے چہرے دیکھتی ان کے مسکراتے چہرے ہر طرح کی فکر و غم سے آزاد دکھائی دیا کرتے تھے۔ اسے سارا جہان خود سے بہتر دکھائی دیتا۔
چند سال پہلے ان کے ہمسائے میں ایک گھرانہ آکے آباد ہوا تھا۔ رکزی نامی لڑکی اکثر ہی اپنی چھت پہ ٹہلتی دکھائی دیتی۔ وہ والدین کی اکلوتی اولاد تھی، خوش مزاج، خوش گفتار پہلے ہی دن کڑھی پکوڑے بنا کے ان کے گھر آن دھمکی۔ دروازہ عبیر نے کھولا، وہ اس سے

بڑے تپاک سے ملی ایسے گویا برسوں پرانی شناسائی ہو، مگر پھر حسب عادت وہ پس منظر میں چلی گئی جب فارہ نے عبیو سے پوچھا۔
"یہ کون ہے عبیو۔۔۔"
رکزی نے مڑ کے آواز کے تعاقب میں دیکھا اور کسی مقناطیسی کشش کے تحت کھنچی ہوئی فارہ تک گئی۔ عبیو پھیکا سا مسکرائی۔ وہ تو یوں بھی عادی ہو چکی تھی اس سب کی بلکہ اب جو کبھی کوئی فارہ کی جانب نہ بڑھتا تو اسے حیرت ہوتی اور اس شخص کی عقل پہ افسوس بھی۔
"میں ہوں رکزی۔۔۔ یہ برابر والے گھر میں ابھی کل ہی شفٹ ہوئے ہیں، اماں نے کڑھی پکوڑے بنائے تھے، سوچا کہ آپ کو بھی چکھا دوں، اماں کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے نا۔" وہ شاید بولنے کی بہت شوقین تھی۔ اسی لیے اس نے سانس لیے بغیر جملہ مکمل کیا اور ٹرے فارہ کے آگے بڑھا دی۔
"اچھا۔۔۔ چلو چکھ کے دیکھتے ہیں کہ تمہاری اماں کے ہاتھ میں کتنا ذائقہ ہے، پھر ہم تمہیں اپنے ہاتھ کی کڑھی بنا کے کھلائیں گے، پھر فیصلہ تم خود ہی کر لینا۔۔۔ کیوں عبیو؟" اس نے عبیو سے تائید چاہی تھی۔
"ہاں ہاں۔۔۔ جلدی پتا چل جائے گا فارہ باجی بہت اچھی کڑھی پکوڑے بناتی ہیں، پورا محلہ تعریفیں کرتا ہے۔" رکزی کو سن کے حیرت ہوئی، وہ یہاں پہ کسی مقابلے کے لیے تو نہیں آئی تھی۔ خیر اس نے سر جھٹکا۔
"یہ لڑکی آپ کی بہن ہے کیا؟" رکزی نے مڑ کے عبیو کو دیکھا، وہی ایک اچنبھے والی نظر جو عبیو کو اندر تک ہلا کے رکھ دیا کرتی تھی۔
"بیٹی ہے میری۔۔۔ سوتیلی۔۔۔" طویل وقفے کے بعد لفظ سوتیلی بولا گیا۔ رکزی کی آنکھوں کا پھیلتا حجم لمحوں میں لفظ سوتیلی پہ سمٹا اور چہرے پہ سکون در آیا اور سانس ایسے لی جیسے کسی تختہ دار پہ لٹکی ہو۔
"اوہ۔۔۔ میں بھی حیران کہ اتنی بڑی لڑکی، وہ بھی آپ کی بیٹی، اف توبہ!! آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔ آپ تو مجھے شادی شدہ بھی نہیں لگیں، آخر کرتی کیا ہیں؟" فارہ اکثر ایسے موقعوں پہ اٹھلا کے گردن اکڑاتی اور عبیو کو لگتا وہ ایسی شہزادی کی مانند ہے جسے یہ سب کرنا زیب دیتا ہے، فخر و انبساط اور غرور۔۔۔ اس کی زندگی ایسے ہی گہنوں سے مرصع ہے اور ہونی بھی چاہیے۔ یہی سب اس کے شایان شان ہے، وہ حسن کی ملکہ تھی ملکہ۔

☆ ☆ ☆

اس کی زندگی میں کہیں کوئی روزن، کہیں کوئی روشنی نہیں تھی۔
فارہ اور سلطان رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے ابھی تک سو رہے تھے، اس نے چائے بنا کے پی اور گھر کا دروازہ بند کر کے باہر کا دروازہ کھول کے۔۔۔ نکل گئی۔ اب وہ رکزی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔
"تم۔۔۔ اس وقت۔۔۔ خیریت ہے نا؟" دروازہ رکزی نے ہی کھولا تھا اور وہ عبیو کو اپنے سامنے دیکھ کے حیران رہ گئی تھی۔ عبیو نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اس کی ذات اس کے والدین کے درمیان جدائی کا باعث بن رہی ہے تو وہ اس وجہ کو ختم کر کے ضرور دکھائے گی۔
"ہاں، سب ٹھیک ہے۔" عبیو نے آہستہ سے کہا اور اندر بڑھ آئی۔
"چائے پیو گی؟" رکزی نے کچن میں جاتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ وہ شاید اس کے آنے سے پہلے چائے ہی بنا رہی تھی۔
"نہیں۔۔۔ تم مجھے وہ کریمیں دے دو جو مجھے خوب صورت بنا دیں۔" عبیو نے تیزی سے کہا تو رکزی بغیر کچھ کہے بغیر اندر کی جانب بڑھ گئی اور وہ کریم لا کے اسے تھما دی جسے اس نے پہلے لینے سے انکار کر دیا تھا۔
"یہ مجھے خوب صورت تو بنا دیں گی ناں رکزی؟" عبیو نے انہیں کسی قیمتی شے کی طرح تھامتے ہوئے بے تابی سے سوال کیا۔ اندر کھڑکی کے پاس کرسی پہ بیٹھا سی ایس ایس کے پیپر کی تیاری کرتا نبیل اس لہجے و انداز پہ بے ساختہ چونکا تھا۔
"ہاں، بہت۔" رکزی بے ساختہ ہنسی تھی۔

"تم سچ کہہ رہی ہو نا۔" اسے جیسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"تو اور کیا جھوٹ بولوں گی' تمہاری قسم۔" اس نے اسے یقین دلانے کو باقاعدہ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے بس خوب صورت بننا ہے 'کسی بھی طرح۔۔۔ بابا بہت پریشان ہیں 'ان کی جاب ختم ہو گئی ہے نا۔۔۔" عبیر نے بے چارہ سامنہ بنایا۔ "وہ کینیڈا جانا چاہتے ہیں 'لیکن فارہ باجی انہیں جانے نہیں دے رہیں تو بابا نے پھر یہ فیصلہ کیا ہے کہ میری شادی کر دیں۔ لیکن رکزی! مجھ سے شادی کون کرے گا۔"

"اسی لیے تمہیں اس کی ضرورت پیش آگئی؟" رکزی جیسے آگے کی ساری بات سمجھ گئی تھی۔

"فارہ باجی کہتی ہیں کہ مجھ جیسی بدصورت لڑکی سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔ میں اسی طرح بابا اور ان کے سینے پہ مونگ دلتی رہوں گی' اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں بھی اب خوب صورت بنوں گی' تاکہ بابا' فارہ باجی کو بھی اپنے ساتھ ہی کینیڈا لے جائیں۔" اس نے تیز تیز بولتے ہوئے رکزی کو بتایا تو کھڑکی کے پار بیٹھے نبیل نے اپنی کتاب بند کر دی۔ اسے اس کتاب سے زیادہ دلچسپ اس لڑکی کی باتیں محسوس ہو رہی تھیں۔

"تم نے اپنے بابا کو یہ کیوں نہیں کہا کہ تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جائیں؟" رکزی کو جانے کیوں' مگر ہمیشہ ہی اس پہ ترس آتا تھا۔

"بابا کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں' وہ تو فارہ باجی کو بھی منع کر رہے ہیں' لیکن فارہ باجی نے اپنا زیور بیچنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہ تو زیور بیچ کے بابا کے ساتھ جا سکتی ہیں' لیکن میرے پاس تو بیچنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے معصومیت سے کہا تھا۔

رکزی کچھ کہے بغیر چائے کا کپ لے کے اندر بڑھ گئی اور کپ جا کے نبیل کے پاس ٹیبل پہ رکھ دیا' واپس آئی تو عبیر کو کسی سوچ میں گم پایا۔

"کیا سوچ رہی ہو عبیر؟" رکزی نے اسے گم صم دیکھ کے سوال کیا۔ آج اسے عبیر میں عجیب سی تبدیلی نظر آرہی تھی۔

"ایک بات تو بتاؤ رکزی۔"

"پوچھو۔۔۔؟"

"کیا میں واقعی میں بہت بدصورت ہوں۔" رکزی کی اب سمجھ میں آیا۔ وہ عبیر کے لہجے کا دکھ تھا جو کانچ بن کے اس کے دل میں چبھ رہا تھا۔

"یہ سب تمہیں فارہ کہتی ہے کیا؟"

"ہاں۔۔۔ لیکن مجھے خود بھی یہی لگتا ہے جیسے میں بہت ہی بدصورت ہوں۔"

"اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو پھر میری بات غور سے سنو۔ بدصورت وہ نہیں جس کی شکل اچھی نہیں' بلکہ وہ ہے جس کا دل اور اخلاق برا ہے۔ اور تم دل کی بھی بہت اچھی ہو اور اخلاق کی بھی۔"

نبیل اس بار کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس لڑکی کا چہرہ دیکھنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔

"دل کون دیکھتا ہے' سب شکل ہی دیکھتے ہیں اور خوب صورت لوگوں کی تو خطائیں بھی معاف ہو جایا کرتی ہیں۔"

عبیر کی آنکھوں کے سامنے فارہ کی غلطیوں کے کئی مناظر گھوم گئے جن پہ سلطان احمد اف بھی نہیں کرتے تھے' جبکہ عبیر سے ایک گلاس ٹوٹ جانے پہ فارہ گھر میں طوفان اٹھا دیا کرتی تھی۔

"فارہ باجی بہت حسین نظر آتی ہیں۔" عبیر نے جانے کس احساس کے تحت کہہ دیا تھا۔

"ایسی کوئی دنیا کی انوکھی خاتون نہیں ہیں۔ اگر تم بھی اپنا خیال رکھو گی تو تم بھی یقیناً" اس سے زیادہ حسین لگ سکتی ہو۔" رکزی نے قطعیت سے کہا تھا' لیکن عبیر اس کی بات سن کے یوں ہنسی جیسے اس نے کوئی بے وقوفی کی بات کر دی ہو۔

"پاگل ہو گیا۔۔۔ بھلا میرا اور فارہ باجی کا کیا مقابلہ۔۔۔ میں ان جیسی پیاری کبھی نہیں بن سکتی' وہ بہت گوری اور گلابی سی ہیں۔ اچھا سچ بتاؤ' یہ کریم اثر تو کرتی ہے نا؟"

"ہاں' بہت کرتی ہے۔"

"ٹھیک ہے اگر اس نے مجھ پہ اثر کیا تو میں اسے دوبارہ بھی منگواؤں گی۔ میرے پاس کافی پیسے جمع ہیں۔" اس نے تیز تیز بولتے کہا تھا۔ نبیل کے چہرے پہ بے ساختہ مسکراہٹ چمکی۔

"اب میں چلتی ہوں۔ فارہ باجی اٹھ گئی ہوں گی۔" اگلے ہی لمحے وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ عبیر نے جانے کے لیے قدم بڑھائے تو کچھ سوچ کے رکزی نے اسے آواز دے کے روک لیا۔

"سنو... یہ کریم اپنی فارہ باجی سے چھپا کے رکھنا... ورنہ وہ تمہیں یہ کریم نہیں لگانے دے گی۔"

"فارہ باجی بہت اچھی ہیں رکزی، تم خوامخواہ ان سے خائف رہتی ہو۔" عبیر جانتی تھی کہ رکزی انہیں کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھی، وجہ وہی فارہ کی خود پسندی تھی۔ رکزی عبیر کی بات پہ ہمیشہ کی طرح ایسے مسکرائی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کی شرارت پہ مسکراتی ہے۔

"اچھا جاؤ اب... ورنہ فارہ ناراض ہوگی۔" رکزی نے اسے خود ہی جانے کا کہہ دیا، اگلے ہی لمحے وہ چھپاک سے باہر نکل گئی۔

"یہ فارہ کون ہے جس سے یہ لڑکی اتنی متاثر ہے۔" عبیر کے جانے کے بعد جیسے ہی وہ واپس آئی تو نبیل بھائی برآمدے میں کھڑے شاید اسی کی واپسی کے منتظر تھا۔

"عبیر کی سوتیلی ماں ہے۔ عبیر بہت پسند کرتی ہے۔" رکزی نے بتاتے ہوئے بے ساختہ ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"مجھے تو پسندیدگی سے زیادہ متاثر لگتی ہے ان سے... بہرحال اگلی دفعہ یہ لڑکی آئے تو مجھ سے ملوانا... شکل سے تو خاصی ذہین لگتی ہے، پھر ایسی بے وقوفی کی باتیں کیوں کرتی ہے، جبکہ اس کی شکل اتنی بری بھی نہیں۔" اس نے الجھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تھا۔

"لمبی کہانی ہے نبیل بھائی... پھر کبھی آپ کو سناؤں گی۔" رکزی یہ کہہ کے اس کا ناشتا بنانے پلٹ گئی تو وہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ مٹھی میں جگنو بند کیے ہوئے واپس آئی تھی، جس میں مستقبل کے حسین خواب تھے۔

لیکن گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا، فارہ اور سلطان کہیں جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ عبیر کو حیرت ہوئی، وہ دونوں اتنی صبح صبح کہاں جا رہے تھے۔

"کہاں گئی تھیں اتنی صبح صبح...؟"

"میں رکزی کے پاس گئی تھی۔" اس نے بے ساختہ کریم والا ہاتھ دوپٹے کے نیچے کیا۔

"کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ اس لڑکی سے دور رہا کرو لیکن تم سمجھو تب نا۔" اسے جانے کس بات پہ غصہ آیا تھا۔ عبیر خاموشی سے لب کاٹتی رہی۔

"وہ دوست ہے میری... اس کے پاس نہ جاؤں تو پھر کہاں جاؤں۔" عبیر بے چارگی سے بولی۔

"جا کے ناشتا بنا لاؤ جلدی۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" عبیر "جی" کہہ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی، لیکن فارہ کو بولنے کا موقع مل گیا۔

"دیکھ لی آپ نے اس کی ہٹ دھرمی... ابھی آپ یہاں ہیں تو یہ ایسے کرتی ہے، آپ چلے گئے تو یہ کیا کرے گی بھلا۔" فارہ کی زبان کے آگے بھی بس خندق تھی۔ بھلا اتنی سی بات میں عبیر نے کون سی ہٹ دھرمی دکھادی تھی جو وہ اتنی بڑی بات کہہ رہی تھی۔

"بس کچھ دن کی بات ہے فارہ باجی! میں بھی آپ کی طرح حسین ہو گئی تو میری بھی کسی اچھے لڑکے سے شادی ہو جائے گی جو بابا کی طرح مجھ سے بھی بہت پیار کرے گا۔ پھر میرا وجود آپ پہ بوجھ نہیں بنے گا۔"

اس نے کریم والی ڈبیا اپنی مٹھی میں دباتے ہوئے ایک عزم سے سوچا تھا، اس کے ہاتھ میں کریم نہیں وہ جگنو تھے جو اس کے بہترین مستقبل کی نشانی تھے۔

فارہ اور سلطان ناشتے کے بعد جیولر کے پاس چلے گئے تو عبیر نے جلدی سے گھر کا دروازہ لاک کر کے منہ

ہاتھ دھو کے وہ کریم لگائی تھی۔ اسے رکزی نے بتایا تھا کہ اگر دن میں۔ کوئی بھی کریم تین گھنٹے لگا کے کمرے میں ہی رہا جائے تو اس کا ویسے ہی اثر ہوتا ہے جیسے رات کو لگانے سے ہوتا ہے۔ لہٰذا کچھ شوق اور اشتیاق اور کچھ ضرورت کے تحت اس نے جلدی سے وہ کریم لگائی تھی۔ تاکہ جلد از جلد بہت اچھا رزلٹ دیکھ سکے' ویسے بھی اس کی زندگی کا یہ پہلا تجربہ تھا جب اس نے اپنے چہرے پہ کچھ لگایا تھا۔

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کے اس نے ڈریسنگ ٹیبل پہ پڑی فارہ کی تصویر اٹھائی۔ جس میں وہ ہنس رہی تھی۔

فارہ سلطان۔۔۔ حسن کی ملکہ جس کے گال سرخ تھے اور چہرے پہ روشن کالی سیاہ آنکھیں تھیں۔ گلابی ہونٹ اور دانت اتنے ہموار اور خوب صورت تھے جیسے انار کے دانے جڑے ہوتے ہیں۔ بھرے بھرے گال' صراحی دار گردن اور بے حد لمبے بال۔۔۔ مناسب قدو قامت بلکہ ذرا چھوٹا قد مگر بلا کی جاذب نظر۔۔۔

اس نے فارہ کو دیکھنے کے بعد اپنا عکس آئینے میں دیکھا۔ اسے ایک بار پھر مایوسی سی ہوئی۔ وہ فارہ جیسی کبھی بن ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کا فارہ کے ساتھ کوئی تقابل نہیں تھا' نہ ہی حسد جیسا کوئی جذبہ' ہاں بس بات اتنی سی تھی کہ اس کی دنیا صرف اپنے باپ اور فارہ تک محدود تھی۔ وہ ابھی بھی فارہ سے زیادہ یہ اس جیسی حسین نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ بس اتنی خوش شکل ہونا چاہتی تھی کہ اس کا رشتہ با آسانی ہو سکے اور اس کا باپ اس کی وجہ سے پریشان نہ ہو۔ وہ اپنے بابا کی پریشانیوں کو کم کرنا چاہتی تھی اور بس۔

تین گھنٹے بعد جب اس نے منہ دھویا تو وہ ویسا ہی تھا کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کا سانولا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ رکزی نے اس سے جھوٹ بولا تھا' اسے دکھ ہوا تھا اس کا دل چاہا کہ وہ ابھی جائے اور رکزی کو جا کے خوب کھری کھری سنا کے آئے۔ لیکن اس نے وقت دیکھا تو دو بج رہے تھے۔ فارہ اور سلطان کے آنے کا وقت ہو چلا تھا اور عبیو نے ابھی تک کھانا بھی نہیں بنایا تھا' اسی لیے وہ تیزی سے کچن کی جانب بھاگی۔ گوشت کا پیکٹ وہ پہلے ہی نکال کے رکھ چکی تھی ورنہ بہت ہی مشکل ہو جاتی۔ ماش کی دال کو بھگو کے جلدی سے ککر میں ڈالا اور گوشت کا مسالا بنانے لگی۔ ابھی وہ اس کام میں لگی ہی تھی جب دروازے پہ بیل ہوئی تھی۔ وہ چپل پاؤں میں اڑس کے دروازے تک آئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ہی فارہ اور سلطان کھڑے تھے۔ فارہ کا موڈ بے حد خراب لگ رہا تھا' جبکہ سلطان احمد کے چہرے پہ بھی پریشانی تھی۔ عبیو نے کسی انہونی کے احساس کے تحت پوچھ لیا۔

"کیا ہوا۔۔۔ خیریت؟" اس نے بے اختیار پوچھا تھا فارہ جواب دیے بغیر اندر بڑھ گئی۔ اس کا انداز جارحانہ اور ناقابل برداشت تھا' مگر دونوں باپ بیٹی کو عادت ہو چکی تھی اس کے ناز نخرے اٹھانے کی۔

"بابا!" عبیو نے باپ کو دیکھ کے محض لب پھڑپھڑائے تھے۔

"آجاؤ دروازہ بند کر کے۔ کچھ نہیں ہوا۔ فارہ کی عادت کو جانتی تو ہو تم۔" انہوں نے برگر والا پیکٹ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ عبیو کے چہرے پہ بے ساختہ مسکان ابھری۔ سلطان احمد کبھی نہیں بھولتے تھے کہ عبیو برگر شوق سے کھاتی ہے۔ گھر واپسی پہ ہمیشہ ان کے ہاتھ میں اس کی پسند کا برگر لازمی ہوتا تھا۔

"تھینک یو بابا!"

"شکریہ کس بات کا۔ تم بھی تو میرا اتنا خیال رکھتی ہو۔ تم میری بہت صابر بیٹی ہو۔" انہوں نے تھکے تھکے لیکن محبت سے معمور لہجے میں کہا تھا۔ ان کے لہجے کی تھکن عبیو کو عجیب سا احساس دلا گئی تھی' وہ باپ کی تقلید میں اندر بڑھ آئی' لیکن اندر فارہ نے طوفان اٹھا رکھا تھا' وہ باورچی خانے میں برتن اٹھا اٹھا کے پٹخ رہی تھی۔

"اتنی دیر ہو گئی اور تم نے ابھی تک کھانا نہیں بنایا۔ آخر کرتی کیا رہی ہو سارا دن؟ کسی بھول میں مت رہو بی بی۔۔۔ کہ اب کھانا وقت بے وقت ہوٹل سے آیا کرے گا' اب جو بنے گا گھر میں ہی بنا کرے گا۔ اس

گھر میں ہی بنا کرے گا۔ تمہارے باپ کی نوکری ختم ہو گئی اب۔" وہ اچھا خاصا بپھر گئی تھی۔

"میں بس بنا ہی رہی تھی۔ تھوڑی دیر ہو گئی۔" وہ ہکلا کے رہ گئی۔ آج فارہ کا غصہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

"کیوں ہو گئی دیر۔ آخر کر کیا رہی تھیں تم؟"

"فارہ! کیوں چلا رہی ہو اس بے چاری پر۔ تمہیں زیادہ بھوک لگ رہی ہے تو بر گر کھا لو نا۔ میں تمہارے لیے بھی تو لایا ہوں۔"

سلطان کسی شجر سایہ دار کی مانند عبھو تک پہنچے۔ اس نے باپ کو محبت سے دیکھا۔

"کچھ نہیں کھانا مجھے۔" فارہ کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکلے اور وہ کچن سے نکل گئی۔ لیکن سلطان احمد فارہ کے پیچھے کچن سے نہیں گئے' بلکہ اس کے پاس آ گئے۔

"تمہیں پتا ہے آج کیا ہوا؟" عبھو نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"فارہ نے اپنا سارا زیور بیچ دیا اور جس جیولر نے اسے زیور بنا کے دیا تھا وہ فراڈیا تھا' اس نے خالص سونے میں پیتل کی ملاوٹ کر دی تھی' خصوصاً" ان زیورات میں جو وزن میں زیادہ تھے۔ فارہ کو بس اسی بات کا دکھ ہے' اس کا لاکھوں کی مالیت کا سونا چند ہزاروں سے زیادہ کا نہیں ہو سکا۔"

"اوہ۔" عبھو نے لب سکیڑے۔

"زیادہ دکھ تو اس بات کا ہے کہ وہ جیولر اب دکان ختم کر کے کہیں اور جا چکا ہے۔ تم فارہ کی باتوں کا برا نہیں ماننا' وہ دل کی بری نہیں ہے' بس پریشان ہے' ورنہ اس نے ہمیشہ تمہارا خیال رکھا ہے۔"

"جی بابا میں جانتی ہوں۔" وہ اس کا سر تھپتھپا کے چلے گئے تھے۔ عبھو تا دیر کھڑی سوچتی رہی' یہاں تک کہ اپنا غم بھول گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ محبت کا ہنر استعمال کرنے کے عادی تھے۔ سختی تو ان کی فطرت میں تھی ہی نہیں جیسے لیکن اس کے باوجود بھی انہیں غصہ آ گیا تھا۔

"آپ مجھ سے ناراض ہیں چچا جان؟"

اگلے دن اسے چچا جان سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ انہوں نے اس بات پہ اسے بغور دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سچائی تھی۔ وہ جوان خون تھا' جوشیلا تھا اور ایسے لوگوں کو صرف ایک ہی ہنر سے باندھا جا سکتا ہے اور وہ تھا محبت کا ہنر۔

"تمہیں اس بات کا خیال کیوں آیا۔" وہ ہولے سے مسکرائے تھے۔

حذیفہ اس بار کچھ نہیں بولا' وہ نیلم کا نام نہیں لینا چاہتا تھا' ویسے بھی وہ جانتا تھا کہ اسے عادت تھی دو کی چار لگانے کی۔

"بس مجھے محسوس ہوا شاید اس دن آپ کو میری وہ بات اچھی نہیں لگی تھی' لیکن میں نے بھی کسی ممکنہ نقصان کے پیش نظر آپ کو خبردار کرنا مناسب سمجھا تھا۔" اس نے وضاحت دی تو چچا جان کو بھی اپنی اس روز کی تلخی یاد آ گئی۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہاری نیت یا ارادہ برا نہیں تھا' لیکن میں ایسی کوئی بات سوچ بھی نہیں سکتا کہ کوئی میری بیٹی کے کردار پہ بات کرے یا اسے جان سے مارنے کی دھمکی دے۔" چچا جان اٹھے اور اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"جانتے ہو تمہارے باپ نے کبھی مجھے اپنا بھائی نہیں سمجھا۔ ہمیشہ مجھ سے جھگڑتے تھے۔ میں انہیں اسی لیے برا لگا کرتا تھا' کیونکہ انہیں زمینیں بیچنے سے منع کرتا تھا۔ پھر جس وقت شراب کے نشے میں ان کی موت ہوئی' اس وقت ہمارے اس گاؤں کے کتنے ہی لوگ تھے جنہوں نے مجھے منع کیا کہ تمہاری اور بھابھی کی کفالت نہ کروں' لیکن میں کسی کے کہنے میں نہیں آیا' جانتے ہو کیوں؟" انہوں نے توقف کیا۔ تمہاری وجہ سے "تم ہمارا خون تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ تم کسی اور کی دہلیز پہ پرورش پاؤ۔ تم ایک اعلا خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔

"جی چچا جان! میں جانتا ہوں۔" حذیفہ نے سر جھکا کے اعتراف کیا۔
"تو میرا بیٹا یہ کبھی نہ بھولا کرو کہ تم راحت اکبر کے بھتیجے ہو جس کی طاقت سے ایک گاؤں نہیں سات گاؤں خوف زدہ رہتے ہیں۔"
"جی چچا جان' اس بار کے الیکشن میں آپ کی پوزیشن نے ابھی سے آپ کے مخالفین کے دانت کھٹے کردیے ہیں۔" وہ مسکرایا تھا۔
"اس میں تمہاری بھی بہت محنت ہے جس طرح سے تم کمپین کررہے ہو اور جس طرح سے ووٹ بچا رہے ہو تم اس کے لیے تو تم انعام کے مستحق ہو۔ بولو کیا لوگے۔" چچا جان نے فیاضی دکھائی جو وہ اکثر ہی دکھایا کرتے تھے۔
"ابھی نہیں' الیکشن جیتنے کے بعد لوں گا۔" حذیفہ مسکرایا بہت دنوں کے بعد اس کے چچا جان اس کے ساتھ اسی انداز میں بات کررہے تھے۔ راحت اکبر کی خامی یہ تھی کہ وہ بات کو سنتے ہی نہ تھے' سنتے تھے تو سمجھتے نہ تھے' انہیں سارا زمانہ اپنا دشمن لگتا تھا اور اگر حذیفہ نے بھی نیلم کے حوالے سے بات کہہ دی تھی تو وہ بجائے اس کی بات کی تحقیق کے' اس سے بدگمان ہوگئے تھے کہ شاید وہ ان کی بیٹی کو بدنام کرنے کی کوشش کررہا ہے' حالانکہ حذیفہ کبھی جھوٹ بولتا تھا' نہ ہی غلط بات کہتا تھا' لیکن قصور تو راحت اکبر کا بھی نہیں تھا انہیں تو بات ہی اس انداز میں بتائی گئی تھی۔
چاندنی بیگم نے بات کو اپنے ہی انداز میں پیش کیا تھا۔
"نیلم نے ناشتے کی بات پہ پروین کو کچھ الٹا سیدھا بول دیا تو کیا ہوا؟ ہے تو بچی ہی نا' لیکن آپ کا بھتیجا جسے آپ نے اتنا سر پہ چڑھایا ہوا ہے' اس نے جا کے نیلم کی اتنی بے عزتی کی کہ وہ روتی ہوئی میرے پاس آئی تھی اور اب دیکھیں! ابھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ میری بیٹی پہ اتنا بڑا الزام لگادیا بھلا میری معصوم بیٹی ایسی ہے جو اس نے ایسا کہنے کی جرات کی۔ کسی پرندے کی جرات نہیں ہوئی کہ وہ آپ کی اجازت کے بغیر اس گھر میں پر بھی مار سکے' وہ تو پھر ایک آدمی تھا۔"
سوں سوں کرکے اپنی آنکھیں اور ناک صاف کرتی چاندنی بیگم راحت اکبر کے دل میں بال پیدا کرہی چکی تھیں۔ انہیں تو کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا جو وہ حذیفہ کو اپنے اتنا قریب رکھتے تھے اور پھر انہیں تو یہ بھی ڈر لگا تھا کہ کہیں بھتیجے کی محبت میں وہ نیلم کا رشتہ اس کے ساتھ طے نہ کردیں' جبکہ وہ تو نیلم کے لیے بھانجے آصف کا سوچے ہوئے تھیں' بلکہ ان کی بہن تو اب الیکشن کے بعد باقاعدہ رشتہ بھی لے کے آنے والی تھی۔ اسی لیے تو چاندنی بیگم نے بھی اپنی کوششیں تیز کردی تھیں' تاکہ راحت اکبر بھول کے بھی حذیفہ کا نام نہ لیں۔
ایوانوں میں سیاست کرنے والے گھریلو سیاست کا شکار ہوگئے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

دروازہ آہستہ سے کھلا' ہیڈ نامی "انوکھی چیز" رینگتی ہوئی اندر آئی۔ کمرے میں موجود دونوں نفوس نے سر اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھا۔ وہ آنے والی "چیز" بلکہ "نا چیز" کے والدین ہیں۔

"تیاری کرلی تم نے؟" خوف ناک سی شکل منہ کھولے انہیں گھور رہی تھی۔

"سو دفعہ کہا ہے اتنی خوف ناک شکلوں والی شرٹ مت پہنا کرو۔" یہ بڑبڑاہٹ ہیڈ کے ڈیڈ کی ہے۔ وہ صوفہ پر بیٹھ چکا تھا۔

"لیس۔۔۔ آف کورس۔۔۔"

"دیکھو ہیڈ! وہاں جاکے اس طرح کی شرٹ نہیں پہننی۔"

"جی ہاں۔۔۔ بالکل۔۔۔" بغیر حجت جواب اور ان کا ہیں۔

"بس یار! ان باتوں پر ہی عمل کرلو' تو یہ تمہارا بڑا احسان ہوگا۔"

وہ خاموش رہا۔

"ویسے تمہارا بالکل بھی ارادہ نہیں ہے نا' ہم پر اتنا بڑا احسان کرنے کا۔" انہوں نے جتایا۔ (میں بھی بچو! اچھی طرح جانتا ہوں۔)

"کوئی شک؟" وہ شرارت سے مسکرایا۔ وہ بھی مسکرائے۔ وہ تو بھئی دل لگی کررہے تھے۔ انہیں معلوم تھا۔ کہاں تک وہ شریف ہے اور کہاں سے اس کی شرارتیں نہیں' بلکہ خوفناکیاں شروع ہوتی ہیں۔

"اپنی جاسوسانہ اور خوفناکانہ حرکتوں پر کنٹرول رکھنا ادھر لوگ ذرا جلدی ڈر جاتے ہیں۔ خاص طور سے

سعدیہ اصغر

یقین جتنے سے خالی جواب۔

"تمام ہاربل (خوف ناک) اور میجیکل (جادوئی) ماسکس ادھر پھینک کے جانا۔"

"اگر آپ کہیں گے تو آگ بھی لگا جاؤں گا۔"

ممی کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔ انہیں پتا تھا' یہ جواب کہاں سے آرہے ہیں۔ (اوپری اوپری جواب۔ اندر سے تو وہ یہ سب کرنے کے لیے بے تاب تھا۔)

"اپنی ایڈونچر طبیعت کو یہیں چھوڑ کے جانا۔"

"چھوڑ دیا اور کچھ۔۔۔؟" اتنا ہی "فرماں بردار" ہے وہ۔ (زبانی فرماں بردار) مگر "نظر" آج تک نہیں لگی۔ اس کی حرکتیں "نظر بٹو" کی صورت ہمیشہ ساتھ رہی

لڑکیاں۔۔۔" سمجھانے والا انداز (اس دفعہ) نا سمجھنے والے اطوار (ہمیشہ کی طرح)

"کیا واقعی ڈیڈ! پاکستانی لڑکیاں زیادہ اور جلدی ڈرتی ہیں۔" کل سے دماغ میں ادھم مچاتا خیال زبان سے نکلا۔

"اور نہیں تو کیا۔ دن کو اکیلی سایہ دار جگہوں پر نہیں جاتیں۔ رات کو چھوٹی بہن کو لازمی اپنے ساتھ سلاتی ہیں۔ خدانخواستہ اگر کوئی جن آجائے تو اس کو مار بھگانے کے لیے بھی تو کوئی ساتھ ہو۔ خواب میں بھی اگر کاکروچ دیکھ لیں' تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ خواب تھا۔ چیختے ہوئے پانچ چھ دفعہ کپڑے ضرور جھاڑیں گی۔"

"اوہ مائی گاڈ۔۔۔! بے چاریاں۔۔۔ کتنی مشکل زندگی گزارتی ہیں اف۔۔۔" تاسف و افسوس تھا' صرف الفاظ میں' وہ انہیں مزید "بے چاریاں" بنانے کے لیے جلد از جلد پاکستان جانا چاہتا تھا۔

کمرے میں آکے اس نے اپنے پیکنگ کے سامان کا از سر نو جائزہ لیا۔ سب سامان سیٹ تھا۔ اس کی نظر ٹیبل پر پڑی کتاب پر گئی۔ اوہ یہ کتاب وہ کیسے بھول گیا۔ دوبارہ سے اٹیچی کیس کھولا اور سب سے اوپر وہ کتاب رکھ دی' نام تھا۔

"لوگوں کو ڈرانے کے ایک سو دو طریقے۔" اور وہ جلد ہی ایک کتاب مرتب کرنا چاہتا ہے۔ جس کا نام یوں ہوتا۔

"پاکستانی لڑکیوں کو ڈرانے کے دو سو دو طریقے۔" تو پھر گرلز' انتظار کرو بہت جلد تم لوگوں کے درمیان ہوگا۔ "آل ہیڈ" اصلی نیم علی حیدر۔۔۔

☼ ☼ ☼

شام کی عمر بڑی کم تھی' شب اسے پچھاڑنے کو تیار کھڑی تھی۔ اور یہ قلق شام کو بہت جلد کھا جاتا تھا۔ پہاڑ سی رات پھیلنے لگی۔ سرسبز درخت جو دن کے وقت ٹھنڈک اور تراوٹ کا نشان تھے۔ شب کا لباس پہنتے ہی ڈر و خوف کا استعارہ بن گئے۔ رات خوف زدہ کرتی ہے۔ لیکن اکثر لوگوں کو مسحور کر دیتی ہے' جیسا کہ وہ تھی۔ رات جادو تھی اور یہ جادو اس کے سر چڑھ کے بولتا تھا۔

اس وقت وہ ٹیرس پر کھڑی تھی اور آنکھیں عادتاً" ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ وہی تانکا جھانکی کی پرانی عادت۔ ویسے بھی بقول علیشہ "ہم تو دنیا میں آئے ہی دوسروں کو دیکھنے کے لیے ہیں۔" (دوسرے پھر کس لیے آئے ہیں' آپ بھی سوچیے' ہم بھی سوچتے ہیں۔)

اردگرد دیکھتی اس کی نظریں ہمیشہ کی طرح ساتھ والے گھر پر ٹھہر گئیں۔ جس کا ٹیرس ان کے ٹیرس کے ساتھ تھا۔ بیچ میں ایک فٹ کا خلا تھا۔ وہ تین سال پہلے یہاں شفٹ ہوئے تھے۔ وہ تب سے اس گھر کو خالی دیکھتی آرہی تھی۔ یہ خالی پن اسے عجیب انداز سے ہانٹ کرتا تھا۔ کیا کوئی یقین کر سکتا تھا کہ ہر بار اس گھر کو دیکھنے اور سوچنے سے اسے اپنے جاسوسی ڈائجسٹس کی کہانیوں کے لیے ایک نیا آئیڈیا مل جاتا تھا۔

یک دم دماغ میں اک فلیش لائٹ چمکی۔ وہ بھاگ کے کمرے میں آئی جہاں وریشہ بیڈ سے ٹیک لگائے موبائل پر کوئی مووی دیکھنے میں مصروف تھی۔

"سو دفعہ کہا ہے' آہستہ سے دروازہ کھولا کرو۔ کیا یہ ضروری ہے کہ کمرے میں موجود ہر چیز آپ کے ویلکم کے لیے ایک دفعہ ضرور لرزے۔" ہمیشہ والی نصیحت وریشہ کی ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دینے والی محترمہ علیشہ۔

"چھوڑو ان باتوں کو! میرے ذہن میں اک آئیڈیا آیا ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" وریشہ نے کمال بے نیازی سے جواب دیا اور دوبارہ سے موبائل اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔ حالانکہ وہ اس کے آئیڈیاز کی فین تھی۔

"سن تو لو۔" وہ اس کی عدم توجہی پر جھنجلائی۔

"سناؤ۔۔۔"

"پہلے میری طرف دیکھو۔"

"میں کانوں سے سنتی ہوں' آنکھوں سے نہیں۔"

"میں آنکھوں سے ہی اندازہ لگاتی ہوں کہ کوئی توجہ سے سن رہا ہے یا نہیں۔" وریشہ نے موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ (اسے دنیا میں بھیجا ہی مجھے ڈسٹرب کرنے کے لیے گیا ہے۔)

"پھوٹو۔۔۔"

"ہم کیوں نہ کل ساتھ والے گھر کا وزٹ کریں۔ "سیکرٹ ہاؤس" کا یار۔ کتنا خوب صورت گھر ہے۔ اس کا حق بنتا ہے کہ اسے دیکھا جائے اور میں اسے اس کا یہ حق دے کر رہوں گی' یہ میرا فرض بنتا ہے۔"

علیشہ بولتی جا رہی تھی اور وریشہ گھورتی۔

"ہو گئی بکواس' اب بتاؤ' تم کیوں اس گھر کا وزٹ کرنا چاہتی ہو؟"

"میں نے سوچا' فارغ اور بور ہونے سے بہتر ہے یہ گھر ہی اندر سے دیکھ لیا جائے۔" (آگے پیچھے تو وہ بہت مصروف ہوتی ان دنوں پیپرز ہونے والے ہیں نا۔ بس اسی لیے بچیاں فارغ ہیں اور بور ہو رہی تھیں۔)

"چھوٹا سا ایڈونچر بھی ہو جائے گا۔ سنو! جب سے ہم لوگ دیکھ رہے ہیں' یہ گھر ویران پڑا ہے۔ ہم وہاں جائیں گے۔ اک اک چیز کا باریک بینی سے جائزہ لیں گے' پھر واپس آکر میں ڈائجسٹ کے لیے کہانی لکھوں گی۔"

"شاید ہانٹڈ ہو۔" وریشہ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"واؤ! یہ بھی ہو سکتا ہے۔" علیشہ پرجوش ہوئی۔ کتنا شوق تھا اسے اس طرح کے گھر دیکھنے کا۔ پر ممی نے آج تک کہیں جانے نہیں دیا اور کہیں سے مراد وہ جگہ تھی جہاں باقاعدہ ٹکٹ لے کر ڈرنے کے لیے جایا جاتا ہے۔

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" وریشہ کی طرف دیکھ کے بات بدلی۔

"شاید ایسا نہ ہو۔ تم نے ایک بری بات سوچی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے اس گھر کے مالک بیرون ملک چلے گئے ہوں اور ان کا ارادہ ہو مستقبل میں ادھر شفٹ ہونے کا۔"

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" کچھ بھی سے مراد واقعی "کچھ بھی" تھا' کوئی مرڈر' ہسٹری بجن شن وغیرہ۔

"دو ہفتوں بعد وہاں بابا صفائی کرنے آتا ہے نا' اگر ہانٹڈ ہوتا تو اب تک پوری کالونی میں مشہور ہو چکا ہوتا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ کل جائیں گے' مگر جائیں گے کیسے؟"

"اب آیا ہے عقل مندانہ سوال تمہاری طرف سے' اس کا جواب عقل مند علیشہ کی طرف سے یہ ہے کہ......" علیشہ چہکی' وریشہ راضی جو ہو گئی تھی۔ اس نے راضی ہو ہی جانا تھا' اسے پتا تھا۔ دونوں کے ایک جیسے ہی تو شوق تھے۔ ہانٹڈ گھر دیکھنے کا شوق (یہ صرف علیشہ کو تھا۔) نقطے سے پوری کہانی گھڑ لینے کا شوق۔ تجسس پسند اور مہم جو۔ "ٹیرس کے ذریعے"

"کیا!" علیشہ کو بولنے کا موقع اللہ دے' بس شروع ہو جاتی ہے۔ اب وہ اسے ٹیرس پھلانگنے کے طریقے بتا رہی ہے اور یہ بھی کہ کس طرح گھر میں موجود ایک ایک چیز کی کیمرے کی مدد سے پوری جزئیات و تفصیلات کے ساتھ ویڈیو بنانی ہے۔ دور و نزدیک سے۔

☼ ☼ ☼

"یار! ہم ٹھیک کر رہے ہیں نا۔" گھر والوں کی طرف سے مکمل اطمینان کے بعد وہ پوری تیاری کے ساتھ ٹیرس پر موجود تھیں۔ سورج آنکھیں دکھا رہا تھا' مگر ان پر اثر نہ تھا۔

"ہم نے آج تک کچھ غلط کیا ہے؟" آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا۔

"نہیں..... کبھی نہیں۔"

"چلو پہلے تم کودو۔" علیشہ نے وریشہ سے کہا۔ وہ اس وقت اپنے ٹیرس کی دیوار پہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

"نہیں! پہلے تم پھلانگو۔" وریشہ ڈر کے دو قدم پیچھے ہٹی۔

"پہلے میں کود گئی تو مجھے ڈر ہے میں تنہا ہی رہ جاؤں گی' پیچھے سے تم بھاگ جاؤ گی۔ ویسے تو تم بہت بہادر بنتی ہو' لیکن مجھے پتا ہے' کہاں سے تمہاری بزدلی شروع ہوتی ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے۔" وریشہ نے کہا اور ساتھ ہی اچھل کر دیوار پر جا بیٹھی۔ دیوار چوڑی تھی' پھلانگ لگانا زیادہ مشکل نہ تھا۔

وہ ایک ہی جست سے دوسرے ٹیرس پر تھی۔

"شاباش! یہ موبائل کیچ کرو اور ویڈیو بنانی شروع کرو۔ کیمرے کا رخ ادھر میری طرف۔"

علیشہ نے بھی اسی طریقے سے ٹیرس پھلانگا۔ چند سیکنڈ لگے تھے۔ سانس درست کرنے میں... گلی میں موجود کوڑا کرکٹ شاید سارے کا سارا ادھر جمع ہو گیا تھا۔ بارشوں نے اسے یوں جمایا تھا کہ اب اس پر گھاس اگ آئی تھی۔ وہاں موجود کمرے کو ویسے ہی تالا لگا ہوا تھا۔ وہ کمرے کی عقبی سمت بڑھیں۔ جب وہ گردوپیش کے جائزے میں مصروف تھیں۔ تب نیچے سے کھٹکے کی آواز آئی۔ وہ بری طرح چونکیں' دھڑکنیں اتھل پتھل ہوئیں۔

"تم نے ٹھیک سے دروازہ تو دیکھا تھا۔"

"ہاں علیشہ! تالا لگا ہوا تھا۔" وریشہ گھبرائی ہوئی تھی۔

"پھر یہ کوئی بلی یا چوہا ہوگا۔" طفل تسلی سے دل بہلایا۔

ادھر عجیب و غریب قسم کی جڑی بوٹیاں اگی ہوئی تھیں' چونکہ وہ ہربلسٹ (جڑی بوٹیوں کے خواص جاننے والا) نہیں تھیں۔ اس لیے انہیں کچلتی ہوئی آگے بڑھنے لگیں۔ تھوڑا آگے سیڑھیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ شیالی سیڑھیوں کی مدد سے نیچے اترنے لگیں۔

"مشکل وقت میں موبائل کس طرح استعمال کرنا چاہیے' یاد ہے نا تمہیں۔" علیشہ نے وریشہ سے دریافت کیا' وہ پراعتماد تھی۔

خاموشی کی راجدھانی میں ان کے قدموں کی چاپ بہت اجنبی لگ رہی تھی۔ ایک نادیدہ خوف دل و دماغ پر پنجے جمانے لگا۔

"جنوں سے ڈرنے والے آسمان نہیں ہم۔"

علیشہ کو یہ خاموشی بہت کھل رہی تھی۔ اسے توڑنے کو شعر پڑھا۔ خوف کو کم کرنے یا پھر ایک نامعلوم احساس سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ ہنسی بھی۔ آواز خالی درودیوار سے ٹکرائی اور اک بازگشت کی صورت' دوبارہ سے ان کے کانوں میں گونجنے لگی۔ یوں جیسے بہت سی چڑیلیں اور بھوت اس کی طرح بولنے کی پریکٹس کرنے لگے ہوں۔ وریشہ اس کی کیفیت سمجھ رہی تھی' کیونکہ اس کی اپنی بھی یہی کیفیت تھی۔

ان جنوں سے دوستی اچھی نہیں علیشہ۔
چڑیا سا تیرا دل ہے' کچھ تو خیال کر....

علیشہ نے کھیل جاری رکھا۔ سیڑھیاں ہال کمرے میں جا کے ختم ہو رہی تھیں۔ ابھی وہ آگے بڑھتیں کہ انہیں رک جانا پڑا۔ یہاں ہر شے گرد آلود تھی اور اپنے اصلی رنگ و روپ سے نابلد تھی' وہاں ایک جدید و خوب صورت اٹیچی کیس کی موجودگی انہیں ورطہ حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی تھی۔ علیشہ ہر ہر زاویے سے اس کی ویڈیو بنانے لگی۔

"نزدیک چل کے دیکھیں۔" علیشہ نے وریشہ کو کھینچا۔ دونوں پرجوش سی آگے ہوئیں۔

"لگتا ہے "جن کا بچہ" اپنی ایجوکیشن مکمل کر کے آج ہی آیا ہے۔"

تھوڑی دور بیٹھا "جن کا بچہ" ان کے تبصرے سے محظوظ ہوا۔ وہ اس وقت صوفہ پر ان کی طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے' دو بزنس پارٹنر لڑتے لڑتے مر گئے ہوں اور یہ پیسوں سے بھرا بیگ ہمارے لیے چھوڑ گئے ہوں' جیسا کہ فلموں میں ہوتا ہے' آؤ کھول کے دیکھیں۔" وہ بیگ میں ہی الجھی جا رہی تھیں اور نظر

آگے دوڑانے سے قاصر تھیں۔

"قدموں کے نشان دیکھو' اور یہ پانی کے چھینٹے' ضرور یہاں کوئی انسان ہے۔" علیشہ کی نظریں جابجا نظر آتے قدموں کے نشانوں پر تھیں۔

"تم نے بتایا' دروازہ لاک تھا۔ ہمیں ادھر نہیں رکنا چاہیے' کھسکو!"

"میں نے جو میسج سیو کیا تھا' نکال رہی ہوں' اگر کوئی مشکل پیش آئی تو پھر ممی' پاپا کو سینڈ کردوں گی۔"

وہ میسج تھا۔ "ماما' پاپا! ہمیں بچائیں۔ ہم ساتھ والے خالی گھر میں ہیں۔" حفاظتی اقدام کے تحت انہوں نے یہ پہلے سے ہی لکھ رکھا تھا۔

ساری بہادری لمحوں میں اڑی تھی۔ وہ بھاگنے کے لیے پر تول ہی رہی تھیں کہ انہیں آگے حرکت کا احساس ہوا۔ وہ جو کوئی بھی تھا' ان کی طرف پشت کیے کھڑا ہو رہا تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ ان کی طرف مڑا۔ شکل اتنی خوف ناک تھی کہ دیکھ کے کراہیت محسوس ہوئی۔

اس طرح کے جن کا تو تصور بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی لڑکیوں کے سامنے تو وہ خوب صورت ترین روپ میں آتے ہیں۔ مگر شاید یہ ڈرا کے خوش ہونے والا جن تھا۔

"وہ۔ وہ۔۔۔ نہیں آ۔۔۔" دونوں ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑے کھڑی تھیں۔ آواز حلق میں ہی دم توڑ گئی' رگوں میں خون رکا۔ چند بے معنی الفاظ حلق سے برآمد ہوئے۔ سوچ سمیت ساکت ہوئیں' پھر دماغ چلنے لگا۔ موبائل اتنی زور سے مٹھی میں دبایا۔ جیسے جن کا چھیننے کا ارادہ ہو۔

انہوں نے تو آج تک کوئی "غلطی" نہیں کی تھی' پھر یہ جن کس غلطی کی سزا تھا۔

"اللہ! پیارے اللہ! ہمیں اس بھوت سے بچا۔ ابھی تو ہماری شادی بھی نہیں ہوئی' ہم اعتراف کرتے ہیں "اپنی غلطی کا" ہم مانتے ہیں کہ بعض تجسس ہی انسان کو لے ڈوبتے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں' زمین پہ آپ کی یہ مخلوق بھی ہے۔ ہم آئندہ سے انہیں کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ نہ ہی انہیں تنگ کریں گے' ہمیں محفوظ رکھ اس کے شر سے۔" (آمین) دونوں نے اجتماعی دعا مانگی۔

"تم دونوں کہیں نہیں جا سکتیں۔" جتنی بری آواز ہو سکتی ہے' اس نے اس سے بھی زیادہ بری آواز نکالی۔

آواز سن کے انہیں حوصلہ ہوا۔ آواز و لہجہ کچھ کچھ انسانی تھا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھیں۔ شیر کو دیکھ کے گدھا کس طرح اپنی جگہ جم جاتا ہے' یہاں تک کہ شیر اسے کھا جاتا ہے۔ اس خوف و دہشت کا تجربہ انہیں اس وقت ہوا تھا۔

"دیکھو! جن بھائی' ہمیں کچھ نہیں کہنا۔ بھائی نہیں ہو۔" یہ وریشہ تھی جو علیشہ کے پیچھے چھپی جا رہی تھی۔ علیشہ' صورت حال کو سمجھ رہی تھی۔ وہ حواس باختہ نہیں تھی۔ چھوٹی ہونے کے باوجود وہ وریشہ سے زیادہ بہادر تھی۔

"ہمیں کچھ نہیں کہنا جن بھائی! میری تو کل منگنی ہے' آپ بھی آئیے گا اور گفٹ بھی لائیے گا' بہنوں کی منگنیوں میں خالی ہاتھ نہیں جاتے۔" کیا مان بھرا انداز تھا بھئی وریشہ کا۔

"ایک شرط پہ تم لوگوں کو جانے دوں گا' منظور ہو تو بتاؤں۔" اس صورت حال سے جن پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شرط کے چکر میں اپنی اصلی انسانی آواز نکال بیٹھا۔

"جی! آپ کہیں۔۔۔" تمیزداری ختم تھی' وریشہ پر اس وقت کیا متانت سے جواب دیا تھا۔

"جب آپ لوگوں نے مجھے جن کا بچہ کہا تو میرے پاپا کو بہت غصہ آیا۔ حیران مت ہوں' وہ دنیا والوں کو نظر نہیں آتے' یہ "شکتی" مجھے ہی حاصل ہے۔ وہاں تو دنیا اتنی آگے نکل گئی ہے۔ انسانوں نے اپنے نت نئے نام رکھ لیے ہیں' لیکن ہمیں جن کہہ کر ہی پکارا جاتا ہے۔ آئندہ سے آپ ہمیں جینٹ کہا کریں گی تو ٹھیک ہے ورنہ۔۔۔" ایک دفعہ رکا' پھر بولا' آواز زیادہ بھاری کی۔

"ویسے میرے پاپا کا نام جی می ہے۔ (سوری پاپا) اگر

آپ انہیں اس نام سے پکاریں گی تو وہ زیادہ خوش ہوں گے۔ میرا نام ٹی ٹی ہے' آپ مجھے یہ کہہ سکتی ہیں۔ ایک اور بات' آپ مجھے فرینڈ۔۔۔" جن کی فرینڈ شپ کی درخواست منہ میں ہی رہ گئی۔ اس سے پہلے ہی علیشہ آگے بڑھ کر اس کے منہ پر موجود ماسک نوچ چکی تھی۔

سر کے اوپر تک جاتا ماسک۔

جن ہکا بکا رہ گیا۔ اتنی بہادری۔۔۔ عش۔۔۔ عش۔۔۔ عش۔۔۔ نہیں بلکہ۔۔۔ غش۔۔۔ غش۔۔۔ غش۔

دونوں دوسری دفعہ ساکت ہوئیں۔

ماسک کے نیچے سے جو چیز برآمد ہوئی' وہ بھی کچھ کچھ ہی "انسانی" تھی۔ کچھ سے زیادہ "غیر انسانی۔" کپڑے تو شاید کسی جن سے ادھار مانگ کے پہنے گئے تھے۔ اس کے لباس کی طرح بالوں کی بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ سر کے درمیان سے اڑے ہوئے تھے اور سر کے ارد گرد جھالروں کی صورت لٹک رہے تھے۔ آنکھوں کا رنگ بھی سبحان اللہ تھا۔ ایسا رنگ دید نہ شنید۔ ہاف ریڈ اور ہاف وائٹ کے کنٹراسٹڈ لینز تھے۔ ماشاء اللہ کیا کنٹراسٹڈ آنکھیں تھیں۔

اوپر سے لڑکیوں کے بولنے کی آواز سن کے' جتنا اہتمام ہوسکتا تھا اس نے کیا تھا۔

"اچھا کیا آپ نے' میں بھی الجھن محسوس کررہا تھا۔" ڈھٹائی سے کہتے ہوئے علیشہ کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"آؤ چلیں۔۔۔" علیشہ نے وریشہ سے کہا اور دونوں سیڑھیوں کی طرف بڑھیں۔

"نہیں' بیٹھیں' میری پہلی پہلی گیسٹ ہیں آپ تو' آپ کی خدمت مجھ پر فرض ہے۔ آپ لوگ تو پھر ڈائریکٹ اوپر سے ادھر آئی ہیں۔ پیاس تو لگی ہوگی۔ حلق سوکھ رہا ہوگا۔"

"پیاس تو ہمیں لگی ہے' لیکن ہم کسی غیر کے گھر سے پانی نہیں پیتے اور یہاں ہمیں کوک نظر نہیں آرہی۔ سو تھینک یو۔"

"گیٹ کی طرف سے چلی جائیں' دروازہ کھلا ہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر اکٹھے اس کی طرف۔۔۔ وہ یقیناً" اپنا قہقہہ ضبط کررہا تھا۔ نہیں' وہ انتظار کررہا تھا کہ کب وہ جائیں اور کب وہ ہنسے۔ علیشہ نے سوچا۔ دونوں نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

جب انہوں نے دروازہ بینگ (ٹھاہ) کی آواز سے بند کیا' انہیں پردے پھاڑ قہقہہ سنائی دیا۔ دروازے کے ہینڈل یا ہک کی طرف دیکھا۔ اس میں تالا جھول رہا تھا' لیکن وہ کھلا ہوا تھا۔ علیشہ نے خشم ناک آنکھوں سے وریشہ کو دیکھا۔

ساتھ والا گھر ہی تو ان کا تھا۔ آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مالی بابا نے دروازہ کھولا۔ وہ حیران ہوئے۔

"جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا' مگر یہ باہر سے آرہی تھیں۔ وہ کام میں مصروف ہوں گے' ادھر دھیان ہی نہیں گیا ہوگا۔"

"ہوں۔۔۔" ہنکارا۔

دونوں چپکے سے اندر جانے لگیں کہ ٹھہر جانا پڑا۔ کچن کے دروازے کے پاس فاطمہ کھڑی تھی۔ ان کی بڑی بہن' ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ شاید وہ ابھی اپنے کمرے سے نکلی تھی۔

"کدھر سے آرہی ہو تم دونوں؟" چنی سی آنکھیں پوری کھول کے ان کی طرف دیکھا۔

"کدھر سے بھی نہیں۔ ہم تو صحن میں تھیں۔ پھولوں کو دیکھ رہی تھیں۔ جو کہ دھوپ میں مرجھائے ہوئے تھے' ہم نے اوپر پانی پھینکا تو کچھ فریش ہوئے۔"

"مالی بابا کیا کررہے ہیں؟"

(تسلی نہیں ہوئی' تحیر وہ کرادیتی ہے۔)

"وہ بے چارے بوڑھے انسان تھک جاتے ہیں' ابھی بکائن کی چھاؤں میں سستانے کے لیے بیٹھے ہیں۔" یہ فی البدیہہ جواب علیشہ کی طرف سے تھے۔ پتا جو تھا وہ کتنی رحم دل ہے اور رحم دلی میں وہ سوچنے کی قائل نہیں۔

"اچھا' اچھا اب کمرے میں جاؤ' باہر کتنی گرمی ہے۔"

☆ ☆ ☆

"میں کہہ رہی ہوں' یہ فلم نہیں دیکھنی' تو بس نہیں دیکھنی۔" یہ وریشہ کی آواز ہے اور جھگڑا ہے فلم کا۔

"سو دفعہ کی دیکھی ہوئی لو اسٹوری ہے یہ۔ مگر تمہیں پھر بھی چین نہیں پڑتا۔ اگر یہی اسٹوری دیکھنی ہے تو کمپیوٹر کو ہاتھ لگا کے دکھاؤ۔ ہاتھ توڑ دوں گی۔" علیشہ کمپیوٹر کی طرف لپکی۔

"لو... لگا دیا ہاتھ۔" اوپر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ دونوں کے فورتھ ایئر کے امتحانات ہونے والے تھے۔ چونکہ صرف چار دن رہ گئے تھے' تو اس لیے فاطمہ نے انہیں روم میں بھیجا تھا کہ وہ پڑھ لیں' مگر یہاں تو فلمی "جھگڑا" چل رہا تھا۔ فاطمہ دروازہ دھکیل کر اندر آگئی۔ جبکہ وریشہ کہہ رہی تھی۔

"اگر دیکھی ہوئی فلم ہی دیکھنی ہے تو یہ کیا بری ہے۔"

"اگر فیصلہ نہیں ہو پا رہا تو ٹاس کرلو' کون سی دیکھنی ہے' کون سی نہیں۔"

"نہیں فاطمہ! اس کی کیا ضرورت ہے' ہم تو بس انگلش دیکھنے ہی لگے ہیں۔" فاطمہ کو دیکھا تو رنگ اڑے۔ پاپا سے شکایت پکی۔ بات سنبھالنے کو پلک جھپکنے کی مدت میں کمپیوٹر کا سوئچ آف کیا۔

"انگلش مووی؟" چبھتا ہوا اور سب کچھ جانتا ہوا لہجہ تھا فاطمہ کا۔

"نہیں فاطمہ! ہم تو پڑھ رہے تھے۔ یہ دیکھیں کتاب۔" بیڈ پر کتاب کو دیکھا' صوفوں پر بھی نظر دوڑائی' مگر وہ شاید شرمندگی سے کہیں منہ چھپائے بیٹھی تھی کہ لاکھ جتن کے بعد بھی دکھائی نہ دی۔

پھر وہ نظر آ ہی گئی' مگر کہاں؟ فاطمہ کے قدموں سے چند قدم دور... اوندھی پڑی اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔

اگر فاطمہ کی نظر پڑ گئی تو اس نے ابھی جا کے پاپا کو بتانا

ہے اور کل کمپیوٹر نے "آؤٹ ہونکلی" خراب ہو جانا ہے۔ فلم دیکھنا وہ بھی کتاب کو نیچے کرائے، امتحانوں کے دنوں میں۔۔۔ ناقابل معافی جرم ہوتا۔ پاپا کے نزدیک۔ علیشہ نے سوچا اور جا کے فاطمہ کے گلے میں بانہیں حمائل کردیں، ساتھ ہی وریشہ کو آنکھ ماری۔

"پیاری بہن! زیادہ غصہ بھی صحت خراب کر دیتا ہے، پھر میری اتنی پیاری بہن کو کچھ ہوا تو میں بھی ٹھیک نہیں رہ سکوں گی، ہم دونوں ہی بیمار پڑ گئیں تو بے چاری وریشہ کا کیا ہوگا۔ دیکھیں آپ کے بیمار ہونے کا سن کر ہی "اتنا سا" منہ نکل آیا ہے۔" فاطمہ نے وریشہ کو دیکھا تو وریشہ نے بھی جان دار ایکٹنگ کرتے ہوئے آنکھیں مسلیں۔ یہ اور بات ہے کہ بھرپور بیچ میں بال پڑ گیا تو بار بار مسلنا پڑیں۔

"اتنی محبت کرتی ہو مجھ سے۔۔۔" اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ دوسرے لفظوں میں اس میلوڈرامے کو طول دیا۔

"اتنی سے بھی زیادہ۔۔۔"

"کتنی۔۔۔؟"

"سمندر جتنی۔۔۔" وہ یک زبان بولی تھیں۔

"شکریہ۔۔۔ اتنی محبت کا۔"

فاطمہ چلی گئی، تو دونوں نے خوشی سے لبریز قہقہہ لگایا۔ شکر ہے، انہوں نے اپنی باتوں سے فاطمہ کا دھیان ہٹالیا۔

ہنسی تو فاطمہ بھی تھی باہر آکر۔ بعض اوقات چھوٹوں کی چالاکیوں کو انجوائے کرنا، کیا لطف دیتا ہے اف۔۔۔

☼ ☼ ☼

ڈائننگ ٹیبل پہ کھانا چنا گیا تھا اور گھر کے سب افراد خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ چونکہ پاپا بھی موجود تھے، اس لیے علیشہ اور وریشہ کی ہمہ وقت چلتی چونچیں بند تھیں۔ ویسے تو وہ تینوں ہی اپنے پاپا کی لاڈلی بیٹیاں تھیں۔ لیکن ان کا رعب بھی بڑا تھا ان پر۔ ماما سے وہ بالکل نہیں ڈرتی تھیں۔ "اللہ نے ماں نامی مخلوق تو بھیجی ہی پیار کرنے کے لیے ہے۔" (یہ ان سب کا مشترکہ خیال تھا۔)

"علیشہ! پیپر کیسا ہوا؟" فاطمہ نے بات کا آغاز کیا۔ علیشہ جو کھانا کھا رہی تھی۔ ذرا بھی نہ چونکی، بلکہ اور زیادہ انہماک سے کھانا کھانے لگی۔

"علیشہ! میں نے پوچھا ہے، پیپر کیسا ہوا؟" آواز بلند کی، پاپا بھی متوجہ ہوئے۔

"کون سا پیپر؟" وہ کھانا کب کھا رہی تھی، وہ تو سو رہی تھی۔ ایکٹنگ ایسی ہی تھی۔

"وہی۔۔۔ جو آج صبح تم دے کے آئی ہو۔" دانت پہ دانت جماتے ہوئے کہا تھا۔ لفظ بھنچے ہوئے تھے۔ پاپا مسکرائے۔

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ اس کا پوچھ رہی ہیں آپ۔۔۔ بیسٹ ہوا۔"

"ماشاء اللہ سے۔۔۔" وریشہ کے بھی دانت باہر نکلے۔

"ویل! میں نے آپ لوگوں کو بتانا تھا کہ ساتھ والے گھر میں اس کے مالکان آرہے ہیں۔ ابھی تو صرف ایک لڑکا آیا ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔" تعریفی انداز۔ علیشہ اور وریشہ کو جھٹکا لگا۔ (پاپا اتنے ماڈرن کب ہوئے، ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔)

"پاپا! آپ نے اس کی ڈریسنگ دیکھی ہے؟ اور اس کا ہیئر اسٹائل۔۔۔" علیشہ منمنائی۔ وہ حرکتیں بھی کہنا چاہتی تھی۔ مگر یہ لفظ لبوں پہ دم توڑ گیا۔

"آج کل کے نوجوان ایسی ہی ڈریسنگ کرتے ہیں۔ رہی بات ہیئر اسٹائل کی تو وہ کچھ ایسا برا بھی نہیں ہے۔ بال ہی تو برے ہیں۔ ہر وقت سر پر کیپ رکھتا ہے، چھچھورے لڑکوں کی طرح، میں نے کبھی بھی علی حیدر کو بار بار بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

(ہائے معصوم پاپا! اس کا سر اس قابل کہاں کہ اس میں انگلیاں چلائی جائیں۔ درمیان سے تو بالکل ہی ستھرا سر ہے۔) علیشہ نے دل ہی دل میں کہا۔ جبکہ پاپا، ماما کی طرف رخ کیے مزید کہہ رہے تھے۔

"روز شام کو میرے ساتھ واک پر جاتا ہے۔ کل میں نے پوچھا کہ تمہارے پاپا کیوں ادھر شفٹ ہونا چاہتے ہیں؟ تو کہنے لگا۔ "میں نے ادھر پاکستانی فیملیز کو دیکھا ہے سر! جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی ہے، انہیں پاکستان میں بہت کشش محسوس ہونے لگتی ہے۔ پاکستانی مٹی، کسی مقناطیس کی طرح، انہیں اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے اور لوگ اس کی محبت میں لوہا بنے کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہاں آکے مجھے لگا سر، یہ واقعی وہ مقناطیس ہے جسے لوہے سے پیار ہے اور جو ادھر نہیں آسکتے، وہ ادھر ہی پاکستان کی محبت میں گھلنے لگتے ہیں اور اک دن ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ میں اپنے پاپا کو اس عمل یعنی توڑ پھوڑ سے بچانا چاہتا تھا۔ اس لیے کوئی اعتراض نہیں کیا۔"

"اس کی یہ باتیں مجھے بہت پسند آئیں۔ ذہین لڑکا ہے۔ مجھے جاب کے لیے کہہ رہا تھا کہ کچھ تجربہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جب تک اس کے پاپا وہاں سے بزنس وائنڈ اپ کر کے نہیں آجاتے، تب تک میں نے اسے ہماری فرم میں بطور ہیلپر رکھ لیا ہے۔"

"پاپا تو کچھ زیادہ ہی اس کے مداح ہو گئے ہیں۔"

علیشہ اور وریشہ کی اندر والی سوچ جس نے باہر نہیں آنا تھا۔ ویسے بھی کافی دن ہو گئے تھے انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس دن فاطمہ کی شکایت پر کمپیوٹر خود بخود خراب ہو گیا تھا۔ دزدیدہ نظروں سے فاطمہ کو دیکھا۔ ان کے رہنے کا انتظام فاطمہ کے کمرے میں ہو گیا تھا۔ جہاں فاطمہ خواب میں بھی ایک ہی بات کہتی نظر آتی تھی۔

"اٹھو کتاب کھولو Essay ایک بھی نہیں آتا تم لوگوں کو، جلدی اٹھو!"

☼ ☼ ☼

آسمان پر موجود بادلوں نے جیسے ہی غروب آفتاب کی شفق چرائی، ساری کائنات اس رنگ میں رنگی گئی۔ وہ سیٹی بجاتا ٹیرس پر آیا اور پھر منہ کا "اوہ" کے انداز میں بٹوا بن گیا۔

قریبی ٹیرس پر کوئی لڑکی پشت کیے کھڑی تھی۔ ہاتھ میں کتاب تھی، جسے وہ رٹنے میں مصروف تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ خاموش ہوئی اور ٹکٹکی باندھے سامنے دیکھنے لگی۔

(یہ دیکھ کسے رہی ہے؟) یہ دیکھنے کے لیے اس کے کندھوں سے اوپر دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر وہ ٹھہر گیا۔ اس کی نظریں آفتاب پر تھیں جو غروب ہونے کی تیاریوں میں تھا۔

وہ مڑی۔ علی حیدر شکل سے جانتا تھا اسے۔ نہیں، وہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے اس کے پیچھے دیکھا، سورج لمحہ بہ لمحہ ڈوبتا جارہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل بھی ڈوبا تھا۔ اس کے بالوں کا رنگ سیاہ تھا، لیکن شاہ خاور کی سرخی نے جو رنگ انہیں دیا تھا، وہ زیادہ پیارا تھا۔ بال شربتی جھلک دکھلا رہے تھے۔

"ہائے۔" بہت دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ (ماسک اتارنے والی۔۔۔ واؤ۔۔۔)

علیشہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ (وہی ہے نا، جس کی وجہ سے وریشہ نے اپنی فرضی منگنی کروائی تھی۔)

"میرا نام علی حیدر ہے۔ دوست ہیڈ کہتے ہیں۔ آپ مجھے ہیڈ پکار سکتی ہیں۔" (مائی سیلف مضمون سنایا جائے گا اب۔ نام تو نی می بھی برا نہیں تھا۔)

وہ جانے لگی۔

"آپ کا نام؟" رک کر اسے دیکھا۔ (نام بتانے میں کیا حرج ہے اس دلچسپ چیز کو۔)

"علیشہ!"

"علیشہ! آپ مجھ سے دوستی کریں گی۔"

"نہیں۔" وہ چلی گئی۔ وہ خفیف ہوا، تھوڑا شرمندہ۔

خیر نہ بنائے دوست۔ واپس لاؤنج میں آیا۔ الماری میں سے ایک خوب صورت سا پیک کیا ہوا باکس نکالا۔ کاغذ کے لیے آس پاس دیکھا۔ اخبار نظر ہی آگیا۔ چند الفاظ اس پر گھسیٹے۔ اخبار کو باکس پہ رکھا۔ دوبارہ سے اوپر آیا۔ دونوں چیزیں، دیوار پھلانگ کر ان

کے ٹیرس پر رکھیں۔ اپنے ٹیرس پر آ کے وہ نیچے جانے ہی لگا تھا کہ اسے علیشہ آتی دکھائی دی۔ وہ جلدی سے دروازے کی آڑ میں ہوا۔ علیشہ نے دونوں چیزیں دیکھیں' لیٹر پڑھ کر منہ بگاڑا۔ دونوں چیزیں اٹھا کر اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ اسے ایک چیخ سنائی دی۔

کامک بوائے (مضحکہ خیز) کے سارے کے سارے دانت باہر تھے۔

"وہ مارا۔"

"لڑکیاں جنوں سے اتنا نہیں ڈرتیں' جتنا چھپکلیوں سے ڈرتی ہیں۔" مشاہدے کی روشنی میں نتیجہ نکالا۔

☼ ☼ ☼

"برتن دھوئے بغیر یہاں سے ہلنا نہیں ورنہ۔۔۔" فاطمہ نے کہا اور وریشہ کا منہ بنا۔ (یہ فاطمہ اتنی دھمکیاں کیوں دیتی ہے آخر۔ اگر دے ہی دیتی ہے تو پھر ان پر عمل کیوں نہیں کرتی ہے؟ کیوں؟) اسے تنبیہہ و ہدایات دینے کے بعد فاطمہ کچن سے جانے لگی تھی کہ اسے چیخ کی آواز سنائی دی۔

"ہلنا نہیں! مجھے پتا ہے تم لوگوں کی چالا کیوں کا۔ تم نے ہی کہا ہو گا اسے کہ اگر میں پانچ منٹ تک واپس نہ آئی تو چیخیں مارنا شروع کر دینا۔" فاطمہ نے وریشہ کے لہجے کی ہو بہو نقل اتاری۔

"کتنا شک کرتی ہو تم! میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ پتا نہیں کیوں چلائی ہے؟ میں ابھی آتی ہوں۔" تشویش و گھبراہٹ ختم تھی وریشہ پر۔ سراسر مصنوعی گھبراہٹ۔ (خوشی میں بھی تو انسان چیخ سکتا ہے' لیکن فاطمہ کو تھوڑا ہی بتانے والی بات ہے یہ۔)

اس سے پہلے کہ فاطمہ کچھ کہتی' وہ بھاگتی ہوئی زینے پھلانگنے لگی۔ ایک بات فاطمہ بھی جانتی تھی۔ اب کس نے واپس آنا ہے۔ کمرے کی صورت حال اس کی توقع کے برعکس تھی۔ علیشہ بال بکھرائے ہنوز آہستہ آواز میں اک تسلسل کے ساتھ چیخ رہی تھی۔

"آس پاس تو کوئی قابل دید چیز نہیں ہے۔" پھر یہ کیوں؟" سوچنے کا نہیں پوچھنے کا وقت ہے۔

"کیا آئینہ دیکھ لیا ہے جو یوں چیخ رہی ہو۔"

"سر پہ دیکھو۔" گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا ہے سر پہ۔۔۔" وریشہ آگے بڑھی۔ بالوں کو سمیٹنا چاہا۔ مگر کرنٹ لگنے کے انداز میں پیچھے ہٹی۔ سر کے درمیان میں۔ چھپکلی بالوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اسے اصلی ہی لگی۔

"یہ کہاں سے آئی؟" گھبراہٹ آمیز انداز۔

"یہاں سے۔۔۔" قریب پڑے باکس کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا! نقلی ہے۔" سکون کا سانس لیا۔

"ویسے جس طرح کی حرکتیں اس "جی می" کی ہیں کیا پتا اصلی ہو۔" جی می کو اتنا چبا کر کہا کہ دانت رگڑنے کی باقاعدہ آواز سنائی دی۔ وریشہ جو اتارنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی' بدکی۔

"کیسے اتاروں اسے' کیسے۔" سب سے پہلے نظر پاؤں پر گئی۔ جوتا اتارا اور پھر اس کی مدد سے چھپکلی کو دور اچھالا گیا۔ موٹی تازی چھپکلی ویسے ہی پڑی رہی۔

"نقلی ہے۔"

"یہ کیوں بھیجی اس ٹی می نے۔۔۔ اور ہاں جی می اس کے پاپا کا نام ہے۔" وریشہ نے تصحیح کی۔ علیشہ نے حواس یکجا کیے اور اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔ جس پر بال پین کی مدد سے لکھا گیا تھا۔

"اگر آپ کو میری فرینڈشپ کی ریکویسٹ منظور ہے تو اسے اپنے پاس ہی رکھیے گا۔ اگر نہیں' تو پلیز اسے پھینکیے گا نہیں۔ اس میں موجود چیز بہت نازک ہے۔ جھٹکا لگنے سے ٹوٹ جائے گی۔ آپ یوں کیجیے اسے گیٹ پر پکڑا جائیے۔۔۔ تھینکس۔"

"زبان تمیزدار ہے اور کام بدتمیز۔۔۔"

وریشہ نے ہنسی کو روکنے کی بالکل بھی کوشش نہ کی اور اس "نازک اندام حسینہ" کی طرف دیکھا' جو فرش پر چت لیٹی تھی۔

"بندہ تمہیں جانتا ہے۔ یعنی اسے معلوم تھا کہ تم تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کے ضرور دیکھو گی۔ تم نے

سوچا ہو گا "ایک دفعہ دیکھ لوں۔ بعد میں اسی طرح پیک کر کے واپس کر دوں گی۔" علیشہ نے واقعی یہ سوچا تھا۔

"ویسے یہ سر تک کیسے پہنچی؟"

"پتا نہیں کیسے، پیکنگ کا کور ہٹتے ہی یہ سر پر چڑھ بیٹھی۔"

"ہاہاہا! اب کیا کرو گی اس کا۔" وریشہ نے اس کا آئندہ کا لائحہ عمل جاننا چاہا۔

علیشہ آگے بڑھی اور اس نے چھپکلی اٹھالی۔ اتنی بہادر تو تھی وہ کہ نقلی چھپکلی اٹھا سکے۔ اس کے لیے بھی بہادری کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا نہیں ہوتی؟ نقلی چھپکلی سے تو وہ خود اسکول و کالج میں کئی دفعہ لوگوں کو ڈرا چکی تھی، لیکن جس طرح یہ اچھلی تھی اسے اصلی کا ہی گمان گزرا۔

"بس جی بی! تھوڑا سا انتظار۔ اس غلطی کا بھگتان تو تمہیں بھگتنا ہی پڑے گا۔" وریشہ نے اس کی بڑبڑاہٹ سنی۔ دانت پیسنے کی آواز سمیت۔۔۔

غلطی اس کی بھی تھی اور اس غلطی کا نام تجسس تھا۔ بڑے بڑے نتائج کی حامل ایک چھوٹی سی غلطی جو بعض اوقات بہت کچھ غلط کر دیتی ہے۔

✡ ✡ ✡

"تم نے ادھر کوئی شرارت تو نہیں کی؟" موبائل پر فیضان صاحب تھے اور علی حیدر سے پوچھ رہے تھے۔

"نہیں پاپا۔۔۔" جھٹ پٹ جواب۔

"کسی کو تنگ تو نہیں کیا؟" نئے پیرائے میں پرانا سوال۔

"بالکل نہیں۔" سارے جواب زبان کی نوک پر دھرے تھے۔

"فرحان صاحب کے گھر جاتے رہتے ہو۔"

"نہیں۔"

"تم نے تو کہا تھا تمہارے ان کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔"

"گھر جانے کو دل ہی نہیں کیا، کل جاؤں گا۔" ارادہ ظاہر کیا۔ سنجیدہ و متین انداز سوچا کچھ اور ان کی بیٹیوں کے ساتھ تعلقات کچھ زیادہ "اچھے" ہیں۔ میں گھر گیا اور انہوں نے اپنے پاپا کے سامنے مجھے کچھ کہہ دیا تو پھر کیا عزت رہ جائے گی میری۔ (کافی عزت والا انسان ہے وہ۔)

"خدا حافظ ہیڈ۔ تھوڑی دیر بعد کال کروں گا۔ اس وقت موبائل پر کال آرہی ہے۔" موبائل قریبی صوفے پر اچھالا۔ آرام دہ پوزیشن میں صوفے سے پشت ٹکائی۔ گھر کی حالت اب بہتر تھی۔ اس نے فرحان صاحب کی مدد سے ارجنٹ ملازم کا بندوبست کروایا تھا۔ وہ بھلے مانس انسان اس کے اکثر کام آجاتے تھے۔ ہمسائے کی حیثیت سے یا شاید اس کو "نیا نیا" سمجھ کے۔

ملازم اور اس کے اہل خانہ نے در و دیوار اور فرنیچر کی سالوں سے اوڑھی گئی مٹی کی چادریں اتاری تھیں۔ "اتنے سے کام" سے گھر کی صورت نکھر گئی تھی۔ منہ دیکھنے لائق نکل آیا تھا۔ اپنے گھر سے ہوتی سوچ ساتھ والے گھر تک گئی تھی۔ گھر سے اس میں موجود ایک ہستی تک۔ پھر سوچ کا دائرہ اسی تک محدود ہو گیا۔

وہ اسے اچھی لگی تھی، لیکن وہ اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار چکا تھا۔ وہ کیا سوچتی ہو گی اس کے بارے میں۔ اگر پاپا کے اقوال کی روشنی میں سوچا جائے جو انہوں نے پاکستانی لڑکیوں کے بارے میں کہے تھے۔ تو برا سوچتی ہو گی، برے سے بھی زیادہ برا۔

"وہ مجھے جانتی نہیں ہے نا اس لیے۔ ورنہ تو میں ایک اچھا لڑکا ہوں۔ اچھے لڑکے کیا شرارتیں نہیں کرتے، کرتے ہیں نا! تو بس میری طبیعت بھی کبھی کبھار شرارت کے لیے مچل جاتی ہے۔ اس میں میرا کیا قصور۔۔۔ مگر لوگ کہاں دوسروں کو سمجھتے ہیں، وہ تو بس فتوے لگاتے ہیں۔"

"فرحان صاحب کے گھر سے یہ پیالہ آیا ہے۔" ملازمہ ہاتھ میں ایک ڈش پکڑے کھڑی تھی۔

"کون دے کر گیا ہے؟"

"دو لڑکیاں تھیں۔" اس کا ماتھا ٹھنکا۔ "اوہ انتقام۔"

"ٹھیک ہے 'ادھر رکھ دیں۔" ملازمہ کے جانے کے بعد 'تھوڑا آگے کو ہو کر ڈش سے ڈھکنا اتارا۔ تب ہی اس کی نظریں اس پہ چپکے نوٹ پر گئیں 'لکھا تھا۔

"آج سے ہم دوست ہیں۔" (منفرد لڑکی ہے۔)

ڈھکن اس نے سائڈ پر رکھا۔ کسٹرڈ تھا۔ اوپر سے اچھی طرح گارنش کی گئی تھی۔ دیکھ کے منہ میں پانی آیا۔

"کیا ہوگا اس میں۔" اس نے سوچنا چاہا۔ "چینی کی جگہ نمک ڈالا گیا ہوگا۔ یا بالکل پھیکا ہوگا یا اسٹرابری پر مرچیں چھڑکی گئی ہوں گی۔ اتنی بڑی غلطی تو نہیں ہے میری کہ زہر ڈالا گیا ہو۔ چکھ کے دیکھ لیتا ہوں۔" اس نے چمچے میں ذرا سا کسٹرڈ لے کر منہ میں ڈالا اور ڈالنے کے ساتھ ہی اسے پتا چل گیا۔ اس کے سارے اندازے غلط نکلے تھے۔ کسٹرڈ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ اسے عجیب محسوس ہوا۔

"شاید انہوں نے سوچا ہو کہ وہ اس طرح کر کے ہی میری شرارتوں سے محفوظ رہ سکتی ہیں اور ہمارا دوست بن جانا ہی بہتر ہے۔ اس دن ان کے پاپا بھی کہہ رہے تھے 'وہ اسے اچھا نہیں سمجھتیں۔ انہیں اس کی ڈریسنگ بری لگتی ہے تو انہوں نے انہیں سمجھایا کہ وہ اچھا انسان ہے۔ اپنے باپ کے سمجھانے کا ان پر اثر ہو گیا ہوگا۔"

دل کو اطمینان ہوا تو اس نے ایک چمچہ اور منہ میں ڈالا۔ پھر دوسرا 'کسٹرڈ واقعی مزے دار تھا۔ پورا ایک ماہ تو ہو گیا تھا 'اس نے گھر کی بنی کوئی اچھی چیز نہیں کھائی تھی۔

تیسرا چمچہ زیادہ بڑا لینے کے چکر میں پیندے سے ٹکرایا۔ اسے کوئی سخت سی چیز محسوس ہوئی۔ دل زور سے دھڑکا۔ چھٹی حس اس وقت الرٹ ہوئی تھی جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ چمچے کی مدد سے اس سخت چیز کو باہر نکالا اور ساکت و ششدر رہ گیا۔ اسے باؤل میں پٹخ اور باتھ روم کی طرف بھاگا۔ برا نہیں، بہت برا انتقام تھا یہ۔ قے کی کوشش کی۔

"اس کی بھیجی گئی چھپکلی کسٹرڈ میں۔ اخ' تھو!"

اسے کراہت محسوس ہوئی۔ قے تو نہیں آئی تھی اسے 'لیکن وہ منہ دھو کے واپس آیا اور اپنے باپ کو کال ملائی۔

"پاپا! میں نے کسٹرڈ کھالیا ہے۔" روہانسے لہجے میں کہا۔

"تو کیا ہوا بیٹا۔ سب کھالیتے ہیں۔" پاپا نے بھی بات سمجھے بغیر جواب دینا ضروری سمجھا۔ اسے دہشت طاری کرنے کے لیے کچھ اور طرح جملہ کہنا چاہیے تھا۔

"اس میں چھپکلی تھی۔"

"واٹ! چھپکلی کہاں سے آئی۔" ماما 'پاپا دونوں کے ایک ساتھ اچھلنے کی آواز اسے سنائی دی تھی۔

"ہمسائیوں کے گھر سے۔" سچ بولنے کا وقت تھا یہ۔

"ضرور تم نے شرارت کی ہوگی 'اب بھگتو!" ماما کی آواز۔

"چھوٹی سی شرارت تھی بس۔"

"کتنی چھوٹی؟"

"اچھا! نقلی چھپکلی ہے ہم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔" پورا واقعہ سننے کے بعد انہوں نے نہایت اطمینان سے کہا تھا۔ "بی پریکٹیکل بیٹا! کچھ نہیں ہوا۔" حوصلہ دینے کا بوجھ بھی سر سے اتار پھینکا۔

"پاپا چھپکلی تو چھپکلی ہوتی ہے 'نقلی ہو یا اصلی۔" (ادھر ایک ہی بات تھی آہ۔)

"اچھا انتقام لیا ہے انہوں نے 'میں آکے ان سے ملنا چاہوں گا۔" وہ کچھ ناراضی سے گویا ہوئے۔ اس نے کال کاٹ دی۔

"اب ڈنکے کی چوٹ پر تم لوگوں کے گھر آؤں گا۔ ڈی ڈی علیشہ۔" اس کی نظر ٹیبل پر دھرے پیالے پر گئی۔ "اتنی موٹی و بد صورت چھپکلی اف!"

"بندہ اگر کسی کو تنگ کرے تو پھر اس گھر سے آئی چیز کبھی نہ کھائے۔" ماشاء اللہ پاکستان آکے اس کی تجزیاتی و مشاہداتی حس میں کافی پیش رفت ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ گرمیوں کی صبح کی یہ ہوا کافی تیز تھی۔ درختوں کی لہلہاہٹ اور پرندوں کی چہچہاہٹ دلوں میں خوشی بکھیر رہی تھی۔

"پارک میں چلیں۔" ناشتا کرنے کے بعد علیشہ' وریشہ سے کہہ رہی تھی۔

"ماما سے پوچھ لو۔" وریشہ نے کہا اور ناشتے کے برتن سمیٹنے لگی۔ آج کل ناشتے کی ذمہ داری وریشہ کی ہے۔ چونکہ ایک ماہ بعد فاطمہ کی شادی ہے' اس لیے ماما اور فاطمہ' انہیں گھرداری سکھانے کے چکروں میں ہیں۔ (وہ دونوں اس سے بچنے کے چکروں میں۔۔۔) علیشہ سے پھر چھوٹا ہونے کی وجہ سے نرمی برتی جارہی ہے' مگر وریشہ سے نہیں۔

علیشہ کچن سے باہر نکلی۔ لاؤنج میں ہی ماما کھڑی تھیں اور ملازمہ سے کہہ رہی تھیں۔

"اچھی طرح صاف کرواسے۔" گھر میں سب کاموں کے لیے ملازم تھے' مگر کچن گھر کی خواتین ہی کی ذمہ داری تھی۔

"اچھی طرح ہی کیا ہے بی بی جی۔"

"ہاں بس۔ آنکھ میں میل ہے اس میں نہیں۔"

ملازمہ کھسیائی اور زور سے صاف کرنے لگی۔

"ادھر آؤ علیشہ!" اسے دیکھ کر کہا۔ "یہاں کھڑی ہوکے اچھی طرح صفائی کرواؤ۔ میں واشنگ مشین کو دیکھ لوں۔"

"ماما! ہم لوگ ذرا پارک تک ہو آئیں۔" اس سے پہلے کہ ماما جاتیں وہ جلدی سے بولی تھی۔

"کیوں؟" یک لفظی استفسار۔

"پیپرز کے بعد ہم کہیں گئے نہیں ماما۔ ہمارا بھی دل کرتا ہے' ہم گھومیں پھریں' زیادہ نہیں' تو پارک تک ہی ہو آئیں۔"

"پیپرز کب ختم ہوئے ہیں تم دونوں کے؟"

"کل آخری تھا۔" جوش سے جواب دیتی وہ دھیمی پڑی۔

"ہوں۔۔۔ اور کل شام ہی تم دونوں نے اپنے پاپا سے بالکل یہی الفاظ کہے تھے۔ بس آخر میں کہا تھا' زیادہ نہیں تو آئس کریم کھا آئیں۔" ماما نے آخری الفاظ اسی کے انداز میں منہ بنا کے کہے اور مسکرا دیں۔

"ماما جانے دیں نا! ہم ابھی آجائیں گے۔" مسکراہٹ سے حوصلہ بڑھا۔

"ٹھیک ہے' مگر جلدی آجانا۔" وریشہ کو کچن سے باہر نکالا۔ دونوں باہر نکل رہی تھیں کہ ماما نے فاطمہ کو دیکھ کر کہا تھا۔

"فاطمہ کو بھی ساتھ لے جاؤ۔"

"ماما! حامی بھیا کا فون آنا ہے ابھی۔ پتا نہیں انہوں نے فاطمہ سے کیا کیا کچھ پوچھنا ہے۔" وہ کہہ کر نو دو گیارہ ہو گئیں۔ ایک' تین پانچ (جھگڑے) کو جنم دے کر۔ واپس آتے ہی فاطمہ نے ان کو اچھی طرح پوچھ لینا تھا۔

"فاطمہ کو ساتھ لے لیتے تو اچھا تھا۔" سڑک کے اطراف میں چلتے ہوئے دونوں نے ایک ساتھ کہا تھا۔ نم نم ہوا چہروں سے ٹکرا رہی تھی۔ خیر! دوپہر کو اسی ہوا نے "لو" میں تبدیل ہو کر چہرے جھلسانے تھے۔

"پھر۔۔۔ ادھر اسٹیچو بن کے کھڑے ہوتے۔" وریشہ نے کہا۔

"فاطمہ بالکل ہی بڑی ہے۔ ساری حرکتیں بڑوں والی' ہا!" علیشہ کا بیان۔ پارک گھروں کے نزدیک تھا۔ وہ چہل قدمی کرتی پارک میں آگئی تھیں۔ چند بچے فٹ بال کھیل رہے تھے اور ان کی مائیں آپس میں باتوں میں مصروف تھیں۔ موسم بھی انسان کی شخصیت پر انداز ہوتے ہیں۔ بعض لوگ زیادہ اثر قبول کرتے ہیں کہ موسم کی طرح بدلنے بھی لگتے ہیں۔

"آؤ فٹ بال کھیلیں۔" علیشہ چہکی' وریشہ کو ساتھ لیے' باقاعدہ پکڑے' بچوں کی طرف بڑھ گئی۔ وریشہ اس طرح کے کاموں سے گریز کرتی تھی' مگر اس کا ساتھ دینے کے لیے مان جاتی تھی۔ پارک میں داخل ہوتے علی حیدر کی نگاہ ان پر گئی تھی اور پھر واپس نہیں پلٹی' ان پر قربان جو ہو گئی تھی۔

"ہو ho (خوب) نام بوائے ٹائپ گرلز۔۔۔" وہ بڑبڑایا۔

تھوڑا سا کھیلنے کے بعد وہ نزدیکی بینچ پر جا بیٹھیں۔

"وف۔ آنٹی دیکھ رہی ہو۔" علیشہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وریشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ انداز کوئی خاص بات بتانے والا تھا۔ "ان کے ہاتھوں کی طرف دیکھو۔"

"کیا ہوا ہے ہاتھوں کو سادہ سے تو ہاتھ ہیں۔" وہ اس کے سسپنس سے تنگ آئی۔ جاسوسی کہانیاں پڑھ پڑھ کے دوسروں کو متجسس کرنا تو آگیا تھا اسے۔

"میں نے کچھ کہا ہاتھوں کے بارے میں۔" مسکرا کے شرارت سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں تو کہہ رہی ہوں کہ ان کے ہاتھوں میں جو منرل واٹر کی بوتل ہے وہ لادو۔ پلیز۔" ملتجی لہجہ۔ مطلب کے لیے تو وہ ہاتھ جوڑ دے۔ یہاں تو طلب کا سوال تھا۔ مطلوب تھی فقط پانی کی بوتل۔ اس لیے لہجہ درخواستانہ رکھا۔

"ٹھیک ہے' لا دیتی ہوں' مگر آج شام کو مووی میری پسند کی ہوگی۔" وہ آنٹی شناسا تھیں۔ دے دیتی تھی بوتل۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ لوگ محبت کا فائدہ کیوں اٹھاتے ہیں۔ وہ بھی ناجائز فائدہ۔ سوچا۔ خود کا تو جیسے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اس فرماں برداری کے پیچھے۔

"ہائے۔" علیشہ سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عقب سے آواز بلند ہوئی' وہ ڈر گئی۔ یہ "ہائے" بھی ڈرانے والا "ہاؤ" تھا۔ وہ عقب سے نکل کر سامنے آیا اور بینچ کے آخری سرے پر بیٹھ گیا۔

"اف یہ کامک بوائے نہیں بلکہ چی می۔" (اسے یہ نام اس لیے پسند تھا کہ یہ زیادہ چبا کے ادا کیا جا سکتا تھا۔

سر پر الٹی کیپ' شرٹ پر ایک خوف ناک سی شکل جس کی آنکھیں انگارہ تھیں۔ جو رات کو چمکتی تھیں۔ (علیشہ نے نہیں دیکھا تھا۔) داڑھی لمبی باریک لکیر کی صورت آویزاں تھی۔ بچے چھچھے۔ وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔ (یہ کیوں چھچھے؟ کیا اسے دیکھ کر۔ یقیناً۔) وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وریشہ کو دیکھا۔ (آنٹی کیا ہیر سنانے بیٹھ گئی ہیں اسے۔)

"بیٹھو علیشہ! میں انسان ہی ہوں۔" (لگتا ہے دوستی والی چیٹ پڑھ کے آیا ہے۔ تکلف برطرف۔) انداز سنجیدہ تھا۔ مگر الفاظ چبا کے ادا کیے گئے تھے۔

"تمہیں واقعی یہ بات بتانی چاہیے' ورنہ دیکھنے سے کم ہی یقین آتا ہے۔" علیشہ کی طرف سے منہ توڑ' بلکہ منہ کھول جواب آیا۔

"تمہیں بھی بتانا چاہیے کہ تم انسان نہیں ہو' ورنہ دیکھنے سے کم ہی یقین آتا ہے۔" علی حیدر نے اینٹ کے جواب میں پتھر بڑی مشکل سے ٹانکا تھا۔ (اس کی اتنی جرات کہ یہ مجھے چڑیل کہے۔ کاش وہ چڑیل ہوتی اور اس جن کے سر کے لٹکتے ہوئے بال نوچ سکتی۔ کیا اب اسے چڑیل بن جانا چاہیے؟ نہیں! یہ انسان بنے رہنے کا وقت ہے۔) پارک میں موجود لوگوں کو دیکھا۔

"مطلب؟" آنکھیں سکوڑ کے بالکل چنی کیں۔ ان میں غصہ لبالب بھرا۔ تب اسے دیکھا۔

"جب لوگ مطلب سمجھ جائیں تو پھر کم فہمی کے انداز اپناتے ہیں۔ درحقیقت وہ تب ہی کم فہم بننا گوارا کرتے ہیں۔" شرارت و مسکراہٹ کی آمیزش تھی۔

"کچھ لوگوں کو عادت ہوتی ہے ایک بات سے سو مطلب نکال لینے کی۔ ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جو۔"

"میری طرح ذہین ہوتے ہیں۔" علی حیدر نے بات کاٹی' خوش گمانی کی کوئی حد ہوتی ہے؟

"نہیں! ایڈیٹ ہوتے ہیں۔" (غلط گمانی کی بھی حد نہیں ہوتی ہے نا!) علیشہ کہہ کر "جانتے نہیں پہچانتے نہیں۔" کی عملی تفسیر بنی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"مجھے تمہارا جواب پسند آیا۔ "یہ" بھی اور "وہ" بھی۔ ویسے ملازم رونے والا ہو گیا تھا۔ اس کی چیخ سن کے میں گیا تو بتایا "نقلی" ہے۔ تب بے چارے نے منہ میں زبان ڈالی۔ تمہیں کیا لگا تھا میں ڈائریکٹ کھا لوں گا۔ نہیں جناب! میں نے پہلے چیک کرایا تھا۔ جب ملازم نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے تو میں نے اسے کھانے کے لیے دے دیا۔ کچھ ڈالا نہ گیا ہو' یہ تو ہو نہیں سکتا تھا۔ میں تم لوگوں کو اچھی طرح جانتا

ہوں۔" (بس ثابت ہوا لکیر پیٹنے والے بھی عقل مند بن جاتے ہیں۔) علیشہ نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ بولتا رہے' کتنا بول سکتا ہے؟

"ملازم کہہ رہا تھا۔ کتنی بدتمیز لڑکیاں ہیں' جو یہ ڈال کے دے گئیں۔ اس ایریے میں یہی دو لڑکیاں ہیں جنہیں الٹے سیدھے کاموں کی عادت ہے۔" خاموشی دیکھ کر ایک سو بیسواں جھوٹ بھی بول دیا۔

(کہانی بنانے میں ماہر ہے بندہ۔ کوئی بات نہیں' وہ ابھی اس کے فیوز اڑاتی ہے۔) وریشہ آگئی تھی' مگر وہ علی حیدر کی طرف گھومی۔

"وہ کسٹرڈ تم نے ہی کھایا تھا۔ میں نے تمہاری گھریلو ملازمہ سے پوچھا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ کسٹرڈ کھانے کے بعد صاحب کی حالت بری ہوئی تھی۔" وہ مسکرائی

ملازمین کب گھر کی باتیں دوسروں کو بتانے سے باز آئیں گے۔ ہا! ساری چالاکی و زبانی تیزی گئی پانی میں۔۔۔ علیشہ نے بوتل پکڑی اور قدم آگے بڑھا دیے۔ وریشہ بھی ساتھ گھسٹی۔ "اس کا دل کر رہا تھا' اس جن سے باتیں کرنے کا' لیکن اس کے آنے سے پہلے ہی منہ ماری ہوگئی تھی۔ سوچا تھا اور با آواز بلند بولنے لگی۔

"کان تھکا دیے آنٹی نے۔ یہ آنٹیوں کو اپنے تمام بچوں کے عادات و خصائل ہر ایرے غیرے کو بتانے کی عادت کیوں ہوتی ہے؟ (رونے والا منہ) چھوٹو کا دودھ ایک ماہ پہلے ہی چھڑایا ہے سے آنٹی شروع ہوئی تھیں اور بڑی بیٹی کے او لیولز تک جا پہنچی تھیں۔ جو ابھی آٹھویں کلاس میں ہے' ہا! بس اک ذرا چھیڑیے' پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" (غالب)

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"بہت کچھ۔"

علیشہ نے کانی آنکھ سے علی حیدر کو دیکھا۔ سب کھیلنے والے بچے اس کے گرد جمع تھے اور اسے کھینچ رہے تھے۔ وہ ویسے ہی بیٹھا رہا' پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اک زوردار نعرے کے ساتھ فٹ بال کو کک لگائی اور گیم شروع ہوگیا۔

"بوتل تم واپس دے کے آؤ۔" وریشہ نے کہا۔

"او کے۔۔۔" علیشہ نے بوتل اٹھائی۔ چپکے سے آنٹی کے پاس گئی۔ وہ دوسری طرف متوجہ تھیں۔ علیشہ نے بوتل پاؤں کے قریب رکھی۔ تھوڑا قریب و تھوڑا دور جا کے اونچی آواز میں تھینک یو کہا۔ (اتنی تہذیب تھی ان میں۔۔۔) ان کے چونکنے پر پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔ علیشہ اور وریشہ ہنسیں۔

انہیں معلوم تھا' آنٹی کیا کہہ رہی ہوں گی۔

"اس طرح کی لڑکیوں کو تمیز انسٹی ٹیوٹ میں داخل کروا دینا چاہیے۔" کیا نہیں کھلا! ان کی بیٹی ذرا الیس کلیئر کرلے' پھر وہ کھول لیں گی۔ تیسرا فرد بھی مسکرایا تھا' مگر اس بے چارے کا کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا۔

☼ ☼ ☼

"یار ہیڈ! تم نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" یہاں بیٹھے ہوئے اس نے کیا برا کر دیا جو پاپا ایسا کہہ رہے ہیں۔ موبائل کان سے لگائے اس نے سوچا۔ وہ تو وہاں بھی اپنی اچھائیوں اور برائیوں کی پاپا کو خبر نہیں ہونے دیتا تھا۔ (خاص طور سے اچھائیوں کی) اب کیسے ہوگئی۔

"میرے ساتھ بھی کچھ اچھا نہیں ہوا۔" تازہ دل دکھا ہوا تھا' اسی تناظر میں کہا۔ "آپ بتائیں۔۔۔ آپ کے ساتھ کیا برا ہوا۔" اس نے بات بدلی۔ وہ سمجھ گئے کہ پچھلا زخم ابھی تازہ ہے۔ (پرانے زخم کو نیا تڑکا لگا تھا آج۔)

"تم ادھر تھے تو تمہارے دوست آجاتے تھے۔ گھر میں رونق تو ہوتی تھی۔ تمہارے دوستوں کی لمبی لمبی کالیں' جنہیں تم ہمارے پاس بیٹھے سنتے رہتے تھے' تمہیں کیا معلوم ہمارے لیے کتنی انجوائے منٹ کی بات تھی یہ۔۔۔ اب تو تمہارے کسی دوست نے کال تک نہیں کی۔"

پھر جیسے کچھ یاد آیا تو بولے تھے۔ "ہاں! "رابر" کی کال آئی تھی۔ کہہ رہا تھا۔ اپنے بیٹے کو سنبھال کے رکھیں' جب بھی میں پاکستان گیا' اس کی گردن موڑ

کے آؤں گا۔ آپ کے بیٹے کی وجہ سے تین دن سے نہیں سویا۔ وہ مجھے امریکہ آکے دکھائے، قتل کے الزام میں اندر نہ کرایا تو میرا نام بدل دیجئے گا۔ خواہ کمینہ رکھ دیجئے گا۔"

"کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ، جو وہ یوں کہہ رہا تھا۔ میں جانتا ہوں دوستوں میں سب سے زیادہ رابری تمہارا خیال رکھتا ہے۔"

"کچھ بھی تو نہیں کیا پاپا! میں جب آرہا تھا، سب سے زیادہ رابر اداس تھا۔ کہنے لگا۔ "ہیڈ! تم جا رہے ہو؟ میں تنہا کیسے رہوں گا۔ میں جب تک تم سے بات نہ کرلوں، مجھے نیند نہیں آتی۔ اس کی اتنی محبت مجھ سے دیکھی نہیں گئی اور آتے ہوئے ایک نیندیں اڑا دینے والا میسج اس کے والدین اور فیانسی کو کردیا۔"

"اور یہ "کچھ بھی نہیں" ہے تمہارے نزدیک۔" وہ زور دے کے بولے۔ اس طرح کے مواقعوں پر اس کی طرف سے ایک ہی جواب موصول ہوتا تھا۔

"کوئی شک۔" بھنویں ایک دوسرے سے ملتیں اور واپس اپنی جگہ پہ چلی جاتیں۔

"پاپا! بہت بھوک لگ رہی ہے۔ باقی باتیں اب آپ کی واپسی پر ہوں گی۔ آرہے ہیں نا! آپ اور ماما پرسوں۔"

"کوئی شک۔" اس کے انداز و لہجہ کی نقل اتاری تھی پاپا نے۔ وہ مسکرا دیا۔

موبائل رکھ کر وہ کچن کی طرف بڑھا ہی تھا کہ وہ پھر سے بج اٹھا۔ اس دفعہ فرحان صاحب تھے۔ وہ اسے اپنے گھر ڈنر کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔ چونکہ عنقریب ماما، پاپا آنے والے تھے تو اس لیے اس نے ان کی دعوت قبول کرلی۔ وہ ان کے گھر جانا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

شمس اپنی روشنی سمیٹے کسی دوسرے نگر کو روشن کرنے جارہا تھا۔ قمر تنہا رہ گیا تھا۔ شب نے ڈرتے ڈرتے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ان میں اتنی سیاہی تھی کہ کل عالم سیاہ پڑ گیا تھا۔ سیاہی جو کسی کے لیے "سزا" ہے تو کسی کے لیے عبرت مگر رات کی "قسمت" ہے۔

شب کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں جب وہ فرحان صاحب کے گھر داخل ہوا۔ دائیں بائیں دیکھا اور دوبارہ سے دائیں۔ وہاں کچھ درخت تھے اور درختوں کے نیچے ایک لڑکی موبائل کان سے لگائے کھڑی تھی۔ سیاہ زلفیں لہرا رہی تھیں۔ اسے چہرہ دکھائی نہ دیا۔

عورت، درخت، اندھیرا اور سیاہ بال اس کے اندر اک سوچ پیدا ہوئی۔

"کیا وہاں "میڈیوزا" (ایک بدصورت عورت جس کی زلفیں سانپ تھیں اور جسے دیکھنے سے انسان پتھر ہوجاتا تھا۔) کھڑی ہے۔ یہ ابھی میری طرف دیکھے گی اور مجھے پتھر کردے گی۔" وہ ہولے ہولے چلنے لگی تھی۔

اسے اس کا چہرہ دکھائی دیا اور وہ پتھر ہوگیا۔ یہ چہرہ اسے پتھر کردیتا تھا۔ "اس میں کچھ تو ایسا ہے جو مجھے متاثر کررہا ہے۔ پتا نہیں کیا؟ جلد معلوم کرلوں، پھر ماما کو بتاؤں گا" اب کھسکو یہاں سے یار ہیڈ! باقی غور و فکر گھر جاکر۔"

وہ آگے بڑھ جاتا اگر اسے اس کا بلند آواز میں پوچھا گیا "کیا؟" سنائی نہ دیتا۔ ایک لمحے میں اس کے اندر کا "اسپائی (جاسوس) بوائے" جاگا۔ "لور بوائے" پس منظر میں اونگھنے لگا۔

"کیا! تم نے اپنے گھر میں سانپ دیکھا۔" وہ پرجوش سی کہہ رہی تھی۔ "کیسا تھا؟"

اس کی دوست نے اس کی بات کا برا مانا تھا یا شاید اسے اپنے احمقانہ پن کا اندازہ ہوگیا تھا۔ جلدی سے بولی تھی۔

"میرا مطلب ہے چھوٹا تھا یا بڑا۔"

"تمہیں اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیا کرے گا وہ۔ زیادہ سے زیادہ ڈس لے گا، تو کوئی بات نہیں ہے۔" بے خوفی کی حد ہے۔ اب اسے اندر جانا چاہیے۔ نہیں! وہ ایک بات اور سن لے، پھر چلا جائے گا۔

"مذاق نہیں کررہی! بالکل نہیں ڈرنا۔ اگر اس .

طرح کی چیزوں سے زیادہ ڈرا جائے تو یہ ڈرا ڈرا کے مار دیتی ہیں۔ سوچو ذرا اگر سانپ کو معلوم ہو گیا کہ تم اس کی وجہ سے تھر تھر کانپ رہی ہو تو وہ۔"

بات ادھوری رہ گئی۔ شاید نہیں یقیناً "دوست کال کاٹ چکی تھی۔ اس نے ابھی تک علی حیدر کو نہیں دیکھا تھا۔ "یہ دیکھ لے نا مجھے، پھر میں آگے بڑھ جاؤں۔"

پپ۔ وہ موبائل کے ساتھ مصروف اندر کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ ناچار وہ بھی اس کے آگے آگے چلنے لگا۔ علیشہ کافی پیچھے تھی، لیکن اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے آگے چل رہا ہے۔ علیشہ نے موبائل سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ وہ یوں اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا جیسے وہ اکثر یہاں آتا رہتا ہے یا یہ گھر اسی کا ہے۔ لان میں لگی روشنیاں اور ملگجا سا اندھیرا اسے واضح دکھا رہا تھا۔ سر پر کیپ تھی۔ (ایک دفعہ پھر وہ ہیر اسٹائل بدل چکا ہے اور آج کل چھپکلی کٹنگ میں گھومتا ہے۔ جی ہاں! چھپکلی کٹنگ۔ (فرضی نہیں ہے) اس میں بال یوں کاٹے جاتے ہیں لائنوں کی صورت میں کہ سر پر چھپکلی نہ بھی بنے تب بھی سر دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کیاریوں کی شکل میں فصل اگائی گئی ہو۔)

لوگ زمین پر نت نئے تجربے کرتے ہیں۔ وہ اپنی "سرزمین" پر کرنے کا عادی معلوم ہوتا ہے۔ دو دنوں کی بات ہے، وہ یہ اسٹائل بھی بدل دے گا۔

علی حیدر کے قدم بے جھجک آگے بڑھ رہے تھے۔ دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے کاؤچ پر فرحان صاحب بیٹھے تھے۔ اسے دیکھ کر اس کی طرف آئے، پاس بیٹھی ماما بھی۔

"آجاؤ حیدر۔ میں کافی دیر سے تمہارا منتظر تھا۔ اب تو یوں لگنے لگا جیسے تم نہیں آؤ گے۔"

علیشہ اپنے بابا کی اتنی بے تکلفی پر حیران ہوئی۔ (کیا بابا کے دل میں بھی اس طرح کے شرارتی و دلچسپ بیٹے کی خواہش دبی تھی؟)

"نکل! ایک دفعہ کہہ دیا تھا نا کہ آؤں گا تو پھر آنا ہی تھا۔ جو لوگ جلد فیصلہ کر لیتے ہیں، وہ اچھا کرتے ہیں۔ جو فیصلے کو اتنی جلدی نبھا لیتے ہیں وہ بہترین ہوتے ہیں اور مجھے خوب تر کی صف میں رہنا ہمیشہ سے پسند رہا ہے۔"

نزدیک کھڑی علیشہ کو دیکھ کے خواہ مخواہ مسکرایا۔ جس کی سوچ اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ "ان ہی باتوں سے ہمارے بابا کو اپنی مٹھی میں کیا ہوا ہے۔ یہ ہمارے گھر کیوں آیا ہے؟ اگر آ ہی گیا ہے تو اسے باہر کیسے پھنکوایا جائے۔ کیسے؟"

☼ ☼ ☼

"عماد کا فون آیا تھا تو کس نے بات کی تھی؟" فاطمہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ دونوں اس وقت کچن میں موجود چیئرز پر بیٹھی فروٹ ٹرائفل سے پورا پورا انصاف کر رہی تھیں۔

"تمہیں کیا پتا۔" کھانے کے دوران بمشکل علیشہ نے کہا تھا۔

"تھوڑا کھاؤ، مجھے زیادہ بھوک لگی ہے۔" وریشہ نے چھلکتا ہوا چمچہ منہ میں ڈالا۔

"پورا باؤل ختم ہونے کو ہے، مگر تمہاری بھوک زیادہ ہی ہے۔" (ندیدوں کی طرح کھانے کی عادت کب جائے گی ان کی۔۔۔) اوپر کھڑی فاطمہ نے سوچا۔ گھر میں صرف یہ ہی تھیں جنہیں وقت بے وقت کھانے کی عادت تھی اور ہر گھر میں ایک ایسا ضرور ہوتا ہے۔ کیا نہیں ہوتا؟

"مجھے پتا ہے، شرم آئی تھی یہ کہتے ہوئے کہ فاطمہ کہہ رہی ہے برائیڈل ڈریس وائٹ کلر میں ہو۔ یہ بھی کہ آپ کی پسند کچھ خاص نہیں ہے۔ شاپنگ اکٹھے کریں گے۔ ایک تو میری پہلے ہی ارینج میرج ہے۔ اوپر سے تم دونوں۔۔۔" سخت صدمے سے بات نامکمل چھوڑی۔

"ارینج میرج! اللہ ہمیں بھی اسی طرح کی میرج نصیب کرے۔"

"کیا ہوا فاطمہ! کیوں اتنا چلا رہی ہو۔" لان میں

پودوں کو دیکھتی ماما بھی کچن میں آگئی تھیں۔

"ماما جانی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے ایک نیا شوشا چھوڑ دیا کہ شاپنگ اکٹھے کریں گے اور برائیڈل ڈریس وائٹ کلر میں ہی ہوگا۔" (فاطمہ کو ریڈ کلر چاہیے تھا اور یہ شوق سے اوپر کی بات تھی۔) کہنے لگے میرے سامنے تو تم بولتی نہیں ہو۔ اپنی بہنوں سے یہ بات شیئر کی ہوگی اس لیے تو انہوں نے کہا۔"

"وہ آئے گا تو میں بات کرلوں گی۔ تم پریشان نہ ہو۔" ماما نے فاطمہ سے کہا' پھر ان کی طرف گھومیں۔

"اپنی شرارتوں پر کنٹرول کرو تم دونوں' ورنہ تمہارا باپ ہی تم لوگوں کو سمجھائے گا۔" خفیف سی ناراضی لیے لہجہ تھا۔ وہ کچن سے نکلتی چلی گئیں۔

"انسلٹ ہوگئی آج تو۔۔۔"

"مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔" دونوں نے کرسیوں سے ٹیک لگا کے ایک لمبا سانس فضا میں چھوڑا۔

☼ ☼ ☼

انہیں بیٹھے ہوئے چند لمحے ہوئے تھے۔ جب فرحان صاحب گھر داخل ہوئے۔ وہ دونوں ان کی طرف بڑھیں مگر رک جانا پڑا۔ ان کے پیچھے وہ بھی چلا آرہا تھا۔ دی کامک بوائے' دی جینٹ اینڈ دی ہیڈ۔

"بیٹھو' حیدر! میں اسٹڈی ٹیبل سے فائلز اٹھا لاؤں۔" فرحان صاحب نے علی حیدر سے کہا۔ پھر ان سے مخاطب ہوئے۔

"تم دونوں ہیڈ کے لیے چائے کا بندوبست کرو۔ ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے بھی لازمی ہو۔ بلکہ میں تم لوگوں کی ماما کو بھیجتا ہوں۔" وہ کہہ کر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ پھر سے صوفوں پر بیٹھ گئیں۔ (ماما آجائیں گی نا تو بس وہ کرلیں گی بندوبست۔) سامنے والے کاؤچ پر وہ بیٹھا تھا۔

وریشہ نے بات کرنے کے لیے منہ کھولا۔ پھر بند کرلیا۔ علیشہ نے بھی۔ (کیا بات کی جائے' ہمارے گھر کیوں آئے ہو؟ یا اپنے گھر چین نہیں پڑتا یا پھر ہمارے گھر مت آیا کرو۔ نہیں! یہ سب نہیں۔ انہیں کچھ اور کہنا چاہیے۔)

"ہاں تو پھر ہیڈ کب شادی ہوئی تمہاری؟" بلا کے بے تکلف لہجے میں پوچھا۔ وریشہ کا بے ساختہ منہ کھل گیا۔

ہیڈ چونکا۔ اس بات کی توقع نہیں تھی اسے۔ لیکن زندگی غیر متوقع باتوں کا مجموعہ ہے۔ وہ مسکرایا۔ بولتا تو تب' اگر موقع ملتا۔ علیشہ من پسند مطلب اخذ کیے بولنے لگی تھی۔

"جس طرح کا تمہارا حلیہ ہے' پھر تمہارے بال' ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ تمہاری یہ درگت تمہاری بیوی نے بنائی ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ کیا تم اس کا کہنا نہیں مانتے؟" طنزیہ سا ترس کھاتا لہجہ۔۔۔ اف۔۔۔ امریکی بچے کی عزت نفس پر حملہ تھا یہ۔۔۔ بس بہت ہوا۔ اب اسے بھی کچھ کہنا چاہیے۔ نہیں' اسے ایک کام کرنا چاہیے۔

وریشہ کی نظر سب سے پہلے صوفے کے نیچے گئی تھی۔ جہاں سے ایک چھوٹا سا سانپ کا بچہ رینگتا ہوا ان کی طرف آرہا تھا۔

"سانپ! سانپ علیشہ۔۔۔" وریشہ صوفے پر چڑھ گئی تھی۔ علیشہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ دونوں باجماعت چیختی صوفوں پر اچھل کود کررہی تھیں۔

"ماما! پاپا سانپ۔۔۔" ماما' پاپا بھی آگئے تھے اور پریشانی میں سانپ کو مارنے کے لیے کوئی چیز نہیں مل رہی تھی۔ علی حیدر نے اپنی چپل اتاری۔

"چپل سے نہیں مرے گا۔"

"مرجائے گا انکل۔۔۔" (بلکہ مرگیا ہوگا۔ بٹن دبانے کے بعد اس کی عمر صرف ایک منٹ ہوتی ہے۔)

"یہ آیا کہاں سے؟" فاطمہ کا سوال۔

علی نے ایک صوفہ الٹا۔ اس کے نیچے سانپ دبکا پڑا تھا۔ کیونکہ اس کی ایک منٹ کی زندگی تمام ہوگئی تھی اور اس "ایک منٹی زندگی" نے بھی قیامت اٹھادی تھی۔ لاؤنج کا سارا انتظام درہم برہم کردیا تھا۔

اس نے سانپ کو دو چپل لگائے۔ علیشہ نے بھی یہ منظر دیکھا۔ اف! اگر ابھی یہ فینگ۔ (زہر والا دانت)

نکالے اور۔۔۔ اور۔۔۔ اسے ڈس لے۔ نہیں نہیں۔۔۔ بے چارے کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ اس نے جھرجھری لے کر آنکھیں بند کرلیں۔

"مر گیا ہے انکل۔۔۔" سانپ کو اپنے جوتے پر لٹکائے وہ کہہ رہا تھا۔

"اب میں چوکیدار کو دے آؤں۔ وہ اسے دور پھینک آئے گا۔" سانپ کو زیادہ دیکھنے نہ دیا اور اسے لے کر باہر چلا گیا۔ دروازے کے پار پہنچ کر سانپ کو جیب میں ڈالا اور چپل میں پاؤں۔

واپس آیا۔

"انکل فائلز؟" فائلیں پکڑیں اور واپسی کے لیے قدم دھر دیے۔

لان میں اسے علیشہ نظر آئی۔ یہ اب اپنی اسی دوست کو فون کرے گی۔ اسے پورا یقین تھا۔ وہ عین اس کے سر پر پہنچ کر شروع ہوا تھا۔

"تم سانپ سے اتنا ڈریں کیوں؟ کیا کرتا وہ' زیادہ سے زیادہ کاٹ لیتا۔" اپنی کہی بات اس کے منہ سے سن کر اسے عجیب لگا۔ (کیا اس نے اس دن میری باتیں سنی تھیں۔) ہیڈ کو بدلہ چکانے کا موقع اب ملا تھا۔

جیب سے سانپ نکالا۔

"اس طرح کے سانپ سے بالکل نہیں ڈرتے بے بی! ان کے نیچے بٹن ہوتا ہے۔ ان کو چلانے اور بند کرنے والا۔ یہ دیکھو۔" بٹن کو دبایا۔ ساتھ سانپ حرکت میں آیا۔ بند کر کے پاکٹ میں ڈال لیا۔

علیشہ ششدر تھی۔

"میرا ارادہ پاکستان میں شادی کرنے کا ہے' تاکہ میری بیوی میری درگت نہ بنا سکے۔ اوکے۔ بائے بائے۔" ہاتھ ہلا کے یہ جا وہ جا۔

علیشہ کا سکتہ ٹوٹا۔ وہ پاؤں پٹختی پاپا کے پاس گئی۔

"پاپا! وہ سانپ نقلی تھا۔"

"اچھا بیٹا! پھر آپ کو اس سے "اتنا زیادہ" نہیں ڈرنا چاہیے تھا۔" انہوں نے مذاق میں کہا تھا۔ مگر اسے انسلٹ محسوس ہوئی۔

"اب اسے کسی سپیرے سے رابطہ کرنا چاہیے اور اصلی سانپ اس امریکی بندر کے کمرے میں چھوڑنا چاہیے۔ فی الفور۔۔۔ ہاں! جلد از جلد۔۔۔"

☆ ☆ ☆

"ماما! آپ میری شادی کردیں۔"

"ابھی کردوں یا شام تک کا انتظار کرلو گے۔ دراصل تمہارے پاپا بھی آجائیں تو اکٹھے چلیں گے شادی کرنے۔"

فیضان صاحب دفتر چلے گئے تھے اور اس سے کہہ گئے تھے کہ گھنٹے بعد تم بھی آجانا۔ مگر وہ اس گھنٹے میں شادی کا منصوبہ بنائے بیٹھا تھا۔ کچن کیبنٹ صاف کرتی ماما کا جواب دوسرے لفظوں میں مزاحیہ انداز' اسے بالکل ہضم نہ ہوا۔

"میں مذاق نہیں کررہا۔"

"معلوم ہے مجھے' تم مذاق سے بھی اوپر کی چیز کرنے کی کوشش کررہے ہو' یعنی شادی۔۔۔" وہ کام چھوڑ کے اس کے پاس آبیٹھیں۔

"لڑکی ڈھونڈلی تم نے! بڑے تیز ہو۔ ہر الٹے سیدھے کام میں تم بڑی تیزی دکھاتے ہو' اس میں کیسے پیچھے رہتے۔ کون ہے وہ؟" طنزیہ کلمات و تبصروں کے بعد وہ سوال آگیا تھا جس کا اسے اشد انتظار تھا۔

"کل کی تقریب میں وہ تھی؟" انہوں نے کل اپنے گھر میں کالونی کے لوگوں سے آشنائی کے لیے ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں پاکستان میں اپنی مستقل آمد کو سلیبریٹ کیا تھا۔

"بس! میں جان گئی۔" ہاتھ کھڑے کیے۔

"وہی نا! جس پر تم نے پوری افشاں کی ڈبی خالی کردی تھی۔ اگر وہ تمہیں دیکھ لیتی تو تمہارے سر پر ضرور کوئی چیز دے مارتی۔ اگر چیز نہ ملتی تو وہ اپنا سر دے مارتی۔ اتنا ہی غصہ تھا اس وقت اس کے چہرے پر۔۔۔ پھر جب وہ واپس جارہی تھی تو تم نے آئس کریم پکڑے بچے کو اس کی طرف دھکیل دیا۔ اگرچہ اس کے کپڑے خراب کر کے خود نیچے گرا' نہ رو رہا ہوتا تو وہ اس کو دو ہاتھ ضرور لگاتی۔ اس لیے صبر کے گھونٹ بھرتی چپکے

سے دروازہ پار کر گئی۔ کوئی تمہاری اس طرح کی حرکتیں دیکھ لیتا تو کیا امیج رہ جاتا ہمارا۔ لوگ تو یہی کہیں گے۔ "بدلحاظ بدتہذیب بیٹا ہے فیضان کا۔"

"وہی تھی۔" گردن کو اوپر نیچے کر کے جواب دیا۔ شرمندگی ندارد۔

"آپ جائیں گی ان کے گھر؟"

"وہ انکار کریں گے۔"

"وجہ۔" بھنویں ایک دوسرے سے ملیں۔

"تمہاری ظاہری حالت و حرکتیں۔"

"نہیں کریں گے۔" درمیان میں ہی وہ بولا تھا۔ "ان کے ساتھ میرے اچھے تعلقات ہیں۔"

"وہ تو نظر آ ہی رہے تھے۔ ان کے باپ کے سوا کسی نے تم سے کلام تک نہیں کیا۔"

"پاکستانی لڑکی کا جب باپ راضی ہو تو وہ بھی راضی ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر تم "انسان" بن کے رہنا۔"

"میں انسان "بنے" رہنے کی کوشش کروں گا۔" وہ سنجیدہ سا کھڑا ہو گیا۔ گویا انسان بننے کی کوشش ابھی سے شروع کرنے کا ارادہ ہو۔ "خوب بلکہ خوب تر۔"

☆ ☆ ☆

وہ چاہنے کے باوجود اپنی توجہ ٹی وی کی جانب مبذول نہیں کر پایا تھا۔ جہاں اس کی پسندیدہ ہارر موومی کا کلائمکس چل رہا تھا۔ وہ جو پہلے ڈوب کر دیکھتا تھا۔ اس وقت کنارے سے بھی کوسوں دور تھا۔ کاؤچ پر دراز وہ "کہیں اور" بہت گہرائی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اتنی گہرائی کہ نکالنے والے کو بھی تین چار غوطے کھانے پڑتے۔ ماتھے پر دستک دیتا ہاتھ رکا اور وہ اٹھ کے کچن کی طرف چل دیا۔ گہرائی کا عالم ہنوز تھا۔ پہلے بھی وہ بھوک نہ ہونے کے باوجود دو کباب کھا چکا تھا۔ اس بار پانی پر اکتفا کیا۔

"اُف۔ کتنا مشکل ہوتا ہے انتظار کرنا۔ اللہ ہر کسی کو انتظار کی کوفت سے بچائے۔" خود کلامی کافی "اونچی" تھی۔

"کیا انتظار کے سوا میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں۔" دوسری سوچوں کے برعکس اس نے ایک نئی نہج پر سوچا تھا۔ "راستہ تو ہمیشہ ہوتا ہے 'یار ہیڈ!' اور کوشش اس راستے کو مزید ہموار کرتی ہے۔ انتظار تو انسان کا انتخاب ہوتا ہے۔" اسے افسوس ہوا۔ اپنے بُرے انتخاب پر۔ وہ سیڑھیوں کی جانب چل دیا۔ ارادہ تھا 'ٹیرس پر سن گن لینے کی کوشش کرے گا۔ اگر کوئی نہ ہوا تو ٹیرس سے ان کے گھر کود جائے گا۔ آگے دیکھا جائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ (جاسوسی فلموں نے دماغ خراب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔) حرفِ تاسف اس پر کہ اس نے اس دفعہ بھی برا راستہ منتخب کیا تھا۔ وہ "صبر" بھی تو کر سکتا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو ہیڈ' بیٹھو۔" ماما کی آواز پر وہ لمبی سانس فضا میں چھوڑتا اسی کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ جس پر اس سے پہلے بیٹھا تھا۔ اب وہ ان کے بولنے کا منتظر تھا۔ (ماما تو بتا نہیں کب بتائیں گی اسے خود ہی پوچھ لینا چاہیے۔ پاپا بھی کمرے میں چلے گئے۔ حالانکہ انہیں یہاں آکر مجھے جواب بتانا چاہیے تھا۔ ماما بھی منہ لٹکا کے بیٹھی ہیں۔ خیر ان کا ارادہ مجھے ستانے کا ہو گا۔) وہ پرسکون تھا۔

"ماما! اب کچھ "بتانا" بھی ہے یا خاموش رہ کر صرف "ستانا" ہی ہے۔" اس نے اپنے استفسار پر ماں کے منہ پر کرب کی لہریں دیکھیں۔ جینئس تھا چہرے سے سمجھ گیا۔

"اوہ! تو انکار کر دیا انہوں نے۔ انکل سے تو مجھے انکار کی بالکل بھی امید نہیں ہے۔ یقیناً" علیشہ نے کچھ کہا ہو گا۔ تو اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ وہ تو ویسے ہی بولتی رہتی ہے۔ یوں تو وہ کچھ عادات میں میرا پرتو ہے۔ (ماشاء اللہ ان کا بیٹا بچپن سے ہی لوگوں کے بارے میں بالکل ٹھیک اندازے لگاتا ہے) ثمینہ فیضان نے سوچنے کے ساتھ ہاتھ سے اپنا چہرہ تھپتھپایا۔ (کچھ مصنوعی تو نہیں لگ رہا تا!)"

"علیشہ نے کچھ نہیں کہا' جب ہم نے وہاں

تمہارے رشتے کی بات کی تو ہمیں بتایا گیا کہ علیشہ کا نکاح بچپن میں ہی اس کی خالہ کے بیٹے سے کر دیا گیا تھا۔"

"مذاق نہیں ماما! سچ بتائیں۔" علی حیدر نے جاسوسی کی آنکھ سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ سخت بے چین لگ رہی تھیں۔ چشم نم سے اسے تکتی، وہ افسردہ تھیں۔

"مجھے کیا پڑی ہے جھوٹ بولنے کی۔" بھرایا ہوا لہجہ۔

"دیکھو بیٹا! اب تم باقاعدگی سے آفس جانا شروع کرو۔ اپنی لک کو تھوڑا زیادہ ڈیسنٹ بناؤ۔ اتنے اچھے بن جاؤ کہ وہ تم سے رشتہ نہ جڑ سکنے پر پچھتائے۔ میں آج ہی علیشہ سے زیادہ اچھی لڑکی ڈھونڈنے کی مہم شروع کرتی ہوں۔" (کیا ماما کو نہیں پتا وہ بہترین ہے۔ ان کو اپنی پڑی ہے جبکہ میرے تمام جذبات و احساسات اور تصورات کو نکاح نامی گولی سے اڑا دیا ہے) اس کا دماغ خالی ہو گیا تھا' اس سے بڑھ کر اس کے دل میں کچھ نہیں بچا تھا۔

"میں پہلے ہی بہت اچھا ہوں ماما! اس سے زیادہ اچھا بننا میں افورڈ نہیں کر سکتا۔ کچھ لیجیے زیادہ اچھائی مجھے راس نہیں آتی۔ اپنی بھی اور دوسروں کی بھی۔" وہ باہر نکل گیا۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ انہیں ایک اچھی ماں بننا چاہیے تھا اس وقت ' لیکن وہ اچھی ساس بننے کی مشق کر رہی تھیں۔

"محبت حقیقت ہوتی ہے لیکن انہوں نے اسے مفروضہ بنا لیا تھا۔ اس مفروضے کو حقیقت ثابت کرنے کے لیے ان کے بیٹے نے کوئی ایسی ویسی حرکت کر لی تو..." آخر والی بات انہوں نے نہیں سوچی تھی۔

"پاپا آج ڈنر باہر کریں؟" ایک تو وہ اس سے بہت تنگ تھیں ہر روز نئی فرمائش' فریج سے سبزی نکالتے ہاتھ تھمے۔

"تمہارے پاپا اجازت نہیں دیں گے۔ چپ کر کے میرے ساتھ سبزی بناؤ۔"

"اوہ ماما! میں ابھی آئی۔" وہ جانتی تھی۔ پاپا مان جائیں گے۔ یہ ماما تھیں جنہیں گھر کا کھانا کھانے کی عادت تھی۔

جیسا کہ توقع تھی پاپا مان گئے تھے۔

دن کی آنکھ بند ہو رہی تھی جب وہ سب ڈنر کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ کھانے میں جی جان سے مشغول تھی جب وریشہ کی کہنی نے اس کا پاسا سینکا۔ وہ ان کہنیوں کی عادی تھی کہ جب بھی وہ لوگ کسی پبلک پلیس پر جاتیں تو وقتاً "فوقتاً" دوسری طرف متوجہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کے کہنیاں مارتیں یا پھر چٹکی کاٹتیں۔

"اب کیا دیکھ لیا؟" بھرے منہ سے کہا اور کہنے کے ساتھ پانی منہ سے لگا لیا۔ ابھی تو وہ لکیر کے فقیر پر تبصرہ کر کے بیٹھی تھیں کہ موٹی لکیر آگے تھی اور ننھا سا فقیر پیچھے۔

"ادھر دیکھو!" آنکھوں کے ڈیلوں اور بھنوؤں کی مدد سے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔

"منگیتر تمہارا اور ڈنر اڑا رہا ہے کسی اور کے ساتھ اپنی ہاں پر نظر ثانی کرو۔" وہ جو ابھی نگاہیں دوڑا رہی تھی۔ اس کی بات پر نظر خود بخود اس طرف اٹھتی چلی گئی۔ جہاں... جہاں... دفعتاً "وہ صدمے میں گھر گئی۔

ماما پاپا اور فاطمہ نے بھی اس کا انداز دیکھ کے اس طرف نگاہ کی۔ ان کی ٹیبل سے چند ٹیبلز دور بڑا سنجیدہ سا وہ بیٹھا تھا۔ ساتھ میں پھٹے پرانے اور پیوند لگے بند چغے میں ملبوس فقیر بیٹھا تھا۔ جس کے لمبے مڑے بال اور سرمئی داڑھی آپس میں مدغم ہو رہے تھے۔ صحت ایسی تھی کہ پھونک مارنے سے اڑ جائے (محاورتاً) "ناخن چبا رہا تھا' کھانا آیا تو صدیوں بھوکے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ وہ کھانا ہاتھ بھر بھر کے لے رہا تھا اور اسی حساب سے ضائع بھی کر رہا تھا۔

علی حیدر نے نگاہیں دوسری سمت موڑ دیں۔ یہ اسے دروازے کے آگے کھڑا ہوا ملا تھا' پھر وہ اس کی امید بن گیا اسے اچھا لگتا تھا کسی کی امید بن جانا۔ ان لوگوں کی طرف رخ پھر بھی نہیں کیا۔

"شاید دیکھ چکا ہو اور انجان بن رہا ہو۔" علیشہ نے سوچا۔

"فقیر سے دعا کرائی ہوگی کہ علیشہ اسے مل جائے۔" دریشہ کو سوچ سے زیادہ اندازے لگانے کی عادت تھی۔ آواز کان تک مشکل سے پہنچی تھی۔

"کیا واقعی میں۔ لگ تو ایسے ہی رہا ہے۔" وہ خوش ہوئی۔

"بلا ٹل جانے کی دعا بھی کرا سکتا ہے وہ۔" فاطمہ نے کہا۔

(وہ تو بہت آہستہ باتیں کر رہی تھیں' پاپا کی موجودگی کے باعث فاطمہ کو کیسے سنائی دیا؟)

"مجھے فخر ہے اس پر اور اس سے جڑے رشتے پر۔ انسان کا اندرون کیسا ہوگا' اس کا اندازہ اس کے رویے سے ہوتا ہے۔ اس کے سلوک سے جو وہ بوڑھوں' معذوروں اور حیثیت میں اپنے سے نیچے لوگوں کے ساتھ روا رکھتا ہے۔" پاپا خوشی سے چمکتی آنکھوں سے کہہ رہے تھے۔ وہ اسے جتا رہے تھے ان کا "منتخب" کتنا درست ہے وہ خوش تھی کہ وہ اس کے لیے "منتخب شدہ" تھا۔

❁ ❁ ❁

اس کی شوخ و چنچل ست رنگوں میں گھلی زندگی کو محبت نے واشنگ پاؤڈر کی طرح دھو دیا تھا۔ اس پر ایک رنگ حاوی تھا۔ اس رنگ نے اسے پوری طرح ڈھانپ لیا تھا اور وہ رنگ سنجیدگی کا رنگ تھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ وہ ابھی آفس سے لوٹا تھا۔ بھوک' بھوک کا شور مچانے کے بجائے خاموشی سے ڈاکومنٹری فلم لگا کے بیٹھ گیا۔ ثمینہ فیضان چند لمحے بے مقصد اس کے پاس کھڑی رہیں (بظاہر) وہ معقول حلیے میں رہنے لگا تھا اور بہت پیارا لگ رہا تھا۔ ان کا دل اس کی طرف کھنچ رہا تھا لیکن وہ کلام کرنے کے بجائے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ فیضان صاحب نے آکے یہ خاموشی توڑی تھی۔ اسے یوں مگن دیکھ کے وہ بولے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے ہمارے بیٹے کا نام سنجیدہ لوگوں کی لسٹ میں لکھ دیا گیا ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ دوبارہ اس کا نام مسکرانے والوں کی فہرست میں لکھ دے۔" محبت کے گاڑھے شیرے میں ڈوبا ہوا لہجہ تھا ماما کا۔

"آپ کو یقین ہے آپ کی دعا قبول ہوگی۔" علی حیدر نے ان کی طرف دیکھے بغیر پوچھا تھا۔ وہ کسی کی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ سامنے کی طرف دیوار میں کچھ کھوج رہا تھا۔ اور کھوجنے میں کامیاب بھی تھا۔

"ہاں! میں ماں ہوں نا!" ماں سے بولیں! زبان کی شیرینی ویسی کی ویسی۔

"دعا کریں نا میرے لیے اللہ میرا نام محبت پانے والوں کی فہرست میں لکھ دے۔"

"اللہ نے پہلے سے لکھا ہوا ہے۔" فوری جواب۔ یقین انتہا کا تھا۔ وہ زور سے ہنسا۔ ہنستے ہوئے کھڑا ہوا اور کوئی بات کیے بغیر وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

کیا ان کی "ہمیشہ مسکراتا رہے" والی دعا اتنی جلدی قبول ہوگئی ہے۔ اگر ہوگئی ہے تو کیا یہ ہر وقت یوں ہی دانت نکالتا رہا کرے گا۔ اف! انہوں نے آنکھیں بند کر کے اسے ہر وقت ہنستے ہوا دیکھا۔ ماما کو ڈیسنٹ اور سیریس لڑکے اچھے لگتے تھے جبکہ پاپا کو اس جیسے شوخ و شنگ' ماں کے تاثرات اسے مزہ دے گئے ہوپ! ویسے بھی اتنے دن "منہ بنا" کے رہنے کی وجہ سے اس کا منہ دکھنے لگا تھا۔ صبح کا تو واقعہ تھا یہ۔

جب ماما موبائل پر ماموں سے بات کر رہی تھیں۔ پرجوش ہونے کے باعث آواز بلند ہوگئی تھی وہ دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ جبکہ وہ کہہ رہی تھیں۔

"ہم نے علی حیدر کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ پندرہ دن بعد باقاعدہ منگنی کی تقریب ہوگی۔ اس کی پسند سے طے پایا ہے۔"

"ہرا جانو! میرا بھی یہی خیال تھا' جس طرح کی اس کی حرکتیں ہیں انکار ہو جانا ہے۔ مگر انہوں نے ہیڈ کا نکھرا ستھرا باطن دیکھا۔ لڑکی کی طرف سے خدشہ تھا کہ وہ انکار کر دے گی۔ مگر میں اس سے ملی اسے بتایا کہ علی حیدر تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ اسے یقین نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

آیا۔ لیکن اس نے ایک شرط رکھ دی کہ منگنی کی تقریب سے پہلے تک ہیڈ کو بتایا جائے کہ اس کا نکاح کر دیا گیا ہے۔ وہ اسے تنگ کرنا چاہتی تھی۔"

ہر روز اس کی غمگین اور معقول حلیے والی تصاویر اسے بھیجی ہیں اور اسے یقین دلایا ہے کہ میرے بچے کا ایسا حال صرف اس کی محبت میں ہوا ہے۔ میں نے حیدر کو ابھی تک یہ سب کچھ نہیں بتایا' شرط کے مطابق۔ منگنی والے دن سرپرائز دینے کا ارادہ ہے۔ اب اسے کسی اور لڑکی کے لیے راضی کرتی ہوں اور منگنی والے دن... کیا حالت ہو گی اس کی' واؤ۔!! وہ حرا سے پلان شیئر کر رہی تھیں اور علی حیدر خوشی سے پھٹنے والا ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا' مبادا خوشی سے اچھل پڑے اور ماما کے منصوبے ملبے تلے دب جائیں۔

"ایک ہی تو بیٹا ہے ان کا' وہ یہاں اپنے ارمان نہیں نکالیں گی تو کہاں نکالیں گی) اس نے اندھا بننے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک بات وہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ اندھا انہیں بہت ستانے والا ہے۔ یعنی ماما کو "وبھی" پتا تھا...

☼ ☼ ☼

قرمزی' نارنجی' زرد و سبز پتے اس پر برس رہے تھے۔ پتے سر پر ٹھہرتے' پھڑاڑتے ہوئے پاؤں میں آگر گرتے۔ بعد میں یہی پتے دائرے کی صورت چکرانے لگتے۔ وہ ان سب سے بے نیاز اپنے کیے ہوئے فیصلے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آسانیاں ہمارے فیصلوں کی محتاج ہوتی ہیں تو کیا اس نے آسانیاں اپنانے کا فیصلہ کیا تھا یا مشکلات کو دعوت دینے کا۔

کچھ لوگ ہوتے ہیں' جو دوسروں کے بارے میں ایک رائے قائم کرکے آرام سے بیٹھ جاتے ہیں۔ انہیں لوگوں کے بارے میں بس اتنا ہی تجسس ہوتا ہے خواہ وہ رائے انہیں کنویں میں گرا دے۔ اسے لوگوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کی حد تک تجسس نہیں تھا۔ بلکہ انہیں جاننے تک تھا اور جاننے کے بعد سمجھنے تک۔

"السلام علیکم!" کی آواز پر چونکی۔ مناسب فاصلہ رکھ کے وہ بینچ پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ اٹھ جاتی مگر اس کے الفاظ! وہ جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔ "جب ماما نے مجھے تمہارے نکاح کے بارے میں بتایا تو میرا دل چاہا کہ ابھی تمہاری کنپٹی پر ریوالور رکھ کر تمہیں تمہارے خالہ زاد کے پاس لے جاؤں اور اس سے کہوں کہ وہ تمہیں ابھی کے ابھی طلاق دے۔ شکوہ نہیں' پلیز۔ اپنی کنپٹی پہ کیوں رکھتا مجھ سے کیا سروکار تھا اسے" علیشہ کا منہ کھلا' جب بھی ملا تھا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ کیا شادی کے بعد وہ کھلے منہ سے پھرا کرے گی۔

آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر شرارتی رنگ لیے وہ سیدھ میں دیکھتے ہوئے باتیں بتا رہا تھا۔ جہاں تمام گرد و غبار دائرے کی صورت گھوم رہا تھا۔

"اس مقصد کے لیے میں اسی وقت تمہارے گھر گیا تھا۔ تم اور وریشہ تھیں' روم میں اور میری ملاقات ہو گئی فاطمہ سے۔ جو بہت اچھی رہی ہوا یوں کہ جب میں گیا تو وہ تمہاری کسی حرکت پر بھری بیٹھی تھی۔ میرا ذرا سا حال دریافت کرنا تھا کہ وہ پھٹ پڑی اور "اے" سے لے کر "زیڈ" تک مجھے تمہاری سازش بتا دی۔" علیشہ بھونچکی رہ گئی (ہائے) گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھا دی تھی۔ وہ گھر چلی جائے۔ بس پھر وہ چکر چلائے گی کہ اسے وائٹ ڈریس پہننا ہی پڑے گا۔ اور حامی کو اس کی ناپسندیدہ چیزوں کو پسندیدہ بتا کر خریدنے کا کہے گی۔ یہ کام تو وہ جاتے کے ساتھ ہی کرے گی۔

"میں نے بہت سی لڑکیوں کو تنگ کیا ہے (نظر نہ لگے' دو صفحات پر مبنی لسٹ ہے اس کے پاس) مگر جس طرح تم جھنجلاتی و تلملاتی ہو' تمہارا بیک وقت بزدل و بہادر ہونا' اس طرح کی کوئی بھی نہیں! کوئی بھی پھر تمہارے منہ کے ہمہ وقت بجے باؤٹ آہ! جو مجھے دیکھ کے بنتے تھے' مجھے تمہارا دیوانہ بنا گئے۔ بات سمجھ گئی ہونا' یا میں "آئی لو یو" کہوں۔" علیشہ جو اسے دیکھ رہی تھی۔ (یاد رکھیں منہ...) آخری بات پر سٹپٹائی۔ ہوا نے اپنا رخ بدلا اور تمام پتے علیشہ کے گرد گھومنے لگے۔ بعد میں علی حیدر نے ان کی جگہ لے لی۔ محبت

عالم وجد میں الہام کی طرح دونوں کے دلوں پہ اتری۔ دل سادہ تھے۔ محبت کو اپنے لیے یہ مسکن پسند آئے اور اس نے ہمیشہ وہاں رہنے کا ارادہ باندھ لیا۔ (یہ زیادہ نہیں بولنے لگا' خیر شادی ہو جائے پھر وہ اس کی زبان تالو سے چپکا دے گی۔ ایک (ہاں کیا کہہ دی' یہ تو زیادہ ہی "فری" ہو رہا ہے۔)

"دراصل میں اپنے سارے کام خود کرتا ہوں' ہاں تو' یہ سوال تم سے میری ماما نے بھی پوچھا ہو گا۔ لیکن میں خود پوچھنا چاہوں گا۔"

"دل یو میری می ؟" آنکھوں میں دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ گفتگو کا انداز عام تھا۔ مگر آنکھیں کھوج لگانا جانتی تھیں۔

علیشہ کی اندر والی باتیں شروع ہو گئی تھیں۔ کیا اسے چبھتا ہوا جواب دینا چاہیے "رشتہ لینے بھی خود آجاتے" یا ایک مشکل کام کرنا چاہیے۔ اس نے ایک مشکل ترین کام کرنے کی ٹھانی۔ مطلب زبان پر پتھر رکھ لیا۔

علیشہ آنکھیں چرا کر دوسری سمت دیکھنے لگی۔

خلاف توقع خاموشی تھی۔ وہ حیران ہوا۔

(خیر سے "دو طرفہ تماشا ہے" "مغرب پر مشرق حاوی ہو ہی جاتا ہے") وہ سوچ کے گلستان ہوا۔ مشرق و مغرب اکھٹے ہوں تو علی حیدر بنتا ہے اور علی حیدر جیسی علیشہ ڈی ڈی علیشہ!

وہ چلنے لگی تھی۔ بس بہت ہوا۔

"ایک منٹ!" اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔

"میں تمہارے لیے گفٹ لے کر آیا ہوں۔" علیشہ کے ذہن میں پرانی یاد لہرائی اور لہرا لہرا کر خبردار کرنے لگی۔

"دیکھو انکار نہیں پلیز۔ مجھے خوشی ہو گی کہ تم نے مجھ پر اعتبار کیا۔" اس نے اپنی آڑ میں رکھا ہوا گفٹ اٹھایا اور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بڑا سا پیکٹ تھا۔

"گھر جا کے کھولنا۔ اوکے!" علیشہ نے پکڑ لیا۔ (بے چارے کو اتنا تنگ بھی تو کیا ہے اب کچھ خوشی بھی دے دینی چاہیے۔) وہ تو پیکٹ پکڑا کر آگے بڑھ گیا۔ مگر علیشہ دوبارہ سے بینچ پر بیٹھ گئی۔ اس کے نظر سے اوجھل ہوتے ہی اس نے اسے کھولا۔ ڈرتے ڈرتے احتیاط سے پچھلا واقعہ خطرے کے نشان کی طرح جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ حالانکہ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس دفعہ اس میں کچھ اچھا ہی ہے۔ پیکٹ کھل گیا تھا اس میں ایک خوب صورت ترین ٹیڈی بیئر تھا۔ اس نے اسے ہاتھوں میں تھاما اور اس نرم نرم سے بھالو کو اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیا۔ اس کے بعد ایک بے ساختہ چیخ تھی اور وہ ٹیڈی بیئر اس سے پانچ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ (چھٹی حس یقیناً ایکسپائر ہو گئی ہے علیشہ کی) اتنی وولٹیج کا کرنٹ تھا اس میں کہ وہ پوری کی پوری کانپ گئی۔ حواس درست کرنے میں آدھا گھنٹہ تو لگتا مگر اسے تو یہ ٹائم بھی نہ ملا۔ وہ دوسری دفعہ اچھلی۔

"ہاہاہا!" یہ آواز اس کے مزاج آشنا کی تھی۔ کاش! وہ ایک زبردست سا مکا اس کے جبڑے پر مار سکتی۔ اس کے تو بال بھی اس کی پہنچ سے دور تھے۔ کیونکہ وہ پہلے ہی انہیں کھڑے کر کے آیا تھا۔ (علیشہ کا قد زیادہ بڑا نہیں ہے نا اور علی حیدر کا قد زیادہ چھوٹا نہیں)

"میں تم سے شادی کروں گی تو صرف تمہیں سبق سکھانے کے لیے۔" اس نے آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پایا۔ اور بہت زیادہ بہادر بن کے چلائی۔

"میں سارے سبق سیکھنا چاہتا ہوں اسی لیے تو تمہارا انتخاب کیا ہے۔" اس کی حالت کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ (جس طرح کی کتاب وہ لکھنا چاہتا ہے وہ کسی پاکستانی لڑکی کے ساتھ رہنے سے ہی مکمل ہو سکتی ہے۔)

وہ مسکرایا اور یہ مسکراہٹ چہار اطراف میں پھیل گئی۔ علیشہ کو معلوم تک نہ تھا کہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ ہے۔ شاید اپنے پھر سے بے وقوف بن جانے پر یا اس کے مزاج آشنا ہونے پر۔

گہر کے پھیلائے سرمئی اندھیروں کے سبب سڑک پر ٹریفک معمول سے کم تھا۔ ہر گزرنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشنی اگلتی ہارن بجاتی اپنے رستے بنا رہی تھی۔ اسی معمولی ٹریفک میں اس کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس یک دم بند ہوئیں۔ ٹائر چرچرائے۔ گاڑی رکی۔ وہ دروازہ کھول باہر نکل آیا تھا۔ رائل بلیو ڈریس سوٹ' سفید کالر شرٹ' انہی رنگوں کی ہم مزاج اسٹرپ والی ٹائی اور ٹائی پر لگی قیمتی نگوں کی پین' کف لنکس' مہنگے فریم کی عینک اس کی کھلی رنگت پر بہت اٹھ رہی تھی۔ ترچھی مانگ نکال کر بالوں کو پیچھے جما رکھا تھا۔ ایک بھرپور شخصیت' اگر کوئی ایک نظر اٹھا کر دیکھے تو دوسری نگاہ ڈالنے کی خواہش خود بخود دل میں جگہ بنانے لگتی۔ سب کچھ مکمل تھا اور اگر اس سب میں کچھ نہیں تھا تو وہ اس کا اپنا آپ۔

بے پناہ تالیوں کا شور' ستائشی نگاہیں' تعریفی جملوں کی گونج ابھی تک اس کے کانوں کے پردے لرزا رہی تھی۔ "ڈاکٹر حماس حیدر" اس کا نام ایوارڈ کے لیے پکارا گیا۔ کچھ جونیئرز فرط محبت میں تالیاں بجاتے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنے کوٹ کا بٹن بند کیا۔ ایک دو سینئرز سے جھک کر مصافحہ کرکے اور کھڑے جونیئرز کا ہاتھ اٹھا کر شکریہ کرتے تیزی سے اسٹیج پر چڑھا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے کے بجائے سرد اور سپاٹ سا تھا۔ بنا کسی تاثر کے۔ اس نے مصافحہ کرتے ایوارڈ شیلڈ پکڑتے شکریہ ادا کیا اور تیزی سے مڑنے لگا تھا۔ جب کمپیئر نے اسے روسٹرم پر آنے کی دعوت دی۔

"ڈاکٹر حماس حیدر! آپ کچھ کہیں گے نہیں' میرا مطلب ہے کوئی پیغام ینگ جنریشن کے لیے۔" ہال میں بیٹھے تمام نوجوان کی آنکھیں یک لخت جگر جگر کرنے لگی تھیں۔ اس نے لمحہ بھر سوچا پھر اثبات میں سر خم کرتا قدم قدم روسٹرم کی جانب بڑھا۔ مائیک درست کرتے ہوئے کہنیاں روسٹرم پر اعتماد سے جمائی تھیں۔ نچلے لب پر زبان پھیر کر اپنی گمبھیر آواز میں سلام کے بعد کہا تھا۔

"میں اتنا ہی کہوں گا کہ زندگی اور قسمت ایک دوسرے کے ساتھ سفر کرتے ہیں' کہیں زندگی دھوکا دیتی ہے' کہیں قسمت' دیکھنا یہ ہے آپ کیا کرتے ہیں؟" اس نے پل بھر ٹھہر کر سانس لیا۔ "میرا مشورہ ہے' اپنی زندگی' قسمت کو جینے مت دیں بلکہ زندگی کو کہیں کہ وہ قسمت کو جیے۔۔۔ شکریہ۔"

کھچا کھچ بھرے ہال میں مجال ہے کہ کسی کو ایک حرف بھی سمجھ میں آیا ہو۔ وہاں۔۔۔ مختلف شعبوں کے سائنس دان بیٹھے تھے۔ پلازمہ سے کھیلنا' کمپاؤنڈ بنانا' نتیجہ اخذ کرنا سب مشکل ترین کام آتے تھے۔ ارشمیدس کی تھیوری پڑھنے والے اس اٹامک انرجی کے بہترین سائنس دان کے پاگلوں والے فلسفے کو کیا سمجھ پاتے۔ سب کے چہرے بے تاثر مسکرائے تھے ایسے جیسے سمجھنے کی کوشش کی ہو مگر ماتھے پر چسپاں تھا' کچھ سمجھ نہیں آئی۔

"پاگل' پتا نہیں کیا کہہ گیا ہے۔ زندگی' قسمت' دھوکا۔۔۔ ہونہہ گدھا۔۔۔ بھلا یہ بتاتا کیسے تجربہ اتنا کامیاب گیا' کس کی تھیوری پڑھتا رہا ہے' مگر کیوں اپنے راز دے بھئی' ورنہ ہم بھی گولڈ میڈلسٹ نہ بن جائیں اس کی طرح۔"

وہاں بیٹھے اکثر نوجوانوں نے ایسا ہی کچھ سوچا تھا۔

اسی ہال کی آخری نشستوں پر ایک شخصیت ایسی بھی تھی جس نے حرف حرف سنا تھا' سمجھا تھا اور بھوری آنکھوں میں حرف کانچ بن کر چبھے بھی تھے۔ اس نے چھوٹی سی ناک کی نادیدہ نمی "سوں" کر کے چڑھائی' گود میں رکھا سفید کوٹ اور اپنا پرس اٹھایا۔ آڈیٹوریم کی سیڑھیوں پر چڑھتی پچھلے دروازے کی جانب بڑھی۔ گارڈ نے فوراً" روک لیا تھا۔ ملک کے انتہائی قابل سائنس دان اکٹھے تھے اور ایک مہمان دوران تقریب یوں اٹھ کر جائے' فکر تو بنتی ہے۔ وہ کسی معمولی گھر سے نہیں آئی تھی۔ بلکہ اسی ہال میں موجود مہمان خصوصی کی مہمان تھی۔ گارڈ نے اس کا کارڈ دیکھا' ادب سے سر جھکا کر ہاتھ سے دروازے کی جانب اشارہ کیا خود کار دروازے کا قفل قدم آگے بڑھاتے ہی کھل گیا۔

اب وہ آڈیٹوریم کے خارجی دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ ہر منظر یخ بستہ دھند میں لپٹا نم آلود تھا۔ اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ فضا میں دھند زیادہ ہے یا اس کی نگاہوں میں' وہ گم صم تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ واقعی حیرت سے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین پر MCAT (میڈیکل کالج ایڈمیشن ٹیسٹ) کی لسٹ موجود تھی۔

"اتنی جلدی!" اس نے تحیر سے سوچا۔ صرف چار گھنٹے بعد ہی فہرست لگا دی گئی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اپنی کاربن کاپی سے اپنا رزلٹ چیک کیا تھا۔

"ہررے۔۔۔!" مارے خوشی کے چہرہ کھل گیا تھا۔

"ڈاکٹر بسامہ۔" اسے اپنے منہ سے اپنا نام پکارنا بے حد اچھا لگا تھا۔ کتنی خواہش تھی اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لفظ لگانے کی اور اب وہ وقت قریب تھا جب ڈاکٹر اس کے نام کا حصہ بننے جا رہا تھا۔ اسے انٹری ٹیسٹ میں اپنے اتنے ہی نمبروں کی امید تھی۔ اس نے فوراً" حماس کو ٹیکسٹ کیا تھا۔

"کی آگئی ہے۔"

"ہاں پتا چلا ہے' بٹ نیٹ بزی۔" اس نے جواباً" لکھا۔

"مجھے پتا چل گئے۔"

"کتنے؟" دونوں تیز تیز ٹائپ کر رہے تھے۔

"921/1100۔" بسامہ نے ٹائپ کیا۔

"اوہو' مبارکاں۔"

"تھینکس۔" حماس کے مبارک دینے پر اس نے شکریہ کہا ساتھ ہی ایک اور میسج آگیا۔

"اگریگیٹ؟؟؟؟"

"873409"

"گڈ۔۔۔"

فتح کے نشان کے مسکراتے کارٹون کے ساتھ رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ غالباً" حماس کی لسٹ کھل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

حماس نے پورا ہفتہ کسی کا فون اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا۔ حماس حیدر جو بہت بچپن سے اپنے ہر کاپی رجسٹر کتاب پر یہاں تک کہ اگر کہیں بھی نام لکھنا پڑ جاتا تو وہ ڈاکٹر حماس حیدر لکھتا۔ اور دوسرا ہنس پڑتا گال پر تھپکی دیتے یہی کہتا۔ "ارے، پیدائشی ڈاکٹر" اور اب یہ کیا ہو گیا اس کے ساتھ؟؟

بسامہ کی ہمت نہ ہوئی کہ کس طرح اس کی ہمت بندھائے۔ عجیب دوراہا تھا۔ اپنی کامیابی بھی بے حد پھیکی، بے جان لگ رہی تھی۔ وہ اکٹھے پڑھنے کے خواب، مسیحائی کا دعویٰ۔ دکھی انسانیت کی خدمت، خیراتی اسپتال سب کرچی کرچی ہو گیا تھا۔

"اف خدایا، اب کیا ہو گا؟ حماس کیا کرے گا، میڈیکل اس کا خواب ہے، وہ تو کہتا ہے، وہ اس کے بنا مر جائے گا اور۔۔۔ اور میں اللہ!" بہت تکلیف سے اس کی سانسوں سے نکلا۔ "میں اس کے بغیر" اس کی سانس رکی، وہ جھٹکے سے اٹھی۔

دوپٹا جلدی سے سر پر جمایا۔

"پلیز، پلیز، پیارے اللہ جی حماس کے لیے کوئی راستہ، کوئی صورت، کوئی طریقہ نکال دیں، اس کا داخلہ ہو جائے، وہ ڈاکٹر بن جائے۔"

ابھی ایف ایس سی کا رزلٹ آنا تھا اور پھر وہ دن بھی آ گیا۔ جب ٹی وی اسکرین پر تمام بورڈز کی جانب سے فائنل رزلٹ کی پٹی نشر ہو رہی تھی۔

"لاہور بورڈ۔۔۔ اول پوزیشن حماس حیدر 1100/1062۔۔۔"

یہ کوئی ان ہونی خبر نہیں تھی اس کے تمام اساتذہ، دوست، کالج فیلوز کو پتا تھا۔ ظاہر ہے وہ فرسٹ ایئر میں امتیازی نمبروں پر تھا۔ یہ تو ہونا تھا مگر رزلٹ کی تقریب کے دعوتی خط پر جو کچھ اس کے گھر پر ہوا تھا، وہ کسی کو نہیں پتا تھا۔ خط دیکھتے ہی وہ کسی ہسٹریائی کیفیت میں چیخا تھا۔ خط کے پرزے پرزے کر کے فضا میں بکھیر دیے۔

"وہ نہیں، نہیں چاہیے مجھے کوئی پوزیشن، نہیں چاہئیں مجھے ان کے میڈلز، آگ لگا دوں گا میں ہر چیز کو۔"

"حماس، حماس۔۔۔ میری جان کیا ہو گیا۔ پاگل ہو گیا ہے تو، کیوں ایسے کر رہا ہے۔" زینت کھانا بنا رہی تھیں، سب کچھ چھوڑ کچن سے بھاگتی نکلی تھیں۔ بیٹے کی یہ کیفیت ان کا دل دہلا رہی تھی۔

"ہاں، ہاں پاگل ہو گیا ہوں، آپ کا بیٹا پاگل ہو گیا ہے امی۔۔۔" وہ اپنے بال نوچتے ہوئے دھاڑا تھا۔

"یہ تو کیا کر رہا ہے حماس، تجھے پتا بھی ہے، تو بارہویں میں بہت زیادہ نمبروں سے پاس ہوا ہے، تجھے سونے کا تمغہ ملے گا۔۔۔ وظیفہ ملے گا۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں ملے گا، میرا مذاق اڑانے کے لیے یہ سب کچھ مجھے دیں گے۔" اس کے لہجے نے کاٹ دار کروٹ بدلی۔

"امی تمہارا وہ بیٹا جو نرسری سے اول آ رہا ہے، جسے ہر بورڈ نے تمغہ دیا اور اب سونے کا تمغہ اس لیے ملے گا کہ وہ ایف ایس سی پری میڈیکل میں ٹاپ کر گیا اور اس ٹاپر کو انٹری ٹیسٹ میں یو ایچ ایس۔" اس نے انتہائی کرب اور تکلیف سے دانت جما کر کہا۔ "نے فیل کر دیا ہے، ٹوٹلی فیل، میری آنکھوں سے خواب نوچ لیے ہیں امی۔۔۔ میرے خواب۔" وہ پھر سے چلانے لگا تھا۔

"میں اب ڈاکٹر نہیں بن سکتا امی۔" وہ چلا رہا تھا اور بسامہ چھوٹے سے بوسیدہ لکڑی کے دروازے کے بیچ سینے پر ہاتھ لپیٹے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی اس حالت پر اس کے اندر جو بھی شکست و ریخت ہو رہی تھی مگر اس کے سامنے وہ حوصلے سے آگے آئی اور جم کر بولی۔

"تم سے کس نے کہا حماس، تم بیکار ہو گئے ہو، میڈیکل زندگی کا آخری کنارہ نہیں ہے۔" اس نے سرعت سے نگاہ اٹھائی تھی اور صرف ایک جملہ کہا۔

"تم کہہ سکتی ہو۔۔۔" بسامہ کا اندر تک جھلس گیا۔۔۔ مگر وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا۔ "تم نے مجھے بیٹ کر ہی دیا،

مبارک ہو ڈاکٹر بسامہ۔" شاید تیر کا نشتر اتنا گہرا نہ ہوجتنا اس وقت اس کا انداز لگا تھا۔

اس نے تو کبھی خیال میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ میرا ایڈمیشن ہو جائے اور حماس رہ جائے۔ اس کے لہجے کی تختی سے قطع نظر وہ مسکرائی۔

"بیوقوف لڑکے! میرا تو ایگریگیٹ بنتا ہے' زیادہ سے زیادہ کہاں ایڈمیشن ہو گا' نشتر ملتان یا پھر پی ایم سی (پنجاب میڈیکل کالج فیصل آباد) میں۔۔۔ اور تم' تم کے ای (کنگ ایڈورڈ لاہور) کا میرٹ بنا سکتے ہو' بلکہ بناؤ گے" حماس نے ہونہہ میں گردن جھٹکی مگر وہ اپنی بات پوری کر رہی تھی "اور تم یہ بھی جانتے ہو اسی فیصد ریپیٹر کامیاب ہوتے ہیں' تم ریپیٹ کرو گے۔" وہ مدمقابل اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ٹھوس لہجے میں بولی تھی۔ حماس کی سیاہ آنکھوں میں یک لخت بہت سا پانی بھر آیا۔

"ہاں ہاں بیٹا تم کامیاب ہو جاؤ گے۔" ڈاکٹر عندلیب شہر کی مشہور اسکن اسپیشلسٹ' بسامہ کی والدہ آگے بڑھیں اور اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

"ہو جاتا ہے' کبھی کبھی غلط بھی ہو جاتا ہے' بٹ ٹرائی اگین۔" ڈاکٹر عندلیب کو بسامہ ضد کر کے اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ حماس ایم سی اے ٹی کی ناکامی پر جتنا بھی افسردہ اور گم صم تھا مگر ایف ایس سی کی شان دار کامیابی آج اس پر بھر بھر تھال انگارے پھینک رہی ہو گی۔ ایف ایس سی میں ایسا میڈل ملنے کا کیا فائدہ جب اس سے ٹیسٹ میں یہ کہہ دیا جائے۔

"یو آر ٹوٹلی فیل -تم ڈاکٹر نہیں بن سکتے' میرٹ پر نہیں۔۔۔"

"آہ! پری میڈیکل کا ٹاپر' ڈاکٹر نہیں بن سکتا' کتنی مضحکہ خیز خبر ہے' ہیں ناں۔۔۔"

☆ ☆ ☆
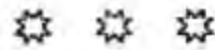
ناشتے کی میز بجی تھی۔ ڈاکٹر سبطین حسین جنرل فزیشن اخبار کی خبروں پر نظریں دوڑاتے گھونٹ گھونٹ چائے پی رہے تھے۔ ایک چوڑی پٹی کی خبر تھی۔

"بورڈ نے میٹرک کے سالانہ امتحانات کے نتائج کا اعلان کر دیا ہے۔"

بچوں کی تصاویر کے ساتھ ان کی رول نمبر اور حاصل کردہ نمبر درج تھے۔ سبطین نے ایک خفا خفا سی نگاہ سامنے بیٹھی مزے سے سلائس پر جیم لگا کر کھاتی بسامہ پر ڈالی۔ ان کی بے حد خواہش تھی کہ کبھی بسامہ بھی بورڈ میں ٹاپ کرے۔ مگر خیر۔ وہ صفحہ پلٹنے ہی والے تھے کہ ان کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے ان کے باورچی نیاز محمد نے صفحہ دیکھا اور نگاہ ایک تصویر پر رک گئی۔ وہ بہت فخر سے آگے بڑھا۔

"صاب جی' یہ ہمارے محلے کا لڑکا ہے۔"

"ہوں۔۔۔" ڈاکٹر سبطین چونکے پھر اس بچے کی اول پوزیشن دیکھ کر اچٹتی نگاہ نیاز محمد پر ڈالی۔ بے ساختہ بولے۔

"ٹیلنٹ ہمیشہ ایسے علاقوں میں ہی جنم لیتا ہے۔" چائے قدرے تلخ لگی تھی پھر وہی خواہش کاش بسامہ بھی۔۔۔!

"ہاں جی۔" نیاز محمد کی آواز میں سارا غرور آ گیا۔

"بڑا ہی پیارا بچہ ہے' ہر وقت کتابیں اور وہ۔ کبھی گلی میں کھیلتے' فضول پھرتے نہیں دیکھا' چھوٹے بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتا ہے۔۔۔ صاب جی! اس نے پانچویں میں بھی بڑے نمبر لیے تھے' وظیفہ ملا تھا پھر آٹھویں میں تو وظیفے کے ساتھ کسی افسر نے تمغہ بھی دیا تھا' اب تو پتا نہیں کیا کیا ملے گا۔" اس کے آخری جملے پر ڈاکٹر سبطین زور سے ہنس دیے۔ کپ کو پرچ میں رکھتے ہلکا سا سر دھنا۔

"ارے شہر میں نہیں' پورے ڈویژن میں' بورڈ ٹاپر ہے۔ تم بھی اپنے بچوں سے کہا کرو کہ پڑھا کریں آگے بڑھنا ہے تو تعلیم دو انہیں۔"

"ہائے جی میں تو ان کمینوں کو روز کہتا ہوں' کان سے پکڑ پکڑ اسکول چھوڑ کر آتا ہوں پر نا جی۔۔۔ بہت ہی بے غیرت ہیں۔" وہ خالی برتن سمیٹتے ہوئے کسی روبوٹ کی طرح شروع ہو گیا تھا۔

"کتنی مثالیں دیتا ہوں حماس کی ہر مجال ہے کہ جوں رینگ جائے سالوں کے۔"

اس کے گالی دینے پر ڈاکٹر نے گھر کا۔ اسے بریک لگی اور بسامہ اس کے بریک لگنے کا انتظار کر رہی تھی۔ جب سے اس نے لسٹ میں ٹاپرز کے نام اور نمبرز دیکھے تھے اس کے اندر کھلبلی مچی تھی۔

"کن جینئس کی اولاد ہے یہ کیسے اتنے نمبرز آ گئے محنت تو میں نے بھی کی تھی۔ صرف بیس نمبر ہی اس سے کم ہیں اور وہ ٹاپر۔"

اور اب نیاز بابا کے منہ سے اس کا نام سن کر وہ فوراً بولی۔

"نیاز بابا! حماس حیدر آپ کے محلے کا ہے؟ کیا واقعی؟" اسے شدید حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں جی۔" وہ برتن چھوڑ کر فخر سے ایسے بولا جیسے وہی حماس حیدر ہو۔ حالانکہ وہ کتنا شدید حسد کرتا تھا اس سے جب بھی اس کا کوئی رزلٹ آتا تو اپنے بچوں کی خوب دھلائی کرتا۔

"وہ بھی تو تمہارے جیسا ہے بدبختو دیکھو کتنے نمبر لیے اس کا تو کمانے والا باپ بھی نہیں خود کماتا ہے ایک تم ہو کھاؤ کے برابر۔" اور نیاز محمد کی بیوی دل ہی دل میں اسے بددعائیں دیتی۔

"پتا نہیں منحوس کب تک نمبر لے لے کر میرے بچے پٹواتا رہے گا کتابی سنڈا۔" لیکن اس وقت اس کا پڑوسی ہونے کے سبب وہ پورے فخر سے گردن اکڑائے کھڑا تھا۔

"بی بی اسے تو بڑے بڑے کالجوں سے دعوت آ رہی ہے مفت پڑھانے کی نویں میں بھی نمبر اچھے تھے ناں۔"

"اچھا بہت ہو گیا حماس نامہ۔" ڈاکٹر سبطین نے اخبار لپیٹتے ہوئے موضوع بھی لپیٹا۔ ڈاکٹر عندلیب اپنا بیگ اور چیزیں اٹھا کر کمرے سے باہر آ گئی تھیں۔

"ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ اسپتال پہنچنا ہے۔" انہوں نے اپنی چابیاں موبائل اور ایک دو کتابیں اٹھاتے ایک بار پھر بسامہ کو دیکھا تھا۔

"آج تمہارے لیے فارم لے آؤں گا۔ پنجاب کالج ٹھیک ہے نا؟"

"جی۔۔۔ جی۔" وہ خوشی سے بولی۔ "ان کا رزلٹ سب سے بیسٹ ہے۔"

"اور میرا خیال ہے تم اس بیسٹ کا حصہ بننا چاہو گی۔" ڈاکٹر عندلیب نے مسکرا کر اسے دیکھا تو ڈاکٹر سبطین نے ٹکا کر چوٹ کی۔

"نہیں نہیں بیگم۔۔۔ یہ بیسٹ ویسٹ ہماری شہزادی کے بس کا روگ نہیں۔"

وہ غرا کر بولی تھی۔ "ایسے ہی نہیں، آپ دیکھنا تو سہی۔"

☼ ☼ ☼
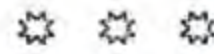
کالج کے دن بہت ہی شاندار تھے۔ پڑھائی زوروں پر تھی۔ گرلز کیمپس میں بسامہ سبطین سب سے آگے تھی۔ خاصی مشہور، ایک وجہ والدین مشہور ڈاکٹرز اور دوسری وجہ ذہانت۔

"بھئی یہ تو جینز میں ملتی ہے۔" اکثر کی یہی رائے تھی۔ البتہ بوائے کیمپس میں حماس حیدر بہت اونچا جا رہا تھا۔ فرسٹ ایئر کے سینڈ اپس (پیپرز) کا رزلٹ نوٹس بورڈ پر لگا دیا گیا تھا۔ بہت سی بچیاں اپنے نمبر دیکھ دیکھ کر گزر رہی تھیں وہ اور اعیزہ اپنے نمبروں پر تبصرہ کرنے لگیں۔

"یار تم تو کہہ رہی تھیں پیپرز اچھے نہیں ہوئے، تمہارے مارکس تو سب سے ہائی ہیں۔ تم واقعی بہت محنت کرتی ہو۔" اعیزہ نے اوپر اوپر سے مرعوب ہوتے ہوئے بسامہ کو سراہا اور دل اندر سے چٹکیاں بھر رہا تھا۔

"کمینی کے نمبر اس بار بھی مجھ سے زیادہ آگئے۔ پیپروں میں بیمار بھی نہیں پڑتی۔"

"کہاں یار۔۔۔" وہ کسر نفسی سے بولی تھی۔ "مجھے تو کتاب کھولتے ہی نیند آجاتی ہے' پاپا مما ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں مگر پڑھا ہی نہیں جاتا۔"

"ہونہہ، نمبر ایسے ہی آجاتے ہیں۔" اعیزہ نے دل میں کوسا۔

"ہم لڑکیاں مر جائیں گی مگر اپنی کامیابی کے گر کسی کو بتا دیں، ہو ہی نہیں سکتا' یہ لڑکے ہی ہوتے ہیں' شوخے۔۔۔ تھوڑا پڑھ کر زیادہ گاتا' ایک سوال صحیح ہو گا بتائیں گے۔" "یار سارے ہی زبردست ہوئے ہیں' بے فکر رہ میرے نمبر کہیں نہیں جاتے' اور آخر میں چاہے فیل ہی ہو۔ خیر۔" بسامہ مسکراتے ہوئے دوسرے بورڈ کی جانب بڑھی تھی۔

"آؤ اعیزہ لڑکوں کا تو چیک کریں' کتنے ہانسٹ ہیں۔" لڑکوں کی فہرست دیکھتے ہوئے پہلا نمبر ہی چونکا گیا۔ 550/525 بسامہ کو دھچکا سا لگا البتہ اعیزہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ مصنوعی افسوس لہجے میں سموتے کہا تھا۔

"اوہو، تم سے دس نمبر زیادہ۔" دل میں بے حد خوشی ہو' چلو اگر یہ مجھ سے آگے ہے تو اس سے آگے بھی تو کوئی ہے ناں (وہی خواتین کی مخصوص جلن)

"بسامہ یار! یہ وہی لڑکا تو نہیں، جو میٹرک کا ٹاپر تھا۔ یہی نام نہیں تھا اس کا حماس حیدر۔" وہ بھی نام کو خوب گہری نگاہ سے گھور رہی تھی۔

"ہوں۔ مجھے بھی لگ رہا ہے۔" پھر کچھ نمبروں کے صدمے سے نکلی کہ یہ کون سا بورڈ یا فائنل رزلٹ ہے۔ کندھے اچکا کر اعصاب نارمل کیے پھر پوری کی پوری اعیزہ کی جانب گھومی۔

"اور تمہیں پتا ہے یہ ہمارے کک کا محلے دار ہے۔"

"ہیں۔۔۔" اس کے لمبے سے "ہیں" میں حیرت ہی حیرت تھی۔

"ایسے کیسے ہو سکتا ہے' ایک کک کا محلے دار' موچی' ڈرائیور یا گارڈ کا بیٹا ہی ہو گا اور وہ شہر کا مہنگا ترین کالج کیسے افورڈ کر سکتا ہے بھئی۔ یار جانتی بھی ہو' ون لیک (ایک لاکھ) کے قریب فیس ہے سالانہ۔"

"بیوقوف۔۔۔" بسامہ نے اس کے ایک جڑا۔

"وہ ٹاپر تھا' سپر سٹس پر آیا ہو گا' فری اسکالر۔۔۔ اور میں نے تو سنا ہے۔ اپنے کالج نے سپر سیٹرز کو بائیک

بھی دی ہیں۔"

"اچھا۔!" اعزہ مرعوب ہوتے ہوئے سر دھننے لگی۔

☆ ☆ ☆

کالج میں فرسٹ ایئر کی فائنل تیاری زوروں پر تھی۔ روزانہ ٹیسٹ، بہت سے بچوں نے اضافی کوچنگ سنٹرز، اکیڈمیز جوائن کی تھیں۔ ڈاکٹر سبطین نے بھی بسامہ کو شہر کی بہترین اکیڈمی Kips میں ٹیسٹ دینے کا مشورہ دیا تھا، اور وہ اسے وہیں ملا تھا۔ لڑکوں کی رو میں پہلی نشست پر بیٹھا، بے حد سنجیدہ صاف ستھری رنگت پر نئی آنے والی مونچھوں داڑھی کا عکس۔ نچلا ہونٹ درمیان سے مسلسل چباتے، وائٹ بورڈ پر گہری نگاہیں جمائے۔ میم لیکچر کے دوران اس سے بار بار وضاحت پوچھتی رہیں۔ وہ بہت عمدگی سے چند لفظوں میں بتاتا رہا۔ جب میم نے اس کا نام پکارا۔

"حماس حیدر آئیں اس کا ریڈ میں شو کریں۔"

اس نے ترچھی نگاہ سے اسے اٹھتے دیکھا۔ سادہ سی بلیک جینز پر عام سی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بہت مطمئن انداز میں کرسی سے ٹیک لگائے، وائٹ بورڈ دیکھنے میں محو تھا۔ ذہانت، روشن دماغی چہرے سے عیاں تھی۔ میم کی بات سنتے ہی اعتماد سے اٹھا۔ بورڈ پر لکھے فزکس کے سوال کو ایک بار غور سے پڑھا اور چند لکیریں کھینچ کر ڈائیگرام مکمل کی۔ اصل فیگر نکال دیا۔

"گڈ۔۔۔ Kips کو آپ پر فخر ہے، ہم چاہتے ہیں آپ ٹاپ کریں۔" اس کی پر اعتماد مسکان میں یقین تھا۔ اب میم باقی بچوں سے کہہ رہی تھیں۔

"بلکہ ہم تو سب ہی بچوں سے چاہتے ہیں ہنڈرڈ پرسنٹ رزلٹ لائیں، بہت محنت کرتے ہیں۔ ہم آپ پر۔" سب نے خوشی میں سر ہلایا تھا اور بسامہ بال پوائنٹ کا سرا منہ میں بجاتی اسے حسرت و حسد کی ملی جلی کیفیت سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے حماس حیدر کو کئی دن نوٹ کیا تھا۔ لیا دیا انداز، اپنے کام پر توجہ، اساتذہ میں مقبول اور ذرا بھی غرور نہیں۔ آج کلاس کے اختتام پر وہ اکیڈمی کے کوریڈور میں اس سے ملی تھی۔

"ایکسوزمی! وہ رکا، مڑا اور دیکھا۔

"جی!"

"السلام علیکم، آئی ایم بسامہ۔" بسامہ نے اپنا نرم و نازک ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ اس کی گہری نگاہ اس کے چکنے چہرے سے پھسلتی اس کے ہاتھ تک گئی۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنی جیبوں میں اڑستے کہا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ میں گرلز سے ہاتھ نہیں ملاتا۔"

"اوہو۔۔۔" اسے کسی قدر سبکی کا احساس ہوا۔ نچلے ہونٹ کو کچلتے دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹ لیے اور مستحکم لہجے میں بولی۔

"میں فائنل میں آپ کو بیٹ کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔۔۔" غیر ارادی نکلنے والے جملے پر وہ قدرے حیران تھی، شاید یہ سبکی کا اثر تھا۔ جواباً" اس نے مدھم سا مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"میں آپ کو ویلکم کرتا ہوں۔"

حیرت سے اس کی ترچھی گئی۔ بھنویں سمٹیں۔

"اچھا۔۔۔ غصہ نہیں آیا۔۔۔ آئی مین جیلسی وغیرہ۔"

"نہیں۔۔۔" وہ اسی بے نیازی سے بولا تھا۔ "آئی ہیو کانفیڈینٹ مائی ٹیلنٹ (مجھے اپنی صلاحیتوں پر بھروسا ہے۔)"

"اور میں ٹیلنٹ کو چیلنج کرتی ہوں۔" نرم آواز میں بھی (وہ اپنے تاثرات پر قابو نہ رکھ سکی) اسے اس کے ٹھنڈے مزاج پر غصہ تھا۔ مگر وہ۔

"میں دعا گو رہوں گا۔" پھر وہی طمانیت بھرا لہجہ۔

"اُف۔" وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ "میں بہت کم لوگوں سے متاثر ہوتی ہوں۔ تم نے متاثر کیا ہے۔" ایک بار پھر اپنا دوستی والا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"اور میں تم سے دوستی کرنا چاہوں گی۔"

اس نے پہلے کی طرح اس کے ہاتھ کو متاسفانہ دیکھا۔ "میں دوستی کرنے کے لیے ہاتھ ملانا ضروری نہیں سمجھتا مس بسامہ، آنکھوں میں عزت، دل میں دعا ہونی چاہیے، اینڈ آئی ول بی بیسٹ آف لک۔"

کہہ کر قدم جماتا آگے بڑھ گیا۔
وہ ساکت رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ان کی بہترین دوستی کو دوسرا سال تھا۔ پہلے پہل بات چیت مضامین اور اساتذہ کی پسندیدگی سے شروع ہوئی۔ پھر چھوٹے موٹے موضوعات اور پھر تو باقاعدہ لیکچرز زیر بحث آنے لگے تھے اور بات یہاں تک پہنچی کہ ایک دوسرے کی موجودگی 'غیر موجودگی کو نہ صرف محسوس کرتے بلکہ فوراً" ٹیکسٹ کر کے پوچھتے تھے۔

"کیوں نہیں آئے؟" بسامہ نے اپنے قیمتی ٹچ پیڈ سے پیغام بھیجا۔

"امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" اس نے بٹنوں والے موبائل کو کھٹ کھٹ زحمت دی۔

"کیا ہوا؟" قیمتی موبائل کا سوال۔

"ٹمپریچر۔۔۔" سستا جواب۔

"ڈاکٹر کو دکھایا۔"

"نہیں۔۔۔" ساتھ ہی دوسرا میسج آگیا۔ "دوا البتہ دے دی ہے۔"

"اوہو ڈاکٹر کو دکھاتے۔"

"ہمیں ایسے ہی ٹھیک ہونے کی عادت ہے۔"

"ہاہاہا۔۔۔"

"ہی ہی ہی۔"

بسامہ کئی بار اپنے ڈرائیور کے ساتھ اس کے گھر آئی۔ کبھی نوٹس لینے 'کبھی کچھ سمجھنے' یا پھر اس کی امی کی عیادت کرنے۔ زینت بہت عمدہ کپڑے سلائی کرتی تھی۔ اسے یہاں آنے کا ایک بہانہ یہ بھی مل گیا تھا۔ اپنے اور مما کے کپڑے لے آتی۔ نہ اس نے پیسے دینے میں کچھ سوچا اور نہ زینت ہچکچائی 'بیٹے کی کلاس فیلو اپنی جگہ 'کاروبار اپنی جگہ۔ حماس بھی دو تین بار ڈاکٹر سبطین 'ڈاکٹر عندلیب سے ملا تھا۔ وہ دونوں ان لوگوں میں سے تھے جو ٹیلنٹ کی قدر کرتے ہیں۔ ایک ٹیلنٹڈ بچے سے بیٹی کی دوستی کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی۔ اس کے مسائل وحالات ایک الگ چیز تھی۔ دونوں ہی اس سے بہت پیار سے ملے۔ آگے کے ارادے 'اس کے خیالات قابل ستائش لگے' انہوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی تھی اور کئی بار بسامہ کو جتایا بھی تھا۔

"ہم نے تمہیں ہر طرح کی سہولیات دے رکھی ہیں تب تم بہتر رزلٹ لاتی ہو مگر کمال ہے حماس پر۔ اتنے مسائل۔۔۔ اور اسی محدود وقت میں ٹیوشنز دینا پھر زبردست رزلٹ 'واؤ!! وہ میڈیکل سائنسز میں بہت نام بنا سکتا ہے۔"

"پاپا۔۔۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔ "آپ اس کے خلاف میرے دل میں جیلسی بھر رہے ہیں ناں۔"

"جیلسی نہیں 'مقابلے کے لیے اکسا رہا ہوں۔ بیوقوف لڑکی۔۔۔ ہم تمہیں نامور ڈاکٹر دیکھنا چاہتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

یہی کچھ کبھی کسی دور میں حماس کے ماں باپ نے بھی اس سے کہا تھا اور اس کے دل پر لکھا گیا تھا۔

"ڈاکٹر حماس حیدر۔"

مارچ کا موسم رخصت ہونے کو تھا۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ کچھ تعلیمی میدان بہت گرم چل رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے بورڈز پیپرز لے کر کلاسز فارغ کر رہا تھا۔ سیکنڈ ایئر کے پیپرز شروع ہونے میں ایک ماہ باقی تھا۔ آج کل ان کے گرینڈ ٹیسٹ چل رہے تھے۔ اکیڈمی بھی خوب زور لگا رہی تھی۔

آج کا ٹیسٹ بہت اچھا اور امید افزا رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اکیڈمی کے باہر بنے گراؤنڈ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنا ٹیسٹ دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اس کے سامنے آبیٹھی۔ ہاتھ میں دو آئس کریم اسکوپ تھے۔ ایک اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے بھنوئیں اچکا کر اسے دیکھا۔

"یہ کس لیے؟"

"تمہارے ٹیسٹ کی خوشی میں۔"

"ٹریٹ تو مجھے دینی چاہیے تھی۔"

”ہاں تو تم سے لوں گی ناں۔۔۔ یہ تو میں ایڈوانس گفٹ دے رہی ہوں۔ اوکے۔“

”اوکے۔۔۔“

آئس کریم کھاتے ہوئے اس کی نگاہ سامنے نادیدہ مناظر پر تھی اور لہجہ کھویا ہوا۔

”بسامہ۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“

”میرا خواب ہے میں ایک بڑا سا خیراتی اسپتال بناؤں۔۔۔ جہاں ہم دونوں کام کریں۔“

”اچھا۔“ اس نے استعجابیہ ہنکارا بھرا۔

”تمہارا تو یہ بھی خواب ہے کہ تم کے ای میں پڑھو۔“

”ہاں ناں۔“ اس نے برملا اعتراف کیا۔

”اور یہ بھی خواب ہے‘ نامور سرجن بنو۔“

”ہوں۔“

”اور انٹری ٹیسٹ میں ٹاپ کرو۔“

”بالکل۔۔۔“ وہ سب اعتراف کر رہا تھا۔

”اور تم نے کہا تھا کہ یہ بھی خواب ہے میرے ساتھ پڑھو۔“ اب کے وہ بولا نہیں بلکہ مسکراتے ہوئے زور سے اثبات میں سرہلایا۔

”ایک زندگی میں اتنے خواب‘ خواب ہیں یا سیل روز نیا سنا دیتے ہو۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”اگر تم غور کرو تو سب خواب ایک ہی منزل کی کڑی ہیں‘ اسٹیپ بائی اسٹیپ۔“

”لیکن ضروری تو نہیں کہ نامور ڈاکٹر بننے کے لیے کے ای ہی جاؤ‘ میرے ساتھ ہی پڑھو‘ ہاسپٹل ویسے بھی کھول سکتے ہو۔“

”ہاں۔۔۔ لیکن خواب تو اچھے دیکھنے چاہئیں ناں۔“

”چاہیے ان خوابوں‘ خواہشوں کی ڈھیری میں بندہ بھول ہی جائے زیادہ اہم کون سا ہے۔“ وہ ہنسا۔

وہ آئس کریم کا آخری چمچ منہ میں رکھتے ہوئے دھیرے سے بولا تھا۔ ”میں نے خوابوں کے ڈھیر کی بات کی ہے‘ خواہشوں کی نہیں۔۔۔ خواہش صرف ایک ہی ہے۔“ ایک لمحے کے لیے دونوں کی نگاہیں ملی تھیں اور اس کی آنکھوں میں ذومعنی تاثر تھا‘ فوراً نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔ بسامہ نے بھی اس کی خواہش نہیں پوچھی تھی۔ کچھ باتیں نہ ہی کہیں جائیں تو زیادہ اثر انگیز ہوتی ہیں۔ اس نے بات ہی بدل دی۔

”تم ایم سی اے ٹی کی تیاری کہاں سے کر رہے ہو؟“

”کہاں سے کرنی ہے‘ ظاہر ہے اودھر اپنی اکیڈمی سے ہی۔“ لہجے میں بیزاریت اتر آئی تھی۔

”یار‘ ویسے یہ اکیڈمی والے بڑا ظلم کرتے ہیں‘ نوے دن کی کوچنگ اور ٹیوشن فیس پچاس ہزار‘ کچھ کنسیشن ہونی چاہیے۔۔۔ جسٹ نوے دنوں میں کروڑوں روپیہ اکٹھا کر لیتے ہیں۔“ اس نے آئس کریم کا خالی اسکوپ دور اچھالا۔

”پوزیشن ہولڈر کو گاڑی دیتے تو ہیں۔“

”ہونہہ گاڑی۔۔۔ چار پانچ لاکھ کی۔۔۔ فضول ترین۔“

”تم کہہ سکتی ہو‘ تمہارے ابا کی بیس لاکھ کی گاڑی ہے‘ مگر سوچو‘ پچاس ہزار فیس جمع کروا کر چار پانچ لاکھ کی گاڑی مل جائے تو کیا مضائقہ ہے۔۔۔ ایک تیر سے دو شکار‘ گاڑی بھی داخلہ بھی۔“

فرسٹ ایئر کے رزلٹ کے مطابق حماس حیدر فی الحال متوقع بورڈ ٹاپر تھا اور بسامہ نے اسے دو انگلیاں ہلا کر دکھائیں۔

”دو دو گاڑیاں۔۔۔ کالج کی تو تمہاری پکی ہے۔۔۔ اکیڈمی کی طرف محنت کر لو۔“

”ہاں اور وہ دونوں بیچ کر ایک ڈھنگ کی لے لوں گا‘ تاکہ کچھ تو تمہارے پاپا کی گاڑی کا مقابلہ ہو۔“ اس نے سرسری بات کی تھی اور وہ فوراً بولی۔

”کیا پاپا سے مقابلہ بھی تمہارا خواب ہے؟“ وہ بے ساختہ زور سے ہنسا۔

”بھئی شہر کے بہترین فزیشن‘ مایہ ناز ڈاکٹر کے ہزبینڈ‘ جن کی اکلوتی بیٹی ڈاکٹر بننے کی تیاری کر رہی ہو۔۔۔ تو پھر مجھے کچھ جیتنے کے لیے مقابلے تو کرنے پڑیں گے ناں۔“ اس کی ذومعنی مسکراہٹ اسے تپا گئی۔ اس نے

سر پہ فائل دے ماری۔

"دفع ہو جاؤ۔" وہ اٹھ کر جانے لگی تو اس نے ہانک لگائی۔

"رکو میں چھوڑ دوں گا۔۔۔ بائیک پر۔"

"جی نہیں۔" اس نے مڑ کر آنکھیں دکھائیں۔

"پاپا سے ٹانگیں نہیں تڑوانی' میرا ڈرائیور باہر کھڑا ہے سمجھے۔"

☼ ☼ ☼
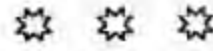
بیس دنوں کی اعصاب شکن محنت' دن رات کے رت جگوں کے بعد ان کے سیکنڈ ایئر کے پیپرز خاصے شاندار ہو گئے تھے۔ اور اگلے دن ہی اپنی پیپرز کی تمام تھکاوٹ بالائے طاق رکھ پھر سے سب نے اکیڈمی کا رخ کیا تھا۔ انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے لیے۔

مگر حماس کے ساتھ کچھ اس طرح ہوا کہ ایک رات پہلے اس کی طبیعت شدید خراب ہو گئی۔ شدید ڈپریشن' پڑھ پڑھ کر گلا زخمی ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں درد' ٹینشن بڑھ رہی تھی۔ اس دن زینت کی بھی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ ایک دن پہلے کوٹھی والوں کے کپڑے دینے گئی تھیں' شاید لو لگ گئی تھی' سر میں درد' ہلکا بخار' وہ گھر میں کھانا نہیں بنا سکی تھیں۔ حماس کو کہہ کر محلے کے تنور سے دال روٹی منگوالی۔ اب پتا نہیں دال باسی تھی یا موسم کی حدت سے خراب ہو گئی یا پھر کچھ بھی خراب نہیں تھا' حماس کی قسمت خراب تھی۔ کھانا کھانے کے چند گھنٹے کے بعد اس کے پیٹ میں شدید درد ہوا تھا۔ پھر ابکائی کے ساتھ الٹیاں' موشن' شدید چکر آنے لگے۔ زینت نے اپنے سارے پھکی چورن' قہوے کے ٹوٹکے آزمالیے مگر افاقہ نہ ہوا۔ زینت کو حماس کی فکر تھی۔ حماس کو صبح ہونے والے انٹری ٹیسٹ کی۔ اس کی گھبراہٹ بڑھ رہی تھی۔ سر میں ٹیسیں اٹھنے لگیں' اعصابی دباؤ بڑھ گیا۔ زینت اسے محلے کے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ دوا دی۔ ڈرپ لگی' شدت میں کمی آگئی تھی مگر مکمل افاقہ نہیں ہوا تھا۔ پژمردگی' ماحول کا تناؤ' بچوں کا ہجوم' اس پر مزید دباؤ بڑھ گیا تھا۔ صبح نو بجے انہیں سوالنامہ' جوابی کاپی مع کاربن شیٹ دے کر شروع کرنے کا کہہ دیا گیا۔

سوالنامے سے سوال کا سیریل پڑھ کر جوابی کاپی پر مطلوبہ نمبر کے درست آپشن کا دائرہ بھرنا تھا مگر پیٹ میں اٹھتی درد کی لہروں' سر میں اٹھتے ہلکے چکر کی وجہ سے اس سے تیسرے سوال پر ہی سیکوئنس (ترتیب) بگڑ گیا۔ سوالنامے پر اس نے تیسرا سوال پڑھا۔ جوابی کاپی پر چوتھے کی آپشنز بھر دی۔ اور اسی بگڑی ترتیب سے وہ تیزی سے بھرتا چلا گیا۔ ارے ایک اور بات' جو ٹیچرز نے بہت اچھی طرح سمجھائی تھی آخری دن بھی ایک ہی بات۔

"ڈیئر اسٹوڈنٹ' تکے بالکل نہیں لگانے' جواب اگر نہیں آتا اسے چھوڑ دو تو صرف پانچ نمبر کٹیں گے' لیکن اگر آپ نے غلط کر دیا تو پھر چھ نمبر یعنی اوپر والے درست جواب میں سے ایک نمبر کاٹ لیا جائے گا۔"

اور حماس کئی سوال حل کر لینے کے بعد ایک سوال پر چونکا تھا۔

"واٹ۔۔۔؟"

سوال نمبر 31' جوابی کاپی کا وہ 32 کی آپشن بھر رہا تھا۔ اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ اس نے تیزی سے اوپر نگاہ دوڑائی۔ ایسے ہی بگڑی ترتیب یعنی کہ وہ بہت بڑی غلطی کر چکا ہے۔ اب اگر وہ مکمل چوکس ہو کر سارے سوال حل کر لے تو شاید وہ میرٹ بنا سکے۔ لیکن دباؤ پر مزید دباؤ۔ حماس جذبات' خواب' مستقبل سب کے دباؤ میں پیپر حل کر رہا تھا مگر اس کا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ پورے ساڑھے گیارہ بجے اسٹاپ کہہ کر بچوں کو روک دیا گیا اور وہ اپنے قلم کی نوک دیکھتا رہ گیا۔

وہ امتحانی ہال سے باہر کھڑا تھا۔ جب وہ اسے ڈھونڈتی ڈھانڈتی وہاں تک پہنچی۔ دونوں کے رول نمبرز الگ الگ ہالز میں تھے۔

"حماس۔۔۔ حماس۔" اس نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"کہاں کھوئے ہو۔" وہ اس کے چہرے کو دیکھے گیا۔

حماس کے چہرے پر ہوائیاں تھیں اور صرف اس کا کیا

حال ڈھال سے جو بچہ باہر آ رہا تھا ایسا ہی بدحواس تھا۔ آنکھیں پھٹیں، منہ کھلے۔

"کہاں... پیپر کیسا ہوا؟" وہ پھر سے مخل ہوئی۔

"تمہارا کیسا ہوا؟"

"بس ہو گیا۔ بڑا ٹف تھا یار... میں نے دس سوال چھوڑ دیے۔" اس کے ہونٹوں پر باریک ہنسی رینگی۔

"پیپر تو بہت آسان تھا۔" اس کی آواز کسی کنویں سے آ رہی تھی۔

"لیکن میرا سیکوئنس بگڑ گیا۔"

"واٹ ربش..." بسامہ کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

حماس حیدر کا سیکوئنس بگڑ گیا۔ تین ماہ سے اکیڈمی بھی تیاری کروا رہی تھی اور جس اسٹوڈنٹ کی روزانہ کلاس میں تعریف ہو، جس کی کامیابی کا سب ٹیچرز کو یقین تھا، وہ کہہ رہا ہے سیکوئنس بگڑ گیا۔

"کیا بکواس ہے حماس..." خالی فضا کو گھورتے حماس کی کہنی اس نے بری طرح جھنجوڑی۔

"تمہیں وہم ہوا ہو گا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ڈونٹ وری، شام تک پتا چل جائے گا۔"

"مس بسامہ..." وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اپنی روندھی آواز کو بے حد قابو میں رکھ کر بولا۔ "اور مجھے شام سے خوف آ رہا ہے، میں چاہتا ہوں شام نہ اترے۔"

وہ کہہ کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا پارکنگ میں کھڑی اپنی بائیک کی جانب بڑھ گیا تھا۔ وہ اس کے جواب میں گم ہو گئی۔ پھر گہری سانس لے کر اپنی گاڑی کی جانب چلی جہاں آج ڈرائیور کی جگہ اس کے مصروف ترین والدین وقت نکال کر اس کی واپسی کے منتظر بیٹھے تھے۔

☆ ☆ ☆

جگمگاتے سورج کے ڈوبتے ہی گرم شام پورے شہر پر جھک آئی۔ محلے کے نیٹ کیفے پر اپنا رزلٹ دیکھ کر گھر تک کا راستہ اسے پل صراط لگ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے دنیا بدر کیا جا رہا ہو۔ ارد گرد رواں ٹریفک تماش بین کی طرح اس کی ناکامی پر قہقہے اچھالتی محسوس ہوئی۔ وہ من من بھاری پاؤں گھسیٹتا گھر میں داخل ہوا، زینت بے حد بے چین پھر رہی تھیں۔ ہاتھ میں تسبیح، لبوں پر ورد۔ اسے دیکھتے ہی اس کی جانب لپکیں۔

"کیا بنا؟ جس وقت وہ ٹیسٹ دے کر گھر میں داخل ہوا تھا تب بھی زینت بے قرار ہی تھیں، صحن میں جائے نماز پر بیٹھیں اسے دیکھتے ہی جائے نماز لپیٹتے اٹھی تھیں اور یہی سوال کیا تھا۔

"کیسا ہوا؟"

اس نے ماں کو دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"بس ہو گیا۔" اور برآمدے میں بچھی بان کی چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔ وہ بھاگ کر سکنجبین لے آئیں۔ کیونکہ اس کی طبیعت بھی کل سے ٹھیک نہیں تھی۔ شاید کمزوری ہو رہی ہو اور اب جب رزلٹ کا پوچھا، وہ کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا۔ جی چاہا زور زور سے روئے، مگر ہمت کر کے بولا تھا۔

"امی! اسی ہفتے آپ نے بیمار پڑنا تھا، ساری زندگی مجھے اپنے ہاتھ کا پکا کر کھلاتی رہیں، اسی ہفتے تنور کا کھلانا تھا۔"

زینت کی سمجھ میں اس کی بات بالکل نہیں آئی۔ ناک چڑھا کر سوچا۔ "باؤلا ہوا ہے، میں رزلٹ کا پوچھ رہی ہوں، آپ کھانے کی باتیں کر رہا ہے، شاید بھوک لگی ہو۔ دوپہر میں بھی آ کر لیٹ گیا تھا، کتنا کہا کھانا کھا لے مگر نہیں۔"

وہ فوراً بولیں۔ "بتایا تو تھا تجھے، آج میں نے خود بنایا ہے، کھچڑی بنائی ہے پتلی سی... ابھی لاتی ہوں، تو رزلٹ کا تو بتا... نفل مانے ہوئے ہیں۔"

"رزلٹ کا ہی بتا رہا ہوں۔ اس تنور کے کھانے کا رزلٹ... فیل ہو گیا ہے آپ کا بیٹا۔"

"ہیں...!! فیل ہو گیا۔"

وہ بچہ جو پہلے دن سے وکٹری اسٹینڈ پر اول رہا ہو۔ جس کے لیے کبھی خواب میں بھی نمبروں کا تصور بھی نہ آتا

ہو جس کے لیے دن رات مشین چلا کر سارا خرچا اس کی تعلیم پر لگایا ہو' وہ کہہ رہا ہے فیل ہو گیا ہوں۔ وہ دھپ سے زمین پر بیٹھ گئیں۔ اور برآمدے میں بچھی چارپائی پر چیت لیٹا وہ کچی چھت کی دیمک زدہ لکڑیاں گن رہا تھا۔ اور کھانا ویسے ہی دیگچی میں اپنی ناقدری کا ماتم کرتا رہا۔ انٹری ٹیسٹ کی ناکامی کے بعد اس گھر کے مکینوں کا کم از کم ایک دن کا کھانا ایسے ہی حرام ہو جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆
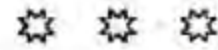
پورا ہفتہ اس کا سستا سا موبائل آف رہا۔ نہ اس نے چارجنگ پر لگایا نہ ہی گھر سے نکلا۔ بسامہ میں بھی ہمت نہ تھی کہ اس سے بات کر سکتی' اس کے نمبروں کا پتا چلتے ہی اس کی اپنی ہمت بھی ٹوٹ گئی تھی۔ یہ تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا میرٹ بن جائے گا اور حماس رہ جائے گا۔ اور جب ہفتے بعد ایف ایس سی کے رزلٹ کی پوزیشنز کا اعلان کیا گیا تو پھر اسے خود کو روکنا محال ہو گیا تھا۔ وہ اپنی مما کو لے کر اس کے گھر آئی تھی۔

جس ایک مقصد کو لے کر وہ بھاگتا آیا تھا۔ اس منزل کو اس کے رستے سے ہٹا دیا گیا پھر بے مہار بھاگنے کا کیا فائدہ۔ اور بسامہ کی عین توقع کے مطابق وہ بھرا ہوا ملا تھا۔ جب اس نے اس سے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"تم ریپیٹ کرو گے!" اس کی سیاہ گھنگھور آنکھوں میں گرد باد مچلا۔ ڈاکٹر عندلیب آگے بڑھیں' اسے حوصلہ دیا' ہمت بندھائی۔

☆ ☆ ☆

زینت کے غریب خانے پر اداسی کی چادر چھائے مہینے سے اوپر ہو گیا تھا۔ وہ پہلے بھی بلاوجہ گھر سے نہیں نکلتا تھا اب گھر میں ہوتے ہوئے بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ کہاں ہے۔ گم صم' چپ چاپ جیسے زندگی کا ہر کام ختم ہو گیا ہو۔ دوبارہ کلاسز شروع ہونے میں پورا ایک سال تھا۔ جن دو تین بچوں کو ٹیوشن پڑھانے جاتا تھا' اب وہ بھی چھوڑ دیں۔ زینت نے بہت سمجھایا مگر بے سود۔

وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے باسی اخبار پھیلا ہوا تھا۔ اس کی جمی پتلیاں دیکھ کر لگتا تھا بہت غور سے کچھ پڑھ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک قلم تھا۔ اس کی نوک "ٹھک ٹھک" اخبار میں چھوٹے چھوٹے سوراخ کر رہی تھی۔ اس کی ٹھک ٹھک میں موبائل کی ٹون مخل ہوئی تھی۔ ناگواریت سے روشن اسکرین کو دیکھا۔

"بسامہ کالنگ۔" اس نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا تھا۔ وہ بھی اپنے نام کی ایک ڈھیٹ تھی' مسلسل کال کرتی رہی۔ آخر اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔

"کہاں غائب ہو... کر کیا رہے ہو تم آخر؟"

"ایک ناکام انسان کیا کر سکتا ہے' بیکار' ٹوٹل فارغ۔"

"اس طرح کی باتیں کر کے کیوں آنٹی کو تکلیف دیتے ہو' دوسروں کو اذیت دے کر کیا مل رہا ہے تمہیں' ہاں۔"

"میں کسی کو اذیت دوں گا؟ کسی کو کچھ کہہ سکوں' حیثیت ہے میری۔"

"پلیز حماس' نکلو اس فیز سے۔ جو ہونا تھا وہ اب ہو چکا ہے' تم ایک سمجھ دار پریکٹیکل اسٹوڈنٹ ہو' تسلیم کرو اس حقیقت کو۔"

"جس بچے کو کبھی کتابوں سے سر اٹھانے کی فرصت نہ ملی ہو' کالج' اکیڈمی' ٹیوشنز' ٹیسٹ' سب ختم ہو گیا میری زندگی سے' اب کیا کروں' دیواروں سے سر پھوڑوں' فارغ نہ بیٹھوں تو اور کیا کروں' پاگل خانے میں جا کر بیٹھ جاؤں۔"

"تمہیں ریپیٹ کا مشورہ دیا تھا۔"

"ہاں بہت آسان ہے نا ریپیٹ کرنا... میری ماں نے جس طرح پچاس ہزار فیس دی تھی وہ میں ہی جانتا ہوں' کھیے میں بہہ گئی اور اب پھر سے جوا۔"

"ضروری تو نہیں انسان ہر بار جوا ہار جائے' پلیز ٹرائی... اور ہاں وہ جو تم ٹیوشنز دیتے تھے' آنٹی بتا رہی ہیں تم وہاں بھی نہیں جا رہے ہو۔ کیوں؟"

"ممی نے بتایا۔"

اس کے استفسار پر بسامہ نے لمحہ بھر کے لیے اپنی زبان دانتوں میں دبالی۔ کیوں کہ زمنت نے اپنی اس سے گفتگو راز میں رکھنے کو کہا تھا۔ وہ اس کی طرف سے بے حد پریشان تھیں۔ جہاں بیٹھا وہیں بیٹھا ہے' کھانا کھایا کھایا نہیں کھایا تو ایسے ہی دن گزار دیا۔ کوئی اخبار رسالہ اٹھالیتا تو اس پر دائرے بناتا رہتا یا بلاوجہ ٹکڑے کر کے بکھر دیتا۔ اگر کچھ کہہ دیتیں تو کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ وہ بھی سن کر فکر مند ہوتی تھی اور انہیں تسلی دیتے کہا۔

"آنٹی آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں' اس کا ذہن اپنی ناکامی قبول نہیں کر رہا کچھ ٹائم لگے گا اسے ٹھیک ہونے میں۔"

"ہاں بچے تو لگائے ٹائم' مگر یوں پاگلوں والی حرکتیں کر کے مجھے اور خود کو اذیت تو نہ دے' ناں۔"

پھر انہوں نے چند دن پہلے کا قصہ اسے سنایا تھا کہ محلے کی چند عورتیں آئی تھیں۔ حماس کو بلایا کہ جا کر کوئی بوتل' جوس لے آئے' مگر نہیں' اندر بیٹھا کانوں میں ٹوٹیاں (ہینڈ فری) لگائی گانے سنتا رہا' تم یقین کرو ہر وقت انہیں کانوں میں اڑسے بیٹھا رہتا ہے' مجھے بہت غصہ آیا۔ ان عورتوں کے جانے کے بعد میں اندر گئی تو سوتا بن گیا' میں نے اس کے کانوں سے وہ نکال کر اپنے لگائیں' دیکھوں کیا سنتا ہے ہر وقت' ایمان سے بسامہ بچے! میرا دل دھک سے رہ گیا' وہ تو بالکل چپ تھیں' اس کا موبائل چیک کیا۔ اس میں نام کی چارجنگ نہیں تھی' پھر مجھے یاد آیا' اس نے تو کئی دن سے موبائل چارج ہی نہیں کیا' لو بتاؤ' سارا دن وہ اڑسے رکھے گا' کیا بہرہ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیوں کر رہا ہے وہ پاگلوں والی حرکتیں' ایسا بھی کیا ہو گیا' اور بھی تو بہت سے بچے رہ گئے' مگر یہ۔" اس کے دل کو خاصا دھچکا سا لگا تھا پھر سنبھل کر بولی۔

"آنٹی آپ پریشان مت ہوں' باقی بچے بھی ایسا ہی ہی ہو کرتے ہیں' خیر میں سمجھاؤں گی اسے۔"

"ہاں ہاں بچے ضرور سمجھانا' اسی لیے فون چارج کرتے ہی میں نے سب سے پہلے تم سے بات کی ہے' مگر میرا نام نہ لینا کہ میں نے کہا تھا' کہیں سوچے' ماں نے شکایت لگائی ہے' لڑے گا۔"

"نہیں نہیں آپ بے فکر رہیں۔۔۔" اور اب اس کے منہ سے ان ہی کا نام پھسلا تو قدرے شرمساری ہوئی اور دوسری جانب وہ بھی سوچ رہا تھا میں نے تو موبائل چارج کیا ہی نہیں' تو پھر یہ امی نے ہی کیا ہو گا' تب ہی تو آج کال آ گئی۔" اس نے سوچتے ہوئے اک شکوہ کناں نگاہ امی کے کمرے کے کھلے دروازے پر ڈالی۔

"میری ماں بھی بس۔۔۔" بسامہ نے جھوٹ نہیں بولا بلکہ سمجھ داری سے کام لیا۔

"ہاں آنٹی نے۔۔۔ جب ایک بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا الٹی سیدھی حرکتیں کرے گا' وہ پریشان تو ہوں گی نہ' کسی کو تو مدد کے لیے پکارے گی۔ اور یہ شغل چھوڑ دینے سے جو دوسرے مسئلے ہو رہے ہوں گے ان کا سوچو' تمہیں جانا چاہیے۔"

"نہیں ہوتا مجھ سے' جس سے ملتا ہوں پہلا سوال' اوہو' یہ کیسے ہو گیا؟ کیسے غلطی ہو گئی' کیا تیاری نہیں کی تھی' اب کیا کرو گے' کیا سال ضائع کرو گے۔۔۔؟ میڈیکل تو جان جوکھوں کا کام ہے۔۔۔ میں تنگ آ گیا ہوں بسامہ جواب دیتے دیتے' ہر شخص دس دس بار اظہار افسوس کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔"

"میری بات سنو حماس' دوسرے کی شخصیت کو منہ میں رکھ کر چیونگم بنانا ہم لوگوں کا من پسند مشغلہ ہے' اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم میٹھی چیونگم بنے ان کے منہ میں پڑے رہیں یا پھر تلخ ہو جائیں کہ وہ اگلنے پر مجبور ہو جائیں' مجھے حیرت ہے' حماس حیدر جیسا کانفیڈنٹ اسٹوڈنٹ لوگوں سے کترا رہا ہے' ان لوگوں سے جنہیں ایم سی اے ٹی کا پتا تک نہیں' جنہیں یہ نہیں پتا اس میں ٹاپکس کیا ہیں' تم ان کے سوالوں سے گھبرا رہے ہو۔"

"بسامہ ڈیئر! جب ایک کامیاب انسان بری طرح ناکامی دیکھے تو سارا کانفیڈنٹ پانی میں بہہ جاتا ہے۔"

"غلط' بالکل غلط۔۔۔

ایڈیسن نے بلب بنانے کے سو ناکام تجربے کرکے یہ نہیں کہا تھا اب لوگوں کو کیا جواب دوں کیوں نہیں بن رہا اس نے یہ جم کر کہا تھا کہ یہ وہ سو طریقے ہیں جن سے کم از کم بلب نہیں بن سکتے' آخر کسی تجربے سے بلب بنا لیا ناں' روشنی ہوگئی۔"

"اچھا تو تم یہ کہہ رہی ہو' میں سو بار انٹری ٹیسٹ دوں اور بوڑھا ہو جاؤں۔"

"خدا کے واسطے حماس! یہ بات ذہن سے نکال دو' اس بار تمہارے ساتھ بیڈ لک ہوگئی' مگر تم کامیاب ہو جاؤ گے' ٹرائی اگین پلیز۔"

"اوکے۔۔۔" اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ "تم نے یہی سب کہنے کے لیے فون کیا تھا۔"

"جی نہیں۔" وہ چڑ کر بولی۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے کسی کو نصیحتیں کرنے کا' سب کو اللہ نے عقل دے رکھی ہے۔"

"اچھا۔۔۔" اس کے لہجے میں استہزا تھا۔

"اب میں کسی ہو گیا ہوں۔۔۔"

"ہاں بالکل۔۔۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔ "جب اپنی بیسٹ فرینڈ کو کامیابی پر گفٹ نہیں دو گے تو کسی ہی ہوئے ناں۔"

"گفٹ چاہیے؟"

"ہاں ناں۔۔۔ میں نے فون ہی تمہیں یاد دلانے کے لیے کیا تھا' تم نے کچھ دینے کا کہا تھا مجھے۔"

"کیا؟" اس کے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا۔ آج سے ٹھیک دو ماہ۔ انٹری ٹیسٹ سے پہلے اکیڈمی میں آخری دن اس نے بسامہ سے کہا تھا۔

"یار تم اوور آل نہیں خریدنا' میں تمہیں گفٹ کروں گا' اپنا اور تمہارا ایک ہی شاپ سے لاؤں گا۔" اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے تھے۔

"شیور۔۔۔ میں انتظار کروں گی۔"

"اب کیا۔" کہتے ہی فوراً اس کے ذہن میں آگیا تھا۔ "ہاں ہاں۔۔۔ مجھے یاد ہے۔"

"پھر دو گے یا میں لے لوں۔"

"اب میں اتنا بھی کم ظرف نہیں کہ نہ دوں۔۔۔"

"ہاں تو پھر اعلیٰ ظرف صاحب ایک مت دینا' اب میں ہاسٹل میں روز روز تو دھونے سے رہی۔"

"ہاسٹل۔۔۔" وہ چونکا۔ "کیوں لسٹ میں کہاں کا نام آیا ہے تمہارا؟"

"پی ایم سی فیصل آباد۔"

"چلو فیصل آباد ہی سہی مگر میرٹ تو بن گیا ناں۔" اس کی آواز میں چھپا درد وہ جان گئی تھی۔ مگر کر کیا سکتی تھی۔ حماس کے اتنے وسائل بھی تو نہیں تھے کہ اسے پرائیویٹ میڈیکل کرنے کا مشورہ دیا جاسکے۔

☼ ☼ ☼

آج اتوار تھا۔ ٹیوشنز سے فارغ' اپنی کتابیں صاف کیں' الماری میں دوبارہ ترتیب سے لگائیں' نوٹس نکالے' انہیں لے کر اپنے چھوٹے سے صحن میں آ بیٹھا۔ امی اپنے کمرے کے دروازے میں بیٹھی سلائی مشین سے الجھی ہوئی تھیں۔ ایک کوٹھی کی شادی کے کپڑے آئے ہوئے تھے اور مشین میں کہیں دھاگا پھنس گیا تھا۔ نکلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ انہوں نے اوپر نیچے کئی بار دیکھا۔

"پتا نہیں کہاں پھنس گیا' نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔" وہ غصے سے الجھ گئیں۔ حماس اپنی کتاب بند کرکے اٹھ کر آگیا۔

"کیا ہوا۔۔۔؟"

"دھاگا کہیں پھنس گیا۔۔۔ نظر نہیں آرہا۔ آج دو فراکیں لازمی سینی تھیں' اوپر سے یہ کم بخت۔"

"ہٹیں میں دیکھتا ہوں۔" وہ ذرا سا پرے کھسکیں۔ وہ ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے پہلے مشین کو تیل دیا پھر بے کار کپڑے سے اس کی صفائی کی اور شٹل لگانے والی جگہ کے پیچ کھولے۔ اندر لیور میں انتہائی چھوٹا سا دھاگا الجھا تھا جس نے شٹل کو جام کر رکھا تھا۔ اس نے مشین کی صفائی کے لیے رکھا ٹوتھ برش لیور میں پھیرا' دھاگا اس میں لپٹ کر باہر آگیا۔

"ہوگئی یہ میڈم ٹھیک۔" اس نے سب چیزیں سیٹ کرکے پہیہ گھما کر دیکھا اور ہاتھ جھاڑتے اٹھ

گیا۔ زینت بہت خوش ہوئی تھیں۔ بہت دنوں بعد اس نے کسی کام میں دلچسپی لی تھی۔ وہ پھر صحن میں بیٹھ گیا' کتابیں کھولیں۔ "ٹھک" کر کے ایک رنگین فٹ بال بیرونی دیوار پھلانگ کر قریب آگری اور تھوڑی دیر میں محلے کے بچوں کا شور' وہ دروازہ پیٹ رہے تھے۔ اس نے اٹھ کر فٹ بال پاؤں سے ایک جانب لڑھکائی' دروازہ کھول کر مصنوعی کرختی سے ڈپٹا۔

"کیا مسئلہ ہے' کیوں دروازہ توڑ رہے ہو۔"

محلے کے چھوٹے بڑے کئی بچے تقریباً" اکٹھے بولے تھے۔ "ہماری فٹ بال اندر آئی ہے۔"

"دروازہ تو بند تھا۔۔۔ اندر کیسے آگئی۔" اس کا آج مذاق کرنے کا موڈ تھا۔

"نہیں اوپر سے اڑ کر آئی ہے۔" نیاز محمد کے بیٹے نے ہانک لگائی۔

"کیوں۔۔۔ فٹ بال کے پر لگے ہوئے تھے۔" بہت دن بعد وہ شرارتی موڈ میں آیا۔

"نہیں بھائی اچھل کر۔۔۔" اب دوسرا بولا۔

"تو نہ اچھالتے۔۔۔ اندر نہیں آئی' چلو بھاگو یہاں سے۔۔۔" بچے ضد کرتے اندر گھسنے کی کوشش میں تھے۔ دائیں بائیں کہیں سے جگہ بے مگر وہ لمبا چوڑا دونوں پٹ پکڑے دروازے پر جما کھڑا محظوظ ہو رہا تھا۔ اندر سے زینت کی آوازیں آرہی تھیں۔

"کیا ہو گیا حماس' دے دے' کیوں تنگ کر رہا ہے۔" اس نے جان بوجھ کر امی کی آواز نہیں سنی بس بچوں کو تنگ کرنے میں مزا آرہا تھا۔

"میں نے کہا نا نہیں آئی' بھاگو۔۔۔ جب آئے گی دے دوں گا۔۔۔ ہو سکتا ہے اوپر ہوا میں پرندے کھیل رہے ہوں۔"

"آپ سیدھی طرح دیتے ہیں یا نہیں۔"

"نہیں۔۔۔ کیا کرو گے؟"

"جس طرح اب کے فیل ہوئے ہیں ناں' اللہ کرے دوبارہ بھی ہو جائیں' کبھی بھی ڈاکٹر نہ بنیں' پھر ہماری فٹ بال سے ہی کھیلنا۔"

اس نے شعلہ بار نگاہ سے اس آٹھ سالہ بچے کو دیکھا۔ اس کا دل کر رہا تھا نیاز محمد کے اس لڑکے کا آج قصہ ہی پاک کر دے۔ اس نے اتنی زور سے ان بچوں کے منہ پر دروازہ بند کیا کہ کچھ دیر تک کنڈی ہلتی رہی تھی۔ پھر اس کی نگاہ فٹ بال پر گئی۔ انتہائی زور سے دیوار پر کک لگائی۔ وہ پلٹ کر واپس آئی پھر باری پھر تو وہ کسی مجنوں کی طرح اٹھا اٹھا کر اسے دیوار' کبھی فرش پر مار رہا تھا۔ یہاں تک کہ فٹ بال کا ٹانکا ادھڑا' ہوا نکلنے لگی۔ فٹ بال بہت حد تک پچکنے کی وجہ سے تیزی سے نہیں پلٹ رہی تھی بلکہ وہ خود تیز تیز اس کی جانب بڑھ کر کک لگاتا' بالکل ایسے جیسے کسی تڑپتے ہوئے کو اپنا' بوٹوں کی ٹھوکروں سے مار دینا چاہتا ہو۔ زینت کپڑے' مشین چھوڑ کر اٹھیں' صحن میں کھڑی اسے تاسف سے دیکھے جا رہی تھیں۔

"اسے پھر بھوت چڑھ گیا۔" دفعتاً" دروازہ بجا۔ زینت نے کھولا۔ بچے تو اتنی دیر میں فٹ بال پر فاتحہ پڑھ کر جا چکے تھے۔

بسامہ پھول اور کیک لے کر آئی تھی۔ آج حماس کی سالگرہ تھی۔ زینت کو تو کاموں سے فرصت نہیں تھی' کیا کیا یاد رکھتی۔ اور وہ خود جان کر بھولا ہوا تھا۔ البتہ بسامہ کو یاد تھی بالکل' اسی طرح جس طرح حماس کو چند مہینے پہلے اس کی یاد تھی' اسے آئس کریم کھلاتے ہوئے پین گفٹ کیا تھا۔

"لو' پین تو میرے پاس پہلے ہی موجود ہیں' پھول گفٹ کرتے۔۔۔"

اس نے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"اس سے پیپر کرنا۔۔۔ بابا جی نے پھونک ماری ہے۔" اس نے بابا جی کہتے ہوئے گردن اٹھا کر اپنی جانب اشارہ کیا تھا۔

"کامیاب ہو کر خود ہی پھول بن جاؤ گی بچہ۔۔۔" وہ بالکل کسی پیر کی طرح جھومتا ہوا بولا تھا۔ وہ زور سے ہنس دی اور آج اس کے ہاتھ میں پھول تھے۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ اسے فٹ بال سے الجھتا دیکھ کر تحیر سے پہلے اسے پھر زینت کو دیکھا تھا۔ جو رو دینے کو تھیں۔ انہیں کچھ بتانا نہیں پڑا' وہ خود ہی سمجھ

گئی۔ کیک اور پھول ٹیبل پر رکھ کر پھر اسے پکارا۔
"حماس..."
اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ امی کے پہلو میں وہ ہاتھ لپیٹے اطمینان سے کھڑی تھی۔ اسے اپنے جنون میں نہ دروازے کی دستک سنائی دی تھی نہ کسی کے اندر آنے کی آہٹ۔ حماس کا چہرہ بے حد سرخ تھا اور آنکھیں سرد جیسی برف جیسی۔ اس نے پیر کی ٹھوکر سے پھسپھسی فٹ بال پرے لڑھکائی۔ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تن من بری طرح جل رہا تھا۔ وہ قدم قدم اس کی طرف چلی آئی۔ نگاہیں اس کے چہرے پر ہی گاڑ رکھی تھیں حماس نے نگاہیں پھیر لیں۔

"نگاہیں پھیر لینے یا بے جان چیزوں کو توڑنے پھوڑنے سے حقیقت نہیں بدلتی' حقیقت کو تسلیم کر کے آگے بڑھنا سیکھو حماس۔" وہ یک لخت پھٹ پڑا۔
"کہاں آگے بڑھوں' بند گلی میں پہنچ دیا گیا ہوں میں' ایک سال' پورا ایک سال ہے... اور پھر کیا گارنٹی ہے کہ دوبارہ بیڈ لک نہیں ہوگی' کوئی ان ہونی نہیں ہوگی میرے ساتھ' لوگوں کو میرا مذاق مل گیا ہے۔"
"تمہیں لوگوں کے مذاق کی پروا کب سے ہونے لگی۔ تم اپنے خوابوں کو دیکھو۔" وہ بنا پلکیں جھپکے بولی تھی۔
اس کا لہجہ بے حد تلخ ہو گیا' چلا کر بولا۔ "میرے خواب گئے بھاڑ میں' میں تو اپنے مرے ہوئے باپ کی خواہش بھی پوری کرنے میں ناکام رہ گیا ہوں' بے حد محنت کرنے کے بعد ٹوٹل ناکام۔" غصے میں اس کی آواز کانپنے لگی تھی۔ اتنے دن سے اندر پکتا لاوا آج پھٹا تھا۔ سرد آنکھیں پگھل رہی تھیں' ان میں سے دھواں اٹھنے لگا۔ وہ ذرا سا گردن کے خم سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔
"تم جانتی ہو موت کیا ہے' میں جانتا ہوں یہ کس بے سروسامانی کا نام ہے' میں نے نو سال کی عمر میں اپنے باپ کو مرتے دیکھا تھا۔" دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں اپنی آنکھوں کے قریب لے جا کر دوبارہ کہا۔ "اپنی آنکھوں کے سامنے' وجہ یہ نہیں تھی کہ ہسپتال' ڈاکٹر غائب تھا۔ بلکہ وجہ یہ تھی اس سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر لایئنٹ ہی نہیں تھا' ایمرجنسی میں دوسرے اسپتال سے ڈاکٹر پہنچا' میرے باپ کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں' میری ماں زاروزار رو رہی تھی... اور پتا ہے کیا ہوا۔" آنکھوں کے دھوئیں نے بھاپ کا روپ دھارا' بھاپ نیچے گر کر چہرہ بھگونے لگی تھی۔
"ڈاکٹر میرے باپ تک پہنچا تو بجلی چلی گئی۔ دل ہاتھوں سے پمپ نہیں ہو سکتا تھا' انہیں الیکٹرک شاک کی ضرورت تھی۔ اگر وہاں پہلے سے ڈاکٹر موجود ہوتا تو..."
آنکھوں کی نمی میں ہر چیز بہہ گئی تھی۔ اس نمی میں ایک معصوم نمی تحلیل ہو گئی۔ وہاں صرف نو سالہ حماس اور اس کے پاس بے بس کھڑی روتی ہوئی ماں تھی۔ جو آسمان کی طرف منہ کیے دعا مانگ رہی تھی۔
"یا اللہ بجلی جلدی آجائے' میرے مالک رحم کر بجلی آجائے..." نو سالہ حماس کو بے حد حیرت ہوئی پہلے کہہ رہی تھی ڈاکٹر آجائے' اب کہہ رہی ہے بجلی آجائے' کیا ڈاکٹر بجلی سے چلے گا' بلب کی طرح' اس نے معصومیت بھرے لہجے میں ماں سے یہی پوچھا تھا۔
زینت نے بھی وہی بتایا جو کچھ دیر پہلے نرس کہہ گئی تھی۔
"تیرے باپ کو بجلی کا جھٹکا دینا ہے' پھر سانس چل پڑے گی۔" بچے کو اپنی ماں کی سستی پر بے حد افسوس ہوا تھا۔ اس نے خفگی اور بھولپن میں ماں کو دیکھا۔
"اگر ابو نے جھٹکے سے ہی ٹھیک ہونا تھا' تو ڈاکٹر کا انتظار کیوں کیا امی' ابو کی انگلیاں پلگ میں دے دیتیں' پہلے تو بجلی تھی ناں..." اس کی معصومیت پر زینت کے یاسیت چھائے چہرے پر ہنسی کی لہر گزری پھر اسے پیار کرتے خود میں بھینچ لیا۔
"جب تو بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا ناں تو تجھے خود پتا چل جائے گا۔ تیرے باپ کی خواہش ہے تجھے ڈاکٹر بنانے کی' بنے گا ناں۔" اس نے اثبات میں زور زور سے سر ہلایا۔ ماں نے ماتھا چوما۔ پھر ان کی ممتا کا لمس ترحم میں بدل گیا اور پھر یہی رحم سب نے اسے لپٹا لپٹا کر کھایا

تھا۔ پہلے تو وہ سمجھا مستقبل کا ڈاکٹر سمجھ کر خصوصی پروٹوکول دیا جارہا ہے جیسے اس دن ڈاکٹر کے آنے پر سب جمع ہو گئے تھے۔ لیکن یہ عقدہ تب کھلا جب باپ کے قلوں پر اس کے چھوٹے سے سر پر سربراہی کی دستار باندھی گئی اور زمنت کے پاس لا کھڑا کیا گیا۔

"میں ابو بن گیا تھا۔ امی کا سربراہ' ان کی ضرورتوں کار کھوالا' خواب و خواہش کا محافظ۔" اس کی آنکھوں سے بہت سایانی چھلکا لحہ موجود میں آکر روندھی آواز کو گھونٹ میں نگلا۔

"تمہیں پتا ہے بسامہ' جب کوئی کم عمر بچہ یتیم ہوتا ہے تو اس پر کیا قیامت ٹوٹتی ہے' کچھ بھی سمجھ میں نہ آنے کے باوجود لوگوں کا غیر معمولی پیار اور ترس اسے غیر محفوظ کر دیتے ہیں' وہ خود میں اپنا سائبان ڈھونڈتا ہے' ایک ان دیکھی زرہ تان لیتا ہے' تب میرے اندر بھی اک زرہ بندھی تھی مجھے ڈاکٹر بننا ہے کیونکہ ڈاکٹر کے لگائے جھٹکے سے سانس چل پڑتی ہے' خود انگلیاں سوئچ میں دے دینے سے تو سامنے والوں کا بچہ مرگیا تھا۔ کیا اب بھی میری خواہش ڈیزرونگ نہیں' اتنی محنت' کوشش' لگن کے باوجود میں صرف ایک ناقص طریقہ کار کی وجہ سے رہ گیا۔ کیا انٹری ٹیسٹ کی سہولی نہیں ہونی چاہیے۔"

"ریلیکس ... ریلیکس ..." وہ قدرے آگے بڑھی۔ اس کے بازو کو نرمی سے تھپکا۔

"تم اپنی اور آنٹی کی خوشی کی وجہ سے کچھ بننا چاہتے ہو' لیکن یہ جو کچھ تم کر رہے ہو' روز غصہ' جلنا کڑھنا' اس سے انہیں کوئی خوشی حاصل نہیں ہو رہی بلکہ زخم ادھڑ رہے ہیں' ذرا ٹھنڈے ہو کر ایک بار پھر کوشش کرو' کامیاب ہو جاؤ گے' کوئی کام ناممکن نہیں ہے۔"

اس نے گردن جھٹک کر کلائی سے اپنا بھیگا چہرہ پونچھا اور آگے بڑھا۔ ٹیبل پر کیک اور پھول دیکھ کر رک گیا۔

"یہ کیا ہے' کیوں لائی ہو؟"

"ویسے ہی ..." وہ لاپروائی سے بولی۔ "گاڑی اسٹال کے پاس سے گزری تو لے لیے۔" دونوں کی نظریں ملیں' کسی حد تک وہ اندر سے خوش ہوا تھا کہ اسے میری سالگرہ یاد ہے مگر بظاہر بے اعتنائی دکھائی۔

"یوں کہو کہ تم کل ہاسٹل جا رہی ہو' خوشی میں لائی ہو۔" اس کے لہجے کی مصنوعی کاٹ پر وہ اسی انداز میں بولی۔

"ہاں بالکل ... میں کل ہاسٹل جا رہی ہوں' کل میرا پہلا دن ہو گا میڈیکل کالج میں' اسی لیے تو تمہیں چڑانے کے لیے لائی ہوں ورنہ میرے پاس کوئی فالتو وقت نہیں ہے کسی ایرے غیرے کو وش کرنے کا۔"

اس کے نروٹھے لہجے پر اس نے بھرپور قہقہہ لگایا تھا۔ وہ صرف گہری نگاہ سے اسے دیکھتی اور مسکراتی رہی اور زمنت بے حد شکر کرتی اندر سے جلدی جلدی پلیٹیں اور چھری لے آئیں۔ اب وہ بھی سمجھ گئی تھیں کہ اسے پیار سے بہلانا ہے۔ اگر وہ کبھی پریشان ہوتا تو وہ فوراً" کسی نہ کسی طرح اسے سمجھاتی تھیں۔ وہ مشین کی مثال ہی ان کے لیے کافی تھی۔

"دیکھو حماس' مشین میں دھاگا پھنس گیا تھا' میں غصے میں ادھر ادھر ہاتھ مارتی رہی' نہیں نکلا' تو نے آکر تیل دیا' صفائی کی پھر پیچ کھول کر آرام سے نکالا' فوراً" نکل گیا۔ رکی مشین چل پڑی۔ جب ایک مشین چل سکتی ہے تو اللہ کا بنایا دماغ تو بھاگے گا' ناں ... اگر تو نرمی سے اسے تیل دے' صفائی کر' ہر الجھن نکل جائے گی۔" بہت حد تک اس کی سمجھ میں امی اور بسامہ کی باتیں آنے لگی تھیں۔ اب اس نے لوگوں کی باتوں پہ دھیان دینا چھوڑ دیا تھا۔

اپنے آپ کو مصروف کر لیا۔ صبح اٹھ کر نماز پڑھی قرآن پاک کھولا۔ اس نے عرصے بعد قرآن کھولا تھا۔ تعلیمی مصروفیت کی وجہ سے وقت ہی کب ملتا تھا۔ جب وہ آٹھ سال کا تھا تب ابو اسے مسجد کے مولوی کے پاس شام کو لے جاتے۔

"مولوی صاحب' آپ اسے حفظ کروائیں۔"

"بھئی حفظ شام میں نہیں صبح میں ہوتا ہے' روزانہ فجر کے بعد لایا کرو۔"

وہ اسے پابندی کے ساتھ اپنے ساتھ لے جاتے'

چھوڑ کر دوبارہ آٹھ بجے لیٹنے آتے تھے۔ وہ سورتوں والا سپارہ (تیسواں) یاد کر رہا تھا۔ پورے سال بعد اسے ایک سپارہ یاد ہوا تھا مگر ابو نہیں رہے' کچھ لانے لے جانے کا مسئلہ بنا۔ پھر اسکول کا بھی کام رہ جاتا تھا۔ کسی دن مسجد جاتا کسی دن چھٹی' کبھی شام کو جا کر سنا آتا' کبھی کسی پڑوسی کے ساتھ۔ دو تین سالوں میں دو سپارے ہوئے۔ اسکول کا کام بڑھتا گیا' سپارہ یاد نہ کرنے پر مولوی صاحب کی مار..... اس نے پھر سپارہ چھوڑ دیا۔

"گرمیوں کی چھٹیوں میں کروں گا"

چھٹیوں کی الگ مصروفیت' یکسوئی نہیں تھی' ناظرہ تو ہو گیا تھا' مگر حفظ نہیں۔ اب جب دل سے قرآن پاک کھولا تو اک جھماکا سا ہوا تھا۔ حفاظ کو بیس اضافی نمبر دیے جاتے ہیں' بیس نمبر کم نہیں تھے۔ پورا ایک پرسنٹ ایگریگیٹ بڑھتا ہے۔ ایگریگیٹ کا مطلب ہے امیدوار کے میٹرک کے حاصل کردہ نمبروں کا دس فیصد' ایف ایس سی کے حاصل کردہ کا چالیس فیصد اور انٹری ٹیسٹ کے نمبروں کا پچاس فیصد کا مجموعہ مل کر جو پرسنٹ ایج بنائے اسے میڈیکل کے میرٹ کا ایگریگیٹ کہا جاتا ہے اور U.H.S (یونی ورسٹی آف ہیلتھ اینڈ سائنسز) جس طرح سخت اور مشکل طریقہ کار سے انٹری ٹیسٹ لیتا ہے بالکل اسی طرح حفاظ کا سخت ترین ٹیسٹ لے کر ایف ایس سی کے نمبروں میں بیس اضافی نمبر بڑھا دیے جاتے ہیں۔ حماس کے دماغ میں فوراً "کلک ہوا۔

"میرے پاس پورا ایک سال ہے' کیوں نہ میں اپنا ادھورا چھوڑا قرآن حفظ کرلوں' اللہ کا کلام ادھورا چھوڑا اسی لیے سزا ملی ہے' پورے بیس نمبر بھی ثواب کا ثواب' اللہ بھی خوش میں بھی۔"

☼ ☼ ☼

اس نے مسجد کے مولانا سے بات کی تھی۔
علی الصبح اٹھ کر یاد کرتا' فجر کی نماز کے بعد مولانا کو سنا آتا۔ اک لگن تھی' جنون تھا اور پھر اب فراغت بھی تھی۔ اسے تیزی سے یاد ہونے لگا۔ دن میں اپنی کتابیں' نوٹس دہراتا۔ شام کو ٹیوشنز بھی شروع کر دیں اور ساری رات اس کی اپنی تھی۔ ذہانت اللہ کی دین تھی۔ وقت کا بہترین مصرف ہو تو پتا بھی نہیں چلتا۔ بسامہ سے کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی کیونکہ وہ بھی وہاں بزی ہو گئی تھی۔ ویسا ہی جنون پھر سے شروع ہو گیا۔ وہی جھلساتی گرمی' سخت رمضان اور مشکل ترین ٹیسٹ کی تیاری۔ اکیڈمیز کا بزنس عروج پر تھا۔

بسامہ کو یہ سن کر حیرت ہوئی کہ وہ اب خود ہی تیاری کر رہا ہے۔

"کیوں' تم نے اکیڈمی ابھی تک جوائن کیوں نہیں کی۔"

"ہاں ابھی نہیں کی' سارا طریقہ کار مجھے پتا ہے' نوٹس اور سلیبس ہیں' میں گھر پر تیاری کر رہا ہوں' ضرور انہیں پچاس' ساٹھ ہزار دینے ہیں۔"

"تم اپنی الٹی شنسی رہنے دو' اکیڈمی جوائن کرو' ان کے پاس نئی معلومات آتی رہتی ہیں' طریقہ کار بدلنے کا پتا چلتا رہتا ہے۔"

"ظاہر ہے' ان ہی کے بزنس کے لیے ٹیسٹ رکھا ہے' اور اس نئی معلومات کے لیے میں اپنی ماں کی حق حلال کی کمائی روڑھ (بہا) دوں....."

"فضول نہیں بولو۔ اگر پیسوں کا پرابلم ہے تو میں پاپا سے ابھی بات کرتی ہوں' ہاں....."

"جی نہیں' ابھی اتنا برا وقت نہیں آیا مجھ پر..... کرلوں گا جوائن' ایک بار پھر جو اسی۔"

"حماس کچھ پانے کے لیے ہمیں کچھ تو لگانا پڑے گا۔"

اس نے اپنے اسکالرشپس اور ٹیوشنز جمع کر کے اکیڈمی کی فیس جمع کروائی تھی۔ اب کی بار زینت سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔ اسے پتا تھا کہ چند مہینے بعد ایڈمیشن کے لیے بھی اسی خاصی رقم چاہیے ہو گی تب دیکھا جائے گا۔ قرآن پاک اس کا مکمل ہو گیا تھا' اب وقت نکال کر دہرائی کر رہا تھا۔ ایک سال میں قرآن پاک حفظ کر لینا معمولی بات نہیں ہے اور صرف حفظ نہیں بحرف۔ بحرف۔ اعراب۔ کے ساتھ سورتوں کی

ترتیب، سنولیس، سجدے، رکوع، پوری ترتیل کے ساتھ ایک مجھے حافظ کی طرح بس بٹن دباؤ اور وہ بتا دے۔ جس کے دماغ میں یہ سب صرف ایک سال کے عرصے میں سما جائے وہ کوئی عام دماغ تو نہیں ہو سکتا۔ وہ یقیناً دنیا کا طاقتور، کامیاب دماغ تھا۔ اس کے آگے انٹری ٹیسٹ کیا معانی رکھتا تھا۔

اس بار تو اس نے مہینے پہلے ہی باہر کی ہر چیز خود پر حرام کرلی تھی۔ جیسے مردہ جانور یہاں تک کہ زینت نے پھیری والے سے خربوزے لیے۔ کاٹ کر اس کے آگے رکھے۔ اس نے حیرت سے دیکھتے ہی بھنوئیں سمیٹ لیں۔

"امی میں نہیں یہ کھا رہا۔"

"کیوں... کھالے بہت میٹھے ہیں۔" انہوں نے ایک قاش کھا کر چکھا واپس پلیٹ میں رکھا۔

"چاہے یہ کھا کر مجھے ہیضہ ہو جائے۔"

"پاگل ہو گیا ہے، کیسی باتیں کر رہا ہے۔" ان کے ہاتھ والی قاش ہاتھ میں ہی رہ گئی۔

"امی بس ٹیسٹ کے بعد ہی ایسی رسکی چیزیں کھاؤں گا۔"

تربوز تو اس نے کہہ رکھا تھا۔ گھر میں بھی نہ آئے، ہر طرح کی احتیاط... ٹیسٹ والے دن بسامہ نے بہت دیر اس سے بات کی اور بار بار ایک ہی جملہ...

"دائرہ بھرنے سے پہلے، دونوں کا ہیڈ پر سیریل چیک کرلینا... کنفیوژ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"اوکے ڈونٹ وری یار..."

اس نے فتح کا نشان لمبی دعائیہ نظم کے ساتھ بھیج دیا۔

جواباً اس نے دوستی کی عظمت پر شعر بھیجا۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت ہشاش بشاش باہر آیا تھا۔ گھر آتے ہی سب سے پہلی جو کال ریسیو کی وہ بسامہ کی تھی۔

"کیا سارے ٹھیک ہو گئے؟" اس کی خوش کن آواز سے اندازہ ہو رہا تھا۔

"نہیں، سارے تو خیر کسی کے بھی نہیں ہو سکتے مگر زبردست ہو گیا ہے نوے فیصد ایگریگیٹ کہیں نہیں گیا۔ اور شام تک اس کا اندازہ بالکل درست نکلا تھا۔ اسکرین پر آنسر کی آچکی تھی۔ اس کا ایگریگیٹ نوے فیصد بنتا تھا۔

"یہ تو K-E (کنگ ایڈورڈ) کا میرٹ ہے... زبردست۔" بسامہ نے کہا۔ بلکہ وہ اگلے دن چھٹی لے کر اسے مبارک باد دینے آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مبارک، سلامتی، خوشیاں زینت نے نہ صرف نفل پڑھے۔ بلکہ فوراً پیسے نکال کر میٹھی دیگ منگوائی اور سارے محلے میں بانٹی۔

"میرے حماس کے نمبر اچھے آگئے ناں اب ڈاکٹر بنے گا۔ ہم تو اس گھر میں ہی اسپتال بنالیں گے اوپر رہائش۔"

انہوں نے لمبی منصوبہ بندی شروع کردی۔ اٹھتے بیٹھتے، جمع تفریق، توڑ جوڑ، کتنے جوڑے روز سلائی کروں کہ اس کی فیس اور کتابوں کا خرچا نکل آئے۔ چلو شکر ہے، نمبر بہت اچھے آئے اب ہاسٹل کا خرچ تو بچے گا، یہاں اپنے لاہور میں ہی داخلہ مل جائے گا۔" زینت کی یہ خود کلامیاں تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ مارکیٹ جانے کی تیاری میں تھا۔ جب اس کی جیب میں موبائل تھرتھرایا۔

"بسامہ کالنگ۔" اس نے بٹن دبا کر موبائل کان سے لگایا۔

"ہاں کہاں ہو بھئی... ڈاکٹر حماس۔"

اس کے چہرے پر ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ خوشی سے بولا تھا۔ "مارکیٹ جا رہا ہوں۔ امی کے ساتھ۔"

"کیوں خیریت...؟"

"شاپنگ پر... میں نے سوچا، دو چار ڈھنگ کے جوڑے ہی لے لوں۔ سنا ہے میڈیکل کالج کی لڑکیاں

بڑی خوب صورت ہوتی ہیں۔"
"لعنت ہے تم پر۔" اس کے منہ سے برجستہ نکلا اور حماس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ پھر وہ حق جتاتے انداز میں بولی تھی۔
"اگر کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ناں، تو تمہاری آنکھیں نکال کر ڈائی سیکشن (جس پر طلبہ سرجری سیکھتے ہیں) میز پر سجاؤں گی، سمجھ آئی۔"
"ہاہاہا۔ یو جیلس۔" اس نے بہت اونچا قہقہہ لگایا تھا۔ زینت بیٹے کو ہنستا دیکھ کر ہر ماں کی طرح خوامخواہ ہی ہنسنے لگیں۔
"تم سے جیلس ہوتی ہے میری جوتی۔ ہونہہ۔"
"اچھا! اس کے انداز پر وہ اندر تک محظوظ ہو رہا تھا۔
"اچھا چلو، تمہاری بات مان لیتا ہوں مگر نظریں نیچی کر کے چلتے اگر کسی لڑکی سے ٹکرا گیا، یار! تو پھر وہ میری آنکھیں نکال دے گی۔ اف میں کہاں جاؤں۔"
"جہنم میں جاؤ۔ وہاں ڈیڈ باڈیز زیادہ ملیں گی، تجربات کر لینا۔"
"اگر تم ساتھ چلنے کو تیار ہو تو یقین مانو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"
"دفع ہو جاؤ، مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ فون بند کرنے لگی۔
"اچھا اچھا سوری یار۔ میں مذاق کر رہا تھا۔ بتاؤ فون کیوں کیا؟"
"یہ کہنا تھا کہ کتابیں مت خرید لینا۔ میرے پیپرز ہونے والے ہیں، فری ہو جائیں گی اور وہ جو احسان عظیم کیا تھا نا اوور آل دے کر۔ وہ پھٹ گئے ہیں، اپنا خریدو تو میرا بھی لے لینا۔ اور ہاں ابھی سے پہن کر گلی میں گھومنا مت شروع کر دینا، لوگ مذاق اڑائیں گے۔"
"اور کوئی حکم۔" وہ اترا کر بولا اور ساتھ ہی کہا "ارے واہ، پرانی کتابیں دے کر مجھ سے نیا اوور آل مانگ رہی ہو، بڑی چالاک ہو۔"
"ہاہاہا۔" اب قہقہہ لگانے کی باری اس کی تھی۔
"او کنجوس! میں تمہارے لیے اوور آل خرید چکی ہوں،

مت خریدنا۔"
"چلو پھر جہاں کتابوں اور اوور آل کی مہربانی کر رہی ہو تو میری فیس بھی جمع کروا دینا۔ ایک لاکھ کے قریب بنتی ہے۔"
"کیوں، ایک لاکھ کیوں۔؟" وہ اس کی شوخی کو تو بھانپ گئی تھی مگر فیس کا غلط اندازہ۔
"تمہارا میرٹ تو لاہور کا پکا بنے گا، تمہیں ہاسٹل کی کیا ضرورت، یہ تو میرے جیسے ہیں، لاہور سے فیصل آباد آ گئے پڑھنے، کچھ نمبر اور آ جاتے تو میرا بھی لاہور کا میرٹ بن جاتا۔" اس کی لاچارگی پر وہ مزید شوخا ہوا تھا۔
"تو ڈھنگ سے پڑھ لیتی ناں، سوال غلط نہ کرتیں، نالائق۔"
"زیادہ شوخا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ سچ مچ چڑ گئی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ آج وہ بہت موڈ میں باتیں کر رہا ہے "پچھلا سال بھول گئے، جب فٹ بال اور کاغذ پھاڑتے تھے اور وہ ٹوٹیاں میں، بھولی نہیں ہوں، مسٹر جینئس۔" وہ نچلا لب دبا کر ہنسی روکتا بے حد محظوظ ہو رہا تھا۔
"اچھا فائلز کب جمع کروا رہے ہو۔" بسمہ نے موضوع بدل دیا۔
"آج حفظ کا ٹیسٹ ہو گیا ہے، کچھ دن بعد ایڈمیشن فارم جمع ہونے شروع ہو جائیں گے، پندرہ دن بعد میرٹ لسٹیں۔"
"او کے، پھر میں آؤں گی، کاکے کو پہلے دن کالج بھی تو چھوڑ کر آنا پڑے گا، ایسے ہی ناں ٹکراتا پھرے۔"
اس نے کہہ کر کھٹ فون بند کر دیا اور اسے بند فون دیکھ کر ڈھیر ساری ہنسی آئی۔ وہ دونوں ابھی تک سمجھ نہیں پائے تھے کہ ایک دوسرے سے بات کر کے وہ اتنے خوش کیوں ہوتے ہیں۔ شاید بے ریا، بے غرض دوستی یا شاید کچھ اور۔ کیا کچھ اور، ابھی یہ واضح نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

اس ایک ڈیڑھ مہینے کا بالکل پتا نہیں چلا تھا۔ اس کے ڈاکومنٹس یو ایچ ایس میں جمع ہو گئے تھے۔ چند دن

تک یونی میں میرٹ لسٹیں لگ جاتیں۔ صحیح کہا تھا بسامہ نے کچھ ناممکن نہیں ہے۔۔۔ آہ۔

واقعی زندگی میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ لسٹیں دیکھ کر حماس کی آنکھیں ناقابل یقین حد تک پتھرا گئی تھیں۔ منہ کھلا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے' ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں' اتنا بڑا اپ سیٹ میرٹ میں کیسے ہو سکتا ہے۔" سب کی زبانوں پر یہی تھا۔ کیونکہ دن ڈھلے یو ایچ ایس کی ویب سائٹ پر پنجاب کے سترہ میڈیکل کالجز کی میرٹ لسٹ لگا دی گئی تھی۔ اور اس سال میرٹ ناقابل یقین حد تک بڑھ گیا تھا۔ لسٹ لگنے سے چند دن پہلے سوشل میڈیا اور اخبارات میں دبی دبی خبریں تھیں۔ اس سال ذہین ترین بیچ سامنے آیا ہے سیٹیں کم ہونے کی وجہ سے میرٹ بڑھ سکتا ہے' سب اسٹوڈنٹس کا اندازہ تھا کتنا بڑھ جائے گا زیادہ سے زیادہ دو پرسینٹ اتنا بھی کبھی نہیں بڑھا' یہ کوئی خاص پریشانی کی بات نہیں تھی۔ لیکن اس سال یہ نہیں ہوا' ذہین بچوں کی یلغار یو ایچ ایس کی محدود سیٹوں کے کنٹرول سے باہر ہو گئی۔ بچے چکرا کر رہ گئے۔ لیکن حماس کی آنکھیں کیوں پھٹ گئیں۔ وہ تو سیف زون میں تھا اور نوے فیصد ایگریگیٹ کے باوجود اس کا نام سترہ میڈیکل کالجز میں سے کسی میں بھی نہیں تھا۔ اس سے کم میرٹ والے بچے لسٹ میں موجود تھے۔

☼ ☼ ☼

بسامہ نے ساری لسٹیں کھنگال لیں' کہیں اس کا نام نہیں تھا۔ وہ بار بار اسے کال کر رہی تھی' میسجز کر رہی تھی مگر کسی کا کوئی جواب نہیں' وہ بے حد بے چین تھی۔ اس نے پاپا کو فون ملایا اور فوراً" پوچھا۔

"پاپا' یہ یہ سب کیا ہے' میرٹ کا پتا چلا آپ کو؟"

"ہاں پتا تو چلا ہے' کہہ رہے ہیں اس بار کوئی بہت بڑا اپ سیٹ ہوا ہے' میرٹ کچھ اوپر ہو گیا' میرا دوست ہے ڈاکٹر اس نے بتایا' بڑ 87 والے گیا بڑ 88 والے رہ گئے ہیں' 88.68 تک میرٹ گیا ہے۔"

"ہوں۔۔۔" وہ تاسف سے بولے "اچھا وہ تمہارے فرینڈ کا کیا بنا' کہاں ہوا اس کا۔"

"میں نے اسی لیے فون کیا ہے' وہ 90% پر تھا اور اس کا نام کسی لسٹ میں نہیں ہے۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ تم نے خود اس کا ایگریگیٹ چیک کیا' کیا پتا اس نے جھوٹ بولا ہو۔" وہ اپنے مخصوص آرام دہ لہجے میں بول رہے تھے۔

"میں نے خود چیک کیا ہے' کئی بار کیا ہے۔۔۔ وہ فون بھی نہیں اٹھا رہا' پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔" اس کی آواز ایسے بکھر رہی تھی جیسے شدید پریشانی میں پھیل جاتی ہے۔

"پاپا۔۔۔" وہ تلخ گھونٹ بھر کر بولی۔

"اس نے فائل جمع کروائی ہو گی ناں۔۔۔؟" وہ رک رک کر بولی تھی۔

"اگر نہیں کروائی تو انتہائی حماقت کی ہے اس نے۔" وہ کچھ توقف سے بولے تھے۔ "تم پریشان مت ہو' تمہارا صبح لاسٹ پیپر ہے۔ اس پر concentrate (دھیان) کرو۔ میں پتا کرتا ہوں۔"

"اوکے پاپا۔" اس نے رندھی آواز میں کہہ کر فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

نیاز محمد ٹرے میں قہوے کا کپ لے کر ڈاکٹر سبطین کے پاس آیا تھا۔ انہوں نے کپ اٹھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"حماس حیدر اپنے گھر پر ہی ہے۔۔۔"

"جی صاحب' آج کل تو بہت تیاری کر رہا ہے۔ ڈاکٹری پڑھنے جائے گا ناں۔"

"ہوں۔۔۔" انہوں نے قہوے کا گھونٹ بھرا۔ "اچھا ایسا ہے' آج جب گھر جاؤ تو ضرور پتا کر کے بتانا اس کا ایڈمیشن کس کالج میں ہوا ہے' مجھے فون کر دینا۔" وہ سرہلاتا چلا گیا۔

ڈاکٹر عندلیب ٹی وی پر کوئی ڈاکومنٹری دیکھ رہی تھیں' متوجہ ہوئیں۔

"کیوں۔ کیا بات ہے کوئی مسئلہ ہے؟"
"ہاں' بسامہ کہہ رہی تھی اس کا نام لسٹوں میں نہیں ہے۔"
"ایسا کیسے ہو سکتا ہے' میں نے خود اس کا ایگریگیٹ چیک کیا تھا' 90 سم تھنگ تھا۔"
"چلو پتا چل جائے گا۔" وہ تو اپنی روزمرہ کی باتوں کی جانب چلے گئے تھے مگر بسامہ سے پیپر کی تیاری کرنا مشکل ہو گئی تھی۔ سب سے مشکل مضمون اناٹومی کا پیپر تھا اور حماس کی فکر' وہ کئی گھنٹے کی مسافت پر تھی اور دل چاہ رہا تھا اڑ کر پہنچ جائے۔ نیاز محمد نے گھر جاتے ہی پتا کیا۔ بہت دیر بعد دروازہ کھلا' زینت کی حالت کسی مردے جیسی تھی۔ نیاز کے پوچھنے پر اس نے جو کچھ بتایا اس کی تو سمجھ میں گاڑھی باتیں نہیں آئی تھیں البتہ اس نے کال ملا کر ڈاکٹر سبطین سے اس کی بات کروادی۔
وہ پیپر دیتے ہی ڈائیو میں بیٹھ کر لاہور آگئی تھی۔ اسے گھر آکر پتا چلا تھا حماس کے ساتھ ہوا کیا۔ "وہ حیران تھی کہ حماس اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتا ہے۔"
"ہو جاتا ہے' ہو جاتا ہے' اوور کانفیڈنس میں اس طرح ہو جاتا ہے۔"
"نہیں سبطین! یہ بہت بڑا اپ سیٹ ہے' اس میں بچے کی غلطی بہت کم ہے۔۔۔ میرٹ بھی تو حد ہو گئی۔"
"بھئی وہ پرفارما کس لیے ہوتا ہے' آپشنز لکھنے میں حرج کیا تھا' آخر کچھ بھی ہو سکتا ہے' غلطی تو ہے۔"
ڈاکٹر سبطین کی وضاحت۔
"آئی کانٹ بلیو۔" کہتے ڈاکٹر عندلیب نے جھرجھری لی۔ "شکر ہے بسامہ کا پچھلے سال ہی ہو گیا تھا ورنہ اس سال کا میرٹ اف۔۔۔!
ان دونوں کی گفتگو وہ پتھرائے وجود کے ساتھ سن رہی تھی۔ پھر شام کو اس کی طرف چلی گئی۔
"واٹ ربش۔" وہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی دھاڑی تھی۔
حماس حیدر ڈاکٹر بننے کے لیے پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ان ہونی ہونا ہی تھی۔ وہ اپنے تمام

ڈاکومنٹس لے کر یو ایچ ایس گیا' وہاں سے فارمز لیے' بھر کے جمع کروا دیے۔ اور سب کو یقین تھا کہ اس کا نام K.E کی لسٹ میں آئے گا۔ اگر میرٹ بڑھ گیا جیسا کہ اڑتی خبریں تھیں تو دوسرے نمبر پر علامہ اقبال میڈیکل کالج اور اگر مزید بڑھ گیا جس کا ہرگز امکان نہیں تھا تو تیسرے نمبر پر Sims (سروسز میڈیکل سائنسز) میں تو ہر صورت پکا ہے۔ بہرحال یونی ورسٹی سترہ چوائسز کی آفر کرتی ہے۔ وہ پورا فارم فل کرنے کے بعد چوائسز والا پرفارما بھرنے لگا۔ سب سے پہلے اس نے "K.E" لکھا۔ پھر "علامہ اقبال میڈیکل کالج" لکھتے اس کا پین اٹکا اسے جھٹکا دے کر "Sims" لکھا پھر "شیخ زید" پر پین رک گیا۔ تین چار جھٹکے دیے۔ "امیر الدین" کا نام لکھنے کے بعد پین نے بالکل چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے بارہا جھٹکا۔ ہاتھ پر لکھ کر دیکھا۔ غصہ بھی آیا کہ میں کون سا پین اٹھا لایا۔ وہ فارم لے کر گھر بھی جا سکتا تھا کل جمع کروا دے گا۔ مگر اب جائے آئے۔ اس نے ساتھ بیٹھے ایک بچے کے والد سے کہا جو اپنے بیٹے کا فارم بھروا رہے تھے۔
"ایکسوزمی انکل' آپ کے پاس ایکسٹرا پین ہو گا؟"
"نہیں بیٹا' ایک ہی ہے۔۔۔ ابھی تھوڑی دیر میں فارغ ہو جاتا ہے۔" وہ ابھی کہہ ہی رہے تھے کہ ان کی نظر حماس کے ایگریگیٹ پر گئی "90" واہ بیٹا۔۔۔" انہوں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔
"آپ کو ساری چوائسز لکھنے کی کیا ضرورت ہے' آپ کا تو K.E کا میرٹ ہے۔
بیٹا! آپ تو کسی ایک کالج کا بھی نام لکھ دو' آپ کا پکا ہونا ہے' یہ دس دس آپشنز تو میرے بیٹے جیسوں کے لیے ہے جو بمشکل میرٹ پر آ رہے ہیں کہ چلو اگر ٹاپ کے کالجز میں نہیں نام آتا تو کہیں دور دراز بھی پڑھنے کے لیے تیار ہیں۔"
ان کے لہجے میں وہی وثوق تھا جو رزلٹ کے بعد سے اپنے لیے سنتا آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اکیڈمی مٹھائی لے کر گیا تو اساتذہ نے بھی یہی یقین دہانی کروائی

تھی کہ پچھلے کئی سالوں سے K.E کا یہی 90٪ میرٹ
ہے۔ اس نے کچھ دیر بیٹھ کر سوچا۔ پھر اٹھ کر اپنا فارم
جمع کروا دیا۔ ایک شخص کاؤنٹر پر بیٹھا فارم جمع کر رہا تھا۔
اس کا فارم بغور دیکھا تمام ڈاکومینٹس چیک کیے اور
پرفارما دیکھتے سرسری سا پوچھا۔

"بس فائیو چوائسز... لاہور ہی۔"

"جی..." اس نے سادگی سے کہا۔

نہ اس کی ماں باپ پڑھے لکھے تھے' نہ بہن بھائی تھا
کوئی فیملی میں دور دور تک کسی نے کالج کی شکل نہ دیکھی'
کیا میڈیکل کالج کی پیچیدگی سمجھ سکتے۔ بسامہ سے ہر
موضوع پر بات ہوتی تھی سوائے پرفارما بھرنے کے'
ایگریگیٹ کچھ کم ہوتا تو شاید وہ اس موضوع پر بات
کرتے۔ بس یہی تھا کہ لاہور میں پکا ہے۔ پھر فکر کیسی؛
لاہور کے تو اس نے پانچوں کالجز کے نام لکھ دیے
تھے۔ فرض تو فارم چیکر کا بنتا تھا وہ اپنے پاس سے قلم
دے کر بھروالیتا' بچے کو گائیڈ کرتا مگر اس نے سرہلاتے۔

"اوکے' بیسٹ آف لک۔"

کہہ کر بچی ہوئی بارہ لائنز پر ایک لکیر کھینچ دی۔ جس
کا مطلب ہے بچے کو باقی چوائسز سے کوئی دلچسپی نہیں
اور وہ لکیر حماس حیدر کی قسمت پر کھینچ گئی تھی۔

میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ایک گورکھ دھندا ہے'
کیوں کہ اگر فارم فل کرتے ہوئے اپنی چوائس میرٹ
کی ترتیب سے نہ لکھی یا پھر آپ کسی کالج کے میرٹ
پر آرہے ہیں لیکن اس کالج کا نام آپ کی چوائس میں
شامل نہیں تو میرٹ پر ہوتے ہوئے بھی آپ کو داخلہ
نہیں ملے گا اور آپ سے کم میرٹ والا بچہ کالج کا نام
لکھ دینے کی وجہ سے سیٹ حاصل کرلے گا۔ یہی
حماس حیدر کے ساتھ ہوا تھا۔ جو کم فہمی کے بنا پر اس
سال بہت سے بچوں کے ساتھ ہوا ہے۔ اور یہ غلطی
انہیں پاگل کر دینے کے لیے کافی ہے۔ آہ یہ سسٹم۔

"تم اتنی بڑی غلطی کیسے کرسکتے ہو حماس۔" بسامہ
اس سے مخاطب تھی جو نہ رو رہا تھا نہ ہنس رہا تھا۔

"مجھ سے ہی پوچھ لیتے' ایٹ لسٹ پاپا مما شہر میں
تھے ان کے پاس فارمز لے جاتے' میرا انہوں نے فل
کیا تھا اور تم نے یہ کیا کر دیا اپنے ساتھ۔" اس نے یک
لخت اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ وہ سنگ
مرمر کی طرح کرسی پر جما بیٹھا تھا ذرا نہیں ہلا۔ اس نے
کندھے چھوڑ کر غصے سے رخ پھیر لیا سینے پر ہاتھ
باندھے کچھ سوچ رہی تھی۔

"آخر سب چوائس لکھنے میں حرج کیا تھا' حماس!"

وہ ایک بار پھر اس کی جانب پلٹی۔

"88.6٪ والے کا ایڈمیشن ہو گیا ہے اور تم 90٪
پر ہو کر رہ گئے' او مائی گاڈ! اب کیا ہوگا... کیا کرو گے؟"

وہ پاؤں پٹخ کر باہر بیٹھی زینت کی جانب بڑھی جو منہ
پر دوپٹہ رکھے روئے جا رہی تھیں۔ وہ سامنے سے چلی
گئی تھی۔ اس کے لفظ پیچھے رہ گئے تھے "اوہ مائی گاڈ!
اب کیا ہوگا' کیا کرو گے' کیا کرو گے' کیا کرو گے۔" ان
لفظوں کی گونج میں وہ تمام افراد نگاہوں کے سامنے آ
رکے جو پچھلے سال ہمدردی کے نام پر امی پر طنز کرنے
آئے تھے۔ اور رات نیاز محمد فون جیب میں ڈالتے
ہوئے خاصا زور سے کہہ رہا تھا۔

"لے باجی' چاول تو تو نے یوں بانٹے تھے جیسے تیرا
لڑکا ہسپتال کھول کر بیٹھ بھی گیا ہو' وہ تو پھر فیل ہو گیا۔
اس سے اچھے تو میرے لڑکے ہیں کم از کم پڑھائی پر پیسا
برباد تو نہیں کیا' موٹروں کا کام سیکھ رہے ہیں۔"

"میں نے سب برباد کر دیا' اپنی ماں کا پیسہ' امید'
خواب..."

پھر وہی گونج "اب کیا کرو گے..." یعنی کہ میں ایک
ناکام انسان ہوں' مجھے بروقت فیصلے کرنے نہیں آتے۔
پھر ایسے لوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہونا
چاہیے... پہلے طبیعت نے دھوکا دیا' اب قلم نے'
مجھے دو قلم رکھنے چاہئیں تھے' اس لڑکے کے قلم کا
انتظار کرلیتا... گھر آسکتا تھا' مگر مجھے فیصلے کرنے نہیں
آتے۔ اب کیا کرو گے..."

وہ یک لخت اٹھا کچن کی جانب بڑھا اور نچلے خانے
سے ایک بوتل نکالی اور غٹ غٹ چڑھالی۔ زینت کی
نظر اس پر گئی تھی' وہ چلا کر دوڑیں... "ہائے یہ تو تیل
ہے۔"

"حماس… حماس۔"

ایمرجنسی کی جانب ڈاکٹرز تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ وہ اسپتال کے کوریڈور میں دیوار سے ٹیک لگائے ہونق بنی کھڑی تھی۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کی ٹانگوں سے جان نکل رہی ہے اور وہ دیوار سے پھسلتی نیچے گرتی جارہی ہے۔ زینت ایک بینچ پر بیٹھی کبھی بین شروع کردیتیں، کبھی تسبیح۔ ایک ادھیڑ عمر ڈاکٹر زینت کے پاس سے گزرتے ہوئے خاصے غصے سے بولے تھے۔

"بی بی! یہ جو بچہ اندر ہے، یہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے کہ مٹی کا تیل اسپرائٹ سمجھ کر پی لے، اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے، بچ بھی گیا تو کیس بنے گا، پولیس کیس۔" بسامہ کے تو پتنگے لگ گئے۔

"اچھا!! یہ پولیس کیس تو بڑا نظر آگیا آپ کو، اور جو اس ملک میں دوسرے کیس ہیں، وہ دکھائی نہیں دیتے۔"

"آپ کہنا کیا چاہ رہی ہو۔" وہ ڈپٹ کر بولے۔ اس کا لہجہ تلخ رہا۔

"خدا کے لیے ڈاکٹر، آپ اس کی زندگی کو بچائیں … ورنہ آج یہاں ایک کیس نہیں بہت سے کیس ہوں گے۔"

استقبالیہ پر کسی نیوز چینل کے نمائندے حسب رواج بلا اطلاع چھاپے مار پروگرام کی کوریج کے لیے آئے ہوئے تھے اس کی چیخ دھاڑ سن کر ادھر ہی آگئے۔ کئی لوگوں نے روکا مگر انہوں نے مائیک آگے کرتے کہا۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں کیا ہوا ہے ادھر۔"

"کیوں… " وہ ویسے ہی دھاڑی۔ "کوئی تماشہ ہے ادھر، کوئی فلم چل رہی ہے، جو آگئے۔"

"نہیں نہیں بیٹے۔" اینکر پیار سے بولا "کیا ہوا؟ آپ بہت پریشان ہیں، کس کیس کی بات کر رہی تھیں، کیا ڈاکٹر چھٹی پر ہیں، ادویات نہیں ہیں… کیسا کیس آیا ہے۔"

"اس ملک کے سائیکو حکمرانوں کے کیس کی بات کر رہی ہوں۔"

"جی! اینکر سٹپٹایا۔ "آپ کیا کہنا چاہ رہی ہو۔"

"میں آنکھیں کھولنا چاہ رہی ہوں ان حکومتوں کی جنہیں یہ نہیں پتا کہ جو بچہ آج پیدا ہوا ہے، وہ اٹھارہ سال بعد کسی شعبے میں سیٹ مانگے گا، آبادی کئی گنا بڑھ رہی ہے اور سیٹیں وہی دس سال پرانی، سیٹیں کم ہونے سے میرٹ میں کتنے بڑے اپ سیٹس ہو رہے ہیں۔ آپ کو پتا ہے کل میڈیکل ایڈمیشن لسٹ لگی ہے۔"

"جی جی… سنا ہے، میرٹ کچھ بڑھ گیا ہے۔"

"صرف بڑھا نہیں ہے، بے حد بڑھ گیا ہے، بے حد…" وہ بہت زور سے بولی۔ "پچھلے سالوں سے تقریباً" ساڑھے تین فیصد، غضب خدا کا چھپن ہزار بچوں کے لیے چھپن سو سیٹیں بھی نہیں، سب ذہین بچے ایک جگہ آگئے، اس ملک کی کریم ضائع ہو رہی ہے، ینگسٹرز کو میرٹ کے نام پر ذہنی طور پر ٹارچر کر کے مفلوج کیا جا رہا ہے۔" چیختے چلاتے وہ بے سروپا بول رہی تھی۔

اس غیر متوقع تماشے سے اینکر کو اپنی لائیو رینٹنگ بڑھتی محسوس ہوئی۔ دوسرے چینلز حرکت میں آئے اور بہت سے کیمرے بریکنگ نیوز مرچ مسالا لگا کر پیش کرنے لگے۔ اصل بات کسی کو پتا نہیں تھی بس ہر اسکرین پر بسامہ چلا رہی تھی، اس کی آنکھوں میں سرخ گھٹا تھی۔

"ہر بات یہ کہہ کر ختم کردی جاتی ہے، یہ بھی ایک سازش ہے، ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کے علاوہ اس ملک کے اصل مسائل نظر نہیں آتے۔ تو پھر ٹھیک ہے، ہم نوجوانوں کے فیصلے اب ایوانوں کے بجائے سڑکوں پر ہی ہوں گے۔" وہ ایک سانس میں اپنے اندر کی بھڑاس نکال رہی تھی اور چینلز نے اس کی آواز کے ساتھ اپنی آواز شامل کردی کہ میو ہسپتال کے کوریڈور میں ایک لڑکی نے ہنگامہ بپا کردیا کہا جا رہا ہے وہ میڈیکل کالج کے میرٹ کے خلاف سڑکوں پر آئیں گی، ایک کیمرہ مین نے سر حال کچھ سمجھنے کے لیے

پوچھا۔

"آپ اصل مسئلہ تو بتائیں۔" ان ہونی کے خوف سے کانپتی آواز اس نے گہرا سانس لے کر قدرے بہتر کی۔

"میرے فرینڈ نے سوسائڈ کی ہے' کیوں کہ میرٹ بے حد بڑھ گیا اس سے چوائس میں غلطی ہو گئی' اگر اسے کچھ ہو گیا۔" اس کے پھر سے آنسو بہنے لگے۔

"تو یاد رکھیں۔" اس نے کیمرے کی آنکھ میں آنکھیں ڈالیں۔ "میں آگ لگا دوں گی' کسی کو نہیں چھوڑوں گی' وہ پھر بپھر گئی۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو...؟"

جس سڑک کے کنارے بنے اسپتال کے کوریڈور میں وہ ناگن پھنکار رہی تھی۔ اسی سڑک کے بہت دور دوسرے کنارے پر ایک گاڑی ہوا میں فراٹے بھرتی اشاروں کی پروا کیے بغیر تیزی سے ادھر ہی بڑھ رہی تھی۔ اس گاڑی کے ڈیش بورڈ پر سیل تھرکنے لگا۔ انہوں نے اچک کر دیکھا اٹھایا اور کان سے لگالیا۔

"سبطین! یہ سب کیا ہے' بسامہ نے کیا ڈراما لگا رکھا ہے۔" سبطین معمول کے مطابق کلینک پر تھے جب ٹی وی پر یہ تماشا دیکھا' مریض چھوڑ اندھا دھند بھاگے۔ ڈاکٹر عندلیب گھر پر ہی تھیں گھبرا گئیں۔ فوراً" میاں کو کال ملائی تھی کیوں کہ بسامہ تو اٹھا نہیں رہی تھی اور شام سے گھر سے یہ کہہ کر نکلی تھی کہ حماس سے مل کر ابھی آتی ہوں اور اب یہ تماشا۔"

"ہاں ہاں میں ادھر ہی جا رہی ہوں' پتا نہیں اس کا کیوں دماغ خراب ہوا ہے....."

"آخر بس لڑکے نے کیا کیا ہے.... میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔ اس کی دوستی اس لڑکے سے بڑھتی جا رہی ہے' مگر تمہیں تو کلاس ڈیفرنس نظر ہی نہیں آتا' جینئس ہے' فرینڈ ہے' آج بسامہ کی آنکھوں میں دوستی نہیں کچھ اور چمک رہا ہے.... مجھے بہت خوف آ رہا ہے سبطین۔"

"ہاں ہاں میں سمجھ رہا ہوں' کرتا ہوں کچھ' ڈونٹ وری۔" انہوں نے فون بند کر دیا تھا' اسپتال آ چکا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر تیزی سے اندر بڑھ رہے تھے۔

کوریڈور میں لگے مجمع کو چیرتے' اس کی بازو کو زور سے جھٹکا دیا۔ دھمکیاں دیتی چلاتی وہ لحہ بھر رکی پھر ان کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی کیمرے' اینکرز پیچھے پیچھے آ رہے تھے لیکن وہ پلک جھپک' اسے گاڑی میں پٹخ' گاڑی بھگا کر لے گئے۔

"بسامہ یہ سب کیا ہے؟"

"بڑی آئیں آگ لگانے والی' جنہیں تم دھمکیاں دے رہی ہو' لحہ لگائیں گی ایجنسیاں تمہیں اور تمہارے ماں باپ کو غائب کروانے میں' کیوں اپنے فیوچر اور ہماری زندگی کے پیچھے پڑی ہو اور کس کی خاطر' جس جاہل نے اپنی غلطی قبول کرنے کے بجائے کشی کرلی' مانتا ہوں تمہاری بات سیٹیں کم ہونے کی وجہ سے میرٹ اپ سیٹ ہوا' لیکن غلطی اس کی بھی ہے' اندھا تھا وہ' جب فارم پر واضح لکھا ہے کم از کم دس چوائس ضرور لکھیں تو ہاتھ ٹوٹتے تھے لکھتے ہوئے' اپنی غلطی بھی تسلیم کرنا سیکھو' چلی ہے تڑیاں لگانے' اس کی ناکامی میں اس کا اپنا ہاتھ ہے۔" بنا کسی مزاحمت کے اس نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے۔ اس کے سسکنے میں بے حد کرب تھا۔ وہ اللہ سے حماس کی زندگی مانگ رہی تھی کیوں کہ اس کی حالت بہت بگڑ چکی تھی۔

✿ ✿ ✿

گاڑی گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ جس طرح اسے بٹھایا تھا اسی طرح نکال کر کھینچتے کمرے تک لے گئے۔

"اس کمرے سے باہر مت نکلنا..... سمجھیں۔" کمرہ مقفل کر کے باہر صوفے پر دھپ سے بیٹھ گئے۔ عندلیب سامنے سر پکڑے بیٹھی تھیں۔

"تم پریشان مت ہو' میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں بندوبست.... ٹھیک ہو جائے گی یہ۔"

"عندلیب نے سر اٹھا کر میاں کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں بہت سرخ ہو رہی تھیں۔ آج انہیں پہلی بار احساس ہوا تھا اس غریب لڑکے سے اس کی دوستی اس

کی ذہانت سے متاثر ہونے تک نہیں رہی۔ کوئی اور روپ دھار گئی ہے۔ پھر اپنی ساکھ کی بھی فکر، اب تک توسب کو پتا چل چکا ہو گا کہ وہ تماشا ان کی بیٹی نے لگایا تھا۔ بار بار نگاہ اپنے لینڈ لائن پر جاتی، انہوں نے اٹھ کر اس کا تار زور سے کھینچا۔ اس کا پلگ سیٹ کے اندر ہی ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بڑبڑا رہے تھے۔

"ہونہہ! شاہوں کے مزاج کے خلاف، کبھی بارشیں نہیں برستیں اور یہ چلی ہے بیٹیں منظور کروانے۔"

☼ ☼ ☼
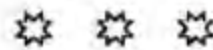
اس واقعہ کو گزرے تیسرا دن تھا۔ ڈاکٹر سبطین اور ڈاکٹر عندلیب دو دن سے طبیعت خرابی کا بہانہ کر کے کلینک نہیں گئے تھے۔ آج انہیں لازمی جانا تھا۔ ڈاکٹر عندلیب نے اسے ساری رات بہت سمجھایا۔ طبقاتی فرق، اپنا مستقبل، لیکن وہ ایک ہی بات کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے آپ جو بھی کہہ رہی ہیں، ایٹ لسٹ مجھے اس کی طبیعت کا تو پتا کر لینے دیں، میرا فون تو واپس کریں۔" اس کا موبائل سبطین کے پاس تھا۔ اور گھر سے نکلنے پر سختی سے پابندی لگا رکھی تھی اور نیاز محمد کو بھی سختی سے منع کیا گیا تھا کہ اس لڑکے کا کوئی ذکر گھر میں نہ کرے۔

وہ دونوں کلینک جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ جب وہ تھکی تھکی کمرے سے نکلی۔ سبطین کو باہر کی جانب نکلتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب میں کوئی بپ محسوس ہوئی۔ بسامہ کا موبائل تھرتھرا رہا تھا۔ انہوں نے نکال کر دیکھا۔ نام پڑھتے ہی ایک کھٹیلی نگاہ دروازے پر کھڑی بسامہ پر پڑی۔ کال کاٹ کر موبائل جیب میں ڈالا۔ وہ ہونٹوں کو تر کرتی لجاجت سے بولی۔

"میرا سیل تو دے دیں، مجھے واپس ہاسٹل جانا ہے۔"

"تم کہیں نہیں جا رہیں۔" ان کا لہجہ اٹل تھا۔

"تمہاری ایک ہفتے کی چھٹیاں ہیں، گھر پر آرام کرو۔" عندلیب نے خاموشی سے اپنا پرس اٹھایا، اک دکھ بھری نگاہ بیٹی پر ڈال کر باہر کی جانب قدم بڑھائے جبکہ سبطین کہہ رہے تھے۔

"میری اجازت کے بغیر گھر سے قدم باہر نہیں رکھو گی اور اگر رکھے تو وہ اس گھر میں تمہارے آخری قدم ہوں گے۔ سمجھیں، اب جاؤ اپنے کمرے میں۔" وہ شکوہ کناں نگاہ سے دیکھتی پاؤں پٹخ کر اندر مڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

گھر کا لینڈ لائن پلگ ٹوٹنے سے بیکار ہو چکا تھا۔ موبائل پاپا کے پاس، ملازمین کو وہ سختی سے منع کر کے گئے تھے۔ آج اسے پہلی بار حماس کے نیٹ یوز نہ کرنے پر دل کھول کر غصہ آیا۔ ورنہ لیپ ٹاپ کے ذریعے کسی نیٹ آئی ڈی پر رابطہ کر لیتی۔

"کنجوس، ڈھنگ کا موبائل بھی نہیں لے سکتا۔"

ان کی گاڑی ٹریفک کا حصہ بنی معمول کی رفتار سے بڑھ رہی تھی کہ پھر سے بپ ہونے لگی۔ انہوں نے رفتار کم کی۔ سیل چیک کیا۔ اب انہوں نے گاڑی نہیں بلکہ موبائل آف کر دیا اور گاڑی یوٹرن کی جانب بڑھائی۔

"کیا ہوا... کلینک نہیں جانا؟" عندلیب کے سرسری سوالوں پر وہ چبا کر بولے۔

"چلیں جائیں گے، پہلے اس لڑکے کو تو دیکھ لیں۔"

"وہ تو میو میں ہے۔ تم پیچھے جا رہے ہو۔"

"گھر چلا گیا ہے۔ پتا کیا تھا، میں نے..." ان کی گاڑی اوسط درجے کے علاقے میں داخل ہوئی اور لکڑی کے دروازے کے سامنے رکی۔ بوسیدہ لکڑی کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ پہلے ہی کھلا تھا۔ آگے پیچھے دونوں اندر داخل ہوئے۔ چھوٹے سے صحن میں چارپائی پر دو تین خواتین بیٹھیں زینت کے پاس حماس کی عیادت کر رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر چونکیں، معنی خیز نظروں کا تبادلہ ہوا۔ زینت اپنی حیرت پر قابو پاتی استقبال کے لیے اٹھی۔

"حماس کہاں ہے؟" ڈاکٹر سبطین نے پوچھا تھا۔

"وہ... وہ اندر ہے۔" وہ انہیں یوں اچانک دیکھ کر لجا سی گئی تھیں۔ وہ دونوں اندر کی جانب بڑھے۔

دوسری خواتین بھی اٹھ گئیں۔
"اچھا باجی ہم چلتے ہیں پھر آئیں گے۔"
"آپ اپنے مہمان دیکھو' اللہ بچے کو صحت دے۔" وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے سر کے نیچے رکھے چت لیٹا چھت گھور رہا تھا۔ پرانے سے کمبل کے اوپر سینے کی جانب اس کا بٹنوں والا موبائل دھرا تھا۔ اسے پتا چلا تھا کہ بسامہ نے اسپتال میں اچھا خاصا ہنگامہ کیا تھا۔ بے حد روئی تھی۔ اس کے والد اسے لے گئے تھے۔ وہ اس کی جانب سے فکر مند تھا۔

"پتا نہیں کیسی ہو گی' کیا ضرورت تھی شور مچانے کی کون سا مر جاتا' تا۔۔۔ اتنا کچی نہیں ہوں میں' اب فون بھی نہیں اٹھا رہی' طبیعت ہی۔۔۔ نہ خراب کر بیٹھی ہو۔" اس کی سوچوں میں قدموں کی چاپ کے ساتھ دو سائے مخل ہوئے۔ اس نے گردن پھیر کر دیکھا۔ قدرے چونکتے ہوئے' اٹھنے لگا تھا۔
"لیٹے رہو' ہمیں پتا ہے تم میں کتنی سکت ہے اٹھنے کی۔" ڈاکٹر سبطین کے منع کرنے کے باوجود وہ سلام کرتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ پاؤں سمیٹ لیے۔ موبائل پھسل کر گود میں آ گرا تھا۔ سبطین اس کے دائیں جانب اور ڈاکٹر عندلیب اس کی پائنتی پر کھڑی ہو گئی تھی۔ سینے پر بازو لپیٹے کہنی پر بیگ لٹکائے۔ وہ پہلے بھی اسے کئی بار دیکھ چکے تھے۔ کھلی رنگت' روشن چہرہ' بہت پر اعتماد بچہ تھا۔ مگر اس وقت زرد رنگت' مرجھایا چہرہ' نقاہت اس کے وجود سے چپکی لگ رہی تھی۔ انہیں دلی رنج بھی ہوا' انتہائی غصہ بھی آیا۔ ڈاکٹر سبطین نے بھنوئیں اچکا کر اک نظر بیگم کو دیکھا اور پھر حماس سے مخاطب ہوئے۔
"یہ مت سمجھنا کہ ہم تمہاری عیادت کے لیے آئے ہیں۔" وہ لفظ جما کر ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگے۔
"خوب جانتے ہیں کیسے ہو' کتنے پانی میں ہو' اور جو یہ دو کارنامے اوپر تلے کیے ہیں' اس پر تیم تو بنتی ہے' افسوس یا عیادت نہیں۔۔۔ تم خود کو جینئس لڑکے سمجھتے ہو' سیٹوں کی کمی اور میرٹ کے بڑھ جانے سے رو گئے' چلو مانا افسوس ہوا۔۔۔ پچھلی بار جو ہوا سو ہوا' مگر اس بار ذہین بچوں کے نمبروں نے میرٹ بڑھا دیا' وہ اپنی جگہ' مگر یہ مت بھولنا' فارمز فل کرنے میں تم صرف اپنی غلطی کی وجہ سے رہے ہو' ٹوٹل اپنی غلطی کی وجہ سے۔۔۔ میڈیکل سائنس جانداروں پر تجربے کرتی ہے اور اس میں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔
ہم تمہیں یہ سب بتانے نہیں آئے بلکہ یہ واضح کرنے آئے ہیں' ہماری بیٹی کو سیڑھی بنا کر یوز کرنے کی ضرورت نہیں ہے' وہ شہر کے مایہ ناز ڈاکٹرز کی بیٹی اور مستقبل کی ڈاکٹر ہے' اس کا کیریئر برائٹ ہے' اور تم۔۔۔ تم کیا ہو' ناکام لڑکے۔"
"ہونہہ۔۔۔ میرا مشورہ ہے اپنے اور اس کے کلاس اور کیریئر ڈیفرنس کو انڈر اسٹینڈ کرو۔"
حماس کتنی بار ان سے مل چکا تھا۔ سنجیدہ' مدبر سے جیسا کہ اکثر ڈاکٹرز ہوتے ہیں۔ اس کے تعلیمی کیریئر اور فیوچر پلاننگ پر سراہتے اس کا حوصلہ بڑھاتے تھے اور اس وقت ان کا لہجہ اور انداز اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ وہ پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے پہلی بار اپنا آپ کسی بلندی سے بری طرح گرتا محسوس ہوا۔ ان کا لمحے بھر کا توقف اس کے بدن میں چنگاری سلگا گیا۔
"انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے قطعی لہجے میں کہا۔
"میری بیٹی سے کم از کم دو میل دور رہنا' سمجھے' میں نہیں چاہتا اس کا کیریئر تباہ ہونے کی وجہ تم بنو۔" انہوں نے گردن سے ڈاکٹر عندلیب کو چلنے کا اشارہ کیا اور جانے کو مڑے۔
ڈاکٹر عندلیب چند قدم چل کر اب ان کی جگہ آ رکی تھیں' ان کی آنکھوں میں بہت نرمی تھی' لہجہ اس سے بھی زیادہ ملائم۔ وہ اس وقت اسے مزید کچھ کہنا نہیں چاہتی تھیں' بہت ہو چکا تھا مگر انہیں کہنا تھا۔
"میرا بھتیجا دو ماہ بعد چائنا سے ایم بی بی ایس کر کے آ رہا ہے' بے شک چائنا سے مگر۔۔۔ ایم بی بی ایس۔"
"وہ پریکٹس اور اسپیشلائزیشن یہاں پر کرے گا ہم نے بسامہ کی بات اس سے طے کر رکھی ہے' چند ماہ

بعد انگیج منٹ ہے۔ اگر تمہاری کوئی نیٹ آئی ڈی ہو تو ضرور دینا' انگیج منٹ کی پکس سینڈ کروں گی۔

"تم فرینڈ ہو ناں بسامہ کے۔۔۔ ہاں۔" انہوں نے اس کا گال نرمی سے تھپکا۔ "بیسٹ آف لک ڈیئر۔" کہہ کر میاں کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔

زینت دروازے کی چوکھٹ میں کسی سانس نکلی مورتی کی طرح ایستادہ تھیں۔ ایک تو اپنے سے بڑے لوگ گھر آجائیں' انسان ویسے ہی پریشر میں آجاتا ہے پھر جس طرح کی گفتگو انہوں نے سنی وہ تو ہل ہی نہیں سکیں۔ ان دونوں کو ماں بیٹے کی حالت پر دلی دکھ تھا اور ہمدردی بھی۔ اس طرح کی صورت حال میں اس طرح کا ماحول پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ کسی وقت بیٹھ کر آرام سے اسے سمجھائیں گے مگر موقع ہی نہ ملا۔ سب کچھ آنا "فانا" ہو گیا' بار بار اس کی کال۔ انہیں سب ٹھیک کرنے کے لیے سخت رویہ اختیار کرنا پڑا۔ اب انہوں نے زینت کو تاسفانہ دیکھا اور لہجہ قدرے نرم کر کے بولے۔

"یہ آپ کا اکلوتا بیٹا ہے' سمجھائیں' اپنی زندگی برباد کرے نہ میری بیٹی کی۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔ عندلیب نے میاں کی تقلید کی' انہوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی ہلکی سی جھرجھری لیتے کہا تھا۔

"اف بڑا مشکل تھا۔۔۔"

"مگر بالکل ٹھیک ہو گیا۔۔۔ آئی ایم شیور۔" انہوں نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔

☆ ☆ ☆

اس نے اپنے باریک گولڈن فریم کی عینک کو کن پٹی پر جماتے وائر ٹل چرخی۔۔۔ سے وائر کا سرا نکال کر گیج (جانچنے والا آلہ) پر سیٹ کیا اور مختلف آلات کی مدد سے اس تار کو جانچ کر مختلف زاویوں سے سیٹ کرنے میں منہمک رہا۔ کہنیاں ٹیبل پر جمائے کرسی پر خاصا آگے ہو کر بیٹھا نچلا ہونٹ چباتے کچھ سوچتے ہوئے قریب رکھے جدید کیلکولیٹر پر کچھ جمع تفریق کیا۔

"ہوں۔" ذرا سا سر اثبات میں ہلاتے خود کلامی کی پھر اس تار سے الیکٹرک کرنٹ گزارا۔ ٹیبل پر ساری بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ اس کی جونیئر کولیگ مس صدف مسکراتے ہوئے لیب میں داخل ہوئی۔ ایک لفافہ اس کے قریب رکھتے ہوئے بہت فخر سے کہا تھا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا ناں۔۔۔ پروفیسر حماس آپ اس تجربے پر Nominate (نامزد) ضرور ہوں گے۔"

اس نے ذرا کی ذرا گردن اٹھا کر مس صدف کو دیکھا پھر نگاہ لفافے پر جمائی۔ سر کی معمولی سی جنبش سے "اوکے" کہا تھا۔ چہرے پر وہی ہمیشہ کا سرد رعب' سنجیدہ' ٹھوس لہجہ اور روشن آنکھیں۔ مس صدف کو کتنی حسرت تھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کی۔

ان کی ساتھ ایک لیب میں کام کرتے تقریبا" چار پانچ سال ہو گئے تھے۔ وہ اس کی شخصیت کے سحر میں جکڑی جا رہی تھی اور وہی کیا' ہر کولیگ ہی متاثر ہوئے بنا نہیں رہتی تھی مگر وہ کوئی سرد چٹان تھا۔ مجال ہے جو کسی کی حوصلہ افزائی کی ہو' کام کی بات پر بھی گن کر لفظ ادا کرتا اور پھر اپنے کام میں مگن۔ اس نے اپنی لیب میں انتہائی سستی سولر پلیٹ بنائی تھی۔ ڈیڑھ فٹ مربع کی پلیٹ بیک وقت سو بلب روشن کرنے والی۔ وہ اپنے اس پروجیکٹ کو ایک پسماندہ گاؤں میں متعارف کروا رہا تھا اور کس طرح یہ کام مکمل مفت ہو' اس کے لیے اس نے متمول افراد سے سوشل میڈیا پر فنڈنگ کی گزارش کی تھی اور فنڈنگ شروع ہو گئی تھی۔

یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ اسی کامیابی پر اسے اٹامک پاور پلانٹ کی جانب سے ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ تقریب کا دعوت نامہ وہ بطور خاص خود لے کر آئی تھی۔ یہ ایک بڑی خبر تھی' بندہ دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جاتا ہے۔ چلو وہ پاگل تو نہ ہوتا جینئس سائنس دان ہے مگر کھل کر مسکرائے تو سہی۔ لیکن اس نے اسی سنجیدگی سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے لفافہ کھولا' تاریخ اور جگہ پڑھی' بند کر

کے واپس ایک جانب میز پر رکھ دیا۔
"بیٹھیں آپ۔" اس نے مس صدف کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر ٹیبل پر سیٹ کیے پروجیکٹ کے بارے میں ڈسکس کرنا شروع کر دیا۔ 'کیسا برف کا جما تودا ہے 'مجال ہے کہ پگھل جائے۔' اس نے خیال کو جھٹکا اور پروجیکٹ کو سمجھنے لگی۔
"اس پروجیکٹ کے لیے جس این جی او نے سب سے زیادہ فنڈنگ کی ہے 'وہ ایک ڈاکٹر چلا رہی ہے۔"
"اچھا! مس صدف کی اطلاع پر اس نے ہلکے سے ابرو اچکائے پھر پروجیکٹ کی تار کسی اور سیل سے جوڑ کر چیک کرتے استفسار کیا۔
"کون سی ڈاکٹر؟ بالکل سرسری سا لہجہ تھا۔
"ہو۔۔۔ں۔۔۔ں۔" صدف نے کچھ دیر دماغ کھنگالا پھر کہا۔
"نام تو اب یاد نہیں آرہا کچھ مختلف سا تھا لیکن جو اس تقریب کے چیف گیسٹ ہیں ان کی کچھ لگتی ہیں' آئی تھنک بھانجی' بھتیجی۔۔۔ دو کروڑ کی فنڈنگ کی ہے انہوں نے۔۔۔ اور شاید اپنے ایم این اے انکل سے کوئی گرانٹ بھی منظور کروا رہی ہیں۔"
"دیٹس گڈ۔" وہ مرعوب ہوا۔
"مس! اگر دنیا میں برے لوگ موجود ہیں تو اچھے بھی بہت سے ہیں 'تب ہی کاروبار کائنات چل رہا ہے۔ بہرحال اگر کوئی مخلص این جی او ہے تو ہمیں ان سے رابطے میں رہنا چاہیے۔ یقیناً" اس میں ہمیں بھی چیرٹی کرنی چاہیے۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے۔" اس نے اپنے مصروف اور کام میں مگن انداز میں بولتے ہوئے لحہ بھر نگاہ اٹھا کر رائے لی۔ توجہ سے اسے سنتی مس صدف کا دل یک لخت بہت تیز دھڑک کر نارمل ہوا اور بے حد خوش بھی۔
"چلو کسی کے حوالے سے ہی سہی تکریمات تو مجھ ہی سے کی ہے وہ بھی اتنی لمبی' ورنہ تو لگتا تھا ایک روبوٹ ہی ہے صرف نئی نئی ایجادات کرنے والا۔"
"جی' جی سر۔۔۔ آئی ایگری۔" وہ فوراً" سنبھلی اور دعوت نامہ اٹھایا۔

"آئی تھنک انویٹیشن لیٹر میں این جی او' اینڈ آرگنائزر کا نام ہو گا۔" وہ دعوت نامہ کھول رہی تھی لیکن حماس حیدر کو کہیں ضروری جانا تھا۔ وہ کرسی دھکیلتے ہوئے اٹھا۔ اور نارمل انداز میں کہا۔
"مس صدف لیب اپنی نگرانی میں بند کروائیے گا۔ ایکچولی مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔"
"اٹس اوکے سر۔" بات کو ذرا بھی اہمیت نہ ملنے پر اسے کچھ سبکی ہوئی پھر لیٹر ان کی طرف بڑھا دیا۔
"ادھر ہی رکھ دیں' میں نے ڈیٹ دیکھ لی ہے۔"
لمحے میں ہی وہ دیوتا اپنی تمام وجاہت کے ساتھ قدم اٹھاتا دروازہ دھکیل باہر نکل گیا۔
المونیم کے بند دروازے کو مس صدف دیکھتے سوچتی رہ گئی۔
"اللہ جی! جذبات سے عاری بندوں کو آپ اتنا خوب صورت کیوں بناتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

اٹھائیس سال کی عمر میں وہ شہر کی بہترین گائنا لوجسٹ مشہور ہو گئی تھی۔ اس کی ایک وجہ' والدین مشہور ڈاکٹرز تھے پھر اپنا چلتا اسپتال تھا۔ نام سے نام جلد بن گیا۔ وہ اپنی مصروفیات کے ساتھ ایک فلاحی تنظیم چلا رہی تھی۔ جس کا مقصد لوگوں کو بہتر صحت و تعلیم کی فراہمی تھا۔ ایک دن میگزین میں سولر سسٹم پر لمبا سا آرٹیکل پڑھا تو بس پڑھتی چلی گئی تھی۔ اس کی تصویریں دیکھ کر وہ حق دق تھی۔ وہ آج بھی ویسا ہی تھا۔ بس معصوم لڑکپن بارعب مردانگی میں بدل گیا تھا۔ یا پھر چہرے کے نقوش پر ایک عدد چشمے کا اضافہ ہوا تھا۔ قیمتی سوٹ پہنے کسی آفس میں بیٹھا صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے مختلف انداز میں اس کی تصویریں تھیں۔ اس کے مختلف اقوال نمایاں کر کے جگہ جگہ لگائے گئے تھے۔ اس نے کئی بار ادھر ادھر سنا تھا کہ سولر پینلز کو سستا کرنے کے لیے بڑی تیزی سے کوئی سائنسدان کام کر رہا ہے۔ آج اسے پتا چلا تھا کہ وہ تو وہی ہے۔ جسے وہ پچھلے دس سالوں سے ڈھونڈ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

کچھ دن کی پابندی کے بعد جب اسے اس کا سیل واپس ملا اس نے سب سے پہلے اس کا نمبر ملایا تھا۔

"مطلوبہ نمبر بند ہے۔" بار بار ایک ہی جواب' وہ عاجز آگئی۔ موقع دیکھ کر وہ ان کے گھر گئی۔ وہاں تالا لگا تھا۔ ارد گرد سے پوچھا

"باجی وہ کل ہی گئے ہیں۔"

"کہاں؟"

"پتا نہیں جی' آناً فاناً گھر بیچ دیا۔"

"ایسا کیسے ہو گیا' اس گھر سے تو آنٹی کو بہت پیار تھا' بیچنے کی تو کبھی بات ہی نہیں کی تھی' پھر اچانک۔" نیاز محمد سے پوچھا۔ وہ لاعلم تھا یا شاید جان بوجھ کر بن گیا تھا۔

اکیڈمی' کالج کے اساتذہ سے پتا کیا' شاید معلوم ہو' کسی کو کچھ علم نہیں تھا البتہ پروفیسر زاہد نے بتایا تھا کہ "کچھ دن پہلے میرے پاس آیا تھا۔ میں نے کافی سمجھایا' تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے' کافی ڈس ہارٹ تھا۔ لیکن اس نے علاقہ بدلنے کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا تھا' نہ ارادہ تھا۔ البتہ سبجیکٹ بدلنے کا کچھ پلان کر رہا تھا۔"

بسامہ کی ساری امیدیں ختم ہو گئی تھیں۔ اتنا بڑا شہر' کہاں تلاش کرے۔ لیکن پھر بھی وہ لاشعوری طور پر ہر سال میڈیکل کالجز کی ایڈمیشن لسٹ کسی روٹین کی طرح دیکھتی تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے ٹیسٹ دیا ہو' اسے ڈاکٹر بننے کا جنون تھا اور آج اس کی نظروں کے سامنے کرسی پر جما دونوں بازو مضبوطی سے ٹیبل پر جمائے پورے اعتماد سے کیمرے کو دیکھتا صحافی سے باتیں کر رہا تھا۔

پروفیسر ڈاکٹر حماس کی سنجیدہ مسکراہٹ' اس کے دل کو کچھ ہوا' بالکل غیر ارادی طور پر اس نے تصویر کو چھونا چاہا پھر جھجک کر اس نے میگزین پلیٹ کر ایک جانب رکھ دیا۔ لیکن بے چینی بڑھ گئی تھی اس نے پھر میگزین کھولا' سارا انٹرویو پڑھا۔

"جی بالکل' میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔"

وہ صحافی کے پوچھے گئے کسی سوال کے جواب میں تفصیل بتا رہا تھا۔ "ہمارے ملک میں بہت ٹیلنٹ ہے' معدنیات بھی بہت ہیں لیکن میرا ذاتی خیال ہے' ہمیں وہ چیز یوٹی لائز (استعمال) کرنی چاہیے جو ہمیں بہ آسانی ملے' جیسا کہ سورج' بادل بھی چھائے ہوں' انرجی دیتا رہتا ہے اور پھر ایک اور چیز' ہمارے یہاں کوڑا کرکٹ پھیلانے کا بہت رواج ہے' لوگ پسند کرتے ہیں کوڑے کو۔" اس کے سنجیدہ لطیفے پر صحافی بھی ہنس دیا۔

"تو ہمیں اس کوڑے سے انرجی بنانی چاہیے' کیوں کہ یہ آل ریڈی ہمارے پاس وافر موجود ہے' نکالنے کے لیے فورس بھی نہیں چاہیے اور جو چیز ہمارے وسائل' لاگت سے باہر ہو اس پر وقت اور افرادی قوت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔" بسامہ کو پڑھ کر خوشی ہوئی تھی۔

"تم نے بہت اچھا یوٹی لائز کیا خود کو' بہت خوشی ہوئی حماس۔" اس نے سارا انٹرویو بغور پڑھا۔ کہیں کوئی ذاتی زندگی پر سوال نہیں تھا یا شاید صحافی کو ذاتیات پر منع کر دیا گیا ہو' اس میں اس کی ویب سائیٹ' ای میل ایڈریس تھے۔ اس نے نیٹ پر اسے سرچ کیا۔ اس کا نام لکھتے ہی اس کے بہت سے پیجز کھلنے لگے۔ بسامہ کو بے حد حیرت ہوئی' اسے پہلے نیٹ کا خیال کیوں نہیں آیا یا شاید اس کے ذہن میں آج بھی وہ نو عمر لڑکا تھا جو نیٹ استعمال کرنا وقت اور پیسے کا ضائع ہونا سمجھتا تھا۔ یہاں بھی اس کی فیملی' ذاتی زندگی کے متعلق کچھ نہیں تھا۔ نہ کوئی پکس نہ اسٹیٹس۔ البتہ مختلف پروجیکٹس بمع تصاویر نمایاں تھے۔ ایک اسٹیٹس واضح تھا۔ کہ وہ کسی دیہی علاقے کی فنڈنگ کا کہہ رہا تھا۔ بسامہ نے اس پروجیکٹ کے لیے فنڈز اکٹھے کرنے شروع کیے تھے۔ کئی بار دل میں آیا' جا کر اس سے مل کر آئے پھر سوچ کر رد کر دیا۔

"وہ گم نہیں ہوا تھا۔ وہ چھپا تھا' اسے خود سامنے آنا چاہیے' میں آج بھی اسی شہر' اسی جگہ رہ رہی ہوں۔۔۔۔"

ہو سکتا ہے میں اب تک اسے یاد بھی نہ ہوں۔"

گاؤں میں وہ تعارفی پروجیکٹ نصب کرنے کے بعد ایوارڈ کی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس فنکشن میں علاقے کا ایم این اے عُبسامہ کے ماموں، مہمان خصوصی تھے۔ وہ ان ہی کے توسط سے وہاں آئی تھی پھر تقریب کے کارڈ بھی اس کی این جی او کی جانب سے پرنٹ ہوئے تھے۔ وہ پچھلی نشستوں پر جان بوجھ کر بیٹھی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بے طرح ہلچل مچ گئی تھی اور اس کا ایک جملہ۔

"اپنی زندگی قسمت کو جینے مت دیں، بلکہ زندگی سے کہیں وہ قسمت کو جیئے۔" سن کر اس سے وہاں بیٹھنا دشوار ہو گیا وہ اسٹیج سے اترا۔ وہ پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔

دھند کے سفید بادلوں میں اس کا سارا وجود پگھل رہا تھا کب تقریب ختم ہوئی۔ کس کس نے اس کی تعریف میں کیا کیا کہا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کے سامنے تھے تو صرف وہی مناظر جب اسے بے جان حالت میں اسپتال لے جایا گیا تھا یا وہ کوریڈور میں اینکر پر چلا رہی تھی اور پھر پاپا کی گاڑی میں بیٹھی بے طرح رو رہی تھی۔ کب وہ لوگوں کے جھنڈ سے گزر کر اپنی قیمتی گاڑی کی جانب بڑھا۔ اس نے دور سے ایک نیلے سوٹ میں ملبوس چوڑی پشت کو گاڑی میں سوار ہو کر گاڑی اسٹارٹ کرتے دیکھا تھا۔ قدم خود بخود اس سمت بڑھنے لگے تھے۔

دھند میں سفر بے حد مشکل ہوتا ہے اور جب اندر بھی بہت دھند ہو تو ناممکن۔ شدید دھند کے باعث اس نے صرف وہی سڑک عبور کی۔ گاڑی روکی باہر نکل آیا۔ اندر اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ باہر نکلتے ہی اس نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلتا گیا۔ اسٹیج پر اس کی شان میں کمپیئر نے بہت قصیدے پڑھے تھے۔

"انتیس سال کی چھوٹی سی عمر میں بہت نام کمالینے والے ملک کے مایہ ناز پروفیسر ڈاکٹر حماس حیدر ساری قوم آپ کی کامیابیوں پر سلیوٹ کرتی ہے۔" یہ الفاظ ہال میں بھی اس کے کانوں پر سیسے کی طرح گرے تھے اور اس وقت بھی گھٹن میں اضافے کا باعث بنے۔ اس کے کانوں کو ایک جملے کی عادت تھی۔

"مایہ ناز ڈاکٹرز کی بیٹی بسامہ، مستقبل کی ڈاکٹر۔ اور تم، تم کیا ہو۔ ناکام، ناکام۔" بس ناکامی کی گونج تھی۔ وہ بجلی کے کھمبے کے پاس رک گیا۔ اس نے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ اڑستے دھند کے ساتھ الجھ کر گرتی پول کی روشنی کو دیکھا تھا۔

"تو پاگل ہو گیا ہے، کیوں اتنی دیر سے ایک طرف ہی دیکھے جا رہا ہے، دفع کر، جو بکواس وہ کر کے گئے ہیں کرنے دے، بڑے آئے مستقبل کی ڈاکٹر کے ماں باپ، جس دن بن جائے گی ناں، دیکھ لیں گے۔"

"اسے کیوں بددعا دے رہی ہو، اس کا کیا قصور امی۔"

"بددعا نہ دوں، پھر کیا کروں۔ لعنت بھیج ان کی صورتوں پر، اپنی کو قابو کیا نہیں۔ یہاں آ گئے منہ اٹھا کے باتیں سنانے، ہونہہ، اٹھ چل منہ ہاتھ دھو کھانا کھالے۔"

اپنے جوان ہوتے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر زینت ساری کانپ گئی تھیں۔ ڈاکٹر سبطین، عندلیب کے جانے کے بعد انہیں غائبانہ گالیوں سے نوازا تھا پھر بیٹے کی دلجوئی میں لگ گئیں۔

"میری بات سن حماس، میرے بچے، قسمت اللہ بناتا ہے، ہو سکتا ہے تیرے نصیب میں کسی اور طرح رزق لکھا ہو، کوئی اور کامیابی لکھی ہو، ڈاکٹری ضروری تو نہیں۔ تو اللہ سے دعا مانگ، اسے پکار، وہ راستہ دکھائے گا۔"

"پکارا تو تھا، اللہ نے میری نہیں سنی۔" اس کی آواز رندھ گئی۔ "میں نے ایک سال میں اس کا پورا کلام حفظ کر لیا تھا امی، پورا قرآن پاک نا۔"

"اللہ مجھ سے تب بھی راضی نہیں ہوا۔"

"چل پاگل۔ تو نے کون سا اللہ کو راضی کرنے کے لیے قرآن پاک حفظ کیا تھا، تجھے تو دنیا سے نمبر چاہئیں تھے، نمبر تیرے آ گئے، تو نے اللہ سے یاری نہیں کی

تھی' اللہ بھی تیری صلاحیت دیکھتا رہا۔ حماس!" انہوں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

"میرے بچے' اللہ تو اپنے منکر لوگوں کو بھی بے یارو مددگار نہیں چھوڑتا' وہ کہیں نہ کہیں رستہ بنادیتا ہے تو اپنے ٹیچرز سے مل' مشورہ کر۔۔۔ اپنی اس مشین۔" انہوں نے اس کی کن پٹی پر انگلی رکھی۔ "کی صفائی کر' کہیں نہ کہیں بہتر راہ ملے گی' ڈاکٹر بنے بغیر تو بھوکا تھوڑی مرجائے گا اور نہ صرف ڈاکٹر ہی لوگوں کی خدمت کرتے ہیں۔۔۔ اور تیرا باپ ڈاکٹر نہ ہونے کی وجہ سے تھوڑی مرا تھا' ڈاکٹر تو آگیا تھا' بجلی نہیں آئی تھی حماس' میرے لال! ڈاکٹر تو صرف مرتے ہوئے کو بچاتا ہے' بچے ہوؤں کو زندہ رکھنا زیادہ بڑا کام ہے' اور کوئی پڑھائی پڑھ لے۔"

اپنی ان پڑھ ماں کی باتیں کچھ دماغ میں سما گئی تھیں۔ وہ چند دن بعد اپنے اساتذہ سے ملا انہوں نے پیار سے سمجھایا تھا۔

"حماس' مزید وقت ضائع نہ کرو۔ تم بائیو کی جگہ ایڈیشنل میتھ کا پیپر دو' اپنا شعبہ بدل لو' تم ذہین قابل لڑکے ہو' ملک و قوم کو تمہاری ضرورت ہے' تمہیں تیاری میں مسئلہ نہیں ہوگا۔"

بند گلی میں اسے راستہ نظر آگیا تھا۔ پہلے اس نے ایڈیشنل میتھ کا پیپر دے کر پری میڈیکل کو پری انجینئرنگ میں بدلا پھر فزکس کو منتخب کرکے آگے بڑھا تو کامیابی سے بڑھتا چلا گیا۔ اسے پی ایچ ڈی کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ جس طرح اس نے مضمون بدلنے کا ارادہ کیا تھا اسی طرح علاقہ بدلنے میں بھی وقت نہیں لگایا۔ زینت ہر فیصلے میں اس کے ساتھ تھی' جلد ہی گھر بک گیا اور وہ دوسرے مضافاتی علاقے میں شفٹ ہوگئے۔ تعلیمی سفر شروع ہوا۔ جب اس نے سولر پلیٹ کم لاگت میں متعارف کروائی تو اٹامک پاور میں اس کے ساتھی حیران رہ گئے تھے۔ اگلا پروجیکٹ کچرے سے ایندھن بنانے کا تھا۔ جو ایک گاؤں میں متعارف ہوتے ہی کامیابی سے پھیل گیا۔ مگر اس کے کانوں میں آج بھی وہی جملہ تھا۔

"اور تم۔۔۔ تم کیا ہو۔۔۔ ناکام۔" یا پھر ڈاکٹر عندلیب کے جتاتے لفظ "کھلے جاتا ہے مگر ایم بی بی ایس۔" ٹھک ٹھک کانوں میں گر رہے تھے۔ یہ الفاظ اسے کبھی اپنی کامیابی پر خوش ہونے ہی نہیں دیتے تھے۔

"اللہ! میں نے تو کبھی بسامہ کو سیڑھی بنانے کا نہیں سوچا تھا' کیوں آگئی تھی میری زندگی میں' ایک ناکام شخص کو ہمیشہ کے لیے ناکام کرنے۔" اس نے گردن اونچی کیے کھمبے پر جلتے بلب کو دیکھتے ہوئے آنکھیں زور سے بند کر رکھی تھیں۔ ٹھنڈی دھند مدھم روشنی میں لپٹ کر اس کے چہرے کو روشن کر رہی تھی۔

اس کی دائیں کہنی پر سفید کوٹ اور بائیں شانے پر اسٹرپ والا پرس جھول رہا تھا۔ تھکے تھکے قدموں سے وہ فٹ پاتھ پر سیدھی چلتی آرہی تھی۔ کوئی منظر واضح نہیں تھا بس دھند ہی دھند تھی۔ وہ فنکشن میں ماموں کے ساتھ آئی تھی۔ استقبالی پروٹوکول خاصا عجیب لگا۔ وہ نکل کر ایک طرف ہوگئی۔ ماموں نے اسے گھر کا تھا۔ انہیں اپنی یہ خبطی بھانجی بالکل پسند نہیں تھی۔

"لو بتاؤ' دنیا پروٹوکول پر مرتی ہے' اور ایک یہ ہے۔۔۔ بھلا میرے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھے۔ آنے کے لیے کیسے اتاولی ہوئی تھی' کارڈ خود چھپوائے اور اب جا کر پیچھے بیٹھ گئی۔"

اسی طرح باہر بھی نکل گئی۔ ماموں کو بھی پروا نہیں ہوئی' چلی گئی ہوگی کسی طرح۔ اور وہ یہاں فٹ پاتھ پر دھند کے مزے لے رہی تھی۔ وہ چند قدم کے فاصلے پر تھی جب اس کی نیلی پشت دیکھ کر ٹھٹکی۔

"حما۔۔۔ س۔۔۔" اسے خود اپنے منہ سے یہ لفظ اجنبی لگا تھا بالکل حماس کی طرح' جسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے جھٹکے سے مڑ کر دیکھا۔ بسامہ منہ وا کیے' آنکھیں پھاڑے اسے تک رہی تھی۔ کتنے پل تو یہ سمجھنے میں لگ گئے کہ وہ حقیقت میں ہیں یا دھند میں کوئی عکس بن رہا ہے' دونوں دو دو قدم آگے آئے' آنکھیں آنکھوں میں جمی تھیں۔ اور لب خاموش۔ لفظ سنگ مرمر کے ہوگئے۔ ایک پل کو تو انہیں اپنا وجود بھی سنگ مرمر جیسا بے جان بے حرکت

سے عاری لگا تھا۔ حماس نے بہت ہمت کر کے اپنے تعجب پر قابو پایا۔

"بسامہ۔۔۔ کیسی ہو؟"

"مختصر۔" اس کے غیر یقینی جواب نے بالکل گنگ کر دیا۔ جو الفاظ بلبلوں کی مانند اندر بن اور پھٹ رہے تھے 'سب جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ کتنی دیر تو سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا بات کرے' پھر کچھ ہمت کر کے اجنبی انداز میں پوچھا تھا۔

"اسی شہر میں ہوتی ہو؟"

"میرا خیال ہے میں شروع سے اسی شہر میں ہوتی ہوں۔" اس کے جواب اسے لاجواب کر رہے تھے۔

اس نے سر کو کچھ خم دے کر اٹھایا اور گہری سانس خارج کر کے آہستہ آہستہ اس کے قریب سے ہو کر آگے چلنے لگا۔ وہ بھی ہم قدم چل رہی تھی۔ دونوں مسافر' دونوں چپ' دھندلی شام اور کم ہوا کی طرح چلتے ہوئے اس نے خفیف سا رخ اس کی جانب کر کے دیکھا۔

"آنٹی انکل کیسے ہیں اور تمہاری فیملی۔۔۔ کیسی ہے؟" بسامہ کے چہرے پر ناگواری اتری۔

"میرا خیال ہے یہ دونوں ایک ہی سوال ہیں۔" یہ جواب ایسا تھا جو حماس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ اس کی الجھی بھنوؤں کو دیکھ کر وہ خود ہی بول دی۔

"میری فیملی میں شروع سے صرف میرے ماں باپ ہی تھے۔"

"نہیں' میرا مطلب ہے۔" وہ قدرے رکا۔

"تمہارا کزن" آئی مین فیانسی' انگیجمنٹ ہو گئی تھی نا تمہاری۔۔۔؟"

"واٹ۔" شاک اب لگا تھا۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ اس کے بہت سے رشتے آئے تھے۔ اکثر تو کزنز ہی تھے۔ مگر وہ انکار کرتی رہی۔ ابھی پچھلے مہینے ماموں کے بیٹے کا پرپوزل رد کیا تھا مگر یہ سب باتیں اس سے دور ہو جانے کے بعد کی تھیں۔ اسے کس نے بتائیں۔ پہلے سے پہلے کی منگنی اس نے شاکی نگاہ سے اسے دیکھتے پوچھا۔

"تم سے کس نے کہا؟ پل بھر کے لیے وہ بھی سٹپٹا گیا تھا' پھر ڈاکٹر عندلیب کا سارا جملہ ذہن میں دہرایا اور منہ سے نکلا۔

"ڈاکٹر عندلیب نے۔"

"مما نے!" وہ بڑبڑائی اور پھر کچھ عرصے پہلے والا واقعہ ذہن میں کوندے کی طرح لپکا۔

وہ فارغ اوقات میں اب اکثر پروفیسر ڈاکٹر حماس حیدر کی پروفائل کھول کر بیٹھ جاتی۔ کبھی اس کا اسٹیٹس کبھی پروجیکٹ دیکھتی رہتی تھی۔ اس دن وہ اسپتال سے آئے ہی تھے' عندلیب اس کی پشت پر تھیں۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظر پڑتے ہی ان کے منہ سے نکلا۔

"ارے' یہ وہی لڑکا نہیں ہے۔۔۔ کیا نام تھا حماس۔" وہ گھوم کر اس کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ نام پر سبطین بھی چونکے اور دوسری جانب سے بیٹھے۔ دونوں دلچسپی سے اس کی پروفائل دیکھ رہے تھے۔ جب کہ بسامہ ان کی موجودگی میں اب بے چینی محسوس کرنے لگی تھی۔

"واؤ' اتنا کمال کر دیا۔۔۔" بسامہ ماں کے لب و لہجے پر چونکی' نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ ذو معنی نگاہ سے میاں کو دیکھ رہی تھیں۔ اسے اس وقت ان کی بھنوؤں کا ستائشی اشارہ خاک بھی سمجھ نہ آیا تھا کہ وہ کیوں اک دوجے کو دیکھ رہے ہیں مگر وہ دونوں اپنی خوشگوار حیرت کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ کوئی معمولی ڈاکٹرز نہیں تھے۔ بلکہ تجربہ کار' ماہرین ڈاکٹرز میں ان کا شمار ہوتا تھا اور اپنے ایک اور کامیاب تجربے پر ان کی خوشی بنتی تھی۔ ان کا ایک بہت آزمودہ نسخہ تھا جو انہیں میڈیکل کے تیسرے سال بی ہیورل سائنسز میں پڑھایا گیا کہ جب مریض مکمل ٹھیک ہونے کے باوجود خود کو ٹھیک محسوس نہ کرے تو اس کو ایسے شرمندہ کرو کہ جو اس کی عزت نفس پر حملہ ہو اور وہ شرمندگی مٹانے کو بالکل ٹھیک ہو جائے یا پھر اسے چیلنج پر اکساؤ کہ وہ اٹھ کھڑا ہو۔ یہ ہے تو خطرناک تجربہ' مریض اس کے برعکس بھی جا سکتا ہے لیکن بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے۔ عندلیب کو

حماس سے خطرہ محسوس ہوا تھا۔ مگر سبطین نے بہت وثوق سے کہا تھا۔

"اوں ہوں... جس طرح میں نے اس کی عزت نفس پر اٹیک کیا ہے' کم از کم وہ دوبارہ سوسائیڈ نہیں کرے گا... اور جس انداز میں تم نے اسے چیلنج کیا تھا' میں تو خود حیران رہ گیا تھا اور مجھے یقین تھا اگر اب وہ ایم بی بی ایس نہیں بھی کرے گا تو کم از کم ایسا کچھ ضرور کرے گا جو میڈیکل سے بھی ایک قدم آگے ہو۔ لکھ کر رکھ لو۔" اور واقعی اس کے کمال نے ان دونوں کا سرنادیدہ فخر سے بلند ہو گیا۔ ان کی آواز میں کھنک تھی۔

"تم اسے کب سے جانتی ہو' کبھی ذکر نہیں کیا؟"

وہ بہت پژمردگی سے بولی۔ "ابھی چند ماہ پہلے ہی سرچ کیا تھا۔"

"ہاں تو رابطہ کیا' ملی ہو اس سے؟ ڈاکٹر سبطین کا استفسار اس کے اندر انگارہ دہکا گیا۔ اس نے شاکی نگاہ سے انہیں دیکھا پھر گود سے لیپ ٹاپ ٹیبل پر رکھتے اٹھی۔

"مجھے اس گھر میں آخری قدم نہیں رکھنے تھے۔"

وہ جتا کر کہتی رکی نہیں بلکہ متوازی چال سے چلتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اب پریشان ہونے کی باری ان دونوں کی تھی۔

"وہ ابھی تک دکھی ہے... کیا ہر پروپوزل ریجکٹ کرنے کی وجہ یہی تو نہیں۔" ڈاکٹر عندلیب کی رنجیدہ آواز پر سبطین سپاٹ بولے تھے۔

"یہ سب ضروری تھا' کچھ بہتر کرنے کے لیے رسک لینے پڑتے ہیں۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔" عندلیب نے سوچتے ہوئے کہا۔

"آپ ملیں اس سے' رابطہ کریں۔"

"نہیں..." انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ خود رابطہ بھی کرے گی' ملے گی بھی' اگر وہ اسے ضروری سمجھتی ہے تو۔" اور ڈاکٹر سبطین کا یہ مشاہدہ بھی درست نکلا' آج وہ اس کے روبرو تحیر میں ڈوبی کھڑی تھی۔ اسے کبھی بی ہیورل سائنسز کے یونٹ یاد تھے اور پھر پاپا سے ڈھیٹ مریض ٹھیک کرنے والی چالیس کئی بار سن چکی تھی اب جیسے ہی واضح ہوا اسے ان دونوں پر شدید غصہ آیا تھا۔

"بڑا تکلیف دہ حربہ آزمایا ہم دونوں پر... آج وہ دونوں ڈاکٹرز میرے ہاتھوں سے بچیں گے نہیں۔" اس کے مسلسل دانت کچکچانے اور خاموشی پر وہ کوفت میں مبتلا ہوا۔

بھئی اس میں اتنی چھپانے والی کیا بات ہے' منگنی کا پوچھا ہے' سیدھی طرح بتا دے' مگر نہیں چپ ہے۔

"ہاں آنٹی نے بتایا تھا' کیا ابھی تک منگنی ہی چل رہی ہے' شادی...؟ تپ تو اسے پہلے ہی چڑھی ہوئی تھی اوپر سے اس کا سوالیہ نشان' اس نے دانت جما کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔

"یہ میرا دل ہے مسٹر حماس حیدر... تمہارے ریکٹر پر سجا کوئی پروجیکٹ نہیں ہے' جسے تم جب جہاں چاہو نصب کر دو' سمجھے۔" لمحہ بھر کے لیے تو اسے اس کی بات کا مفہوم سمجھ ہی نہیں آیا اور جب آیا وہ تیز تیز چلتی واپس جا رہی تھی۔ پھر وہ تیزی سے اس کی جانب لپکا۔

"بات سنو... بسامہ! میری بات سنو' پلیز۔"

فضا میں یک دم ہوا کے بہت سے جھونکے ابھرے۔ دھند مچل کر چھٹتی تیزی سے گرنے لگی۔ وہ دونوں اچھے خاصے ٹھنڈے اور نمی سے شرابور ہو رہے تھے۔ اس نے لمبے ڈگ بھر کر اسے کہنی سے جا پکڑا۔ وہ رکی مگر مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ سامنے آگیا۔

"دھند بڑھ رہی ہے' گاڑی میں بیٹھو' میں چھوڑ آتا ہوں۔"

"بڑھ نہیں رہی چھٹ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد مطلع صاف ہو جائے گا۔" اس نے آنکھیں جما کر کہا تھا۔ حماس حیدر کی مسکراہٹ اس کے غصیلے انداز کو دیکھ کر گہری ہوتی چلی گئی۔ آیوں آپ بسامہ کے غصے میں مسکان کی کلی کھلتی چلی گئی۔

جو پُر پیچ راہوں پہ چلتے رہے
وہ فولادی سانچوں میں ڈھلتے رہے

میں غافل رہا اور زہریلے سانپ
مری آستینوں میں پلتے رہے

انہیں زندگی نے نہیں کچھ دیا
جو روتے رہے ہاتھ ملتے رہے

جو لے کر چلے منزلوں کی لگن
دیے ان کی راہوں میں جلتے رہے

ہے درپیش صحرا کا لمبا سفر
کڑی دھوپ میں پاؤں جلتے رہے

جو عزم جواں لے کر اُٹھے قمرؔ
وہ قوموں کی قسمت بدلتے رہے

ریاض حسین قمر

شام ہوئی اور سورج رستہ بھول گیا
کیسے ہنستے بستے گھر خاموش ہوئے

بولتی آنکھیں چپ دریا میں ڈوب گئیں
شہر کے سارے تہمت گر خاموش ہوئے

کیسی کیسی تصویروں کے رنگ اُڑے
کیسے کیسے صورت گر خاموش ہوئے

کھیل تماشا بربادی پر ختم ہوا
ہنسی اُڑا کر بازی گر خاموش ہوئے

کچی دیواریں بارش میں بیٹھ گئیں
بیتی رُت کے سب منظر خاموش ہوئے

ابھی گیا ہے کوئی مگر یوں لگتا ہے
جیسے صدیاں بیتیں، گھر خاموش ہوئے

افتخار عارف

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ کے پھول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس جہنی رض کے والد فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں گیا۔ وہاں لوگ اس طرح ٹھہرے کہ آنے جانے کے لیے راستے بند ہو گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں میں یہ اعلان کرنے کے لیے ایک آدمی بھیجا۔

"جو اس طرح ٹھہرا کہ آنے جانے کا راستہ بند کر دیا، اسے جہاد کا ثواب نہیں ملے گا۔"

(ابوداؤد)

باتوں سے خوشبو آئے،

- اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔
- خطا کاروں میں وہ بہت اچھے ہیں جو سچے دل سے توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔
- حسن اخلاق سے انسان وہ درجہ پا لیتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور شب بھر جاگنے سے حاصل ہوتا ہے۔
- پہلوان اور طاقت ور وہ نہیں جو مدِ مقابل کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان اور شہ زور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پہ قابو رکھے۔
- اپنے دل سے پوچھو، نیکی وہ ہے جس سے نفس مطمئن ہو اور گناہ وہ ہے جس سے دل میں تردد ہو اور کھٹکے۔
- دعائیں اس وقت کارگر ہوتی ہیں جب ان کے ساتھ جدوجہد کی جائے۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

بہرحال،

فٹ پاتھ پر جھومتے ہوئے ایک صاحب نے برابر کھڑے آدمی سے کہا۔

"ذرا میرے لیے ٹیکسی تو روکنا۔"

ان صاحب نے ناگواری سے شرابی کی طرف دیکھا اور ذرا نخوت سے بولے۔

"میں کسی ہوٹل کا ڈور مین یا چوکیدار نہیں ہوں، نیوی کا آفیسر ہوں۔"

شرابی ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر اسی لہجے میں بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تو کسی بحری جہاز کو روکنا، مجھے بہرحال گھر تو جانا ہی ہے۔"

حورین زینب۔ کہروڑ پکا

نماز کے دوران وسوسے

نماز کے دوران غیر اختیاری وسوسے آنے کی وجہ سے مایوسی کا شکار ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ دراصل انسان کا قلب تو ایک سپر ہائی وے کی مانند ہے۔ اس پر شاہی سواریاں بھی گزرتی ہیں۔ امیر کبیر بھی چلتے ہیں غریب فقیر بھی گزرتے ہیں۔ خوبصورتوں اور بدشکلوں کی بھی یہی گزرگاہ ہے۔ نیکوکاروں، پارساؤں اور دین داروں کے علاوہ کافروں، مشرکوں اور مجرموں گناہگاروں کے لیے بھی یہ شارع عام ہے۔

عافیت اسی میں ہے کہ شاہراہ پر جیسا ٹریفک خود بخود آئے اسے خاموشی سے گزر جانے دیا جائے۔

اگر ٹریفک کی طرف متوجہ ہو کر اسے بند کرنے یا اس کا رخ موڑنے کی کوشش کی جائے تو دل کی سڑک پر خود اپنا ہی ٹریفک جام ہونے کا شدید خطرہ ہے۔

(شہاب نامہ۔ قدرت اللہ شہاب)
رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

مانگی ہوئی محبت

اگر کسی سے کچھ مانگنا ہے تو محبت مانگو...
محبت مل جائے تو سب کچھ مل جاتا ہے...
محبت کے بغیر ہر چیز ایسے ملتی ہے جیسے مرنے کے بعد کفن ملتا ہے۔
مگر میری مانو تو... محبت بھی نہ مانگو...
کیونکہ مانگی ہوئی محبت کا مزا بگڑی ہوئی شراب جیسا ہوتا ہے۔

(بانو قدسیہ)
صفا کالو خان۔ صوابی

محبت نامہ

ایک لڑکی ایک میڈیکل اسٹور کے باہر کھڑی اسٹور میں رش کم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔
اس کے چہرے پر شرم کے ساتھ بے چینی و تذبذب کے جذبات صاف جھلک رہے تھے۔ آخر کافی دیر بعد جب میڈیکل اسٹور سے رش ختم ہو گیا تو وہ گھبراتی شرماتی اندر داخل ہوئی اور اپنے کانپتے ہاتھوں سے اپنے پرس سے ایک پرچی نکال کر سامنے رکھی اور شرماتے ہوئے بولی۔
"میں ایک اسکول ٹیچر ہوں۔ میری ایک ڈاکٹر سے شادی طے ہوئی ہے۔ آج ان کا پہلا خط آیا ہے، کیا آپ پڑھ کر سنا دیں گے کہ کیا لکھا ہے؟"
عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

شعور

کسی کی پہچان علم سے نہیں ہوتی بلکہ ادب سے ہوتی ہے کیونکہ علم تو ابلیس کے پاس بھی بہت تھا لیکن ادب سے وہ محروم تھا۔
مدیحہ فہمیدہ۔ مدینہ کالونی

با اعتماد

دوسری دفعہ کا ذکر ہے۔ جنگ میں جانے سے پہلے بادشاہ نے اپنی خوبصورت تجوری کے کمرے پہ تالا لگا کر چابی اپنے عزیز دوست کو دے دی اور بولا۔
"اگر چار دن میں نہیں لوٹا تو تالا کھول لینا اور پھر وہ تمہاری۔"
بادشاہ گھوڑے پہ بیٹھ کر چلا گیا۔ ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ اس کے پیچھے دھول غبار اور گھوڑے کی آواز آ رہی تھی۔
بادشاہ رُک گیا اور دیکھا کہ اس کا وہی دوست تیزی سے سواری کرتے ہوئے اس کی طرف آ رہا ہے۔
"کیا ہوا؟" بادشاہ نے پوچھا۔
لمبی سانس لیتے ہوئے دوست بولا۔
"یہ چابی غلط ہے۔"
نادیہ، نجمہ۔ گلستان جوہر

اشفاق احمد

ایک بھیڑیا بھیڑیا ہی ہوتا ہے۔ اندر رہے یا باہر۔ اس کو اون کا کوٹ پہنا دینے سے وہ لیلا نہیں بن جاتا۔

(اشفاق احمد۔ بابا صاحبہ)
نوال افضل کھمن۔ گلستان جوہر کراچی

بڑے لوگ بڑی باتیں

☆ دوسروں کا بھلا کرتے وقت یقین رکھو کہ تم اپنا بھلا کر رہے ہو۔ (فارابی)
☆ عظمت طاقت ور ہونے میں نہیں بلکہ طاقت کے صحیح استعمال میں ہے۔

(ہنری وارڈ)
☆ نفرت کو محبت سے کم کر و کیونکہ نفرت، نفرت سے کم نہیں ہوتی۔ (گوتم بدھ)
☆ سچا دوست وہ ہے، جو آپ کی طرف اس وقت آئے جب ساری دُنیا آپ کا ساتھ چھوڑ چکی ہو۔
(بقراط)
عالیہ نور۔ ٹنڈو الہ یار

کیا زندگی کے کھیل میں محبت سب سے بڑا ہتھیار ہے؟

ڈرامہ سیریل منکر کی دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی ایک ایسی سادہ اور معصوم لڑکی رونا کے گرد گھومتی ہے جو اپنی جوان سوتیلی ماں رانیہ کے دوستانہ اور محبت بھرے سلوک کے باوجود اپنی سگی ماں کی کمی شدت سے محسوس کرتی ہے اور یہ کمی اُس کی مری کانونٹ کی ٹیچر سسٹر کیتھرین اپنے پیار اور توجہ سے پوری کر دیتی ہے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد بھی رونا سسٹر کیتھرین سے رابطے میں رہتی ہے۔ رونا کی شادی طے ہوجاتی ہے مگر اُس کا دل اُداس ہے کیونکہ سسٹر کیتھرین اس کی شادی میں شریک نہیں ہوسکتی۔ رونا کی بہترین دوست اور ہمراز انجو کو رونا کے سسرال والے ایک آنکھ نہیں بھاتے جو فرانس میں رہنے کے باوجود دقیانوسی سوچ رکھتے ہیں۔ انجو چاہتی ہے کہ یہ رشتہ ختم ہوجائے۔ عین مایوں والے دن جب رونا سسٹر کیتھرین کے لیے بے قرار ہوجاتی ہے۔ انجو اُسے اُکساتی اور حوصلہ دیتی ہے کہ شادی سے پہلے تم ایک بار میرے ساتھ مری چل کر سسٹر کیتھرین سے مل لو تاکہ تمہارے دل کو چین آجائے۔ رونا اور انجو رانیہ کو شریک راز بنا کر مری روانہ ہوجاتی ہیں جبکہ رانیہ بڑی خوبصورتی سے اس معاملے میں رونا کی ساس کو اعتماد میں لے لیتی ہے رونا اور انجو سسٹر کیتھرین سے ملنے سینٹ میری چرچ پہنچتی ہیں جہاں اُن کی اتفاقی ملاقات ایک خودکش بمبار نوجوان گلریز سے ہوتی ہے جو چرچ میں ہونے والی تقریب کو نشانہ بنانے کے لیے وہاں پہنچتا ہے۔ سخت سیکیورٹی کی وجہ سے گلریز اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتا اور ان دونوں لڑکیوں کو اپنی ڈھال بنا کر ان کے ساتھ وہاں سے نکل جاتا ہے۔ گلریز اپنی اصلیت چھپا کر نرم دل اور سادہ مزاج رونا کو اپنی زندگی کی ایسی درد بھری کہانی سناتا ہے کہ رونا کا دل پسیج جاتا ہے وہ گلریز کی مخلص دوست بن جاتی ہے۔ انجو گلریز کے جذبات کو بھانپ کر موقع غنیمت جانتی ہے اور گلریز کے دل میں رونا کے عشق کی آگ کو ہوا دیتی ہے اور اُسے یہ غلط تاثر دیتی ہے کہ رونا بھی اُسے چاہنے لگی ہے جبکہ رونا گلریز کو صرف ایک اچھا دوست سمجھتی ہے۔ اُدھر رونا کے گھر میں مایوں کی دلہن کی گمشدگی سے ایک بحران پیدا ہوجاتا ہے۔ رونا کو جوں ہی یہ احساس ہوتا کہ اس نے سسٹر کیتھرین سے ملنے کی تڑپ میں کس نازک موقع پر گھر چھوڑا تھا تو وہ گلریز کو الوداع کہے بغیر بھاگم بھاگ انجو کے ساتھ اپنے گھر پہنچتی ہے جہاں اُس کی نہایت مخلص سوتیلی ماں رانیہ نے صورتحال کو سنبھال رکھا ہے۔ رونا کا منگیتر زین بمشکل ایک ہفتے کی چھٹی لے کر شادی کے لیے پاکستان پہنچتا ہے۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہے کہ کیا اس ارینجڈ میرج میں لڑکی کی مرضی شامل ہے۔ شادی کی تیاریاں عروج پر ہیں۔ رونا دلہن بننے کے لیے بیوٹی پارلر پہنچتی ہے کہ اچانک ایک ایسا واقعہ رونما ہوتا ہے جو رونا کی زندگی میں ہلچل مچا دیتا ہے۔

کیا رونا اپنی زندگی میں آنے والے طوفان سے سنبھل سکے گی؟

کیا زین رونا کو اپنی دلہن بنانے پر راضی ہوجائے گا؟

کیا گلریز کا عشق اُسے رونا کے پاس واپس لے آئے گا؟

امت الصبور

جاناں کی ڈائری

نِدا بابر کی ڈائری سے

جگر مراد آبادی کی یہ غزل سوز اور والہانہ پن لیے دل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ آپ سب قارئین بھی پڑھیں اور لطف اندوز ہوں۔

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

بھول جاتا ہوں میں ستم اس کے
وہ کچھ اس سادگی سے ملتا ہے

آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا
رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے

سلسلہ فتنۂ قیامت کا
تیری خوش قامتی سے ملتا ہے

مل کے بھی جو کبھی نہیں ملتا
ٹوٹ کر دل اسی سے ملتا ہے

کاروبارِ جہاں سنورتے ہیں
ہوش جب بے خودی سے ملتا ہے

روح کو بھی مزا محبت کا
دل کی ہمسائیگی سے ملتا ہے

سیما انور کی ڈائری سے

زندگی بجائے خود ایک رمز ہے۔ اسے گزارنے کے باوجود اس کی حقیقت نہیں کھلتی۔ اسی حقیقت کو جمیل یوسف نے اس غزل میں بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔

تمناؤں کی دنیا میں قدم دھرنے نہیں دیتی
جو کرنا چاہتا ہوں، زندگی کرنے نہیں دیتی

کوئی صورت نہیں ہے زندگی سے بچ نکلنے کی
غم و آلام کے ماروں کو بھی مرنے نہیں دیتی

اندھیرا لاکھ ہو مجھ کو سحر کی آس رہتی ہے
یہی وہ روشنی ہے جو مجھے ڈرنے نہیں دیتی

مجھے معلوم ہے وعدہ نبھانا سخت مشکل ہے
میری کم ہمتی انکار بھی کرنے نہیں دیتی

گزرتی رو بدلتی جا رہی ہے ایک ایک شے کو
کسی شے سے مجھے اُلفت کا دم بھرنے نہیں دیتی

نجمہ اکرم کی ڈائری سے

زندگی کے بارے میں انسان کیا جانے گا، وہ تو خود سے بھی بے خبر ہے۔ جعفر شیرازی کی یہ غزل اسی حقیقت کی عکاس ہے۔

کیا بتائیں وقت کو کس طرح گزارا ہے
کس نے سنگ پھینکے ہیں، کس نے پھول مارا ہے

تم بھی خوبصورت ہو، یہ بھی خوبصورت ہے
یہ جو میرے چہرے پر دکھ ہے، یہ تمہارا ہے

کس نے بھید پایا ہے زندگی کے طوفاں کا
دُور تک سمندر ہے، دُور تک کنارا ہے

چھوڑ چھوڑ دل دیکھو، مجھ سے پوچھتے کیا ہو
میں نے اس کو شیشے میں کس طرح اُتارا ہے

جاگتا بھی ہے جعفر اس کی انتظاری میں
اور شب کے دامن میں آخری ستارا ہے

گڑیا شاہ ——— کہروڑ پکا

ملنے کی ہر آس کے پیچھے اَن دیکھی مجبوری تھی
راہ میں دشت نہیں پڑتا تھا چار دنوں کی دوری تھی
بیار گیا تو کیسے ملتے رنگ سے رنگ اور خواب سے خواب
ایک مکمل گھر کے اندر ہر تصویر ادھوری تھی!

نمرہ، اقرا ——— کراچی

کسی گوشے میں شاید حسرت تعمیر رکھتے ہیں
کہ اپنے پاس ہم اک شہر کی تصویر رکھتے ہیں
گھٹن کس طرح کم ہو گی کہ چھوٹے گھروندے ہیں
کہیں ہم خواب دیکھتے ہیں کہیں تعبیر رکھتے ہیں

نجیبا کرم ——— گاؤں گوئیکی

جب آنکھیں درد میں ڈوبی ہوں اور یاد سے اس کی بھر آئیں
تب خود کو دھوکا مت دینا اور چپکے چپکے رو لینا
جب پلکیں کرب سے موندی ہوں اور سب سمجھیں تم سوئے ہو
تب منہ پہ تکیہ رکھ لینا اور چپکے چپکے رو لینا

ثنا عبدالقیوم ——— بنکہ چیمہ

ترکِ تعلقات کے مشکل کہاں تھے مرحلے
مگر سوال اے دل! تیری زندگی کا تھا

راحیلہ منظر ——— فیصل آباد

تکمیل محبت میں یہ ضروری ہے
ٹوٹے نہ دل جب تک، محبت ادھوری ہے
جو بہہ نکلے ایک آنسو آنکھ سے
تو حق ادا ہے، محبت پوری ہے

جمیلا ظفر اقبال ——— جڑانوالہ

وہ کسی خیال میں گم ہو اور اُسی خیال میں ہی
کبھی وہ میرے راستے میں گلاب رکھ جائے
وہ مجھے درد دے تو دیا ہے اور اس پہ چاہتا ہے
میں حساب رکھ نہ پاؤں، وہ حساب بھول جائے

ایمان جلبانی ——— گاؤں دریا خان جلبانی

جہاں میں آئے تھے کیا دُکھ ہی اُٹھانے کو
الٰہی تُو نے ہمیں کس بلا میں ڈال دیا

زوبا ریہ خالد ——— اوہود

میری وسعت کی طلب نے مجھے محدود کیا!
میں وہ دریا ہوں جو موجوں سے بھی ساحل مانگے
سانس میری تھی مگر اسی سے طلب کی محسن
جیسے خیرات سخی سے کوئی سائل مانگے

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ——— کراچی

منظور مجھ کو ضبط، میرے دل کو اضطراب
دل میرا مجھ سے تنگ ہے میں دل سے تنگ ہوں

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

ساتھ دل کے چلے دل کو نہ روکا ہم نے
جو نہ اپنا تھا اُسے ٹوٹ کے چاہا ہم نے
اک دھوکے میں کٹی ہے یہ عمر ساری
کیا بتائیں کیسے کھویا کیسے پایا ہم نے

مہوش ملک ——— گاؤں ہڈالی

اچھا تمہارے شہر کا دستور ہو گیا
جس کو گلے لگایا وہ دور ہو گیا
دادی کو کہنا اُس کی کہانی سنائیے
وہ بادشاہ جو عشق میں مزدور ہو گیا

نوال افضل گھمن ——— گلستان جوہر کراچی

تیری خوشبو نہیں ملتی، تیرا لہجہ نہیں ملتا
ہمیں تو شہر میں کوئی تیرے جیسا نہیں ملتا
یہ کس دھند میں ہم تم سفر آغاز کر بیٹھے
تمہیں آنکھیں نہیں ملتیں ہمیں چہرہ نہیں ملتا

خاموشی کو بیاں ملے

ادارہ

ملیحہ ظفر گوجرہ

امی ابو نے تو میرا نام ملیحہ ظفر رکھا لیکن باقی نام جیسے کہ ملو ملیح اجاج ایمن مدیحہ ملکہ چھوٹی اللہ دتی سنولی وغیرہ پکارنے والوں نے رکھے ہیں۔ میں تحصیل گوجرہ کے گاؤں عثمان کوٹ میں ہی پیدا ہوئی اور اب بڑی ہو کر آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ میرے گاؤں کو ہرگز کوئی ایسا ویسا گاؤں نہ خیال کیا جائے۔ ٹیلی فون حتیٰ کہ 4G کے ساتھ ساتھ صاف پانی گیس اور بجلی بھی میسر ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ انگریزی میڈیم سرکاری اسکول ہیں۔ جانوروں کے علاج معالجے کے لیے مستند ڈاکٹرز اور باقاعدہ اسپتال موجود ہے۔ اور اشرف المخلوق یعنی انسانوں کی طبی امداد کے لیے ایک عدد چوبیس گھنٹے سروس والا گورنمنٹ کا چھوٹا سا اسپتال ہے۔ اگر آپ کے پاس اپنی سواری بھی نہیں ہے تو بھی آپ کراچی سے اسلام آباد تک کا سفر با آسانی کر سکتے ہیں (بھئی اس میں کسی الٰہ دین کے چراغ کی ضرورت نہیں پڑے گی) کیوں کہ یہ گاؤں بالکل بڑی شاہراہ پر واقع ہے۔ بھئی میں تو جب بھی ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کا نقشہ اٹھا کر مطالعہ کرتی ہوں تو سیر خون بڑھ جاتا ہے۔ بھئی مابدولت کا گاؤں جو بالکل دائیں طرف واضح کر کے لکھا ہوتا ہے ناں (خون کی کمی کا شکار اہل عثمان کوٹ یہ طریقہ اپنا سکتے ہیں۔)

اس U.K (Usman Kot) میں زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں غلہ بانی اور تجارت بھی عام ہے۔ جبکہ پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے اکثریت فوج اور محکمہ تعلیم سمیت تمام سرکاری و نجی اداروں سے وابستہ ہو کر ملک کی ترقی اور رزق حلال کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔

میں اونچی لمبی اسمارٹ سانولی سنولی سی ہوں میٹرک گاؤں سے ہی کیا اور پھر گورنمنٹ کالج گوجرہ سے چار سال پڑھا اور اب BSC کے فائنل رزلٹ کا انتظار ہے۔ اللہ رب العزت فرسٹ ڈویژن کے ساتھ بہت اچھی پرسنٹیج دے کر پچھلے تیرہ سالہ تعلیمی سفر کی طرح اس بار بھی سرخرو کر دے۔ آمین۔

خوبیاں' خامیاں

ہر انسان کی طرح مجھے بھی اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ ہے۔ ہاں لیکن کنفرمیشن کے لیے انعم اور شہربانو سے رجوع کیا۔ پہلے خوبیوں کا ہی ذکر کرتے ہیں تو جی اچھی بات یہ ہے کہ میں کبھی بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی' چاہے کچھ بھی ہو جائے کیونکہ مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ دوسروں کو بھی حوصلہ دیتی ہوں۔ اگر کسی کی بات بری لگے تو اس کو بتا دیتی ہوں کہ شاید وہ اپنی عادت ٹھیک کر لے (اچھا انداز لازما") اپنی غلطی تسلیم کر کے معذرت کے ساتھ ساتھ اپنی اصلاح کی پوری کوشش کرتی ہوں۔ اگر کوئی بھلائی کرے تو بدلے میں جزاک اللہ ادا کرتی ہوں اور بھلائی کو پھیلانے کی پوری کوشش کرتی ہوں۔ خوش اخلاق ہوں۔ دوسرے کے غمی خوشی بانٹنے کی کوشش کرتی ہوں۔ سوہنے پرودگار کا اس کی ہر ہر نعمت کے لیے شکر ادا کرتی ہوں۔ خوبیاں تو اور بھی بہت سی ہیں لیکن اب کے لیے اتنا ہی۔

خامیاں جیسے کہ میری منہ پر بات کہنے کی عادت کسی کسی کو بہت بری لگتی ہے۔ غصہ نارملی تو نہیں آتا لیکن اگر آجائے تو بہت شدید ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس پہ کنٹرول بھی ہے (بھئی مفت کا ثواب جو لینا ہے۔) دوسروں پر جلد اعتبار کر لیتی ہوں جو کہ ہے تو اچھی بات لیکن اکثر نقصان بھی اٹھایا ہے لیکن فائدے کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ امی اور آپی کو مجھ میں خوبی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی جبکہ خامی بغیر ڈھونڈے ہر وقت ہاتھ باندھے مل جاتی ہے اور ہر وقت "ملیحہ ایسے نہیں ایسے" کہہ کر مجھے کنٹرول کیا ہوا

ہے۔ خیر۔

ایک عادت پتا نہیں خوبی ہے یا خامی کہ مجھے ہر چیز کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ لیکن میں سب کے سامنے ڈھونڈورا نہیں پیٹتی تو اکثر بے حس ہونے کے طعنے ملتے ہیں۔ بھئی سب کے سامنے اپنی پریشانیوں کا اشتہار لگانے کے بجائے اللہ وحدہ سے شیئر کرو وہ نہ صرف مرہم لگاتا ہے بلکہ پردہ رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ کو صراطِ مستقیم پہ بھی چلاتا ہے۔

ڈائجسٹ سے رشتہ

اسکول کے زمانے سے یہی ہے جب آپی پڑھا کرتی تھیں تو چونکہ میں ان سے کافی چھوٹی ہوں تو مجھے نہیں پڑھنے دیتی تھیں یہی کہتی تھیں کہ بڑے ہو کر پڑھنا۔ لیکن وہ ملیحہ ہی کیا جو منع کرنے سے رک جائے (صرف ان معاملات میں جو مجھے چھوٹا سمجھ کر منع کیے جائیں باقیوں میں میں ایک اچھی بچی ہوں) چوری چھپے پڑھتی تھی جب بھی کوئی کمرے میں آتا محسوس ہوتا تو رسالہ فوراً" تکیے کے نیچے اور آنکھیں بند۔ تھوڑی دیر بعد پھر سے میں، رسالہ اور تنہائی۔ پہلے صرف افسانوں اور احادیث کے ساتھ ساتھ اس ماہ کی مسکراہٹیں اور خبریں تک ہی محدود تھی۔ بھئی مجھ سے پورے مہینے کا انتظار جو نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب چونکہ میں بڑی ہو گئی ہوں (اماں کے بقول ویسے ہی ابھی میں بچی ہی ہوں اماں کی) تو رسالہ خود بھی خرید سکتی ہوں ہو تو آب حیات اور نمل صرف نام کی وجہ سے پڑھنا شروع کیا تو ان کی محبت کے جال میں پھنس کر بے بس ہو گئی اور اب تو مجھے باقاعدہ سے ناول خرید کر پڑھنے کی بھی اجازت ہے۔ اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی ایک ناول پڑھ لیے ہیں۔ ناول نگاروں میں عمیرہ احمد، نمرہ احمد ہاشم ندیم موسٹ فیورٹ ہیں۔ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ہمارے گھر میں شروع سے ہے۔ میری دادی اماں (اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین) ناولز اخبارات کا مطالعہ بڑے شوق سے کیا کرتی تھیں۔ دادا ابو کی تو ایک باقاعدہ چھوٹی سی لائبریری ہے۔ جس سے کتب حاصل کرنے کی اجازت صرف 15 سال سے بڑوں کو ہے۔ اس طرح اب اس بات کا فائدہ میں تو دونوں ہاتھوں سے لے رہی ہوں۔

سالگرہ

باقاعدہ طور پر نہیں مناتی۔ بس دوستیں وش کرنے کے ساتھ گفٹس دیتی ہیں اور پھر ملکہ کنٹین کی طرف مارچ۔ گھر والوں کو بہت کم یاد رہتی ہے بس جب سے سانحہ کارساز ہوا ہے تب سے ابھی تک رات نو بجے کے خبرنامہ میں جب سانحہ کارساز کا ذکر آتا ہے تو آواز آتی ہے "ملیحہ اور ہاں سچ تیری تاں اج برتھ ڈے وی آناں؟ ابھی برتھ ڈے" دوسری آتی ہے "میری وی توں وی" (بھئی ہم سب مل کر رات کو آٹھ بجے والا ڈرامہ اور نو بجے والا خبرنامہ جو دیکھتے ہیں) پھر غصہ بھی آتا ہے اور ہنسی بھی کہ بندہ اب شکریہ کہے یا اچھی طرح خبر لے۔ خیر۔

شاعری سے لگاؤ

بالکل ہے لیکن صرف پڑھنے کی حد تک۔ جناب ڈاکٹر علامہ اقبال کی اردو شاعری، حفیظ جالندھری کی شاہ نامہ اسلام" "مرزا غالب کی رومانوی ادائیں، بلھے شاہ کا پنجابی کلام اور چند دوسرے شعراء کرام کی چند نظمیں اور غزلیں پسندیدہ ہیں۔

آج سے چار سال پہلے رابعہ رحمٰن کی کتاب "سجدہ بے نیاز" پڑھی اور اس میں ایک دعا بہت اچھی لگتی ہے۔ جو میں لکھ کر رہی ہوں۔

کتابِ ہستی میں ہم کو یارب
لکھنا تو باکمال لکھنا
بہت سی باتیں چھپا رکھنا
فقط ہمارا اجمال لکھنا
گناہوں کے عریاں بدن پہ
رحمتوں کا جال لکھنا
اے غمزدوں کے چارہ گر
رحمتوں کی مثال لکھنا

روہی کی ہے بس یہی آرزو
کبھی تو اپنا وصال لکھنا

حافظہ قاریہ بشریٰ عزیز...چونیاں

ایم اے پولیٹکل سائنس' حافظہ و قاریہ (مزید تعلیم جاری) سب سے مشکل اور تکلیف دہ عمل بھی۔ میرے نزدیک کہ آپ لوگوں کو بتاؤ کہ آپ کیا ہو۔ یہ انسانی زندگی کا لازمی جز ہے کہ وہ خود کو متعارف کروائے بنا رہ نہیں سکتا۔ اندر کہیں نہ کہیں ستائش کی بھٹی جلتی اور سلگتی رہتی ہے۔

جب سے میری "خامشی کو زباں ملے" کا سلسلہ شروع ہوا تو بہت اچھا لگا۔ "خامشی کو زباں ملے" میں تقریباً" سب بہنوں کو بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ "پڑھتے پڑھتے" میرے دل نے بھی انگڑائی لی کہ میں بھی اس میں لکھوں' لہٰذا فرسٹ ٹائم لکھنے کی جسارت کر بیٹھی۔ "خامشی کو زباں ملے" ورنہ ریڈیو پروگرام میں ابصار عبدالعلی کے پروگرام "کلام ہمارا انتخاب آپ کا" میں شاعری بھیجتی تھی پھر فیملی میگزین میں شاعری بھیجتی تھی' جو اللہ کے فضل و کرم سے شائع بھی ہوئی' پھر اپنی ایک بک لکھی جس کا نام ہے "شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات" جو ناگزیر وجوہات کی بنا پر شائع نہیں کرواسکی۔ مطالعہ میں۔ سب سے پہلے قدرت اللہ شہاب' بانو قدسیہ کا راجہ گدھ' بشریٰ رحمٰن کا لازوال' لگن' ناجیہ' علیم الحق کا "عشق" عمیرہ احمد کا "تھوڑا سا آسمان" لاحاصل' پیر کامل' کشف المحجوب پسند ہے۔ مگر ایک لفظ کو سمجھنے میں بہت سارا وقت لگا' صرف حال اور قال کو جاننے میں۔

امام غزالی کی احیائے علوم بہت پسند ہے۔

زندگی کے داؤ پیچ خواتین ڈائجسٹ اور شعاع سے سیکھے۔ میرا اور خواتین ڈائجسٹ اور شعاع کا تعلق کم و بیش اس وقت سے ہے جب لفظوں کے مفہوم کا بھی پتا نہیں تھا۔ چارپائیوں کے نیچے یا اسکول میں چھپ کر پڑھتے تھے۔ سب بہنیں شوق سے پڑھتی تھیں اور ہیں' لیکن لکھنے کی صلاحیت مجھ سے بڑی بہن اور پھر مجھ میں آئی۔ لیکن میں نے باقاعدہ تو نہیں "بے قاعدہ ضرور لکھا" میری ڈکشنری میں بے قاعدہ سے مراد غیر مستقل مزاجی ہے۔ سب سے بڑی خامی ہی غیر مستقل مزاجی ہے۔ "ورنہ آدمی ہم بھی تھے بڑے کام کے"

خامیوں کا ایک انبار اکٹھا ہو سکتا ہے۔ صاف گو ہوں۔ غلط بات برداشت نہیں ہوتی۔ منافقت اور چاپلوسی سے چڑ ہے۔ نہ کرتی ہوں' نہ سنتی ہوں۔ منافقت کرنے والے لوگوں سے ناقابل بیان حد تک نفرت ہے۔

خوبی یہ ہے حسد کو دل میں جگہ نہیں دیتی۔ اللہ سے ایک خاص تعلق ہے۔ ہر معاملہ اللہ پر چھوڑ دیتی ہوں۔ خوبی میں مطالعہ اور کھانا پکانا سرفہرست ہے۔ فارغ اوقات میں لکھنے کا بہت شوق ہے۔ جب الفاظ وحی کی طرح ذہن کی بنجر زمین پر شبنم کی طرح گرتے ہیں تو سوکھی' دماغ کی بنجر زمین "نرم اور زرخیز ہونے لگتی ہے۔ پھر اپنے آپ کو روکے بھی نہیں روک سکتی۔ کیونکہ یہ میرے اختیار میں نہیں۔ یہ میرے رب کی عطا ہے۔ دین ہے۔

پسندیدہ شعر۔

میرے ہاتھوں کی لکیروں کے اضافے ہیں گواہ
میں نے خود کو تراشا ہے بہت پتھر کی طرح

پسندیدہ نظم ؛ امجد اسلام امجد

محبت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے
کہ یہ جتنی پرانی جتنی بھی مضبوط ہو جائے
اسے تائید تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے
اسے لفظوں کی حاجت پر پھر بھی رہتی ہے۔

پسندیدہ کتاب۔ بلاشبہ قرآن مجید' اس کے علاوہ اللہ کے سفیر' عقل بیدار' سلطان باہو' منٹو' زیر مطالعہ اردو لٹریچر' آیئے اپنی نماز کا جائزہ لیں۔ اور بہت سی کتب' شاید نام لکھتے لکھتے شام ہو جائے۔

1 "اصلی نام؟"
"ماہم عامر۔"
2 "پیار کا نام؟"
"ماہم ہی کہتے ہیں۔"
3 "تاریخ پیدائش/ شہر؟"
"26 دسمبر 1990ء/ کراچی۔"
4 "قد/ ستارہ؟"
"5 فٹ 10 انچ/ کیپری کورن۔"
5 "بہن بھائی؟"
"ایک بھائی ہے۔ مجھ سے چھوٹا۔"
6 "تعلیم؟"
"بزنس میں گریجویٹ ہوں اور سی ایس ایس کرنے کا ارادہ ہے۔ کیونکہ یہ میری امی کی خواہش ہے۔"
7 "شوبز میں آمد؟"
"میرے والد پروڈکشن میں تھے۔ سات سال قبل ان کا

باتیں ماہم عامر سے

شاہین رشید

انتقال ہو گیا تو جب میں نو ماہ کی تھی تو ایک کمرشل کیا اور بچپن میں کافی کمرشلز کیے۔"
8 "شادی؟"
"کوئی پلان نہیں ہے فی الحال۔ ابھی تو بہت کام کرنا ہے، بہت نام کمانا ہے۔"
9 "زندگی کب بدلی؟"
"جب ایک ڈائریکٹر نے ڈرامے کے لیے بلایا اور پھر خود ہی کہہ دیا کہ آپ تو بہت لمبی ہیں آپ کبھی ہیروئین نہیں بن سکتیں بلکہ آپ تو کبھی آرٹسٹ بھی نہیں بن سکتیں... تب میں نے ان سے کہا ہیروئین بنوں نہ بنوں مگر ایکٹر ضرور بن جاؤں گی اور اس چیلنج نے میری زندگی کو بدلا۔"
10 "پہلا پروگرام؟"
"تھیٹر کیا تھا۔"
11 "وجہ شہرت؟"
"بابل کا انگنا۔ رشتوں کی ڈور۔"
13 "کیا انڈسٹری بری ہے؟"
"ایسا کچھ نہیں ہے... کیونکہ میرے ساتھ کسی نے برا نہیں کیا اور برائی تو معاشرے میں بھی ہوتی ہے۔"
14 "آپ کا سورج طلوع ہوتا ہے؟"
"جب شوٹ ہو تو جلدی اٹھ جاتی ہوں، ویسے بھی جلدی اٹھنے کی عادت ہے۔"
15 "اٹھتے ہی کسے پکارتی ہیں؟"
"امی کو... امی... چائے... دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے مجھے صبح چائے چاہیے ہوتی ہے۔"
16 "بچپن میں امی کی کیا بات بری لگتی تھی؟"

"یہ کہ جب کہیں گھومنے کا پلان بناتی تھی تو امی کہتیں کہ چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ لے جانا اور میں سوچتی تھی کہ میری دوستوں میں میرا بھائی کیا کرے گا۔"

17 "گھر کے کاموں سے دلچسپی؟"

"بہت ہے.... مگر کرتی نہیں ہوں۔ کیونکہ مصروف بہت ہوتی ہوں۔"

18 "ایک پسندیدہ کھانا جو بلاناغہ کھا سکتی ہیں؟"

"بریانی اور مونگ مسور کی مکس دال جو چاولوں میں بھی ڈالتے ہیں، مجھے بلاناغہ کھلادیں، بہت شوق سے کھاتی ہوں اور کڑھی بھی اور ہاں فرنچ فرائیز بھی۔"

19 "سبزی خور ہیں یا گوشت خور؟"

"سبزی خور، گوشت کھانا بالکل بھی پسند نہیں۔"

20 "اپنے آپ میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"

"میں موٹی ہوں۔ مجھے پتلا ہونا ہے۔ مگر وقت نہیں ہے۔"

21 "بے وقت کی بھوک کیسے مٹاتی ہیں؟"

"کچھ بھی مل جائے چاکلیٹ مل جائے اور آلو تو میری پسندیدہ سبزی ہے۔ کبھی بھی کسی بھی شکل میں مل جائیں، کھالوں گی۔"

22 "فخر کا کوئی لمحہ؟"

"بہت سے لمحے آئے.... مگر ابھی یاد نہیں ہے۔"

23 "ایک دن، جس کا انتظار ہے؟"

"کہ میں اتنی مشہور ہو جاؤں کہ لوگ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکیں اور تصویر کھنچوانے کی فرمائش کریں۔"

24 "تھکن میں بھی جانے کے لیے تیار رہتی ہوں؟"

"گھر سے باہر کھانا کھانے کے لیے... اور کافی پینے کے لیے کبھی منع نہیں کرتی۔"

25 "بچپن کی بری عادت، جس سے چھٹکارا چاہتی ہوں؟"

"مجھے غصہ بہت آتا ہے۔"

26 "بے ساختہ رونا آجاتا ہے؟"

"جب میں بہت خوش ہوتی ہوں تو بے ساختہ رونا آجاتا ہے۔"

27 "بات منوانے کی ضد ہے؟"

"طبیعت میں ضد تو ہے۔ مگر بات منوانے کی نہیں کسی کام کو پورا کرنے کی ٹھان لوں تو بس۔"

28 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"میرے خیال سے موبائل فون۔ نہیں ہوتے تو زندگی کیسی ہوتی۔"

29 "پسندیدہ دن؟"

"جس دن میں اپنی امی کے ساتھ پورا دن گزارتی ہوں۔"

30 "پسندیدہ مہینہ؟"

"دسمبر اور سردیوں کے سارے مہینے اچھے لگتے ہیں۔"

31 "مردوں میں کیا بات نوٹ کرتی ہیں؟"

"سب سے پہلے میں ان کے ہاتھ پاؤں اور جوتے دیکھتی ہوں۔ اگر جوتے صاف نہ ہوں تو جج کرلیتی ہوں کہ یہ کیسا ہوگا۔"

32 "برے لگتے ہیں وہ لوگ؟"

"وہ لوگ جو کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر یا کسی بھی کھانے والی جگہ پر بیٹھ کر "ویٹر" کو "اوئے" کر کے آواز دیتے ہیں تو میں ایک دم پلٹ کر دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں یہ کیسا انسان ہے۔ یہ بہت برا انسان ہے۔"

33 "لمبے ہونے کا ایک فائدہ؟"

"راستے میں کوئی چھیڑ نہیں سکتا۔ کیونکہ لوگ پہلے ہی ڈر جاتے ہیں۔"

34 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"امی... کے بہت تیز غصہ ہے۔"

35 "کچھ وقت سے پہلے ملا؟"

"نہیں ہر چیز اپنے وقت پر اور بہت محنت کے بعد ملی ہے۔ حتی کہ جب کلاس 10th میں آئی تب مجھے موبائل فون استعمال کرنے کی اجازت ملی۔"

36 "بچت ہوتی ہے؟"

"کوشش کرتی ہوں.... مگر ہوتی نہیں ہے۔ گولڈ کا شوق نہیں اسلور اچھا لگتا ہے تو شاید ایک آدھ چیز لی ہو۔"

37 "ونڈو شاپنگ کرتی ہیں یا؟"
"جاتی ونڈو شاپنگ کے لیے ہوں۔ مگر پھر کچھ نہ کچھ خرید ہی لیتی ہوں۔ پرفیومز کا شوق ہے وہی لیتی ہوں۔ پرفیوم میری کمزوری ہے۔"
38 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہیں؟"
"دوستوں پر یا گھر والوں پہ خرچ کرتے وقت کچھ نہیں سوچتی 'مگر اپنے اوپر خرچ کرتے ہوئے درد محسوس کرتی ہوں۔"
39 "کون سا ملک بہت پسند آیا؟"
"کچھ عرصہ قبل ملائشیا گئی تھی۔ بہت پسند آیا۔ بہت ایمان داری ہے۔ لوگ بہت اچھے ہیں۔ بہت ہمدرد ہیں۔ انسانیت بہت ہے۔"
40 "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"
"دو دریا میں کلاچی کی کڑاہی بہت پسند ہے اور لاہور میں لکشمی چوک کے دال چاول بہت پسند ہیں۔"
41 "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہیں؟"
"نہیں۔ دو منٹ تک تو کچھ ہوش نہیں ہوتا۔ دس پندرہ اس فیصلے پہ لگا دیتی ہوں کہ مجھے اٹھنا ہے کہ نہیں۔"
42 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"
"اپنے بیڈ پہ ٹی وی لگا کر امی کے ساتھ بکواس کرتے ہوئے یعنی گپ شپ لگاتے ہوئے یا دوستوں کے ساتھ انجوائے کرتی ہوں۔"
43 "چائے کہاں کی پسند ہے۔ ڈھابے کی یا؟"
"چائے مجھے میکڈونلڈز کی بہت پسند ہے۔"
44 "گھر میں کس لباس میں رہتی ہیں؟"
"قہقہہ۔ یہ بتانے والی بات نہیں ہے۔ پاجامہ اور ٹی شرٹ میں۔"
45 "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"
"تو اسے اپنے برے وقت میں آزمائیں۔"
46 "مرد حسین ہو یا ذہین؟"
"انسان اچھا ہونا چاہیے۔ گریس فل اور پرسنالٹی اچھی ہونی چاہیے۔"
47 "گھر میں کہاں سکون ملتا ہے؟"
"جہاں لوگ کم ہوں 'سناٹا ہو اور سکون ہو۔ اپنے ٹیرس میں۔"
48 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب جلدی دیتی ہیں؟"
"سب کے ہی اور نوشین کے جو کہ بچپن کی دوست ہے اگر آدھی رات کو بھی ایس ایم ایس کرے تو جواب دیتی ہوں۔"
49 "بوریت کس طرح دور کرتی ہیں؟"
"باہر چلی جاتی ہوں۔ مووی دیکھ لیتی ہوں اور کچھ سمجھ میں نہ آئے تو پھر گانے سن لیتی ہوں۔"
50 "بی پی ہائی کب ہوتا ہے؟"
"جب غصہ آتا ہے تو میں بالکل پاگل ہو جاتی ہوں۔ آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتی ہوں اور میرا پورا جسم کانپنے لگتا ہے۔"
51 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"نہیں اللہ کا شکر ہے۔"
52 "آپ کے بیگ کی تلاشی لیں تو کیا کیا نکلے گا؟"
"قہقہہ۔ بہت کچھ' میرے دوست کہتے ہیں کہ لگتا ہے اس میں بچے لے کر آتی ہو اتنا بھاری ہوتا ہے۔ لوشن' سینیٹائزر' لپ بام یا لپ اسٹک' والٹ' موبائل کا چارجر' چیونگم ہر طرح کی چیزیں ملیں گی۔ پوری دکان ہے۔"
53 "ملک کو سنبھالنا پڑ جائے تو؟"
"جو بے روزگار ہیں' ان کے لیے کچھ کروں گی۔ روڈ پر بے لگام پھرنے والے جانوروں کے لیے کچھ کروں گی۔"
54 "آپ کے پاس ذخیرہ ہے؟"
"میرے پاس سینڈلز بہت ہیں۔"
55 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"نصیحت تو نہیں لیکن جب میں غصے میں ہوں اور کوئی کہے کہ غصہ مت کرو' کام ڈاؤن ہو جاؤ' تو غصہ اور بڑھ جاتا ہے۔"
56 "اپنے لیے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"عزت بہت کمائی ہے اور پائی ہے اور ویسے اگر چیز کی بات ہے تو ایک مہنگا والا موبائل فون خریدا ہے۔ مگر خرید

کر روئی بھی بہت کہ میں نے اپنے اوپر اتنا خرچ کر دیا۔"

57 "کھانے کے لیے بہترین جگہ چٹائی 'اپنا بیڈ یا ڈائننگ ٹیبل؟"

"میں اپنے بیڈ پہ بھی کھالیتی ہوں۔ چٹائی پہ بھی 'کسی بھی آرام دہ جگہ پر بیٹھ کر کھا سکتی ہوں۔"

58 "دنیا سے کیا لینا چاہتی ہیں؟"

"بہت ساری عزت اور شہرت۔"

59 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"

"دلچسپی ہے کیونکہ بہت کام کی چیز ہے۔"

60 "کھانوں میں آپ کی پسند دیسی یا بدیسی؟"

"دونوں۔"

61 "کیا اچھا پکا لیتی ہیں؟"

"بیکنگ بہت اچھی کرتی ہوں۔ کپ کیک بہت اچھا بنا لیتی ہوں۔"

62 "بہترین کک کون ہوتے ہیں مرد یا عورت؟"

"دونوں ـــ میری امی بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں اور ہمارے گھر میں "میل کک" ہے جو بہت اچھا کھانا پکاتا ہے۔"

63 "اگر آپ کو کوئی اغوا کرے تو؟"

"تو میری امی تو رو رو کر پاگل ہو جائیں گی۔ بھائی ٹینشن میں خاموش ہو جاتا ہے' سب پریشان ہو جائیں گے۔"

64 "آپ کس کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"

"کبھی سوچا ہی نہیں ـــ تو اغوا کیسے کر سکتی ہوں۔"

65 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"اندھی بھی ہوتی ہے۔ کانی بھی ہوتی ہے۔"

66 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"

"مہندی اور جوتا چھپائی میں دولہے سے پیسے مانگنا بہت اچھا لگتا ہے۔"

67 "تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"

"میں تو کوشش کرتی ہوں کہ گفٹ دوں کہ گفٹ دینا اچھا لگتا ہے۔"

68 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"

"دلائی لامہ" "آپ اتنی انسانیت کی باتیں کر کے چلے گئے۔ اتنا اچھا کوئی کیسے ہو سکتا ہے۔"

69 "ڈر لگتا ہے' فوبیا ہے؟"

"جی۔ اونچائی پہ جانے سے ڈرتی ہوں۔ اور سانپوں سے بہت ڈرتی ہوں۔"

70 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"

"میرا چارجر' میرا سیل فون۔"

71 "خونی رشتے قابل بھروسا ہوتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے ماں اور باپ کا رشتہ ہی اولاد کے لیے قابل بھروسا ہوتا ہے۔"

72 "عام لوگوں سے کتنی مختلف ہیں؟"

"ہر کوئی ایک دوسرے سے مختلف ہی ہوتا ہے۔ اگر سب ایک جیسے ہوتے تو مسئلہ ہی نہ ہوتا۔ کافی مختلف ہوں دیگر لوگوں سے۔"

73 "غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"

"فوراً"ـــ سوری بول دیتی ہوں۔"

74 "دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟"

"دل کی سنتی ہوں۔ مگر دماغ کو بھی بہت استعمال کرتی ہوں۔"

75 "بچپن کا ایک کھلونا جو آج بھی محفوظ ہے؟"

"مجھے "باربی ڈولز" کا بہت شوق تھا اور تقریباً"100 باربی ڈولز میرے پاس محفوظ ہیں بلکہ 100 سے بھی زیادہ ہوں گی اور ایک ٹیڈی بیئر بھی ہے۔"

76 "کب منہ سے اول فول نکلتا ہے؟"

"جب ڈرائیو کرتے ہوئے کوئی بدتمیزی کرے' جب کوئی بات حد سے کراس کر جائے تو بس بہت کچھ منہ سے نکلتا ہے۔"

77 "غصے میں پہلا لفظ؟"

"بکواس مت کرو۔"

78 "کبھی چھپ چھپ کر باتیں سنیں؟"

"نہیں 'کبھی بھی نہیں 'ایسی نیچر ہی نہیں ہے۔"

79 "شہرت مسئلہ کب بنتی ہے؟"

"جب آپ اسے سر پر سوار کریں کہ میں ہی سب کچھ ہوں۔ دوسرا کچھ نہیں ہے۔"

80 "نیند کا انتظار کرتی ہیں؟"

"بالکل جی... جلدی نہیں آتی کروٹیں ہی بدلتی رہ جاتی ہوں۔"

81 "ساتھ رکھ کر سوتی ہیں؟"

"پانی کا گلاس فون اور چارجر۔"

82 "دنیا میں اللہ کا بہترین تحفہ؟"

"ہر چیز' انسان بھی تو تحفہ ہی ہے۔ کسی کے گھر میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ بھی تو اللہ کا تحفہ ہی ہوتا ہے۔"

83 "زندگی بری لگتی ہے؟"

"نہیں زندگی بری نہیں لگتی' کیونکہ اس کو اچھا بنانے کا کام اللہ نے ہمیں دیا ہوا ہے۔"

84 "کھانا نامکمل لگتا ہے؟"

"اگر اچار نہ ہو تب۔"

85 "تہوار جوش و شوق سے مناتی ہیں؟"

"عید' رمضان وغیرہ۔"

86 "پیسہ محنت سے ملتا ہے یا قسمت سے؟"

"محنت سے اور اس میں قسمت کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔"

87 "زندگی بدلی؟"

"بابا کے انتقال کے بعد... سب کے چہرے بھی سامنے آگئے اور جدوجہد بھی شروع ہو گئی۔ میں تو بچپن میں ہی بڑی ہو گئی تھی۔"

88 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"

"جب مجھے کسی کو بچانا پڑے تب۔"

89 "گھر دیر سے آنے کے بہانے کرتی ہیں؟"

"ہرگز نہیں... امی کو فون کر کے بتا دیتی ہوں کہ دیر ہو جائے گی اور وجہ بھی بتا دیتی ہوں۔"

90 "بدلہ لیتی ہیں؟"

"نہیں لیتی... اللہ پر چھوڑ دیتی ہوں۔"

91 "کب اپنے آپ کو فریش محسوس کرتی ہیں؟"

"جب میں صبح جلدی اٹھ جاؤں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور فریش محسوس کرتی ہوں۔"

92 "گھر آ کر کیا خواہش ہوتی ہے؟"

"امی کے پاس جا کر بیٹھ جاؤں اور ڈھیر ساری باتیں کروں اور اس وقت نہ کوئی میک اپ اتارنے کو کہے اور نہ کھانا کھانے کو کہے۔"

93 "آپ کی کوئی ایکسٹرا صلاحیت؟"

"لوگ کہتے ہیں کہ میں اچھا گا لیتی ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں اچھا ڈانس بھی کر لیتی ہوں۔"

94 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"

"اپنے آپ میں نقص ہی نکال رہی ہوتی ہوں کہ یہ ہو گیا ہے' یوں ہو گیا ہے' ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

95 "کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟"

"لوگوں سے پیار' کوئی پسند ہے تو نشے کی حد تک پسند ہے۔"

96 "وہم جو پریشان کرتا ہے؟"

"بہت سوچتی ہوں کہ یہ نہ ہو جائے وہ نہ ہو جائے۔"

97 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟"

"جو ہاتھ میں ہوتا ہے دے دیتی ہوں اور اس بات پر میرے دوست بہت چڑتے ہیں۔"

98 "اپنے تجربے سے سیکھتی ہیں یا دوسروں کے تجربے سے؟"

"اپنے تجربے سے' چاہے کوئی کتنا ہی بولے میں جب تک خود تجربہ نہ کر لوں مطمئن نہیں ہوتی۔"

99 "وقت ضائع کب ہوتا ہے؟"

"جب ہم فضول لوگوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔"

100 "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"

"کوشش کرتی ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی ایک بجے بلائے اور میں 10 منٹ پہلے پہنچ جاؤں۔"

100 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"اللہ کی مرضی سمجھوں گی۔ بہت افسردہ ہو جاؤں گی۔ ڈرتی ہوں اس وقت سے۔ مگر جو ہونا ہوتا ہے ہو کے رہتا ہے۔"

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

متاثر

ماہا علی نے ماہرہ خان کی فلم "رئیس" کے لیے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ "یہ حسینہ (واہ بھئی ایک حسینہ دوسری کو حسینہ کہہ رہی ہے) کبھی بھی اپنے حسن اور کام سے متاثر کیے بنا نہیں رہ سکتی۔ (سو تو ہے۔) اب کیا جان لینی ہے۔ (کس کی مایا... بھئی 'جان۔) ماہرہ میرے پاس یہ بتانے کے لیے الفاظ نہیں ہیں کہ آپ کتنی خوب صورت لگ رہی ہیں۔ سخت محنت ہمیشہ رنگ لاتی ہے۔ (مایا! مایا! کیا ہو گیا... بھارتی فلموں میں کام کرنے پر پابندی لگ گئی ہے۔) مجھے آپ پر فخر ہے۔" (کیوں آپ کو کیوں ہے؟)

سلام

سیاحت ایک ایسا شوق ہے جو کسی نہ کسی طرح اپنا راستہ بنا لیتی ہے۔ سیاحتی ادب میں مستنصر حسین تارڑ ایک بڑا نام ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں کہ "میں یہ جانتا ہوں کہ "مستنصر حسین تارڑ ریڈرز ورلڈ" کی ایک ممبر خاتون بی بی بخاری میرے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک مخلوط کوہ پیما ٹیم کے ہمراہ "کے ٹو" بیس کیمپ تک ہو آئی ہیں اور کیا آپ یقین کریں گے کہ وہ مکمل حجاب میں ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں بھی کم کم دکھتی ہیں اور اس کے باوجود انہوں نے وہ ٹریک مکمل کر لیا جو کوئی عام مرد بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے ان سے کہا تھا۔ "بی بی بخاری! تم نے تو کے ٹو کو بھی اپنا چہرہ نہیں دکھایا ہو گا۔ میں تمہیں سلام کرتا ہوں۔"

سوچ

غلام محمد قاصر اردو کے شاعر، جن کا تعلق ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک گاؤں سے تھا۔ ابتدائی تعلیم ڈیرہ سے حاصل کرنے کے بعد لاہور آ گئے اور اردو میں ایم اے کیا۔ شاعری کا شوق بہت زیادہ تھا تو احمد ندیم قاسمی سے تربیت لے کر مزید نکھر گئے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا اور پہلے اسکول اور پھر کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیے' بے حساب مشاعرے پڑھے اور داد وصول کی۔ شادی کے لیے انتخاب ڈیرہ کے مشہور شاعر سعید اختر صاحب کی بیٹی کا کیا۔ پتے کی بیماری کے باعث 1998ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی تین کتابوں کے ساتھ ساتھ تین بچے بھی ہیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ بیٹوں نے باپ کی طرح ہی ہمت سے پڑھا اور اب باپ کی محبت کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا ہے۔ غلام محمد قاصر کا ایک شعر۔

دھمکی

طارق جیکسن منہ سے ساؤنڈ افیکٹس نکال کر نام بنانے والے پاکستانی فن کار ہیں۔ جنہوں نے پینتیس سال پہلے مائیکل جیکسن سے متاثر ہو کر اپنے نام طارق کے ساتھ جیکسن لگالیا۔ ان دنوں کام نہ ہونے کی وجہ سے طارق جیکسن حکومت سے سخت نالاں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شادیوں کی تقریبات جلد اختتام پذیر ہونے' رات گئے تک فنکشنز نہ ہونے کے باعث فن کار برادری سخت پریشان ہے اور بہت سے فن کاروں نے مالی تنگ دستی کے باعث دوسرے شعبوں میں تلاش معاش شروع کردی ہے۔ (طارق جیکسن! تو آپ کیا سوچ رہے ہیں "آپ بھی۔") انہوں نے مزید کہا کہ شوبز مصروفیات نہ ہونے کے باعث پچھلے دس سالوں میں ان کالاکھوں کا نقصان ہوا جو حکومت پر واجب الادا ہے۔ (ہیں۔۔۔؟) اگر حکومت نے ان کا مطالبہ پورا نہ کیا تو وہ عدالت سے رجوع کریں گے۔ (ایک اور دھمکی؟)

خیال

سعودی دارالحکومت ریاض میں منعقدہ ایک اسپورٹس ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے شہزادی ریما بنت بندر بن سلطان نے کہا کہ وہ ملک میں خواتین کے کھیل کے میدان میں انقلابی تبدیلیوں کے لیے کوشاں ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ "کھیل محض لہو لعب نہیں ہے' بلکہ یہ ایک طرح کا طرز زندگی ہے۔ سعودی معاشرے میں فکری اختلاف رکھنے والے مختلف حلقوں میں خواتین کے کھیل کے میدان میں اترنے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی بنیادی وجہ مغربی ذرائع ابلاغ میں خواتین کھلاڑیوں اور خواتین کے کھیلوں میں شمولیت کے متنازع طریقہ کار ہیں۔ مگر سعودی عرب میں خواتین کو اس میدان میں لانے کے ساتھ ساتھ معاشرتی اقدار اور اسلامی روایات کا خیال رکھا جائے۔"

کچھ ادھر ادھر سے

امریکہ کے ممتاز دانشور نوم چومسکی امریکہ کو دنیا کی سب سے بدمعاش ریاست یا State Rougue کہتے ہیں اور ان کا کہنا غلط نہیں ہے۔ امریکہ کہنے کو ایک ملک ہے' مگر دنیا کے سو سے زیادہ ملکوں میں اس کی فوجیں موجود ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ امریکہ خود کو دنیا کا واحد "پولیس مین" سمجھتا ہے

اور ساری دنیا کے لیے اس کا پیغام یہ ہے کہ تمہیں اگر زندہ رہنا ہے تو امریکہ کی بالادستی کو قبول کرنا ہوگا۔ امریکہ دنیا کی واحد ریاست ہے' جس نے ایک بار نہیں' دوبار ایٹم بم استعمال کر کے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔

شاہ نواز فاروقی۔۔۔ فرائی ڈے اسپیشل

☆ دلچسپ بات یہ ہے کہ نواز شریف کی حکومت 1999ء میں جس بھارت پالیسی کا بہانہ بنا کر برطرف کی گئی' وہی پالیسی مشرف نے اپنے دور میں مزید آگے بڑھائی اور سیدھا آگرہ جا گرے۔

(عبداللہ طارق سہیل۔ وغیرہ وغیرہ)

آپ کا باورچی خانہ

سندس خلیل ڈھاڈر

خواتین ڈائجسٹ کی رونق اور ذائقہ بڑھاتا یہ سروے ہمیشہ ہی مجھے اپنی جانب متوجہ کرتا تھا۔ پر میں ہمیشہ یہی سوچ کر رک جاتی تھی کہ میرا ماحول اس سروے سے میل نہیں کھاتا۔ اور جھوٹ میں اپنے پیارے ڈائجسٹ میں لکھ نہیں سکتی۔ تو آج آخر کار بڑا دل کر کے سچ لکھ رہی ہوں۔ اب دیکھوں شائع ہوتا ہے کہ نہیں۔

س ۔ کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں۔ پسند ناپسند' غذائیت؟

ج ۔ کھانا پکاتے ہوئے ہم صرف "کھانا مزے دار بنے" بس اس کا خیال رکھتے ہیں۔ اور کیونکہ ہمارے گھر میں کھانا ون ڈش ہی بنتا ہے تو غذائیت؟ اور پسند ناپسند صرف بھائی کی چلتی ہے جو روزانہ سبزی وغیرہ لاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم بھی فرمائش کر لیتے ہیں۔

س ۔ گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں' کھانے کا وقت ہے کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کر کے تواضع کر سکیں؟

ج ۔ مہمان بے شک اللہ کی رحمت ہے اور چونکہ ہر کوئی اپنا رزق ساتھ لاتا ہے تو اس لیے ہم ہمیشہ بڑے کھلے دل سے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اور ہر کوئی مناسب وقت پہ آتا ہے۔ اس لیے کبھی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔ اور چونکہ ہم مہمانوں کے لیے اپنے رواج اور حیثیت کے مطابق سالن' کڑاہی گوشت' چاول' سلاد اور دہی' روٹیاں وغیرہ ہی بناتے ہیں تو یہ تو سب کو ہی آتا ہے۔ ہاں البتہ ہم روٹیاں بڑی بڑی بناتے ہیں۔ وہ بھی بغیر بیلن کے۔

س ۔ صبح کا ناشتا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟

ج ۔ ہمارا ناشتا بھی ہماری طرح سادہ ہی ہوتا ہے جو کہ بھابھی بناتی ہیں۔ تین پراٹھے اور کالی چائے۔ جب کہ میں سالن کے ساتھ ناشتا کرتی ہوں تو گرمیوں میں رات کا سالن اور سردیوں میں انڈا فرائی کر لیتی ہوں۔

س ۔ آپ مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟

ج ۔ یہ سوال خود پر ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ عیاشی صرف مردوں کے لیے ہے۔ ہم عورتیں مکمل پردہ کرتی ہیں۔ اور ایسی جگہ پہ جانے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اور یہاں بازار بھی صرف مرد جاتے ہیں۔ اور یہاں کے ہوٹل بھی صرف مردوں کے لیے ہیں اور عورتوں کا کھلے عام باہر جانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہاں البتہ ہم جب بھی شاپنگ کے لیے بستی جاتے ہیں تو وہیں کپڑوں کی دکان پر بیٹھ کر پلیٹ برقعے کے اندر کر کے چھولے چاول اور آئس کریم ضرور کھاتے ہیں اور اسی میں بہت خوش ہیں (اللہ تعالیٰ کا شکر ہے)

س ۔ کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کا خیال رکھتی ہیں؟

ج ۔ جی ہاں' اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے ہر موسم کو انجوائے کرنے کے لیے صحت اور توفیق دی۔ موسم اگر سہانا ہو تو موڈ خود بخود کچھ اچھا کھانے کو کرتا ہے۔ پھر ہم سب گھر کی عورتیں پیسے اکٹھے کر کے کبھی چاٹ' کبھی پکوڑے' کبھی بریانی وغیرہ بناتے ہیں اور بادل' بارش ہو اور دودھ پتی چائے کا بڑا سا مگ نہ ہو' یہ کیسے ممکن ہے۔

س ۔ اچھا پکانے کے لیے آپ کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج ۔ اس بات پہ میں سو فیصد یقین رکھتی ہوں کہ ہر کام کے لیے مناسب محنت درکار ہوتی ہے اور بغیر محنت کے کوئی بھی چیز اچھی نہیں ہوتی اور جس کھانے کو اپنی محنت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام اور درود پاک سے شروع کیا جائے تو وہ بابرکت ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ میں تو اس قول پہ یقین رکھتی ہوں کہ۔ اے اللہ محنت میری' رحمت تیری۔

س ۔ کچن کی کوئی ٹپ جو آپ دینا چاہیں؟

ج ۔ اور تو کوئی نہیں ہے اگر روٹی پکاتے وقت ہاتھ جل جائے تو فوراً "گیلا آٹا لگانے سے جلن میں کمی ہوگی۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

مہابت خانی پسندے

پسندوں کی یہ ترکیب دور مغلیہ کے ایک نامی گرامی امیر نواب مہابت خاں کی سوانح عمری سے لے کر آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

ضروری اشیاء:

گوشت	ایک کلو (انڈر کٹ)
دھنیا پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
لہسن کے جوے	پانچ چھ عدد
ثابت لال مرچیں	پندرہ عدد
گھی	ڈیڑھ کپ
پیاز	دو عدد
دہی	ڈھائی سو گرام
گرم مسالا	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

گوشت کے پارچے بنوا کر دھو کر خشک کرلیں اور اس کو کسی بھاری چیز کی مدد سے کوٹ لیں اور دہی لگا کر 3-2 گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ بلینڈر میں یا سل پر ابلی ہوئی ثابت لال مرچیں اور لہسن پیس کر پیسٹ بنالیں۔ برتن میں گھی گرم کرکے اس میں باریک کٹی پیاز ڈال کر ہلکی گلابی تل لیں۔ اور اس میں پسا ہوا مرچوں اور لہسن کا پیسٹ، نمک اور دھنیا پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ جب مسالا بھن جائے اور سرخ ہوجائے تو اس میں دہی لگے گوشت کے پارچے شامل کردیں اور درمیانی آنچ پر بھونیں اور ڈھکن ڈھک کر گوشت گلنے تک پکائیں۔ پانی بالکل خشک کرلیں۔ گوشت گل جائے اور گھی اوپر آجائے تو چولہے سے اتارلیں۔ ڈش میں نکال کر گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔

چنے کی دال کا حلوہ

اشیا:

چنے کی دال	آدھا کلو
(گرم پانی سے دھو کر ایک گھنٹے کے لیے بھگودیں)	
پستے بادام	بیس عدد
(گرم پانی میں بھگو کر چھیل لیں اور باریک کاٹ لیں)	
چھوٹی الائچی	دس عدد
(ایک چائے کا چمچہ چینی کے ساتھ پیس لیں)	
اخروٹ چھلے ہوئے	آدھی پیالی
(باریک کاٹ لیں)	
کشمش	پندرہ عدد
چینی	دو پیالی
خشک دودھ	دو پیالی
گھی	ڈھائی پیالی

ترکیب:

بھیگی ہوئی دال کو ابال لیں۔ دھیان رہے دال زیادہ نہ گل جائے۔ بکھری بکھری رہے۔ جب دال گل جائے تو پانی نکال دیں اور ٹھنڈی کرکے ــــ پیس لیں۔ اب ایک برتن میں گھی گرم کریں جب گرم ہوجائے تو الائچی ڈال دیں، خوشبو آنے لگے تو دال ڈال کر بھونیں، آنچ ہلکی رکھیں، جب دال کا رنگ ہلکا سنہری ہونے لگے تو دودھ، چینی، اخروٹ اور کشمش ڈال دیں اور چمچہ چلاتے رہیں۔ حلوے کو اتنا بھونیں کہ گھی الگ ہونے لگے۔ گھی بالکل الگ ہوجائے تو چولہا بند کردیں۔ ایک بڑی تھالی کو گھی سے چکنا کرکے اس میں حلوہ پھیلا کر ڈال دیں۔ پستے بادام اوپر سے ڈالیں اور پسند ہو تو چاندی کے ورق بھی سجادیں۔ جب حلوہ بالکل ٹھنڈا ہوجائے تو چھری سے ٹکڑے کاٹ لیں۔

سویوں کا زردہ

اشیا :

سویاں	آدھا کلو
بادام	دس عدد (باریک کٹے ہوئے)
چھوٹی الائچی	چھ عدد

(ایک چائے کا چمچہ چینی کے ساتھ پیس لیں)

گھی	چار کھانے کے چمچے
چینی	دو پیالی
پستے	دس عدد

(باریک کٹے ہوئے)

پانی	ایک پیالی

ترکیب :

ایک دیگچی میں گھی ڈال کر گرم کریں، جب گرم ہوجائے تو الائچی ڈال دیں۔ خوشبو آنے لگے تو سویاں ڈال کر اچھی طرح بھونیں، پھر تھالی میں نکال لیں۔ دیگچی میں چینی اور پانی ڈال کر پکائیں، شیرا بننے سے پہلے بھنی ہوئی سویاں اور میوہ ڈال کر ہلکی آنچ پر دم لگا دیں۔ جب پانی خشک ہوجائے تو ایک ڈش میں نکال کر چاندی کے ورق سجادیں۔

ہانڈی کباب مسالا

ضروری اشیا :

قیمہ	آدھا کلو
پسی سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
ہری مرچیں	پانچ سے چھ عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
خشخاش	ایک چائے کا چمچہ
بھنے چنے	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

گریوی کے لیے :

پیاز	دو عدد
پسی سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
پسا ہوا دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
پسی ہوئی ہلدی	ایک چوتھائی چمچہ
دہی	آدھا کپ
پسا ہوا گرم مسالا	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چوپر میں قیمہ، سرخ مرچ ـــ باریک کٹی ہوئی پیاز، ہری مرچیں، ہرا دھنیا، خشخاش (دھو کر بھیگی ہوئی) بھنے چنے اور نمک ڈال کر باریک پیس لیں اور کباب بنا کر فریزر میں پندرہ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ گریوی بنانے کے لیے ایک کھلے منہ کی دیگچی میں تیل گرم کریں اور پیاز ڈال کر سنہری ہونے تک تلیں اس کے بعد نکال لیں۔ اس کے بعد دہی اور تلی ہوئی پیاز کو پیس کر پیسٹ بنالیں۔ اسی تیل میں پسی ہوئی پیاز، دہی، پسی سرخ مرچ، پسا ہوا دھنیا، ہلدی اور نمک ڈال کر اتنا بھونیں کہ تیل اوپر آجائے ایک کپ پانی ڈال کر تیار شدہ کباب احتیاط سے مسالے میں پھیلا کر رکھ دیں اوپر سے گرم مسالا چھڑک دیں۔ ہلکی آنچ پر پندرہ بیس منٹ تک ان کبابوں کو پکائیں۔ جب مسالا تیل چھوڑ دے تو ہلکی سی گریوی رکھ کر سرونگ ڈش میں نکالیں۔ ہرے دھنیے سے سجا کر گرم گرم پیش کریں۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ـــــــــــ	سدرہ جبار
میک اپ ـــــــــــ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی ـــــــــــ	موسیٰ رضا

ش

میں نے بی۔اے کیا ہوا ہے۔ شادی کے بعد میں ایک دن بھی سکھ سے نہیں رہی۔ میرے تین دیور' تین نندیں اور ساس ہیں۔ میرے شوہر کچھ بھی نہیں کرتے۔ میرے پانچ بچے ہیں۔ میں اتنا پڑھی لکھی ہونے کے باوجود اپنے بچوں کو ٹائم نہیں دے پاتی۔ مجھے اس کی بھی ٹینشن ہے میرا اصل مسئلہ انکم کا ہے۔ میں پہلے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھی لیکن اب شوہر نے وہ بھی چھڑوادی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں نہ مجھے نوکری کرنے دیتے ہیں اور نہ ٹیوشن وغیرہ اور اب تو سسرال والوں نے مجھے علیحدہ بھی کردیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس عرصے میں میرے امی ابو کی بھی ڈیتھ ہو چکی ہے بھائی اپنی بیوی کے ساتھ باہر ملکوں میں سیٹ ہیں۔

ج اچھی بہن! آپ کے پانچ بچے ہیں۔ ان کے کھانے پینے' پہننے اور تعلیم کے اخراجات' گھر کے بل' اگر مکان اپنا نہیں ہے تو اس کا کرایہ۔ شوہر کوئی کام نہیں کرتے تو یہ اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں جبکہ سسرال والوں نے بھی علیحدہ کردیا ہے؟ آپ نے اس کی وضاحت نہیں کی۔ شوہر نوکری نہیں کرنے دیتے بلکہ وہ تو ٹیوشن پڑھانے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ آپ اپنے شوہر سے کہیں' وہ کوئی کام کریں ورنہ آپ کو نوکری کی اجازت دے دیں۔ جہاں تک کہانیاں لکھ کر پیسہ کمانے کی بات ہے تو آپ کہانیاں بھجوادیں اگر قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

اصل مسئلہ آپ کے بچوں کی پرورش اور تعلیم ہے' اگر آپ شوہر سے علیحدگی اختیار کرلیتی ہیں تو تنہا ان ذمہ داریوں کو کیسے پورا کریں گی۔

حنا اقبال' کراچی

ہم دو بہنیں ہیں۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ جس گھر میں ہم رہتے ہیں' وہ ہم دونوں بہنوں کے نام ہے۔ دو دکانیں والدہ کے نام ہیں جن کے کرائے سے گزر بسر ہوتی ہے۔ باقی کروڑوں کی جائیداد والد اپنی دوسری بیوی اور ان کے بیٹیوں کے نام کرگئے ہیں۔ وہ لوگ ہم سے ملنا پسند نہیں کرتے۔

دو سال پہلے آپی کی شادی ایک وکیل سے ہوئی تھی۔ جس نے دھوکا دہی سے بنگلہ اور دکانیں اپنے نام کرلی ہیں اور ہم تینوں ماں بیٹیوں کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اس وقت پڑوسیوں کے گھر رہ رہے ہیں۔ وکیل صاحب کے چھوٹے بھائی سے میرا نکاح ہو چکا ہے۔ ہمارے مالی حالات ایسے نہیں کہ وکیل صاحب پر کیس کرسکیں اور ویسے بھی انہوں نے دھمکی دی ہے کہ عدالت جانے کی صورت میں ہم دونوں بہنوں کی طلاق مل جائے گی۔ سخت پریشان ہوں اور آپ سے مشورے کی طالب ہوں۔

حنا بہن! طلاق کا خدشہ تو آپ ذہن سے نکال دیں۔ اگر وہ طلاق دے بھی دے تو کیا فرق پڑے گا' اس سے شادی نے آپ کو دیا کیا ہے۔ گھر سے بے گھر ہیں۔ جائیداد گھر سب کچھ چھن گیا ہے۔ اب طلاق سے آپ کو مزید کیا نقصان ہوگا۔ مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ آپ اپنا گھر اور جائیداد کیسے حاصل کریں۔

آپ وکیل صاحب کے چھوٹے بھائی سے بات کریں وہ رشتہ برقرار رکھنا چاہتا ہے یا اپنے بھائی کے ساتھ ہے۔ اور وہ آپ لوگوں کی کس حد تک مدد کر سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سے ایسے فلاحی ادارے ہیں جو بلا معاوضہ قانونی مشاورت فراہم کرتے ہیں۔ ان سے رجوع کریں' شاید کوئی راہ نکل آئے۔

صدف مغل' کراچی

میں چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ مجھے میری بے اولاد پھوپھی نے پالا ہے۔ پھوپھی نے بہت اچھی تربیت اور پرورش کی اور ان کی شدید خواہش تھی کہ میری شادی کسی امیر گھرانے میں ہو۔ سو میرے حسن کی بدولت یہ خواہش بھی پوری ہوئی۔ میرے سسرال والوں کا رویہ شروع دن سے سرد ہے۔ ساس صاحبہ میرے ہر کام میں کیڑے نکالتی ہیں۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی کچن سنبھال لیا۔ مگر کوئی بھی میری خدمت گزاری سے خوش نہیں۔ شوہر صاحب ہر وقت بے زار رہتے ہیں۔ ساس ہر آئے گئے کے سامنے ہماری سفید پوشی کو میرا عیب بنا کر پیش کرتی ہیں۔ ایک روز شوہر نے مجھ پر چوری کا الزام لگا کر گھر سے نکال دیا۔ میں نہ چور ہوں نہ بدتمیز اور نہ کام چور چھ ماہ سے والدین کے گھر رہ رہی ہوں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ رشتہ ختم ہو جائے۔ میں نے جاب کرلی۔ تو ایک روز شوہر صاحب لینے آگئے کہ نوکری چھوڑ دو۔ کیوں کہ ان کے دوست ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے' اپنی زبان درازی اور میرے احساسات کا نہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

ج۔ عزیز بہن! سسرال والوں کا رویہ اچھا نہیں ہے۔ مگر اسے برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے شوہر بھی بیزار رہتے ہیں۔ آپ نے غور کیا کہ شوہر صاحب کے اس رویہ کی وجہ کیا ہے؟ کیا انہیں آپ سے کوئی شکایت ہے یا آپ کی ساس ان کو آپ سے بدظن کرتی ہیں۔ یا انہیں آپ پسند نہیں ہیں؟ انہوں نے آپ پر بغیر کسی ثبوت کے چوری کا الزام لگایا پھر گھر سے بھی نکال دیا' اتنی بڑی بات کے بعد آپ کے گھر والوں کو ان سے بات کرنا چاہیے تھی اور ان سے پوچھنا چاہیے تھا کہ اس زیادتی کی وجہ کیا ہے۔ اب بھی آپ ان سے پوچھیں اگر وہ آپ کو چور سمجھتے ہیں تو پھر آپ کا ان کے پاس جانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ کل وہ آپ پر اس سے بڑا الزام بھی لگا سکتے ہیں۔ آپ قبول صورت ہیں' کم عمر ہیں ابھی آپ کی دوسری جگہ شادی ہو سکتی ہے لیکن اگر وہ اپنی بدسلوکی پر شرمندہ ہیں تو پھر آپ ان کے ساتھ چلی جائیں کیونکہ بہرحال طلاق کوئی اچھا فعل نہیں اور جائز کاموں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے ناپسندیدہ ہے۔

بہن ش۔ ر سے درخواست

پچھلے ماہ جنوری کے شمارے میں بہن ش۔ ر کا خط شائع ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ان کی بھابھی دو بچے چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اور ان کے بھائی بھابھی کی جدائی کی وجہ سے بہت ڈسٹرب ہیں۔ ہمیں کئی خواتین کے فون موصول ہوئے ہیں۔ جو ان کے بھائی سے اپنی بہن یا بیٹی کے رشتے کی خواہش مند ہیں۔ بہن ش۔ ر اگر چاہیں تو ہمیں خط لکھ کر یا فون کر کے اپنا کانٹیکٹ نمبر یا ایڈریس دے دیں۔ ہم متعلقہ خواتین کے فون نمبر ان کو دے دیں گے تاکہ وہ ان سے رابطہ کر سکیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

امت الصبور

بیوٹی بکس
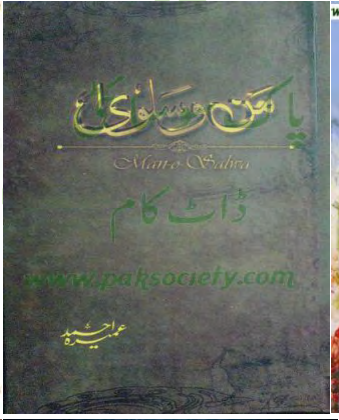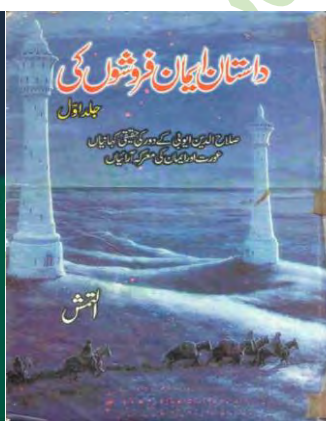
بشریٰ سلیم۔۔۔ اخون بانڈی

س :۔ ایک مسئلہ لکھ رہی ہوں' آپ ہنسیے گا نہیں۔ بڑے بھائی دبئی سے میک اپ کی چیزیں لائے ہیں۔ اس میں مسکارا بھی ہے۔ مجھے مسکارا لگانا نہیں آتا' آپ مسکارا لگانے کا طریقہ بتادیں۔

ج :۔ زینب! اس میں ہنسنے اور مذاق اڑانے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ مسکارا پلکوں پر لگایا جاتا ہے۔ اسے لگانے سے پلکیں خم دار اور خوب صورت نظر آتی ہیں' لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ لگانے کا صحیح طریقہ جانتی ہوں۔ اگر مسکارا ضرورت سے زیادہ لگا ہو تو وہ بہت بھدا نظر آتا ہے۔

اس کو لگانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مسکارا پلکوں پر دو سے تین مرتبہ سے زیادہ نہ پھیریں۔ پہلے برش سے اوپر کی پلکوں پر لگائیں۔ پھر نچلی پلکوں پر لگائیں۔ ایک اور ضروری بات کہ زیادہ عرصہ گزر جائے تو مسکارا خشک ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے استعمال نہ کریں۔

مہوش بٹ۔۔۔ گنگا پور

س :۔ میری عمر 25 سال ہے۔ قد پانچ فٹ دو انچ' وزن 50 KG ہے۔ آپ کوئی آسان سا نسخہ بتائیں۔ جس سے میں اپنا وزن کم کرسکوں۔

ج :۔ آپ کا وزن زیادہ ضرور ہے' لیکن بہت زیادہ نہیں۔ اگر آپ پانچ پونڈ وزن کم کرلیں تو آپ کے قد کے حساب سے ٹھیک ہوگا۔ اس کے لیے آپ کو بہت زیادہ ڈائٹنگ کی ضرورت نہیں۔ آپ مٹھائی کم کھائیں۔

آپ صبح نہار منہ ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک چمچہ شہد اور ایک لیموں کا رس ملائیں اور پی لیں۔

اس سے قبض بھی دور ہوتا ہے۔ یہ خون صاف کرتا ہے۔ لیموں جلد کی خوب صورتی کے لیے بہترین ہے۔ اس سے آپ کا وزن بھی کم ہوگا اور جلد بھی صاف شفاف ہو جائے گی۔

کرن مدیحہ۔۔۔ کراچی

س :۔ میرے سر میں خشکی تو پہلے ہی تھی۔ موسم سرما میں اس میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔ خشکی جھڑنے کی وجہ سے چہرے پر دانے بھی نکل آئے ہیں۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ خشکی دور ہو جائے۔

ج :۔ خشکی دور کرنے کے لیے آپ اینٹی ڈینڈرف شیمپو استعمال کریں۔ یہ گھریلو ٹوٹکے بھی بالوں کی خشکی ختم کرنے کے لیے بہت مفید ہیں۔

1 ۔ مہندی' دہی اور چائے کا پانی ملا کر پیسٹ بنائیں' پھر اس میں چند قطرے لیموں کے ڈالیں اور سر پر اچھی طرح لگالیں۔ خاص طور پر بالوں کی جڑوں میں لگائیں۔ بیس منٹ لگا رہنے دیں' پھر سر دھولیں۔ یہ آمیزہ پندرہ دن میں ایک بار ضرور لگائیں۔

2 ۔ نیم کے پتوں کو ابال کر اس کے پانی سے سر دھونے سے بھی خشکی ختم ہو جاتی ہے۔

3 ۔ چائے کے دو چمچے دہی میں ایک لیموں کا رس ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں اور سر پر لگالیں۔ بیس منٹ بعد سر دھولیں۔ یہ نہ صرف خشکی کو ختم کرتا ہے بلکہ بہترین کنڈیشنر بھی ہے۔

ثمو کنول۔۔۔ میانوالی

س :۔ کہتے ہیں کہ جس عورت کے پیر خوب صورت ہیں' وہ لازمی خوب صورت ہے' لیکن میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ چہرہ تو ٹھیک ٹھاک ہے' لیکن ہاتھ پیر بالکل خوب صورت نہیں ہیں۔ خصوصاً" پیر بہت زیادہ میلے اور کھردرے سے ہیں۔ آپ کوئی نسخہ بتائیں۔

ج :۔ آپ کے پیر اگر بھدے اور کھردرے نظر آئیں تو اس کا آسان اور فوری نسخہ یہ ہے کہ آپ اسکرب لگا کر پاؤں پر رگڑیں۔ بازار میں تیار اسکرب عام ملتے ہیں۔ لیکن آپ کے لیے خریدنا مشکل ہے تو آپ چند منٹ میں بہترین اور کم قیمت اسکرب گھر پر تیار کرسکتی ہیں۔ پانچ چائے کے چمچے زیتون کا تیل لے کر اس کو ہلکی آنچ پر گرم کرلیں' پھر اس میں آدھا چائے کا چمچہ شکر ملالیں۔ بہترین اسکرب تیار ہے۔

اس مکسچر سے باری باری دونوں پیروں کا مساج کریں۔ چند منٹ تک مساج کے بعد پاؤں دھو کر کوئی اچھی سی کریم لگائیں۔ یہ عمل رات سونے سے پہلے کریں۔ پیروں کے داغ دھبے اور کھردرا پن دور ہو جائے گا۔

☆